[illegible] حسرتِ اقبال
[illegible] قرآں گفت دل

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

غلام سرفراز فگار

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاج پورہ - لاہور

قیمت سالانہ دو روپے بارہ آنے — قیمت فی پرچہ ۴ر

سالانہ قیمت

عوام سے دو روپیہ بارہ آنے ۔ رؤسا سے پانچ روپے



فہرست مضامین

جلد ۲ | مارچ سنہ ۱۹۴۰ء | عدد ۳

افتتاحیہ:-

سخنہائے گفتنی — ایڈیٹر — ۲

اقبال اکیڈیمی لاہور — غلام سرور نگار — ۶

مقالات:-

اسرارِ خودی — غلام سرور نگار — ۹

مدافعانہ جنگ — سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن — ۱۴

اقبالیات:-

اقبال کا تصورِ زماں — پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی — ۲۵

رہبانیت صغریٰ — مرزا عزیز فیضانی داناپوری — ۵۱

منظومات:-

ذوق و شوق — غلام سرور نگار — ۵۷

[illegible] تازہ غزل — امین حزیں سیالکوٹی — ۵۹

[illegible] خودی اور بے خودی — مرزا عزیز فیضانی داناپوری — [illegible]

[illegible] گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں چھپ کر [illegible]



سخنہائے گفتنی

ہر ہلاکِ اُمتے پیشیں کہ بُود
زانکہ بر جندل گماں بردند عُود (رومیؒ)

سلطنت ترکی آج کل جس ارضی اور سماوی عذاب الیم میں مبتلا ہے اُسکو دیکھکر روم کی تباہی اور بربادی کا منظر آنکھوں کے سا[منے] پھر جاتا ہے، ایک طرف زلزلوں سے زمین پھٹ رہی ہے اور ہزاروں میل کے اندر اندر جتنے شہر قصبے اور دیہات ہیں پیوند زمین ہو رہے ہیں، انسان جن میں بوڑھے، جوان، بچے مرد اور عورتیں شامل ہیں۔ عالی شان مکانات کے ڈھیروں تلے دب کر سسکتے ہوئے جان دے رہے ہیں اور اُن کی جملہ املاک جس کو وہ جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے خاک میں مل کر خاک ہو گئی ہیں دوسری طرف دریاؤں کے سیلاب نے طوفانِ نوحؑ کا سماں باندھ دیا ہے وہ اپنی طغیانیوں میں بلا امتیاز مر[دہ] و زندہ سب انسانوں اور اُن کے سازوسامان کو بہاتے لئے جارہے ہیں، بارانِ رحمت وہاں کے لئے پیغامِ موت ث[ابت ہو] رہی ہے اور سردی اتنے کڑاکے کی پڑ رہی ہے کہ بیچارے بے خانماؤں اور برہنہ اندامموں کے لئے شاہ مار ثابت ہو ر[ہی] ہے اور وہ یخ بستہ ہو کر بے حس و حرکت ہوتے جارہے ہیں۔ جانکنی کے اتنے مرحلوں سے جو بدنصیب بچ رہتے ہیں بھیڑیئے ا[ن] کو اپنا لقمۂ تر بنا لیتے ہیں۔

یہ ہے اُس ملک کی حالت جہاں کے باشندے ایک ماہ قبل بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ا[ن] کی حکومت کو اپنے ملک کی ثروت اور نوجوانوں کی ہمت پر اتنا ناز تھا کہ موجودہ جنگِ یورپ پر لطف زنی کرتے ہوئے

وہاں کے وزیرِ خارجہ نے کہا تھا کہ جو ترکی کی طرف بُری نظر سے دیکھے گا ہم اُس کی آنکھ نکال دیں گے حکومت ترکیہ میں اتنی طاقت ہوگی کہ وہ دُنیا کی بڑی سے بڑی حکومت کا مقابلہ کر سکتی ہوگی لیکن یورپ کی کسی طاقت کا مقابلہ کرنے کے بجائے آج قدرت نے انہیں اپنا مدِمقابل بنایا ہے اور یہ اتنا سخت مقابلہ ہے کہ آج تک کوئی بھی اس میں گوئے سبقت نہیں لے جا سکا۔ ترکی کے مدبرین کو اس کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ عنقریب انہیں ایسے حریف سے دوچار ہونا پڑے گا جو قضائے مبرم کا گماشتہ ہوگا۔

دُنیا کا یہ دستور ہے کہ جب کسی پر مصیبت پڑتی ہے خواہ وہ انفرادی حالت میں ہو یا اجتماعی تو اس کے ساتھ ہر طرح سے اظہارِ ہمدردی کیا جاتا ہے اور روپے پیسے سے بھی امداد دی جاتی ہے کیونکہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ کل مجھ پر جب کسی قسم کی آفت نازل ہوگی تو ممکن ہے یہ لوگ میری بھی اعانت کریں۔ ترکی پر یہ عذاب ایسے وقت میں آیا ہے جب کہ موجودہ جنگ یورپ نے تمام یورپین طاقتوں کی اغراض کو حکومت ترکی کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے چنانچہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی وابستگی اور تعلقات کے سررشتہ کو زیادہ مضبوط بنانے کے لئے اُس کی امداد میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں پیشقدمی کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور ترکی کی اس بربادی اور اپنی خوش نصیبی پر دل ہی دل میں اس لئے خوش ہے کہ ترکی کو مرہونِ منت بنانے کا موقع مل گیا اور اس کی اپنی دوعملی پالیسی کی ساکھ بھی قائم رہی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ قیامِ جمہوریہ کے بعد ترکی کو جو نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی اس کی بنا پر وہ یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک سے پیچھے نہیں رہی بلکہ مسیحا نفس لیڈروں نے اس کے جسم میں ایسی روح پھونکی کہ قوم کے خفیہ جذبات میں آگ سی لگ گئی اور صدیوں کی راہ انہوں نے بیس سال کی قلیل مدت میں طے کر لی لیکن وہ کونسی راہ تھی جو انہوں نے طے کی۔ کیا وہ اللہ کی اطاعت ہے یا آقائے دوجہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کی شاہراہ ہے؟ کیا یہ ترک وہی صاحب نظر جوانانِ تتاری ہیں۔ فتح سمرنا کے بعد جن کے قوتِ بازو اور جذبۂ ایمان سے اقبالؒ کی تمام آرزوئیں اور امیدیں وابستہ تھیں اور یہ راز جس کو اُسے کسی پر بھی افشا نہیں کرنا چاہیئے تھا از خود رفتگی کے عالم میں اُس کی زبان سے نکل گیا ؎

پھر اُٹھی ایشیا کے دل میں چنگاری محبت کی زمیں جولانگہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

کیا پھر قوم کے ہاتھوں حرم کی جو رسوائی ہوئی تھی اس کے وقار کو از سرِ نو دُنیا میں قائم کرنے کے لئے جس قوم پر دُنیا کے مسلمانوں کی نگاہیں پڑتی تھیں وہ یہی قوم ہے اور کیا خدا نے اسی قوم کو اس لئے موت کے گھاٹ سے نہیں بچایا تھا کہ یہ دُنیا میں اس کے اس ارشاد کی تعمیل کرے گی۔ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ لیکن افسوس کہ اس قوم نے نہ صرف خدا کے اس ارشاد کی نافرمانی کی، نہ صرف دُنیا کے مسلمانوں کو مایوس کیا اور نہ صرف ایک اسلامی مفکر کی آرزوں اور امیدوں کو پامال کیا بلکہ وہ کچھ کیا جس کو خدا اور اس کے رسول صلعم کی غیرت گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

اقبالؒ جس نے ۱۹۲۲ء میں ترکوں کو اس طرح سلام بھیجا تھا ؎

از من بگو سلامے آں ترک تند خود را

کآتش زد از نگاہے یک شہر آرزو را

سن ۳۰ء میں جب آپ نے دیکھا کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے یورپ کی نقالی شروع کر دی ہے جس سے ترک اپنے اصلی مرکز سے ہٹ جائے گا اور جو نئی باتیں ترک اپنی طرف سے پیدا کر رہے ہیں وہ وہی ہیں جو یورپ میں پرانی ہو چکی ہیں اور اسلام سے ان باتوں کو دُور کی بھی نسبت نہیں تو جاوید نامہ میں فلک عطارد میں پہنچ کر سعید حلیم کی زبان سے ترکوں کو ذیل کا پیغام دیا ؎

چوں مسلماناں اگر داری جگر	در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست	عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است	گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست	ہر جہاں اندر برِ اُو چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش	می دہد قرآں جہانے دیگرش

یہ اس قوم کے نام پیغام تھا جس کی قوتِ تسخیر اور پستیٔ فکر کی بابت اقبالؒ بالِ جبریل میں فرماتے ہیں ؎

سُنا ہے میں نے سخن رس ہے ترکِ عثمانی
سُنائے کون اسے اقبال کا یہ شعرِ غریب

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

ترکوں نے یورپ کی کس حد تک تقلید کی۔ یہ ایک طولانی قصہ ہے جس کا نہ موقعہ ہے اور نہ گنجائش تاہم اس عذابِ الیم سے جو خدا کی جانب سے اُن پر نازل ہُوا ہے۔ کافی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے کسی قوم کے لئے قدرت کی یہ تعذیب کوئی نئی بات نہیں تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَار۔

———— (٠) ————

اقبال اکیڈمی لاہور

(غلام سرور نگار)

(۳)

گذشتہ دو اشاعتوں میں میں اقبال اکیڈمی کے مالہ اور ماعلیہ پر سیر حاصل بحث کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ اس کی اساسی روح کیا ہونی چاہیئے۔ یہ اُس سلسلہ کی آخری قسط ہے جس میں اُن اغراض و مقاصد کو متعین کیا جاتا ہے جن پر اس اکیڈمی کی ہیئت ترکیبی منحصر ہے اقبالی ذوق رکھنے والے حضرات کو چاہیئے کہ وہ اس میں عملی حصہ لیں۔

اغراض و مقاصد

۱۔ چونکہ علامہ اقبالؒ دورِ حاضرہ کے مجددِ اعظم ہیں اس لئے آپ نے اسلامی دستور و شریعت کو جن کائناتی، معادی اور معاشی تصوّرات میں پیش کر کے تمام دُنیا کے مسلمانوں کی انفرادی، اجتماعی، سیاسی اور عمرانی زندگی پر اُن کو محیط کیا ہے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تشریح اور تبلیغ کی جائے تاکہ دورِ حاضرہ کے تمام مسائل کو انہی اساسی تصوّرات کی روشنی میں حل کیا جاسکے۔

۲۔ وہ اسلامی اور غیر اسلامی افکار و اعمال جو گذشتہ صدیوں میں عالم اسلام میں رائج رہے ہیں اور اس کی تعلیمات کی اُنھوں نے کایا پلٹ دی اور دورِ حاضرہ کے وہ تمام مشرقی و مغربی تصوّرات جنھوں نے اسلام کی متاعِ حیات پر شبخوں مارا ہے اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر اس طرح چھا گئے

ہیں کہ اب وہ قلبی واردات اور دماغی افکار میں تمیز نہیں کرسکتے دونوں کے خلاف علامہ اقبالؒ نے جس مجتہدانہ انداز میں احتجاج کیا ہے اس کی وضاحت کی جائے ۔

۳ ۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کے احیاء کے لئے علامہ اقبالؒ کے لائحہ عمل کو مسلمانوں میں عام کیا جائے اور بجائے مجلس اقوام مغرب یا مجلس اقوام ایشیا ۔ اتحادِ اسلام اور اتحادِ عالم کی تحریک کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے ۔

۴ ۔ درویش صفت ، فقیر منش اور روح قلندری رکھنے والے مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جن کے انفرادی اور اجتماعی وجود میں علامہ اقبالؒ کی مثالی روح یعنی خودی اور بے خودی کارفرما ہو تاکہ وہ اس مثالی روح اس ملتِ وسطیٰ اور اس مذہبِ انسانیت کے مبلغ و مناد بن کر اقصائے عالم میں پھیل جائیں جس کے لئے علامہ اقبالؒ کا ظہور ایک عالمِ نو کی صبح صادق کے مخبرِ صادق کی شکل میں ہوا ہے ۔

ان اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے لاہور ایسے علمی مرکز میں ایک ایسے ادارہ کی تشکیل کی گئی ہے جس کا نام "اقبال اکیڈیمی" رکھا گیا ہے اور مندرجہ ذیل ذرائع اس کے وظائفِ حیات ہیں ۔

۱ ۔ ماہنامہ "پیغام حق" کا اجرا جو گذشتہ سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے ۔

۲ ۔ تصنیف و تالیف جس کا کام اس ماہ سے شروع کیا گیا ہے اور اس سلسلہ کی پہلی کتاب اس ماہ کے اخیر تک شائع ہو جائے گی ۔

۳ ۔ اقبال اورینٹل کالج کا قیام جس کا تعلق اغراض و مقاصد کی آخری دفعہ سے ہے ابھی تک اس کے لئے ماحول پیدا نہیں ہوا ۔ اہل عزم و ہمت مسلمانوں کی پیشقدمی کا انتظار کیا جا رہا ہے ۔

ہیئت ترکیبی

۱ ۔ محسن خاص ۔ جو حضرات کم سے کم دو سو روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے وہ اقبال اکیڈیمی

کے محسن دوامی متصور ہوں گے ایسے ہمدردانِ اسلام کی خدمت میں اکیڈمی کی تمام مطبوعات معہ رسالہ نذر کی جاتی رہیں گی نیز اکیڈمی کے کارکن اُن کے قیمتی مشوروں پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین ۔ جو حضرات کم سے کم سو روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے وہ اکیڈمی کے محسنین کہلائینگے اس عطیہ کے پیشِ نظر اُن کی خدمت میں اقبال اکیڈمی کی جملہ مطبوعات نصف قیمت پر اور رسالہ بلاقیمت روانہ کیا جاتا رہے گا۔

۳۔ معاونین ۔ جو حضرات کم سے کم پندرہ روپیہ سالانہ مرحمت فرمائیں گے وہ معاونین کہلائینگے اُن کی خدمت میں اقبال اکیڈمی کی طرف سے کم سے کم چار مطبوعات نصف قیمت پر اور رسالہ بلاقیمت روانہ کیا جائے گا۔

۴۔ احبا ۔ جو حضرات دس روپیہ سالانہ مرحمت فرمائیں گے اُن کا شمار اقبال اکیڈمی کے احبا میں ہوگا اُن کی خدمت میں رسالہ بلاقیمت اور اقبال اکیڈمی کی کم از کم دو مطبوعات نصف قیمت پر روانہ کی جائیں گی۔

———— (٥) ————

اسرارِ خودی

خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے

(غلام سرور نگار)

(۳)

جس طرح عشق سے خودی استحکام پذیر ہوتی ہے سوال سے اس میں ضعف آجاتا ہے اور اُس کا شیرازۂ اتحاد منتشر ہونے لگتا ہے افراد اور اقوام کی تاریخ فکر و عمل میں جہاں خودی کو اہمیت حاصل ہے کہ وہ اُن کی تقدیر کو بدلنے میں معجزہ نمائیاں کرتی ہے گداگری اور سائلانہ روش بھی اُن کے زوال اور تخریب کا باعث ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک سوال ایک وسیع المعنی لفظ ہے جو بادشاہ سے لے کر رعایا میں کے ادنیٰ سے ادنیٰ شخص پر حاوی ہوتا ہے چنانچہ آپ کے نزدیک ذیل کی تین صورتیں بھی سائلانہ ہیں۔

۱۔ ایک بیٹے کا اپنے باپ کی جائداد کا وارث ہونا۔

۲۔ دوسروں کے افکار کو اپنانا یا اُن کی روشنی سے اپنی قوتِ فکر کو جِلا دینا۔

۳۔ بادشاہ کا اپنی رعایا کے خراج یا ٹیکس پر زندگی بسر کرنا۔

اقبالؒ انہی تین صورتوں کے پیشِ نظر ضعفِ خودی کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے فراہم کردہ از شیراں خراج گشتہ روبہ مزاج از احتیاج

خستگیہائے تو از ناداری است اصلِ دردِ تو ہمیں بیماری است

اقبالؒ کا روئے سخن مسلمانوں سے ہے آپ اُن کی موجودہ خستہ حالی سے متاثر ہو کر انہیں یاد دلاتے ہیں کہ تمہارے آباؤ اجداد کیا تھے اور تم کیا ہو اور پھر اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ تم دنیا میں کیوں ذلیل و خوار ہو رہے ہو اور تمہارا خون کیوں پانی کی طرح ارزاں ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کے آباؤ اجداد وہی تھے جنہوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت کو اُلٹ دیا تھا اور اقصائے عالم کے شہنشاہ اُن کے سامنے سرِ اطاعت و فرمانبرداری جھکانے پر مجبور ہو گئے تھے اور برضا و رغبت خراج پیش کیا کرتے تھے لیکن جب سے مسلمانوں نے اپنے آباؤ اجداد کے مقرر کئے ہوئے رستے سے انحراف کیا ہے اور جذبۂ فقر و غنا کو ترک کر دیا ہے وہ ذلیل و خوار ہو گئے ہیں اُن کا دل قوتِ ایمان سے عاری ہو گیا ہے اور اخلاقِ حمیدہ کے بجائے اخلاقِ ذمیمہ نے جگہ لے لی ہے گوناگوں اغراض نے اُن کے کانوں، آنکھوں اور دل پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ اور لومڑی کی طرح اُن کا ظاہر و باطن ایک دوسرے سے الگ ہو گیا ہے۔ ان اغراض کو پورا کرنے کی دُھن میں مسلمان رات دن میں مکر و فریب کے کئی لباس بدلتے ہیں لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دن دن اُن کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جارہی ہے اور وہ اس کی وجہ معلوم کرنے کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے دراصل اِن تمام خرابیوں کی جڑ ناداری اور مفلسی ہے اور یہی ایک بیماری ہے جو مسلمانوں کو گھن کے کیڑے کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی ہے اور وہ اس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہر ناشائستہ حرکت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ناداری اور مفلسی سے اقبالؒ کی مراد خدا کی اُن نعمتوں سے محرومی ہے جن سے مسلمانوں کے آباؤ اجداد مالا مال تھے اور جن کی موجودگی میں اُنہوں نے دُنیا پر اپنی عظمت و شجاعت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ آج کل کی یہ دولت اور سامانِ عشرت کی فراوانی یا کمی نہیں ہے کیونکہ اس کی موجودگی یا عدم موجودگی دونوں صورتیں مسلمانوں کے اندر وہ جذبۂ ایمان پیدا نہیں کر سکتیں جو صدیقینِ اُمت کا طرۂ امتیاز ہو سکتا ہے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر اور جَو کی روٹی کھانے والے اُن مسلمانوں سے آج کل مرغ و مزعفر کھانے والے مسلمانوں کو کوئی نسبت نہیں کیونکہ اُن کی زندگی کا جوہر فقر و غنا تھا اور ان کی زندگی کا جوہر احتیاج ہے اور یہ اپنی حاجت روائیوں کے لئے در در مارے پھرتے ہیں لیکن اس کے باوجود آتشِ حرص فرو نہیں ہوتی اور خواہشِ ھل من مزید اِن کی مزید ذلت و رسوائی کا موجب ہوتی ہے۔

می رُباید رفعت از فکرِ بلند　　　می کُشد شمعِ خیالِ ارجمند

اپنی حاجت روائی کے لئے گدائی کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن پست ہو جاتا ہے اور اس میں وہ افکار بھی پیدا نہیں ہوتے جو اعمال صالح کے محرک ہوتے ہیں اور وہ بلند نصب العین آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے جس کے حصول کے لئے حیات اپنی جملہ قوتوں کو صرف کر دیتی ہے چونکہ قوتِ فکر کو انسانی اعمال میں بڑی دسترس ہے اس لئے جب یہ چشمہ مکدر ہو جاتا ہے تو اعمال کا رُخ بھی بدل جاتا ہے یہاں تک کہ حق و باطل میں تمیز کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

از خمِ ہستی مئی گلفام گیر نقدِ خود از کیسۂ ایام گیر

اس لئے دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کے بجائے انسان کو اعتماد علی النفس کی خداداد قوت اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے اور اس قوت کو یہاں تک ترقی دینی چاہئے کہ ہر چیز خود بخود کھچی چلی آئے رسول صلعم نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے یہ بہتر ہے کہ لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد لائے اور بیچ کر اپنی آبرو بچائے۔ یہ اعتماد علی النفس کا بہترین اصول ہے اقبالؒ بھی مسلم نوجوانوں کی زبوں حالی اور پریشاں خاطری کو دیکھ کر اُن کے مُردہ دلوں میں یہی رُوح پھونکنا چاہتے ہیں تاکہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی حاجت لے کر نہ جائیں بلکہ اپنے اندر ایسی قوت پیدا کریں کہ جس چیز کی اُنہیں ضرورت ہو خود بخود مہیا ہو جائے اور وہ قوت کونسی ہے؟ ——— اعتماد علی النفس یعنی لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر لاد کر لانا اور اکلِ حلال کے حصول میں ہر صورت میں کوشاں رہنا کیونکہ یہی خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور یہی بُرائیوں کی جڑ۔ علم و حکمت اور عشق و رقت سب کا وجود اکلِ حلال کا مرہونِ منت ہے اسی لئے رسول صلعم نے اعتماد علی النفس کے سلسلہ میں اکلِ حلال کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ مرشدِ رومیؒ نے بھی اسی پہ زور دیا اور اقبالؒ نے بھی علم و حکمت کی جستجو اور سوز و درد و داغ کی طلب میں اسی کو درجۂ اولیت دیا ہے اور اس کے حصول میں آپ کسی کا احسانمند ہونا پسند نہیں کرتے۔

خود فرود آ از شترِ مثلِ عمرؓ الحذر از منتِ غیر الحذر

حضرت عمرؓ کی بابت منقول ہے کہ جب بحالت سواریِ اُشتر اُن کا تازیانہ ہاتھ سے گر گیا تو اُسے زمین پر سے اُٹھانے کے لئے خود اُونٹ سے اُترے اور اس معمولی سی بات کے لئے بھی کسی کا احسانمند ہونا برداشت نہ کیا۔ اقبالؒ فاروقِ اعظمؓ کے اس اسوۂ حسنہ پہ چلنے کی تاکید فرماتے ہیں کیونکہ آج کل کے مسلمان اتنے سہل انگار اور عافیت کوش ہوگئے ہیں کہ وہ اپنے

ہاتھوں سے کچھ نہیں کرنا چاہتے اور روزمرہ کے معمولی سے معمولی کاموں میں بھی نہ صرف وہ دوسروں کے دست نگر رہتے ہیں بلکہ اس کے جواز میں طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتے ہیں اور اپنے جاہ وجلال اور مراتب عالی کے تحفظ اور بقاء کے لوازمات میں اس کا شمار کرتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ بات زیادہ اہم معلوم نہیں ہوتی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو انسانی سیرت کا یہ سنگِ اساس ہے خوش حال گھرانوں کے جن بچوں کو اتنا سہولت پسند اور نوکروں سے کام لینے کا عادی بنا دیا جاتا ہے بعد میں جوان ہو کر وہ دراصل اس قابل نہیں رہتے کہ زندگی کے دشوار گذار راستوں پر چلنے کے وقت اپنے اوپر اعتماد کر سکیں یہ عادت مسلمانوں میں اتنی عام ہو گئی ہے کہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کسی سے مخصوص نہیں رہی حضرت عمرؓ سے بھی بڑھ کر ہمارے نزدیک رسول صلعم کا اسوۂ حسنہ ہے جن کی زندگی میں اس قسم کے بیشمار واقعات ملتے ہیں ایک سفر میں آنحضرت صلعم کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا آپ نے خود اس کو درست کرنا چاہا ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! لائیے میں ٹانک دوں۔ فرمایا: میں اس کو پسند نہیں کرتا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بڑھ کر کون جان نثار ہو سکتا ہے لیکن ہجرت کے وقت جب انہوں نے سواری کے لئے اپنا ناقہ پیش کیا تو آنحضرت صلعم نے قیمت ادا کئے بغیر اس پر سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ مدینہ منورہ میں مسجد کے لئے زمین درکار تھی مالکانِ زمین نے مفت نذر کرنا چاہی لیکن آپ نے قیمت دیکر لی۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نہ اپنی ذات کے لئے اور نہ اپنی اُمت کے لئے اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ وہ کسی معاملہ میں بھی دوسروں کے مرہونِ منت ہوں۔

تا بکے دریوزۂ منصب کنی صورتِ طفلاں زنے مرکب کنی

جو لوگ آج کل جاہ ومنصب کے پیچھے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں اور اس کوشش میں اپنے تمام اخلاق فاضلہ کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اقبالؒ اُن کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہ تگ و دو کب تک؟ جاہ ومنصب کی حقیقت جب اس نے کی طرح ہے جس کو بچے گھوڑا بنا کر سواری کرتے ہیں تو اندازہ کیجئے اُن شہسواروں کا کیا درجہ ہو گا۔ اگر یہ فریب محض نہیں تو کیا ہے اور ایسے کھلونوں سے اپنے دل کو بہلانا کہاں تک صحیح ہے جو نتیجہ اُن بچوں کا ہوتا ہے جو نے کا گھوڑا بناتے ہیں یہی حال اُن مسلمانوں کا ہوتا ہے جو منصبوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں چونکہ وہ مناصب اُن کے اعتماد علی النفس کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے نہ اُن پر

قائم رہنے کی حالت میں مسلمانوں کی عزت برقرار رہتی ہے اور نہ چھن جانے کے بعد۔ یہ بات روزمرہ ہمارے مشاہدے میں آتی ہے کہ ملازمت خواہ ادنےٰ ہو یا اعلےٰ اس کے حصول کے لئے در در کی خاک چھاننی پڑتی ہے ارباب استغنیاء کے سامنے دست بستہ اور سر جھکا کر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور خوشامدانہ الفاظ اور ایمان فروشی کے مظاہرے کرنے پڑتے ہیں یعنی چند سفید ٹکلیوں کی خاطر پھیلائی جاتی ہے جن کی اس ملازمت کے حصول کے بعد توقع ہوتی ہے اقبالؒ کے نزدیک ایسی ملازمت کے حصول کی کوشش دریوزہ گری ہے

فطرتے کو بر فلک بندد نظر　　پست می گردد ز احسانِ دگر

از سوال افلاس گردد خوارتر　　از گدائی گدیہ گر نادار تر

از سوال آشفتہ اجزائے خودی　　بے تجلی نخلِ سینائے خودی

کلام مجید میں آیا ہے فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِی فطر الناس۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ خدا کی یہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کا خاصہ یہ ہے کہ ایک اڑان میں آسمان پر جا پہنچے کسی کے زیر احسان ہونے سے اس کے شہپر مفلوج ہو جاتے ہیں اور قوتِ پرواز جواب دے جاتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مفلسی بُری چیز ہے لیکن انسان کا فرض ہے کہ اس کی پردہ پوشی کرے سوال کرنے سے مفلسی میں کبھی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ اُس میں اضافہ ہوتا ہے اور سائل بھی دنیا کی نظروں میں زیادہ ذلیل ہو جاتا ہے اور اُس کا رہا سہا اعتبار بھی جاتا رہتا ہے۔ سوال سے جس چیز کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے وہ خودی ہے جس کا وظیفہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ وہ انسان کی تمام منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کرے لیکن جب خودی کے اپنے اجزا ہی آشفتہ ہوں تو وہ دوسری منتشر قوتوں کی کیسے شیرازہ بندی کر سکتی ہے یقیناً اُس کے انتشار سے تمام نظامِ جسمانی متاثر ہوگا اور خودی اپنی منتشر قوتوں کو معرضِ شہود میں نہیں لا سکے گی۔

مشتِ خاکِ خویش را از ہم مپاش　　مثلِ مہ رزقِ خود از پہلو تراش

اس میں کچھ شک نہیں کہ انسان ایک مشتِ خاک ہے لیکن اقبالؒ کی نگاہوں میں اس مشتِ خاک کا درجہ بہت بلند اور رفیع ہے اس کی منزل چرخِ نیلی فام سے بھی پرے ہے اور یہ ستارے اس کی گردِ راہ ہیں اس میں اتنی طاقتِ پرواز

ہے کہ زمین و آسمان اس کے پردوں میں گم ہو کر رہ جائیں یہ کہکشاں، یہ ستارے اور نیلگوں افلاک تمام کے تمام اس آدم خاکی کے عروج کے منتظر ہیں اور اس کی ایک نگاہ دنیا کی تقدیر کو الٹ دیتی ہے اور مہر و ماہ کے آئینہ کو پاش پاش کر دیتی ہے جس مشتِ خاک میں اتنی قوت ہو اقبالؒ کی نظروں میں اس کا ذرہ ذرہ اتنا قابلِ قدر ہے کہ اس کی علیحدگی کو برداشت کر سکیں بلکہ وجود کے ہر ایک ذرہ کی اتنی قدر و قیمت ہے کہ اس کے عوض میں حیاتِ جاودانی کو بھی پسند نہیں کرتے اس شعر میں بھی آپ نے انسان کو تاکید کی ہے کہ اپنی مشتِ خاک کی قدر و قیمت پہچاننی چاہئے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر شیرازۂ ہستی کو منتشر نہیں کرنا چاہئے بلکہ چاند کی طرح اپنے پہلو سے رزق حاصل کرنا چاہئے کسبِ معاش کا یہ زرّیں اصول انسان کی مشتِ خاک میں وہ جوہر پیدا کر دیتا ہے کہ اسکا ہر ایک ذرہ حیاتِ دوام حاصل کر لیتا ہے۔

گرچہ باشی تنگ روز و تنگ دست در رہِ سیلِ بلا افگندہ رخت
رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو موجِ آب از چشمہ خاور مجو

اقبالؒ کہتے ہیں خواہ انسان کو چاروں طرف سے مصائب نے گھیر رکھا ہو اور مفلسی اور ناداری کے ہاتھوں جان سے بھی تنگ آ گیا ہو اُس کو دوسروں کے دسترخوان کے مرغن کھانوں سے اپنے تنورِ شکم کی آگ کو فرو نہیں کرنا چاہئے اور دوسروں کی نعمتوں سے اپنی خواہشات اور ضروریات کے دامن کو پُر نہیں کرنا چاہئے باوجودیکہ تمام عرب حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آ چکا تھا لیکن حضرت محمد صلعم پر فاقہ کشی اور تنگ دستی کی پہلی سی کیفیت رہتی دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہ جلتی دن اکثر فاقوں میں گذر جاتا اور رات کو تو عموماً سارا گھر بھوکا سو رہتا تھا لیکن زہد و قناعت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کے سامنے اپنی زبان سے اس کا اظہار تک کرنا گوارا نہ کیا یہ شان تھی اُس آقائے دو جہاںؐ کی جس کی نسبت لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ آیا ہے۔

تا نہ باشی پیشِ پیغمبر خجل روزِ فردائے کہ باشد جاں گسل
ماہ را روزی رسد از خوانِ مہر داغ بر دل دارد از احسانِ مہر
ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز آبروئے ملتِ بیضا مریز

اقبالؒ خدا کے سامنے اپنے گناہوں کی خجالت کو برداشت کرسکتے ہیں لیکن حضرت محمد صلعم کے حضور میں خجل ہونا برداشت نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ آپ نے خدا سے یہ دعا مانگی کہ جب یہ عالم پیر اختتام پذیر ہو اور ہر پوشیدہ تقدیر بے پردہ ہو تو مجھے حضرت محمد صلعم کے سامنے رسوا نہ کرنا اور میرے اعمال ناموں کو اُن کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا کیونکہ آپ کے خیال میں خدائے تعالےٰ شانِ پنہانی رکھتے ہیں۔ اور حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم شانِ پیدائی، ایک دنیائے خلوت کا مختارِ مطلق ہے تو دوسرا دُنیائے جلوت کا ایک کی خودی سے خلوتیں منوّر ہیں تو دوسرے کی خودی سے جلوتیں اور اہلِ جلوت ہونے کی بنا پر ہمارا تعلق جتنا حضرت محمد صلعم سے ہے خدا سے نہیں اگرچہ علت العلل خدا ہے لیکن آنحضرت صلعم ایک ایسی علت ظاہرہ ہیں کہ ہمارے عشق و محبت کا رشتہ اُن کے ساتھ براہِ راست پیوستہ ہے اور جب ہم اس تعلق کی استواری اور استحکام میں تساہل برتتے ہیں تو لامحالہ ہمیں بہ نسبت خدا کے آنحضرت صلعم سے زیادہ محجوب ہونا پڑتا ہے اس مقام پر بھی اقبالؒ مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ قیامت کے دن حضرت محمد صلعم کے حضور میں شرمسار نہ ہو تو اُنکے ارشادات پر عمل کرو۔ انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ ہر معاملہ میں خدا سے استعانت کرو اور غیر اللہ کی جتنی طاقتیں تمہارے راستے میں حائل ہوں اُن سے نبرد آزما ہو جاؤ۔ غیر اللہ کے سامنے اپنی حاجتوں کو لے کر جانا ملتِ بیضا کی آبروریزی کرنا ہے اور وہ ملتِ بیضا کونسی ہے؟ وہ آنحضرت صلعم کے نعرۂ بیباکانہ کی تخلیق ہے جس کو خدا نے بھی خَیْرَ اُمَّةٍ کا لقب دیا۔

آنکہ خاشاکِ بتاں از کعبہ رُفت مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت

وائے بر منت پذیرِ خوانِ غیر گردنش خم گشتۂ احسانِ غیر

خویش را از برقِ لطفِ غیر سوخت با پشیزے مایۂ غیرت فروخت

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت محمد صلعم نے فرمایا اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ۔ یہ اُس آقائے دوجہاں کا مقولہ ہے جس نے کعبے کو بتوں سے صاف کر دیا تھا لیکن جائے افسوس کہ مسلمانوں نے اس کو بھلا دیا ہے اور اب دوسروں کے دستِ کرم کے محتاج ہو گئے ہیں جن کی گردنیں سوائے خدا کے کسی کے سامنے جھکنی نہ چاہئیں تھیں اب وہ اغیار کے احسانات کے تلے دبی ہوئی ہیں اُنکے دل سے احساسِ خودی رخصت ہو چکا ہے اور ادنےٰ سے ادنےٰ اغراض کے پورا کرنے کی خاطر وہ اپنے بیش قیمت

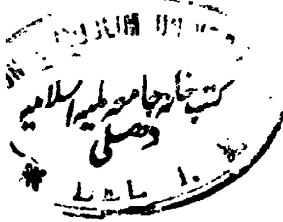
سرمایۂ غیرت کو قربان کرنے کیلئے آمادہ ہو جاتے ہیں مسلمانوں کی یہ تباہی اسی کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنے قوتِ بازو پہ بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔

خنک آں تشنہ کاندر آفتاب | می نخواہد از خضر یک جامِ آب
تر جبیں از خجلتِ سائل نہ شد | شکلِ آدم ماند و مشتِ گل نہ شد
زیرِ گردوں آں جوانِ ارجمند | می رود مثلِ صنوبر سربلند
در تہی دستی شود خود دار تر | بختِ او خوابید و اُو بیدار تر

اقبالؒ اس نوجوان کی خوش بختی کو قابلِ رشک سمجھتے ہیں جو انتہائی شدّتِ پیاس کے وقت آبِ حیات کے پینے سے بھی انکار کر دیتا ہے اور حیاتِ جاودانی کیلئے خضر کا مرہونِ منت ہونا پسند نہیں کرتا وہ اس سرشاری سے دوچار ہونا نہیں چاہتا جو عموماً سائل کے چہرے پر نمایاں ہوتی ہے اور صحیح معنوں میں آدم بن کر زندگی بسر کرتا ہے نہ کہ مشتِ گل جسے ہوا کے جھونکے جا بجا اُڑائے لئے پھریں اس آسمان کے نیچے اسکی گردن سوائے خدا کے کسی کے سامنے نہیں جھکتی اور جب کبھی افلاس و غربت اسکو گھیر لیتے ہیں تو اسکی خودداری پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے اور اس امتحان میں اسکے جملہ قویٰ ان موانعات کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں جو اسکی خودی کے جوہر کو مٹانا چاہتے ہیں یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان کے جوہر مصائب و آلام ہی میں کھلتے ہیں لیکن یہ اُن لوگوں کیلئے ہے جنکے اندر خودی کی طاقت زندہ ہوتی ہے اور جو اپنی کمینہ حرکات سے خودی کی قوتِ عمل کو بیکار کر دیتے ہیں وہ دین و دُنیا میں خائب و خاسر رہ جاتے ہیں۔

قلزمِ زنبیل سیلِ آتش است | گر ز دستِ خود رسد شبنم خوش است

گداگری سے خواہ انسان کو قاروں کا خزانہ ہی کیوں نہ ملجائے اسکے سرمایۂ خودی کیلئے وہ سیلِ آتش کی حیثیت رکھتا ہے جو اسکے جوہر کی قوت اور تابناکی کو ضعیف کر دیتا ہے بادشاہی کرلے لیجئے کونسی نعمت ہے جو اسکے خزانہ میں نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی نعمت نہیں ہے تو وہ خودی ہے جسکو وہ مال و دولت کے جمع کرنے میں ضائع کر دیتا ہے کیونکہ اس دوران میں وہ ایسے ایسے ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے جو انسان کی خودی کیلئے پیغامِ موت ہوتے ہیں اسکے برعکس جو شخص اپنی خودی کو قائم رکھتے ہوئے صرف ایک وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھاتا ہے اس بادشاہ سے کئی درجہ بہتر ہے اور اسکی زندگی یقیناً قابلِ رشک ہوتی ہے۔ (باقی آئندہ)



الجہاد فی الاسلام

مدافعانہ جنگ

(از جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور)

(۵)

سابقہ آیات میں اسلام کے ایک رکن یعنی حج سے روکنے کو صدٌّ عن سبیل اللہ کہا گیا ہے اور جبکہ اسلام کے سب ارکان و فرائض یکساں ہیں۔ اور سب کی تعمیل مسلمانوں کے لئے ضروری ہے تو اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح ایک فریضہ کو ادا کرنے سے روکنے کو خدا کی راہ سے روکنا کہا گیا ہے اسی طرح دوسرے تمام فرائض سے روکنا بھی اللہ کی راہ سے روکنا ہے۔ اور اس لحاظ سے ہر وہ رکاوٹ جو مسلمانوں کے راستہ میں ان کے مذہبی احکام کی تعمیل سے باز رکھنے کے لئے ڈالی جائے۔ وہ قرآن کے اس فیصلہ کے مطابق صدٌّ عن سبیل اللہ کی تعریف میں آتی ہے۔

پس دوسری صورت جس میں مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیا گیا ہے، یہ نکلی کہ:۔

(۱) یا تو اسلام کی ترقی کو تلوار یا اقتصادی و سیاسی قوت یا اور کسی شیطانی طاقت سے روکا جائے

(۲) یا مسلمانوں کو مرتد بننے کے لئے مجبور کیا جائے۔

(۳) یا ان کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے اور مذہبی احکام کی تعمیل کرنے سے روکا جائے۔

(۳) دغابازی و عہد شکنی کی سزا | سورہ انفال میں ایک اور جرم جس کے خلاف جنگ کرنے کا حکم ہے یہ بتایا گیا ہے کہ

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ (۸:۵۵)

اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانداروں میں بدترین وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے! وہ ایمان نہیں لائے جن سے تُو نے معاہدہ کیا تھا مگر وہ بار بار اپنے عہد کو توڑتے ہیں اور بدعہدی سے پرہیز نہیں کرتے پس اگر تو جنگ میں ان کو پالے۔ تو انہیں سخت سزا دے کر ان لوگوں کو خوفزدہ و پراگندہ کر دے۔ جو ان کے پیچھے ہیں (یعنی انہیں ایسی سزا دے جو ان کے بعد والوں کے لئے موجب عبرت ہو) شاید کہ وہ کچھ سبق حاصل کریں اور اگر تجھے کسی قوم سے دغا کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر علی الاعلان ان کا عہد ان کی طرف پھینک دے۔ اللہ یقیناً دغا بازوں کو پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح سورہ توبہ میں زیادہ سختی کے ساتھ ان کافروں کے متعلق جنہوں نے مسلمانوں سے بار بار عہد کئے تھے۔ فرمایا ہے کہ:۔

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ ۔

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ براءت ہے ان مشرکوں کی طرف جن سے تُو نے معاہدہ کیا تھا اور جنہوں نے بار بار اس کی خلاف ورزی کی پس چار مہینے اور زمین میں چل پھر لو اس کے بعد خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو بلکہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ضرور ہے۔

اس کے بعد ان مشرکوں کے متعلق جنہوں نے عہد نہیں توڑا تھا حکم دیا کہ فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ان کے معاہدہ کی مدت مقررہ تک پابندی کرو۔ اور پھر دوبارہ نقض عہد کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ:-

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

جب وہ چار حرمت والے مہینے (جن کی مہلت اوپر دی گئی ہے) گذر جائیں تو ان کو قتل کرو جہاں پاؤ۔ اور انہیں گرفتار کرو۔ اور انہیں گھیر کر محصور کر لو (تاکہ بلاد مسلمین میں نہ آسکیں) اور ان کے لئے ہر کمین گاہ میں بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ کریں، نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو (یعنی پھر ان سے تعرض نہ کرو) کیونکہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

آگے چل کر پھر انہی بدعہد اور دغاباز مشرکوں کے متعلق فرمایا ہے کہ

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ (۹:۲)

ان مشرکوں سے اللہ اور اس کے رسول کا عہد کیسے رہ سکتا ہے سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا۔ سو وہ جب تک عہد پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو کیونکہ اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ مگر (ان بدعہدوں سے کیونکر عہد ہو سکتا ہے جن کی کیفیت یہ ہے کہ جب تم پر غلبہ و فتح حاصل کر لیں تو نہ تم سے قرابت کا لحاظ رکھیں اور نہ عہد و اقرار کا۔ وہ (عدم ظفر کی حالت میں) تم کو زبان سے خوش

کرتے ہیں۔ مگر ان کے دل انکار کرتے ہیں (یعنی وہ دل میں تمہیں نقصان پہنچانے کی فکر رکھتے ہیں۔) اور ان میں اکثر بدکار و سرکش ہیں۔

اس کے بعد پھر انہی بدعہدوں کے متعلق فرمایا ہے۔

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ۔ أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ۔

(یہ دغا باز مشرکین) کسی مومن کے ساتھ قرابت یا عہد و اقرار کا لحاظ نہیں کرتے۔ اور وہی ہیں جو بیجد زیادتی کرتے ہیں پس اگر وہ توبہ کریں۔ نماز ادا کریں۔ اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور یہ آیات ہم کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو کچھ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنی قسموں کو توڑ دیں عہد کرنے کے بعد اور تمہارے دین میں طعن کریں۔ تو کفر کے لیڈروں کے ساتھ جنگ کرو کیونکہ (اس کے بعد معلوم ہو گیا کہ) ان کی قسم کا کچھ اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اپنی حرکات سے باز آئیں۔ کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا۔ اور رسول کو نکال دینے کا اہتمام کیا۔ اور انہوں نے ہی اول مرتبہ تم پر پیشدستی کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرو بشرطیکہ تم ایماندار ہو۔ ان سے تم ضرور جنگ کرو۔ اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں

سے عذاب دیگا۔ اور انہیں رسوا کرے گا۔ اور تم کو ان پر نصرت بخشے گا۔ اور مومنوں کے قلوب کو شفا بخشے گا۔

ان تمام آیات اور ان کی شانِ نزول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ۔

(۱) جو لوگ مسلمانوں سے عہد کر کے توڑیں۔ ان سے جنگ کرنی چاہیئے۔ اس حکم میں وہ کفار بھی آجاتے ہیں جو مسلمانوں سے اطاعت کا معاہدہ کر کے پھر حکومت اسلامیہ کے خلاف بغاوت کریں۔

(۲) جن سے معاہدہ تو ہو مگر ان کا رویہ ایسا مخالفانہ و معاندانہ ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کو ان سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہے تو انہیں علی الاعلان فسخ معاہدہ کا نوٹس دیدینا چاہیئے اور ان کی دشمنی کا منہ توڑ جواب دینا چاہیئے۔

(۳) جو لوگ بار بار بدعہدی و دغا بازی کریں۔ اور جن کے عہد و اقرار کا کوئی اعتبار نہ رہے اور جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں اخلاق و انسانیت کے کسی آئین کا لحاظ نہ رکھیں ان سے دائمی جنگ کا حکم ہے اور صرف اسی صورت سے ان کے ساتھ صلح ہو سکتی ہے کہ وہ توبہ کریں اور اسلام لے آئیں ورنہ ان کے شر سے اسلام اور دارالاسلام کو محفوظ رکھنے کے لئے قتل، گرفتاری، محاصرہ اور ایسی ہی دوسری جنگی تدابیر اختیار کرتے رہنا ضروری ہے۔

(۴) گھر کے بھیدیوں اور اندرونی دشمنوں کا استیصال

ان بیرونی دشمنوں کے علاوہ کچھ اندرونی دشمن بھی ہیں جو ظاہر میں دوست مگر باطن میں اسلام کی جڑ کاٹنے والے ہیں۔ یہ لوگ اس جماعت میں داخل ہیں۔ جس کے لئے قرآن حکیم نے منافق کا جامع لفظ استعمال کیا ہے۔ اور ان کے باب میں یہ حکم دیا ہے کہ۔

یَاۤ اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ اے نبی منافقوں اور کافروں سے جہاد کرو۔ اور ان پر سختی کرو۔ ان کا ٹھکانا وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ دوزخ ہے۔ اور وہ بہت ہی بری جائے قرار ہے

۱۰:۹

لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینہ میں بری خبریں

قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ — اڑانے والے اپنی معاندانہ حرکات سے باز نہ آئے تو ہم تجھے ان پر مسلط کر دیں گے اور پھر وہ اس
ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا مَلْعُونِينَ — شہر میں تیرے ہمسایہ نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔ ان پر پھٹکار پڑے گی جہاں ملیں گے
أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا (۳۳) — پکڑے جائیں گے اور خوب قتل کیے جائیں گے۔

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا — یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح یہ خود کافر ہوئے۔ تاکہ تم اور وہ برابر
تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ — ہو جائیں پس تم ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ یہ اللہ کی راہ میں اپنے
فَإِن تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ — گھروں سے نہ نکلیں اگر وہ انحراف کریں (اور اظہار و اعانت کفر سے باز نہ آئیں) تو انہیں
وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۔ — پکڑو۔ اور جہاں پاؤ مارو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست و مددگار نہ بناؤ ۔

سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَن يَأْمَنُوكُمْ وَ — کچھ دوسرے لوگ ایسے پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم کے لوگوں
يَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا — سے بھی (اس لئے جب تمہارے پاس آتے ہیں تو اقرار اسلام کرتے ہیں) اور جب فتنہ کی
فَإِن لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا — طرف لوٹائے جاتے ہیں تو اس میں اوندھے گر پڑتے ہیں (یعنی خود بھی فتنہ میں شامل ہو جاتے
أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ — ہیں) پس اگر تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے صلح کی طرح ڈالیں۔ اور نہ تمہارے خلاف جنگ
وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا — دشمنی سے ہاتھ روکیں تو انہیں پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کرو۔ ان لوگوں پر ہم نے تمہیں یہ واضح
(۴:۹۱) — دلیل دے دی ہے ۔

ان آیات میں منافقین کی اس جماعت کا جرم بھی بیان کر دیا گیا ہے جس کے باعث وہ واجب القتل ہوئے ہیں لیکن مزید وضاحت کیلئے ہم قرآن مجید ہی کی چند آیات پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ سورہ نساء میں فرمایا ہے کہ

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ — وہ تجھ سے تو کہتے ہیں کہ تابعدار ہیں مگر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ
طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ — جو کچھ تو کہتا ہے اس کے خلاف بات کو منصوبہ گانٹھتا ہے اور جو کچھ یہ لوگ راتوں کو منصوبے

مَا يُبَيِّتُونَ ۔ (۴:۸۱)

کا خشا کرتے ہیں اللہ ان سے خبردار ہے۔

سورہ توبہ میں فرمایا۔

لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۔ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَارِهُونَ

اگر وہ تمہارے ساتھ مل کر لڑنے کو نکلتے تو تمہارے اندر فساد کے سوا اور کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور تمہارے درمیان جھوٹی خبریں پھیلا کر اور چغلخوریاں کر کے فتنہ برپا کرنے کی کوشش کرتے اور تم میں ان کی باتیں سن کر دشمنوں تک پہنچانے والے بھی ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے انہوں نے اس سے پہلے بھی (غزوۂ احد میں) فتنہ برپا کرنا چاہا تھا اور تجھے مکاندو حیل سے دھوکہ دینے کی تدبیریں کی تھیں یہاں تک کہ حق کی نصرت آگئی اور اللہ کا حکم ہوا۔ اگرچہ وہ انہیں بہت ہی ناگوار تھا۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ۔ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ۝

اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم ہی میں سے ہیں حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ڈر رہے ہیں (کہ ہمارا حشر بھی مشرکین کا سا نہ ہو) اگر انہیں کوئی جائے پناہ یا غار یا گھس بیٹھنے کا مقام مل جائے تو ضرور اس کی طرف پھر جائیں اور دوڑ کر جائیں۔

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۹:۹)

منافق مرد و منافق عورتیں سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، بری باتوں کا حکم کرتے ہیں، اچھی باتوں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو نیک کاموں سے روکتے ہیں، وہ اللہ کو بھول گئے ہیں، اس لئے اللہ بھی ان سے بے پروا ہو گیا ہے بیشک یہ منافق بڑے ہی بدکار اور نافرمان ہیں۔

سورۂ احزاب میں فرمایا۔

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۔ وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ

اور (جب جنگ احزاب کے موقع پر) منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدہ ہم سے کیا تھا وہ دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہ تھا اور جب ان میں سے ایک گروہ بولا کہ اے اہل یثرب اب تمہارے ٹھہرنے کا

فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ موقع نہیں ہے یہاں سے بھاگ نکلو۔ اور ان میں سے ایک فریق نبی سے اجازت لینے لگا۔ یہ
يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ کہہ کر کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے ہوئے (غیر محفوظ) نہ تھے اور ان کا مطلب
إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا۔ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ بھاگ جانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر مدینہ کے اطراف سے دشمن گھس پڑتے اور ان سے درخواست
مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا کی جاتی کہ تم بھی مسلمانوں کو قتل و غارت کرنے کے فتنہ میں شریک ہو جاؤ تو وہ ضرور شریک
وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ہوتے اور اس میں ذرا تامل نہ کرتے۔

سورہ منافقون میں فرمایا:۔

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً خدا کا رسول ہے
اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ ہاں اللہ بھی جانتا ہے کہ تو ضرور اس کا رسول ہے مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً
الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا جھوٹے ہیں انہوں نے اپنی قسموں کو (اپنی دشمنی کے لئے) ڈھال بنا لیا ہے اور یہ اللہ کے
عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۶۳:۲) راستہ سے روکتے ہیں اور یہ بہت ہی برا کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔

یہ آیات بتلاتی ہیں کہ منافقین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کے ساتھ ظاہر میں مسلمانوں کا سا معاملہ نہیں کیا جا سکتا اور اس گروہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کرنے کے بعد علانیہ اظہار کفر کرتا ہے یا زبان سے بدستور اسلام کا اقرار کرتا ہے مگر اس کی حرکات یہ ہوتی ہیں کہ ہر وقت مسلمانوں کے درپے آزار رہتا ہے، انہیں نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتا ہے ان کے دشمنوں سے سازباز رکھتا ہے ان کی خفیہ خبریں دشمنوں کو پہنچایا کرتا ہے ان کا ایمان بگاڑنے اور انہیں گمراہ کرنے کی کوششیں کرتا ہے، انکی جماعت میں ریشہ دوانیاں کر کے تفرقہ برپا کرتا ہے انکے دشمنوں کو اخلاقی و عملی مدد پہنچاتا ہے اور اسلام پر جب مصیبت کا وقت آئے تو اس کی حفاظت کی بجائے اسے مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ گروہ اسلام کے لئے اس کے بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے اسلئے جو لوگ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں خواہ وہ ہر وقت کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھتے رہیں، اور خواہ ظاہری حیثیت سے انکے اسلام میں کسی شک کی گنجائش نہ ہو، مگر ان کے ساتھ قطعاً کوئی رعایت نہ کرنی چاہئے اور جب ان سے ان جرائم کا صدور ہو تو جسم اسلام کے ان پھوڑوں پھنسیوں کے ساتھ اصلاح کا نشتر استعمال کرنا چاہئے۔ (باقی آئندہ)

اقبالیات

اقبال کا تصورِ زماں

مبحث نہم

اَلوَقتُ سَیفٌ

(پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی۔ اے)

میرے محترم دوست پروفیسر سلیم چشتی نے اسرارِ خودی کی شرح جس کاوش، محنت اور شوق سے تحریر کی ہے۔ اُس کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہوں نے پیغامِ حق کے سابقہ پرچوں میں اس شرح کے مبحث مطالعہ فرمائے ہیں اس اشاعت میں ہم پروفیسر صاحب کی شرح اسرارِ خودی کے باقی دونوں مبحث شائع کر رہے ہیں ہمیں پوری مسرت ہے کہ اسرارِ خودی کے بہت سے دقیق اور اہم نکات پروفیسر صاحب موصوف نے مختصر سے الفاظ میں اس طرح حل کر کے رکھ دیئے ہیں کہ اب ہر شخص بلا دقت انکو سمجھ سکتا ہے اگر خدا نے توفیق دی تو ہم اس شرح کو عنقریب کتابی شکل میں بھی طبع کرینگے ـــــ محمد شاہ

علامہ اقبالؒ نے اس عنوان کے ذیل میں زمان و مکان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں اس ضمن میں اُس بحث کو بھی لکھ دوں جو علامہؒ نے اپنے خطبات مدراس میں پیش کی ہے اور پروفیسر الگزینڈر، برگساں اور دیگر مغربی فلاسفہ کے افکار کی طرف بھی اشارہ کر دوں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اگر

اس اسلوب کو اختیار کیا تو یہ بحث بہت طویل اور بہت دقیق ہو جائے گی۔ اس لئے میں سردست صرف مثنوی کے اشعار کی تشریح پر اکتفا کرتا ہوں۔ زمان و مکان کی مفصل بحث اس وقت لکھوں گا جب خدا مجھے حسب خطبات مدراس کی شرح لکھنے کی توفیق دے گا۔

سبز باد احناکِ پاکِ شافعی　　عالمے سرخوش، زتاکِ شافعی

فکر او کوکب زگردوں چیدہ است　　سیف بُرّان وقت را نامیدہ است

یعنی خدا تعالٰی امام شافعیؒ کو مراتب عالیہ نصیب کرے، انہوں نے کیسی عمدہ بات کہی ہے کہ الوقت سیفٌ یعنی وقت تلوار ہے

حضرت امام شافعیؒ فقہ اسلامی کے چار اماموں میں سے ایک امام ہیں۔ اور غالباً انہوں نے یہ مقولہ کہ "وقت تلوار ہے"۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے استعمال کیا تھا کہ وقت حوادث روزگار کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ علامہؒ نے جو معانی، ان کے مقولہ کو پہنائے ہیں وہ ان کے نہاں خانہ دماغ میں بھی موجود ہوں۔ خواہ کچھ بھی ہو، علامہؒ کو ان کا یہ مقولہ بہت پسند آیا یعنی انہیں الوقت سیفٌ کی ترکیب بہت پسند آئی اور اسی لئے انہوں نے اسے زیب عنوان بنایا۔

من چہ گویم سرّ ایں شمشیر چیست

آب او سرمایہ دار از زندگیست

وقت بمنزلہ تلوار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ (سرِّ شمشیر سے مراد ہے ماہیت یا حقیقت وقت) علامہ فرماتے ہیں کہ وقت کی حقیقت لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اس تلوار کی دھار حیات پر منحصر ہے یعنی اگر حیات نہ ہو تو وقت کا وجود بھی نہ ہو۔

اب علامہؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ صاحبِ وقت (یعنی وہ شخص جو وقت یا زمان پر حکمران ہو) کی صفات کیا ہوتی ہیں :-

صاحبش بالاتر از امید و بیم　　　دست او بیضا تر از دست کلیم

جو شخص زمان پر حکمران ہو وہ امید و بیم سے بالاتر ہوتا ہے ، اور اُسے غیر معمولی بلکہ فوق البشر قوتیں حاصل ہوتی ہیں

در کفِ موسیٰؑ ہمیں شمشیر بود　　　کار او بالاتر از تدبیر بود

سینۂ دریائے احمر چاک کرد　　　قلزمے را خشک مثلِ خاک کرد

پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیر بود　　　قوت او از ہمیں شمشیر بود

یعنی حضرت موسیٰؑ نے جو بحرِ قلزم (RED SEA) کو خشک کر دیا اور حضرت علیؓ نے جو خیبر کا دروازہ ایک ہاتھ سے اکھیڑ پھینکا، یہ محض اس لئے کہ یہ دونوں حضرات، زمان پر حکمران تھے[1] -

گردشِ گردونِ گرداں دیدنی است　　　انقلابِ روز و شب فہمیدنی است

قرآن مجید نے انقلابِ روز و شب کو اللہ کی سب سے بڑی نشانیوں میں سے قرار دیا ہے -

اس لئے علامہؒ فرماتے ہیں کہ گردشِ افلاک اور انقلابِ روز و شب پر غور کرو لیکن انسان بعض وجود کی بنا پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ زمانہ بھی کوئی خارجی وجود رکھتا ہے- چنانچہ علامہ اس غلط خیال کی تردید

---

[1] علامہ اقبالؒ نے علم کلام میں کیا خدمت انجام دی، اور متکلمین کے زمرہ میں ان کا پایہ کیا ہے؟ یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے اس پر مفصل بحث اس وقت ہوگی جب میں اس موضوع پر مستقل کتاب لکھوں گا۔ بر دست اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دورِ مادیت میں، معجزات کا عقلی امکان ثابت کرکے، علامہؒ نے مذہب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے ۔ اگر سرسید مرحوم کی توجہ اس طرف مبذول ہو جاتی تو انہیں معجزات انبیاء کی تاویلات رکیکہ کی ضرورت پیش نہ آتی بلکہ وہ یہ کہہ کر ان کا ثبوت دے سکتے تھے کہ جو شخص زمان پر حکمران ہو جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ :-

پنجۂ او پنجۂ حق می شود　　　ماہ از انگشت او شق می شود　　　(اقبالؒ)

فرماتے ہیں :-

اے اسیرِ دوش و فردا در نگر — در دلِ خود عالمِ دیگر نگر
در گلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی — وقت را مثلِ خطے پنداشتی

یعنی اے اسیرِ دوش و فردا! اے وہ شخص جو اپنے آپ کو زمانہ کا محکوم سمجھتا ہے، اگر تو اپنے ضمیر میں غوطہ زن ہو تو تجھے اور ہی عالم نظر آئے گا یعنی تجھے معلوم ہوگا کہ زمانہ کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے، بلکہ اس کا وجود، تیری زندگی کے کارناموں کے اظہار پر منحصر ہے

تو نے اپنی گل یعنی اپنے دماغ میں یہ غلط خیال قائم کر لیا کہ وقت یا زمانہ (TIME) خط[1] (LINE) کی طرح کوئی ممتد وجود رکھتا ہے یعنی تو نے ٹائم کو خط یا لکیر تصور کر لیا۔

اور چونکہ خط کو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں اس لئے انہوں نے لیل و نہار کو اس کی پیمائش کا آلہ بنا کر اس کو ماضی حال اور استقبال میں تقسیم کر لیا، اور چونکہ انسان اپنے آپ کو دن اور رات میں محدود اور محصور سمجھتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے آپ کو گردشِ روزگار کا قیدی تصور کر لیا، اور اس تخیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان نے زمانہ (TIME) کو اپنے اوپر حکمران قرار دے دیا۔

ہندی اور یونانی حکماء نے اس طرح استدلال کیا ہے۔

"زمانہ باعثِ تکوینِ حوادث ہے یعنی واقعات، زمانہ کی بدولت رونما ہوتے ہیں اور زمانہ انسانی دسترس سے بالاتر ہے، اس لئے حوادثِ روزگار انسانی دسترس سے بالاتر ہیں پھر چونکہ انسان زمانہ ..... کا اسیر ہے یعنی "کال" اس پر مسلط ہے اس لئے انسان اپنی زندگی میں مجبور ہے یہی وجہ ہے کہ ہندی اور یونانی فلسفہ کے زیرِ اثر آکر ایرانی شعراء نے گردشِ افلاک کو انسانی

---

[1] ہندی یونانی اور نیوٹنی (NEWTONIAN) فلسفہ میں زمانہ کا خارجی وجود تسلیم کیا گیا ہے اور ان حکماء نے زمانہ کو خط کی طرح تصور کیا ہے +

زندگی پہ اثر آفریں بلکہ حکمراں، بیان کیا اور رفتہ رفتہ یہ غیر اسلامی تخیل مسلمانوں کے دل و دماغ میں ایسا راسخ ہو گیا کہ اس نے ان کو زندانی زماں بنا دیا، چنانچہ آج بھی ہم آپس میں اس طرح اظہار فکر کرتے ہیں "دیکھئے گردش افلاک کیا رنگ دکھاتی ہے" "دیکھئے زمانہ کون سی کروٹ بدلتا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا (غالب)

مطلب ان سب کا ایک ہی ہے کہ انسان مجبور ہے اور زمانہ اس پر مسلط ہے اس غلط فہمی کا مبنیٰ یہ ہے کہ ہندی اور یونانی حکما نے زمانہ کو مکان (SPACE) کی طرح (EXTENDED LINE) ایک خط ممتد قرار دیا، اور سمجھا کہ یہ ایک دائرہ (چکر) ہے جس کے گرد ہم گردش کر رہے ہیں۔ چنانچہ روزمرہ گفتگو میں ہم "زمانہ کے چکر"[1] کی ترکیب عموماً استعمال کرتے ہیں۔ اور مطلب وہی زمانہ کی فعالیت (ACTIVITY) ہوتا ہے۔

اب آئندہ اشعار کا مطلب بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔

درگِلِ خود، تخمِ ظلمت کاشتی وقت را مثلِ خطے پنداشتی
باز با پیمانۂ لیل و نہار فکرِ تو پیمود طولِ روزگار

یعنی پہلی اور بنیادی غلطی انسان سے یہ ہوئی کہ اس نے وقت کو لائن تصور کیا، اور پھر اس کے طول کو لیل و نہار کے پیمانہ سے ناپا

---

[1] ممکن ہے ہندو فلاسفہ نے حیات انسانی کے چکر سے زمانہ کے چکر کا تصور مستعار لیا ہو۔ بودھ دھرم کا چکر تو دنیا میں مشہور ہے۔ زندگی سے خواہش، خواہش سے عمل، عمل سے جزا و سزا، اور جزا و سزا سے زندگی، اسی لئے گوتم نے اس چکر سے نکلنے کی ترکیب یہ نکالی کہ زندگی ہی کو ختم کر دو۔ ۱۲

ساختی این رشتہ را زنّارِ دوش گشتۂ مثلِ بتاں، باطل فروش

(اے مسلمان! اے وہ انسان جس کو خدا نے زمانہ پر حکمراں بنایا تھا) تو نے اس تخیل کو گویا رشتۂ زنار بنا لیا اور غلط خیالات کا شکار ہو گیا۔

مسلمی؟ آزاد این زنّار باش شمعِ بزمِ ملّتِ احرار باش

آخرکار علامہؒ نے واضح طور پر لفظ مسلمان استعمال کر ہی لیا۔ فرماتے ہیں۔

اے مخاطب کیا تو مسلمان ہے؟ اگر ایسا ہے تو تیرا پہلا فرض یہ ہے کہ اس زنار کو گردن سے اُتار ڈال یعنی زمانہ کے اس تخیل کو دماغ سے نکال دے۔

زماں (TIME یا काल) کا خارج میں کہیں وجود نہیں یہ تو ہمارے ذہن کی پیداوار ہے یعنی زمانہ کا وجود خارجی نہیں ہے بلکہ ذہنی ہے (TIME IS SOMETHING SUBJECTIVE) اور اس کی بدولت ہم حیات کا تصوّر کرتے ہیں اگر ہمارے ذہن میں زمانہ کا تصوّر نہ ہو تو حیات کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا۔ (WITHOUT TIME, LIFE IS UNTHINKABLE).

تو کہ از اصلِ زماں آگہ نہٖ از حیاتِ جاوداں آگہ نہٖ؟

تو چونکہ زمانہ کی ماہیت سے آگاہ نہیں ہے اس لئے حیاتِ جاوداں (ETERNAL LIFE) کے مفہوم سے بھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔

اب علامہؒ، زماں کی تفہیم و تفہّم کے لئے دوسرا پہلو اختیار کرتے ہیں اور حدیث مشہور لی مع اللہ وقتٌ سے استفادہ کرتے ہیں۔

تا کجا در روز و شب باشی اسیر رمزِ وقت از لِیْ مَعَ اللّٰہ یاد گیر

یعنی تو کب تک یہ سمجھتا رہے گا کہ زمانہ تجھ پر حکمران ہے؟ تو کب تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہے گا کہ زندانِ لیل و نہار ہے؟ اگر تو جویائے حقیقتِ وقت ہے تو آ میں تجھے ایک طریقہ بتاؤں آنحضرت صلعم کی اس حدیث

پر غور کرو:-

لی مع اللہ وقتٌ لایسعنی فیہ نبیٌ مرسلٌ ولا ملکٌ مقربٌ ۔ یعنی بعض اوقات مجھے خدا کے ساتھ وہ راز نیاز کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ اس تخلیہ کی محفل میں، نہ نبی مرسل بار پا سکتا ہے نہ ملک مقرب۔

مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اس کائنات میں، مجھے اپنے اور خدا کے علاوہ کسی تیسری چیز کا احساس نہیں ہوتا یعنی وقت، روز و شب یا ماہ و سال کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے، جس کا خارج میں وجود نہیں ہے صرف ذہنِ انسانی اس کا ادراک کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اُسی کی پیداوار ہے۔

ایں و آں پیداست از رفتارِ وقت زندگی سرّیست از اسرارِ وقت

کائنات میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں یہ سب وقت کی رفتار کی بدولت ظہور میں آتے ہیں۔ واضح ہو کہ وقت ایں و آں یعنی حوادث مظاہر اور واقعات (EVENTS) سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایں و آں وقت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ (TIME) لمحات (سکنڈ۔ منٹ۔ ساعت) کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک وحدت ہے۔ یہ جو آپ کے دماغ میں دوش، امروز اور فردا کا تصور پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی سہولت کے لئے وقت کی وحدت کو، حسب منشا حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ دراصل زمانہ کوئی مادّی شے نہیں بلکہ ذہنی تصور (LOGICAL CONCEPT) ہے

ہماری زندگی، زمانہ کے اسرار میں سے ایک سر ہے یہاں زندگی سے مراد فعالیت (ACTIVITY) ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ وقت اور زندگی دونوں ہی راز ہیں وقت کا تصور زندگی (حوادث و واقعات) کے بغیر نہیں ہو سکتا اور زندگی کا تصور وقت کے بغیر ممکن نہیں۔

چنانچہ اس شعر کی شرح میں علامہؒ نے فرمایا

" TIME IS LIFE AND YOU CAN NOT UNDER STAND LIFE WITH-OUT TIME "

اصلِ وقت از گردشِ خورشید نیست وقت جاوید است و خور جاوید نیست

یعنی زماں کی اصلیت، اختلافِ لیل و نہار پر مبنی نہیں ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ آپ نے دن رات کو پیمانہ فرض کیا اور تیس دن کا ایک ماہ اور بارہ ماہ کا ایک سال بنایا، اور آپ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی وفات کو چار ہزار سال ہوئے تو یہ جو بات آپ نے کہی اعتباری ہے کیونکہ اگر ماہ و سال کا پیمانہ زمین کی گردشِ دَوری کے بجائے کچھ اور ہوتا، تو آپ کبھی چار ہزار سال نہ کہتے۔

وقت بذاتہ آنی فانی یا عارضی چیز نہیں بلکہ وہ حقیقتِ ابدی ہے (TIME IS ETERNAL) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زماں، تخلیقی حرکت کا نام ہے اور خدا ہر وقت تخلیق میں مصروف ہے، اس لئے زماں، خدائی زندگی (DIVINE LIFE) کا ایک جزو ہے یا اگر یہ لفظ مغالطہ آمیز نظر آئے، تو یوں کہہ لیجے کہ زمان، حیات ایزدی کی ایک شان (ASPECT) ہے۔

کوئی انسان، خدا کے متعلق زمانہ کی قید سے آزاد ہو کر تصور نہیں کر سکتا، بلکہ خود خدا کے تصور کے ساتھ زمانہ کا تصور لازمی ہے مثلاً جب آپ کہتے ہیں کہ خدا ہے تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ "وہ ازل سے ہے" اور "وہ ابد تک رہے گا"۔ یعنی خدا تعالےٰ الحیّ ہے یعنی زندہ یعنی زندگی اس کی صفت ہے لیکن آپ اس کی زندگی کا تصور بھی، وقت[1] کے تصور سے منزّہ ہو کر نہیں کر سکتے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ خدا زمان و مکان کی قید میں ہے

---

[1] علامہؒ نے فرمایا کہ "وقت زندگی ہے" اس پر اس اعتبار سے بھی غور کیجے کہ فرض کیجے کہ آپ سکتہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور چھ ماہ تک بے ہوش رہے اب سوال یہ ہے کہ

(۱) کیا اس عرصہ میں آپ وقت کا تصور کر سکے؟

بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ اپنی ہیئت دماغی، اور ترکیب ذہنی، کی بنا پر مجبور ہیں کہ جب خدا کی زندگی کا تصور کریں، تو اس کو زمانہ کے تصور سے جدا نہیں کر سکتے۔

قصہ مختصر وقت ازلی ہے حالانکہ آفتاب ازلی نہیں ہے وہ تو ایک مادی چیز ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ فنا ہو جائے گا

عیش و غم عاشور و ہم عید است وقت　　　سِرِّ تابِ ماہ و خورشید است وقت

زمانہ کیا ہے؟ عیش بھی ہے اور غم بھی ہے یعنی جملہ حوادث روزگار جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں، سب وقت ہی کی بدولت رونما ہوتے ہیں۔ انسان وقت کے تصور سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتا۔ عیش اور غم، رنج اور راحت، عاشورہ اور عید غرضیکہ ہر حادثہ کا تصور، بقید زمان ہی کر سکتا ہے۔ بلکہ چاند اور سورج کی روشنی کا بھی تصور نہ ہو سکے اگر وقت کا تصور نہ ہو۔

وقت را مثلِ مکاں گسترده؟　　　امتیازِ دوش و فردا کرده؟

تجھ سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ تو نے زمان کو بھی مکان کی طرح ممتد (EXTENDED) سمجھ لیا اور اس طرح دوش و فردا کا امتیاز پیدا کر لیا۔ یہ غلطی اس لئے ہوئی کہ تو نے وقت کو مادی چیز سمجھا حالانکہ وقت مادی شے نہیں ہے۔

واضح ہو کہ آئن سٹائن (EINSTEIN) اور اقبال کے خیالات میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر زمان کو بُعدِ رابع (FOURTH DIAMENSION) قرار دیتا ہے یعنی اس کو مادی شے تصور کرتا ہے لیکن اقبال[۲]

اور (۲)، جب آپ کو ہوش آیا تو کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ کتنی دیر تک یا کتنے دنوں تک آپ غافل رہے؟ آپ جب ہوش میں آئیں گے تو آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ تھوڑی دیر گذری ہے حالانکہ ایک نہ دو پورے ۲۸ دن کے بعد آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ، ۲۸ دن، ایک لمحہ کے برابر بھی ہو سکتے ہیں۔ تو اگر ماہرین علم الارض کے چھ لاکھ سال، خدا کے چھ دن کے برابر ہوں تو اس میں کون سی عقلی قباحت ہے؟

کا خیال یہ ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ Serial time مادی ہو لیکن، وقت کا جو ذہنی احساس ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ مادی نہیں ہے بلکہ ذہن ہی کی پیداوار ہے اور اسی کا جز ولاینفک ہے۔ برگساں کا بھی یہی خیال ہے۔

الغرض اقبالؒ کے نزدیک، وقت یا زمانہ، خط (line) کی طرح نہیں ہے کہ آپ اس کے حصے کر سکیں مثلاً فلاں حصہ دوش ہے اور فلاں فردا۔

اے چو بو، رم کردہ از بستان خویش   ساختی از دست خود زندان خویش

اے شخص تو اپنی خودی یا اپنی حقیقت سے اس طرح دور ہو گیا، جس طرح خوشبو، غنچہ سے نکل جاتی ہے۔ اور زمان (وقت) کو مادی اور خارجی شئے قرار دے کر مقید بالزمان ہو گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تو اسیر دوش و فردا نہیں ہے بلکہ دوش و فردا تیرا اسیر ہے۔ زمان کچھ نہیں کرتا، کیونکہ کر نہیں سکتا۔ جو کچھ کرتا ہے تو کرتا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے تجھ سے ہوتا ہے۔

وقت ما کو اوّل و آخر ندید   از خیابان ضمیر ما دمید

وہ زمانہ جس کا نہ اوّل ہے نہ آخر یعنی زمان مطلق، وہ تو ہمارے ہی ذہن (MIND) کی پیداوار ہے یعنی زمانہ کا وجود ذہنی ہے خارجی نہیں

زندہ از عرفان اصلش زندہ تر   ہستی او از سحر تابندہ تر

زندہ یعنی انسان، وقت کی اصلیت کے عرفان کی بدولت حقیقی زندگی کا مالک بن سکتا ہے یعنی انسان زندہ ہی اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ زمان (time) کا صحیح عرفان (Knowledge) حاصل کرے

زندگی از دہر و دہر از زندگی است   'لا تسبوا الدھر' فرمان نبیؐ است

حصول عرفان کی صورت یہ ہے کہ اس حقیقت سے واقف ہو جاؤ کہ دہر یعنی زمانہ یا وقت زندگی ہے اور زندگی زمان ہے۔ اسی لئے تو آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "زمانے کو برا بھلا مت کہو" کیوں؟ اس لئے کہ زمانہ تم سے جدا

کوئی شے نہیں، تم خود زماں ہو۔

اب اس کے عرفان کی صورت یہ ہے کہ

(a) زمانہ، زندگی ہے۔

(b) اور زندگی کا عرفان، ضمیر (خودی) میں غوطہ زن ہونے پر منحصر ہے۔

(C) لہٰذا، زمانہ کا عرفان اگر حاصل کرنا مقصود ہے تو اپنی خودی کا عرفان حاصل کرو۔

جو شخص اپنے آپ سے واقف نہیں وہ زمانہ کی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہو سکتا۔ جب تم اپنے من میں ڈوب کر، وقت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ گے، تو تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ قابلِ پیمائش (MEASUREABLE) نہیں، اور نہ اس کا اوّل نہ آخر ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ تو ایک ذہنی کیفیت ہے MENTAL PHENOMENA

جب انسان، زندانِ وقت سے نکل جائے گا، تو وہ زندہ تر ہو جائے گا کس طرح؟ اس طرح کہ پھر وہ اُسے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کر سکے گا۔ اور اس کی ذات سے خوارقِ عادت سرزد ہو سکیں گے۔

زندگی کی حقیقت، زمانہ کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی کیوں؟ اسلئے کہ دراصل حیات اور زمان دونوں ایک ہی شے کے دو پہلو (ASPECTS) ہیں۔ جب آپ حیات کا تصوّر کرتے ہیں تو زمانہ کی قیود کے تحت اور جب آپ زمانہ کا تصوّر کرتے ہیں تو حیات کے واقعات کے تحت۔ غور سے دیکھئے تو حیات (LIFE) ذہن (MIND) اور زمانہ (TIME) تینوں ایک ہی ہیں۔ اسی لئے علامہؒ نے فرمایا۔

وقتِ ما کو اوّل و آخر ندید   از خیابانِ ضمیرِ ما دمید

یہاں ضمیر سے مراد ذہن یا نفسِ ناطقہ ہے۔

ہمارے شعراء نے مسلمانوں کو صدیوں تک یہ خواب آور معجون کھلائی کہ "کامیابی کے لئے موزوں وقت کے منتظر رہو"۔ اقبالؒ نے صدیوں کے اس جمود کو توڑا اور یہ بتایا کہ جب تک انسان کوشش نہیں کرے گا اس

کے لئے موزوں وقت کبھی نہیں آسکتا۔

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ"

اور میں سچ کہتا ہوں کہ یہ وہ شاندار علمی خدمت ہے کہ ہندوستان کے غلام اس کی عظمت اور اہمیت کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اگر سلطان محمد فاتح، اپنے عزم آہنیں کی بدولت ۱۴۵۳ء میں، اپنے جہازوں کو آبنائے باسفورس کی "شاخ زریں" میں ڈالنے کے لئے، موزوں وقت پیدا نہ کرتا، تو وہ وقت، آج تک ترکوں کو نصیب نہ ہوتا۔

اب علامہ ایک نکتہ بیان فرماتے ہیں اور اس بات کے نکتہ ہونے میں کیا شک ہے جسے خود حضرت علامہ نکتہ سے تعبیر کریں۔

نکتۂ می گویمت روشن چو دُر تا شناسی امتیازِ عبد و حُر

وہ نکتہ کیا ہے؟ غلام اور آزاد میں فرق۔ ملاحظہ فرمایئے:

عبد گردد یاوہ در لیل و نہار در دلِ حُر یاوہ گردد روزگار

غلام کی شناخت یہ ہے کہ وہ زندانی روز و شب ہوتا ہے، اور بندۂ آزاد کی شان یہ ہوتی ہے کہ روز و شب اس کے پابند احکام ہوتے ہیں یعنی عبد وہ ہے جس پر زمانہ حکمراں ہو اور حُر وہ ہے جو زمانہ پر حکمراں ہو۔

اسی مضمون کا ایک شعر جاوید نامہ میں بھی ہے۔

انچہ در عالم نگنجد آدم است انچہ در آدم بگنجد عالم است

اب علامہؒ دوسری بات اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں وہ یہ کہ

چونکہ عبد یعنی غلام، اپنے زمان کا پابند اور دام صبح و شام میں ہمچو طائر گرفتار ہوتا ہے اس لئے یکساں طور پر زندگی بسر کرنا، اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ اور اس کی زندگی میں کوئی نُدرت یا انوکھا پن نظر نہیں

آتی لیکن مردِ حُر، یکسانیت (MONOTONY) کو برداشت نہیں کر سکتا ۔

عبد را تحصیلِ حاصل، فطرت است — وارداتِ جان او، بے ندرت است

دمبدم نو آفرینی کارِ حُر — نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر

یقیناً ناظرین مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ہماری قوم کے اکثر دولتمندوں کی زندگی بالکل تحصیل حاصل ہوتی ہے یعنی موسم سرما میں ۔

(۱) ۹ یا ۱۰ بجے سو کر اُٹھنا، بغیر مُنہ دھوئے چاء پینا ۔

(۲) اس کے بعد حقہ نوش جان ناتواں کرنا، اور بڑا کمال کیا تو کوئی ناول یا عریاں وضع کا لٹریچر پڑھ لیا ۔

(۳) قریب ایک بجے، خاصہ تناول فرمانا، اور اس کے بعد قیلولہ یا اگر تضیع اوقات کی صورت ہوگئی تو برج یا گنجفہ سے دلِ زار کو تسکین دینا ۔

(۴) شام کو موٹر میں ہوا خوری کے لئے نکل جانا ۔

(۵) شب کو بعد طعام، اُس دولت کے بل بوتے پر، جو محض اس لئے حاصل ہو گئی ہے کہ دولتمند باپ کے گھر پیدا ہو گئے، اس فعل میں غرق ہو جانا، شریعت اسلامیہ جس کے قریب جانے کی کبھی اجازت نہیں دیتی

(۶) دو، تین بجے سو جانا اور پھر ۹، ۱۰ بجے اُٹھ بیٹھنا ۔ غرضکہ اسی چکر میں عمر ختم ہو جاتی ہے (الا ماشاءاللہ)

از گراں خیزی مقام او ہماں — نالہ ہائے صبح و شام او ہماں

یہ تو دولتمند غلاموں کا حال ہے اب رہے وہ، جو متوسط الحال ہیں۔ وہ بھی اپنے دائرہ ہی میں گردش کرتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ وہ جب اپنے گردوپیش کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں، تو تھوڑی دیر کے لئے تقدیر کا رونا رو لیتے ہیں، اور اس کے بعد حسب معمول پھر مرکزی گردش میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔

عبد را ایام زنجیر است و بس — بر لب او، حرفِ تقدیر است و بس

جو لوگ زنجیریِ ایام ہیں، کاہلی، تن آسانی، دوں ہمتی، اور پستی ان کی فطرت ثانیہ ہوجاتی ہے، زمانہ

جس طرح اُن کو چلاتا ہے اُسی طرح چلتے رہتے ہیں۔ اور اپنی تقدیر کا رونا روتے رہتے ہیں۔

ہمتِ حرُ، با قضا گردد مشیر   حادثات از دستِ او صورت پذیر

علامہؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص وقت پر حکمران ہوتا ہے (اور یہ مقام خودشناشی یعنی عرفان خودی سے حاصل ہو سکتا ہے) وہ ناسازگار دنیا میں نہیں رہتا بلکہ زندہ ہونے کی وجہ سے اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے

اقبال کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص آزاد ہے وہ دوسروں کے جہاں میں رہنا پسند نہیں کر سکتا

بندۂ آزاد را آید گراں   زیستن اندر جہانِ دیگراں

اسی لئے وہ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان!

وہی جہاں ہے ترا، جس کو تو کرے پیدا   یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

پس اب ہمیں کفر اور اسلام کا معیار حاصل ہو گیا۔ مسلمان دراصل وہ ہے جس میں قوتِ تخلیق پائی جائے۔

یہی تو وجہ ہے کہ جب اقبالؒ کو عالمِ تصوّر میں، خدا کی حضوری حاصل ہوئی تو، خدا نے یہ فرمایا۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست   نزدِ ما جُز کافر و زندیق نیست

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان وہ ہے جس میں (CREATIVE ACTIVITY) یعنی قوتِ تخلیق پائی جائے۔ اسی لئے اقبالؒ کہتے ہیں۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

پھر ایک جگہ یوں تلقین فرماتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جو

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار   اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اس کی وجہ یہ ہے کہ خود کارکناں قضا و قدر کا یہ قول ہے

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟   گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

سوال یہ ہے کہ مسلمان میں یہ طاقت کیسے پیدا ہو؟ اس کا جواب اقبال نے یہ دیا ہے کہ قرآن یہ نعمت انسان کو عطا کر سکتا ہے۔

کہنہ گردد چوں جہاں اندر برش   می دہد قرآں جہانے دیگرش

قرآن مجید نئی دنیاؤں کا ایک زبردست خزانہ ہے، اسی لئے اقبال نے اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان کو یہ نصیحت فرمائی۔

صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز   اندر آیاتش یکے خود را بسوز

ہمت حُر با قضا گردد مشیر   حادثات از دست او صورت پذیر

لیکن مرد حُر، قضا کا مشیر بن جاتا ہے اور اس لئے عالم میں وہ واقعات رونما ہوتے ہیں، جو وہ چاہتا ہے۔

ترکی کے دشمنوں نے کہا "ترکی کو ہمارا غلام بن جانا چاہیئے"؛ مصطفےٰ کمال نے کہا "نہیں ایسا نہیں ہوگا"!

چونکہ مصطفےٰ کمالؔ اپنی خودی کے عرفان کی بدولت وقت پر حکمراں ہوگیا تھا اس لئے زمانہ اس کا فرمان پذیر بن گیا، اور ترکی میں جو حالات رونما ہوئے، وہ اس کے ہاتھ سے صورت پذیر ہو کر عالم میں رونما ہوتے تھے۔

معرکہ سقاریہ میں یہ مرد حُر باوجودیکہ نمونیا اور ذات الجنب جیسے جاں گسل امراض کا شکار تھا۔ سترہ دن اور سترہ رات پیہم گھوڑے کی پشت پر سوار رہا۔

واضح ہو کہ ایام کا یہ شمار، ہمارا یعنی غلاموں کا ہے۔ بندۂ آزاد زمانہ کو روز و شب کے پیمانہ سے نہیں ناپتا، اس کی نظر میں، اودن، امنٹ سے بھی کم ہوتے ہیں۔ ورنہ آپ خود ہی انصاف کریں کوئی شخص جو

ایسے امراض میں گرفتار ہو، ، اون تک معرکہ جنگ وجدل میں حصہ لے سکتا ہے ؟

اب سوال یہ ہے کہ بندۂ آزاد کے شمار روز وشب کا معیار کیا ہے ؟ اور کیوں ، اون اس کی نظر میں ، امنٹ سے بھی کم ہوتے ہیں کہ وقت تو ذہنی کیفیت کا نام ہے' نہ کسی موجود فی الخارج کا ، اور جو شخص رازحیات سے آگاہ ہوتا ہے ، سِرّ وقت سے بھی آگاہ ہوتا ہے ع

ذوق این بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

والا معاملہ ہے جو اپنی خودی سے واقف نہ ہو وہ اس راز سے بھی واقف نہیں ہو سکتا کہ ، اون ، ، امنٹ سے کم کیسے ہو سکتے ہیں ۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے (HIGHER LOGIC) کی ضرورت ہے FORMAL LOGIC یہاں بالکل نہیں چل سکتی ۔ چنانچہ علامہؒ فرماتے ہیں

رفتہ وآیندہ در موجود او　　دہرہا آسودہ اندر زود او

بندۂ حُر کے زمانۂ موجود میں ماضی بھی ہوتا ہے اور مستقبل بھی ، اور اس کے لمحات میں ایام ، اور ایام میں لمحات پوشیدہ ہوتے ہیں ۔ لیکن یہ بات ، لفظوں یا منطقی دلیلوں سے سمجھ میں نہیں آ سکتی

آمد از صوت وصدا پاک این سخن　　درنمی آید بہ ادراک این سخن

گفتم وحرفم ز معنی شرمسار　　شکوۂ معنی کہ حرفم را چہ کار

زندہ معنی چوں بحرف آمد بمُرد　　از نفس ہائے تو نارِ او فسرد

یعنی یہ باتیں ایسی ہیں کہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتیں اگرچہ میں نے کہنے کو یہ کہہ دیا کہ

رفتہ و آیندہ در موجود او　　دہرہا آسودہ اندر زود او

لیکن میرا مفہوم ان لفظوں سے ادا نہیں ہوا ، کیوں ؟ محض اس لئے کہ ہو نہیں سکتا ۔ مفہوم اس درجہ نازک اور لطیف ہے کہ الفاظ کا بار نہیں اُٹھا سکتا ۔ اس بات کا تعلق ادراک REASON سے نہیں ہے بلکہ وجدان (INTUITION) سے ہے اور وجدانیات کو انسان لفظوں میں بیان

نہیں کرسکتا۔ مثلاً محبوب کے خندۂ زیرلب سے قلب عاشق کی جو حالت ہوتی ہے، کوئی شخص اس کا بیان الفاظ کے ذریعہ سے نہیں کرسکتا۔

توسوال ہو سکتا ہے کہ پھر اس کی تفہیم کی صورت کیا ہے؟ یعنی رفتہ و موجود یا غیب و حضور کو کس طرح سمجھا جائے؟ علامہ فرماتے ہیں۔

نکتۂ غیب و حضور اندر دل است — رمز ایام و مرور اندر دل است

نغمۂ خاموش دارو ساز وقت — غوطہ در دل زن کہ بینی راز وقت

یعنی ماضی حال اور استقبال کی حقیقت خود تیرے دل میں پوشیدہ ہے لہٰذا، اپنے دل میں غوطہ لگا، تو تجھے وقت کا راز معلوم ہو سکے گا۔ غوطہ در دل زدن سے مراد ہے اپنی خودی کا عرفان حاصل کرنا، عارف خودی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

می شود پردۂ چشمم پر کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

اب اگر کوئی عامی یہ سوال کرے کہ دونوں جہاں کو ایک نظر میں کس طرح دیکھا جا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خودی کی معرفت حاصل کر لو پھر پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی کیونکہ خود دیکھ سکو گے۔

کسی بات کا لفظوں کے ذریعہ سے بیان میں نہ آنا اس کے بطلان یا اس کے عدم پر دلیل نہیں ہے مثلاً:۔

(۱) میٹھی چیز کی مٹھاس کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی، لیکن محض اس بنا پر کوئی شخص مٹھاس کا انکار نہیں کرسکتا۔

(۲) محبت آمیز نگاہ سے دل پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا، بایں ہمہ کوئی شخص اس کے اثر سے انکار نہیں کرسکتا۔

(۳) راگ سن کر دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اُسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے لیکن کیفیت کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔

(۴) آنکھ اور دماغ میں کیا تعلق ہے اس کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے لیکن علاقہ کی حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

(۵) آکسیجن اور ہائیڈروجن میں جو علاقہ ہے کہ ان دونوں کے ملنے سے پانی بن جاتا ہے اُسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے کیونکہ جب لیبارٹری میں دونوں کو ایک خاص تناسب سے ملاتے ہیں تو فی الحقیقت پانی بن جاتا ہے۔

بس اسی طرح مذہبی تجارب کا حال ہے بعض باتیں ایسی ہیں کہ انہیں لفظوں کے ذریعہ سے بیان نہیں کر سکتے، لیکن عمل سے ان کا ثبوت ملتا ہے مثلاً حیات خودی ادراک اور زمان ان حقائق کی حقیقت لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

اب اگر یہ چاہیں کہ ایک بہرہ (DEAF) آدمی موسیقی کی لذت سے یا ایک اندھا (BLIND) آدمی مصوری کی لذت سے بہرہ اندوز ہو سکے، تو یہ ممکن نہیں کیونکہ موسیقی کا تعلق سماعت سے ہے اور بہرہ آدمی سماعت سے محروم ہے۔

ٹھیک اسی طرح حیات، خودی، ادراک، زمان اور خدا کی حقیقت سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے روحانی حس کی ضرورت ہے اور چونکہ عقل کا مدار حواس جسمانی پر ہے اس لئے مجرد عقل ان حقائق کا ادراک نہیں کر سکتی۔ یہ حقائق عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ بڑی غلطی تعلیم یافتہ طبقہ کو آج کل یہ لگی ہوئی ہے کہ وہ روحانی حقائق کا ادراک، مادی آلات کے واسطہ سے کرنا چاہتا ہے حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ کوشش ایسی ہی ہے جیسے بنیئے کی ترازو میں آواز یا روشنی کو تولنا، اور فیتہ لے کر ہوا کو ناپنا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ گلاب کی خوشبو محسوس کرنے کے لئے اُسے کان یا زبان پر رکھنا اور فونوگراف کی نلکی کو ناک میں لگانا۔

جب ایک شخص یہ پڑھتا ہے کہ حضرت علیؓ جب بایاں پاؤں رکاب میں رکھتے تھے تو الحمد سے قرآن کی تلاوت شروع کرتے تھے اور جب دایاں پاؤں رکاب میں ڈالتے تھے تو والناس تک پہنچ جاتے تھے تو وہ حیران رہ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک منٹ میں ایک شخص ۷ ہزار سے زاید الفاظ زبان سے ادا کر سکے؟ اس کے لئے

توکم ازکم ۱۲×۲×۶۰ = ۲،۰۰ منٹ درکار ہیں اس کا جواب صوفیاء کی زبان سے یہ ہے کہ علیؓ کے مقام پر پہنچ جاؤ تم بھی ایسا کر سکو گے اور اقبال کی زبان سے یہ ہے کہ

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت   غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

جہانگیر کے زمانہ میں انگریزوں کو لندن سے کراچی پہنچنے میں ۳ سال لگتے تھے، لیکن ہمارے زمانہ میں لندن سے کراچی کا فاصلہ ۳ دن میں طے ہو سکتا ہے یعنی جو کام سرطامس رو نے ۳ سال میں کیا وہ آج ۳ دن میں ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کے ۳ سال ہمارے ۳ دن کے برابر ہیں۔ تو اس میں کیا استحالہ ہے کہ علیؓ کا ایک منٹ ہمارے ۲۰ منٹ کے برابر ہو؟

پیدل کے لئے از لاہور تا دہلی ۱۰ دن کا فاصلہ ہے لیکن ہوائی جہاز کے لئے یہی فاصلہ ۳ گھنٹے کا ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہوائی جہاز کے (PILOT) نے مکان (SPACE) پر، پیدل کے مقابلہ میں بہت زیادہ قابو حاصل کر لیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم جس کام کو ۲۰ منٹ میں کرتے ہیں علیؓ اس کام کو ایک منٹ میں کر سکتے تھے کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے مقابلہ میں، زمان (TIME) پر بہت زیادہ قابو حاصل کر لیا تھا۔ اس میں پیچیدگی کیا ہے؟

اگر انسانی زندگی میں پہلی بات کی قوت موجود ہے تو دوسری بات کی بھی ہے۔ اگر وہ طاقت ہمارے اندر موجود نہ ہو تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ کسی میں بھی موجود نہیں ہو سکتی؟

ضرورت بحث کی نہیں، ضرورت عمل کی ہے اور افسوس ہے کہ اس کی طرف ہمارے تعلیمیافتہ طبقہ کی توجہ بالکل مبذول نہیں ہوتی۔ یہ تو سچ ہے کہ علیؓ نے ایک جھٹکے میں خیبر کا دروازہ اکھاڑ کر پھینک دیا تھا لیکن ایسا کرنے سے پہلے انہوں نے شیوۂ تسلیم و رضا کی بدولت اپنے بازو میں طاقت بھی پیدا کر لی تھی۔ ہمارا کیا حال ہے؟ ہم نانِ جویں کے بجائے وہ نان جس کے متعلق اقبال یہ لکھتے ہیں۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر　　کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدریؓ

ہم اس نانِ جویں کے بجائے ، نہ صرف مرغِ مُسلّم کھاتے ہیں بلکہ مقصدِ حیات ہی کھانے پینے کو سمجھتے ہیں

...... غرضکہ ہر ممکن طریق سے روح کو فنا کرتے ہیں یا کرنے کے درپے رہتے ہیں اور پھر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بازوؤں میں بھی وہی قوتِ حیدریؓ ، اور ہمارے حرکوں میں بھی وہی شانِ کراری پیدا ہو جائے ۔ اور چونکہ نہیں ہوتی اس لئے علیؓ کے بازوؤں میں بھی نہیں تھی ، اور چونکہ نہیں تھی اس لئے واقعہ انفکاک درِ خیبر ، اور واقعہ قتلِ مرحب یہ سب افسانے (MYTHS) ہیں !!

ہم خان بہادری کے لئے اپنا ایمان فروخت کرنے کے لئے تیار ہیں چار مربعوں کے لئے ملت فروشی پر آمادہ ہیں ۔ وزارت کے لئے ساری قوم کو برباد کر دینے پر تلے ہوئے ہیں اور اسمبلی کی رکنیت کے لئے مسجد شہید کی اینٹوں کو فروخت کر دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں ، اور ان سب غداریوں کے باوجود ہم خدا سے یہ شکوہ کرتے ہیں کہ ہم غلام کیوں ہیں ؟ اور رات دن یہ شعر وردِ زبان رہے :-

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر　　برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

آہ ! میں اپنی از خود رفتہ قوم کو کس طرح سمجھاؤں کہ خدا کا قانون کسی قوم کے لئے نہیں بدل سکتا ۔ وہ قانون یہ ہے :-

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم

آہ ! میں اپنی ملت گم گشتہ کو کس طرح اس حقیقت سے آگاہ کروں کہ محمد (روحی لہ الفداء) سے بے وفائی کر کے تم دنیا میں سربلند نہیں ہو سکتے ۔

آہ ! میری قوم کانگریس سے اظہار وفاداری کر رہی ہے اور خدا ______ جس نے محمدؐ کو بھیجا ، کا قول یہ ہے

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اے مسلمانو ! گاندھی اور نہرو ، کارل مارکس اور روسو ، ان سب سے اپنا تعلق منقطع کر دو ، یہ تمہارے محبوب

نہیں ہیں، یہ تمہارے محبوب نہیں ہو سکتے ! تمہارا محبوب محمدؐ ہے۔ تمہارے مرض کا علاج نہ وارداؔ میں نہ لندن میں بلکہ یثرب میں ہے۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است　　اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

تم یثرب کی خاک کو طوطیائے چشم بناؤ ساحران فرنگ اور جادوگران ہند دونوں کا طلسم پاش پاش ہو جائیگا

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ　　سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

آخر میں حضرت علامہؒ مسلمانوں کے شاندار ماضی کا تذکرہ کرتے ہیں۔

یاد ایامیکہ سیف روزگار　　با توانا دستیٔ ما بود یار

تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

ناخن ما عقدۂ دنیا کشاد　　بخت ایں خاک از سجود ما کشاد

اس داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان، اپنے اجداد کے شاندار کارناموں کا مطالعہ کریں اور اپنے اندر وہی رنگ پیدا کریں تاکہ اللہ تعالےٰ کا نام از سر نو دنیا میں بلند ہو سکے۔

قرآن مجید نے مسلمان کو اللہ تعالےٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے پس ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر یہ شان پیدا کرنے کی کوشش کرے اور مجھے یقین ہے کہ اگر مسلمان اپنے حقیقی مقام سے آگاہ ہو جائیں اور یہ بات علم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تو وہ دوبارہ دنیا میں "آیت حق" بن سکتے ہیں۔ لہذا مثنوی کے پڑھنے والے کو اس حقیقت سے آگاہ ہو جانا چاہیئے کہ

ذات ما آئینہ ذات حق است
ہستی مسلم ز آیات حق است

مبحث دہم

خاتمۃ الکتاب

اس منزل پر اسرار خودی ختم ہو جاتی ہے اور اب علامہ خدا سے یہ دعا کرتے ہیں کہ

از شہیدستان رخ زیبا مپوش عشقِ سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش
چشم بیخواب و دل بیتاب دہ باز مارا فطرت سیماب دہ

یعنی اے خدا، اس زمانہ کے مسلمان "عاشقان خام" ہیں، اُن کو صفت عشق میں پختہ کر دے اور ہماری قوم میں سلمانؓ اور بلالؓ کے ٹائپ کے مسلمان پیدا کر جن کی آنکھ بیخواب اور دل بیتاب ہو۔

مسلمانوں کی ذلت و خواری کا باعث یہ ہے کہ:۔

رشتۂ وحدت چو قوم از دست داد صد گرہ بر روے کار ما فتاد
ما پریشاں در جہاں چوں اختریم ہمدم و بیگانہ از یکدیگر ایم

ان میں وحدتِ ملّی مفقود ہو گئی ہے اور اس لئے وہ منتشر اور پراگندہ ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے سے بیگانہ نظر آتے ہیں۔

یہ وحدت جس پر مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار ہے، عشق سے پیدا ہو سکتی ہے اور عشق توحید کو حرز جاں بنانے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

باز آئین محبت تازہ کن باز ایں اوراق را شیرازہ کن
عشق را از شغل لا آگاہ کن آشنائے رمز الا اللہ کن

مسلمانوں کے لئے دعا کرنے کے بعد اب اقبالؔ خود اپنے حال دل کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے خدا!
اس ملک میں تو کروڑ مسلمان آباد ہیں، لیکن مَیں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بالکل تنہا ہوں۔

دل بدوش و دیدہ بر فرداستم — درمیان انجمن تنہاستم
درجہاں یارب ندیم من کجاست — نخل سینایم، کلیم من کجاست؟

اے خدا! میرے سینہ میں آگ دہک رہی ہے ایسی آگ جس نے میرے ہوش وحواس کو جلا کر خاک سیاہ
کر دیا، مجھے دیوانہ بنا دیا۔

ظالمم بر خود ستم ہا کردہ ام — شعلۂ را در بغل پروردہ ام
شعلۂ غارتگر سامان ہوش — آتشے انگندہ در دامانِ ہوش
عقل را دیوانگی آموختہ — علم را سامان ہستی سوختہ

اے خدا! اس زمانہ کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی نظر آتا ہے، جو آگ میرے دل میں بھڑک رہی ہے وہ
کسی مسلمان کے سینہ میں نظر نہیں آتی، مَیں کب تک اس طرح تنہا جلتا رہوں گا؟

سینۂ عصرِ من از دل خالی است — می تپد مجنوں کہ محمل خالی است
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارِ غمگسارے تا کجا؟ — جستجوئے رازدارے تا کجا؟

اے خدا! یا تو یہ امانت مجھ سے واپس لے لے یا مجھے کوئی ہمدم عطا کر تاکہ وہ میری غمگساری کر سکے۔ میرے
درد میں میرا شریک ہو سکے۔

ایں امانت باز گیر از سینہ ام — خار جوہر برکش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدم دیرینہ دہ — عشق عالم سوز را آئینہ دہ

اے خدا! کائنات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمدردی یہاں کا قانون ہے، کوئی چیز تنہا زندگی بسر نہیں کرتی

موج در بحر است ہم پہلوئے موج | ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج
بر فلک کوکب ندیم کوکب است | ماہ تاباں سر بزانوئے شب است
روز پہلوئے شب یلدا زند | خویش را امروز ، بہ فردا زند
ہستی جوئے بجوئے گم شود | موجۂ بادے ببوئے گم شود
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص | می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

اے خدا ، اگرچہ تو اپنی ذات کے اعتبار سے یکتا ہے لیکن تنہائی ایسی چیز ہے جسے تُو نے بھی پسند نہ کیا۔

گرچہ تو در ذات خود یکتاستی | عالمے از بہر خویش آراستی

اے خدا! پھر میں تنہا کیونکر زندگی بسر کروں ؟

من مثال لالۂ صحراستم | در میاں محفلے تنہاستم
خواہم از لطف تو یارے ہمدمے | از رموز فطرت من محرمے

تاکہ میں اس کے سینہ میں بھی وہی آگ روشن کر دوں جو میرے سینہ میں سلگ رہی ہے ، اور پھر اُسے آئینہ سمجھ کر اپنی صورت اس میں دیکھوں ، یعنی تنہائی دور ہو سکے ۔

تا بجان او ، سپارم ہوئے خویش | باز بینم در دل او ، روئے خویش
سازم از مشت گل خود پیکرش | ہم صنم او را شوم ہم آذرش

یہ مثنوی علامہؒ نے ۱۹۱۴ء میں لکھی تھی ، اس وقت وہ بلاشبہ درمیاں انجمن تنہا تھے مسلمانوں نے مثنوی کے مطالب کو (APPRECIATE) کرنے کے عوض اس کی تردید شائع کی تھی ۔

خدا کا شکر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور بیس سال کے بعد یعنی ۱۹۳۴ء میں بال جبریل میں خود انہوں نے یہ لکھا ۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

اور اس کم سواد، مالکہ ابجد خواں نے، جو یہ ادنیٰ کوشش اس مثنوی کے مطالب کو، عام فہم بنانے کے لئے کی ہے، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس ملک میں، اقبالؒ کے ہمدموں کی ایک ایسی زبردست جماعت پیدا ہو جائے جس کے سینہ میں، ملت کی بہبود کے لئے وہی آگ روشن ہو جو ۴۰ سال تک مسلسل اقبالؒ کو جلاتی رہی۔

مسلمانو! اقبالؒ تو ساری عمر اس آگ میں جلتا رہا مرنے سے تین گھنٹے پہلے بھی اس کے دل کی سوزش بدستور تھی۔

علامہؒ کے ایک شیدائی، محبی راجہ حسن اختر صاحب کا بیان ہے کہ "۲۰ اور ۲۱ اپریل کی درمیانی شب میں، ایک اور دو کے درمیان علامہؒ لیٹے لیٹے دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، ہم لوگ جو پاس بیٹھے ہوئے تھے یہ ماجرا دیکھ کر گھبرا گئے، اور دریافت کیا کہ خیر ہے؟ جواب دیا "ہاں خیر ہے .... ہم نے سبب گریہ پوچھا تو کہا "اس وقت میرے دل میں یہ خیال آگیا کہ میں نے تو مسلمانوں کو کامیابی کا راستہ دکھا دیا ہے لیکن اگر انہوں نے میرے مشورہ پر عمل نہ کیا تو ان کا کیا حال ہو گا؟ بس اس خیال نے مجھے تڑپا دیا ...."

مسلمانو! اقبالؒ تو تمہیں زندگی کا طریقہ بتا کر رخصت ہو گیا چنانچہ وہ خود کہتا ہے

زیارتگاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

بلکہ وہ تو اپنے آقا اور مولیٰ کی خدمت میں بھی اپنی سی سالہ کارگذاری کی رپورٹ بایں الفاظ پیش کر چکا

حضور ملت بیضا تپیدم نوائے دلگدازے آفریدم

ادب گوید سخن را مختصر گوے تپیدم، آفریدم، آرمیدم

سوال یہ ہے، کیا تم نے عشق کی وہ آگ اپنے سینوں میں سلگائی ہے؟ کیا تم لذتِ سوزِ جگر سے آشنا

ہو گئے ہو؟

اگر تم نے ایسا نہیں کیا ہے تو اب وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں، پانی دم بدم بڑھ رہا ہے، ایسا نہ ہو کہ تم پروگرام ہی تجویز کرتے رہو، اور ریزولیوشن ہی پاس کرتے رہو، اور پانی سر سے گذر جائے اسپر یہ جلسے اور جلوس، نعرے اور جھنڈے سب بیکار ہو جائیں گے اور اس ملک میں ایک نئی بساط بچھ جائے گی جس میں ہر جگہ سواستیکا اور گنپتی کا چمتکار ہوگا۔

آؤ! قرآن مجید کا دامن تھام لیں، آؤ!

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ پر عمل کر کے پھر عزت کی زندگی بسر کرنے کا سامان کریں۔

میں نے تو عزم بالجزم کر لیا ہے کہ جب تک زندہ ہوں مسلمانوں کو اقبال کے پیغام کی طرف بلاتا رہونگا اور انشا اللہ تعالے ؎

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو

شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس میرا شعلہ بار ہوگا

———(○)———

رہبانیت صُغریٰ

(از جناب مرزا عزیز فیضانی دارا پوری)

(۱)

عزلت و کم آمیزی اور خصوصاً اسے کار ثواب یا تقویٰ و فضیلت سمجھ کر اختیار کرنا رہبانیت کی ایک خفی علامت ہے۔ اس لئے کہ ایک بھلا چنگا مسلمان، مسلمان بھائیوں سے میل جول ترک کرکے جنگل یا پہاڑوں میں تو نہیں جاتا مگر گوشہ نشیں ہو کر رہ جاتا ہے۔ نماز گھر میں پڑھتا ہے اور دن رات نوافل و وظائف میں لگا رہتا ہے۔ گویا وہ ایک گھریلو رہبان ہے۔ اس میں اور صحرا نشیں میں تھوڑا سا فرق رہ جاتا ہے اور قدیم رہبانوں میں بھی سب تو جنگلوں اور پہاڑوں میں کہاں جاتے ہوں گے۔ کچھ تو ایسے بھی ہوں گے ہی جو اپنے گھر ہی میں گوشہ نشیں ہو کر رہبانیت صُغریٰ کا نمونہ قائم کرلیتے ہوں گے

(۲)

ذرا اب سرورِ کائنات ؐ کا اسوہ حسنہ دیکھئے۔ اور اس بارہ میں آپ کے احکام پر نظر ڈالئے۔ فرمایا جو شخص لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرتا ہے وہ اس سے اچھا ہے جو نہ مل جل کر رہتا ہے نہ اُن کی ایذاؤں پر صبر کرتا ہے۔

فرمایا اکثروا من الاخوان یعنی بھائی چارہ بہت بڑھاؤ۔ کیونکہ قیامت کے دن خدا شرم و کرم سے کسی بندے کو اس کے بھائیوں کے درمیان عذاب نہیں کرے گا۔

فرمایا "خیر الناس من ینفع الناس" یعنی انسانوں میں سے بہترین وہ ہے جو لوگوں کے کام آئے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص عزلت وکم آمیزی کا مجسمہ بن چکا ہو وہ کسی کے کام کیا آئے گا پس عزلت بہتری نہیں۔ حالانکہ ایسے فریب خوردہ زاہد بمصداق "یحسبون انھم یحسنون صنعا" (گمان کئے بیٹھے ہیں کہ وہ نیکیاں کر رہے ہیں) اپنی اس نیم راہبانہ روش کو بہترین سمجھتے ہیں۔

فرمایا "سددوا و قاربوا" راستبازی اختیار کرو اور آپس میں تعلقات بڑھاؤ۔ بتائیے عزلت وکم آمیزی

اور ع تم اپنا منہ اُدھر کرو تو ہم اپنا منہ ادھر کریں

یا ع تم وہاں بیٹھے رہو اور ہم یہاں بیٹھے رہیں

پر عمل پیرا تعلقات کیا خاک بڑھیں گے۔ آہ ؎

خدا زاہد کو فرصت دے کہ وہ ہم میں کبھی آ بیٹھے
غضب ہے اُس کو انسانوں سے وحشت ہوتی جاتی ہے

(۳)

سرورِ کائنات صلعم دشمن اور کافر سے بھی بکشادہ پیشانی ملتے تھے۔ جاہلوں کو ہٹاتے نہ تھے۔ بلکہ اُن کی حرکات پر صبر فرماتے۔ کسی شخص سے خود علیحدہ نہ ہوتے تھے جب تک کہ وہ نہ چلا جاتا۔ جو کوئی ساتھ ہو لیتا اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلتے۔ دعوت سب کی قبول فرما لیتے۔ آپؐ نے مجلسی اور کاروباری ہر قسم کے مشترک کام کئے ہیں مثلاً بکریاں چرانا۔ گلہ بانی۔ تجارت۔ وکیل بننا۔ وکیل کرنا۔ ہدیہ لینا اور دینا۔ ہبہ کرنا کرانا۔ قرض لینا۔ رہن۔ ضروریات کا عاریتہً لینا دینا۔ اُدھار خریدنا۔ قرضوں کی ضمانت۔ سفارش کرنا اور چاہنا۔ مذاق کرنا جس میں حق بات ہوتی جھوٹ نہ ہوتا۔ مشورہ دینا اور قبول کرنا۔ بیماروں کی عیادت۔ جنازوں میں شرکت۔ مساکین و غیرہم کے کام آنا۔ امداد۔ شعر سُننا اور انعام دینا۔ اہل وعیال کے کام اپنے ہاتھ سے کر دینا۔ مہمانی، میزبانی۔ غرض ہر قسم کے کام کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان کاموں سے حضورؐ کے زہد و اتقا یا شان و مرتبۂ روحانی میں فرق تو کیا آتا اُلٹا اعلےٰ و اکمل

زندگی وسیرت کا نشان ملا۔ اگر حضورؐ یا صحابہ کرامؓ خفی رہبانیت کے شکار زاہدوں کی طرح گوشہ نشینی کے شیدا ہوتے تو اسلام کے کام کون کرتا۔ فرشتے؟ فرض کیجئے سب یا بہت سے مسلمان گوشہ نشین ہوجائیں تو کونسا تمدنی وجماعتی کام ہے جو باقی رہ سکے گا؟ پھر تو ایسا معلوم ہوگا کہ گھروں میں چلتے پھرتے بُت رکھے ہوئے ہیں اور بس۔

(۴)

ابوالحسن نوریؒ کا قول ہے کہ "گوشہ نشینی سے پرہیز کرو۔ کیونکہ یہ شیطان کی مقارنت ہے اور مل جُل کر رہنا تم پر لازم ہے کیونکہ اس میں خدا کی رضا ہے"۔

حدیث "ان الشیطان مع الواحد وھو من الاثنین ابعد" (یعنی شیطان اکیلے کا ساتھی ہے اور دو سے دُور ہے) بھی ان معنوں میں فائدہ دے سکتی ہے۔

سید علی ہجویریؒ کشف المحجوب میں فرماتے ہیں "۔ اعلےٰ درجے کا ادب یہ ہے کہ تم سفر وحضر میں لوگوں میں مل جُل کر رہو" نیز فرمایا کہ "تنہا رہنا مرید کو ہلاک کر دیتا ہے"۔۔۔۔۔۔ "پس مرید کے لئے تنہا رہنے جیسی کوئی آفت نہیں ہے" ۔۔۔۔۔۔ "سب وحشتیں تنہائی میں ہیں اور سب راحتیں مل جُل کر رہنے میں"۔

(۵)

یہ ظاہر ہے کہ عزلت کے شیدائی زاہد گوشہ نشینی تقویٰ ہی کی بنا پر اختیار کرتے ہیں مگر اس حدیث پر غور کیجئے فرمایا "ان من تمام التقویٰ تعلم من لم یعلم" یعنی علم کا سکھانا کمال تقویٰ ہے۔ تو کیا کم آمیزی میں تقویٰ کے اس کمال کا حصول ممکن ہے؟

(۶)

پھر کیا زہد میں غلو کرنے والے یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ لوگوں سے ملنا جلنا انہیں خدا سے دُور لے جائے گا کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ اسلام میں سب اعمال کا ثمرہ نیتوں پر ملتا رہے۔ (انما الاعمال بالنیات) پس اگر وہ لوگوں سے اللہ کا حکم سمجھ کر اور اللہ کے لئے ملیں گے اُن کے کام آئیں گے تو ان کی ساری جماعتی زندگی ہی عبادت ہو کر

اللہ کی رضا کا باعث ہو جائے گی جو عین قرب الٰہی ہے نہ کہ اس سے دوری۔ اور جو خلوص للّٰہیت نہ ہو تو لوگوں سے میل جول تو الگ رہا۔ اُن کے حجرے کے نوافل و وظائف بھی شرک کی ایک خطرناک اور خفیہ قسم، دنیا پرستی، نفس پرستی اور ذِلّت بن سکتے ہیں (ویل للمصلین الذین هم عن صلوٰتهم ساهون الذین هم یراؤن)۔

(۷)

سونے کی چمک اُس کے آگ میں تپائے جانے پر منحصر ہے۔ کوئی شخص شہسوار نہیں بن سکتا جب تک اُس کی راہ میں ٹھوکریں اور نشیب و فراز نہ ہوں ؎

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

پس اگر عشقِ خدا کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ تقویٰ میں کمال حاصل کرنے کی آرزو ہے تو وہ امتحان و بلا کے بغیر کب ممکن ہے اور اگر گوشہ نشینی ہی اختیار کئے رکھیں جس میں بمصداق ع

ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را

کوئی مصیبت و مشقت اور کوئی امتحان و بلا نہیں۔ تو کیا پائیں گے۔ خدا فرماتا ہے۔ ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم ط مستهم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین امنوا معه متی نصر الله ط الا ان نصر الله قریب (۲/۲۱۴) یعنی کیا تم گمان کئے بیٹھے ہو۔ کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر ابھی اُن لوگوں کے احوال نہیں گذرے جو تم سے پہلے ہو چکے جبکہ انہیں سختی اور تکلیف نے مس کیا وہ لرز کر رہ گئے یہاں تک کہ رسول اور اس پر ایمان لانے والے سب پکار اُٹھے کہ خدایا! تیری مدد کہاں ہے! آگاہ رہو کہ اللہ کی نصرت قریب ہے۔

ذرا تصوّر کیجئے یہ حال اور یہ امتحان جنت کے لئے ہے۔ اور روحانی کمال اور ولایت کے مقام کو تو ہمارے عاشقانِ خدا بلند تر سمجھتے ہیں۔ تو کیا وہ گوشہ خلوت میں آرام سے بیٹھے بٹھائے مل جائے گا۔

---

(۸)

اب ان میں سے اکثر لوگ جو بعض فرائض جماعت سے تعلق رکھنے والے احکام کی اہمیت کو محسوس کر لیتے ہیں ۔ اور ان کے ترک پر عذاب سے ڈرتے ہیں ۔ وہ بھی صرف چند نہایت ضروری مگر آسان تر فرائض ادا کرتے اور ان کی بھی صرف کم از کم ضروری صورت رسمی طور پر اختیار کر کے الگ ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً کئی ایک عزلت پسندوں کو دیکھا گیا ہے کہ خوفِ خدا کی وجہ سے اور فرض کی اہمیت سے مجبور ہو کر نماز کی جماعت میں شامل تو ہو جاتے ہیں مگر اس احتیاط سے کہ عین تکبیر کے وقت آکر ملنا اور سلام پھیرتے ہی جماعت سے تیر کی طرح نکل کر مسجد کے کسی کونے میں جا بیٹھنا جہاں دو دو گز کے فاصلے پر کوئی نمازی نہ بیٹھا ہو ۔ گویا ان کی روش مجموعۂ اضداد ہے ۔ کہ جماعت سے تعلق بھی ہے اور اس کا ترک بھی اب آپ اسے صوفیہ کی اصطلاح میں "خلوت در انجمن" کہ لیجئے ۔

اس ایک مثال ہی سے آپ اس رہبانیت صغریٰ کے نقصانات کا اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ ورنہ مثالیں اور بھی کئی ہیں وہ تو کم از کم یہ سمجھ ہی لیتے ہوں گے کہ فرض بھی ادا ہو گیا اور عزلت کا شوق بھی قائم رہا ۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے اور بھی مقاصد ہیں ۔ جب وہ ترکِ جماعت اور عزلت کے فلسفہ کے زیرِ اثر ہو کر اور علائقِ دنیوی سے نفرت کا جذبہ لے کر جماعت میں شامل ہوں گے تو کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے سے جو مقصود ہے وہ کب حاصل ہو سکے گا ۔ یہ تو قریباً قریباً ایسی ہی مثال ہے کہ ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر   ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

بلکہ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ اس میں تسبیح کے مقصد و مفہوم سے گاؤ خر کا خیال متضاد تو نہیں صرف الگ ہے ۔ مگر یہاں جس مقصد کے لئے نماز با جماعت ہے ۔ عین اس کی ضد دل میں موجود ہے یعنی شوقِ عزلت و ترکِ جماعت

(۹)

البتہ اتنا ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ گوشہ نشینی کی اجازت دگو وہ بھی عارضی نہ کہ دائمی اور مجبوری کے طور پر نہ کہ ثواب ، فضیلت ، درجہ یا عبادت کے طور پر) صرف ایک موقع پر دی ہے ۔ جب فتنہ و فساد کے شعلے قابو سے باہر

ہوجائیں۔ مگر اُس وقت بھی عزلت کی اجازت صرف اُن کو ہے جن کا مستضعفین میں شمار ہو سکے یعنی جو فتنہ وفساد کے سامنے کسی کام کے نہ ہوں جس طرح ضعفا پر جہاد کی تکلیف نہیں پس عزلت کے متعلق حدیثیں اسی موقع کی ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ یہ صورت مجبوری وضعف کی ہے نہ کہ درجۂ اتقا یا ولایت کی اور قوت ایمان کا تو تقاضا یہ ہے کہ مردانہ وار فتنہ وفساد کو دور کرنے کے لئے جان ومال خدا کی راہ میں صرف کئے جائیں۔ ہاں اگر اضعف الایمان ہے یعنے بالفاظ حدیث ہاتھ سے بُرے کام سے لوگوں کو روک نہیں سکتے اور زبان سے بھی منع نہیں کر سکتے۔ تو یہ اس وقت کی رخصت ہے کہ دل میں بُرا سمجھو اور اس بُری مجلس سے اُٹھ کر چلے آؤ۔ کہ اس کا اثر اُلٹا تم پر بھی نہ پڑنے لگے۔

اسی طرح یادِ خدا کے لئے محض چند روزہ اعتکاف ہے گو وہ بھی بقول مفسرین لیلۃ القدر تلاش کرنے کے لئے ہے اور اس میں بھی یہ شرط لگی ہوئی ہے کہ ایسی مسجد میں، ہو جہاں نماز باجماعت ہوتی ہو۔ نیز ہمیشہ کی چیز وہ بھی نہیں۔

(۱۰)

بہر حال بلا معذوری یونہی تقویٰ یا ولایت کا ذریعہ سمجھ کر جماعت سے کٹ کر قواعد[1] کی طرح گھر میں بیٹھ رہنا رہبانیت کی ایک شاخ ہے، اور قوم کے حق میں مضر۔ اس سے بچنا ضروری ہے۔ ایسا شوق رکھنے والوں کو سمجھانا چاہئے کہ اہل وعیال، اقربا، ہمسایہ، محلہ دار اور ساری قوم کے کام آنا یعنی حقوق العباد کا مخلصانہ طور پر ادا کرنا بھی عبادت ہے۔

---

[1] وہ لوگ جو چار دیواری سے باہر نہ نکلیں اور عورتوں کی امن سے بیٹھے رہنا چاہیں۔

منظومات

ذوق و شوق

(غلام سرور نگار)

پھر پلا کر آبِ حیواں ساقیا — مجھ کو کر دے مستِ عرفاں ساقیا
اُٹھ کے پھر قفلِ درِ میخانہ کھول — میکشی کر سب پہ آساں ساقیا
زاہدوں کو بھی تُو اذنِ عام دے — چھوڑ دیں وہ خوئے پنہاں، ساقیا
رند اور زاہد بیٹھیں اک بزم میں — غیریت پہ ہوں پشیماں، ساقیا
پھیل جائیں مشرق و مغرب میں پھر — ہو کے مستِ جامِ ایقاں، ساقیا
ساری دنیا کو کریں سرمستِ عشق — عشق ہو پھر جزوِ ایماں، ساقیا
چھیڑ دیں جس وقت سازِ دلبری — ہو جہاں اک بزمِ خنداں، ساقیا
اُن کی پیشانی پہ جب آئے شکن — ہو بپا عالم میں طوفاں، ساقیا
توڑ کر باطل کے سررشتے تمام — حق سے باندھیں اُن کا پیماں، ساقیا
خودکشی پہ کفر بھی آمادہ ہو — اور کافر ہوں مسلماں، ساقیا

منتظر ہیں سب ترے دیدار کے — اور تیری شوخیٔ گفتار کے
بام پر آکر ہو جلوہ ریز تُو — دیکھ منظر کوچہ و بازار کے
آرزو سے کس قدر بیتاب ہیں — دل تمہارے عاشقانِ زار کے

نوکِ مژگاں پر ہیں رقصاں کس طرح
اشکِ حسرت، دیدۂ خونبار کے

اک جھلک سے اور بھڑکا شوق کو
ہم تو خوگر ہیں رہِ دشوار کے

وصل کی خواہش نہیں رکھتے کبھی
مردِ میداں عالمِ پیکار کے

جستجوئے مستقل ہے زندگی
موت رُک جانا ہے ہمت ہار کے

ذرّہ اور خورشید سے جنگ آزما!
ہیں کرشمے یہ دلِ بیدار کے

ہے بدل دیتی جو تقدیرِ حیات
کام ہیں یہ دیدۂ ہشیار کے

یہ سزائے عشق اور میرے لئے!
مَیں تو لائق ہوں ستونِ دار کے

گوشِ مسلم کو سُنا اقبالؔ تو
رجز پھر سے حیدرِ کرّارؓ کے



زینتِ بزم جو وہ دلبرِ مستانہ نہیں
لب پہ رندوں کے بھی اب نعرۂ رندانہ نہیں

شہر اور دشت نظر آتے ہیں اک ویرانہ
جس کے دم سے تھے یہ آباد وہ دیوانہ نہیں

جس کے سوزِ غمِ فرقت کی پَر افشانی سے
شمعِ محفل بھی پگھل جائے، وہ پروانہ نہیں

جس کی فطرت میں نہ ہو تشنگیِ برقِ جمال
وہ خسِ خشک مرے قابلِ کاشانہ نہیں

تندیٔ مے سے جو ہو خود بھی ہمہ سوز و گداز
بزمِ ہستی میں میسّر مجھے پیمانہ نہیں

لطفِ مے نوشی و رقص آئے تو کیسے آئے
پینے والے تو ہیں پہ ساقیٔ میخانہ نہیں

مَیں بھی ہوں حلقۂ اقبالؔ کا اک محرمِ راز
میرا انداز فقیرانہ ہے، شاہانہ نہیں

ترانۂ دل

(جناب امین حزیں سیالکوٹی)

مئے تند خودی کی مینا ہوں نغمگانی کا طور و سینا ہوں
جو حقیقت کو دیکھ سکتی ہے مَیں ہی تنہا وہ چشمِ بینا ہوں



فلکِ زندگی کا زینہ ہوں قلزمِ دہر کا سفینہ ہوں
جس کو روحِ حیات کہتے ہیں مَیں اسی مئے کا آبگینہ ہوں



شمعِ بزمِ شہود مَیں ہی ہوں زندگی کی نمود مَیں ہی ہوں
مَیں ہی مہرِ منیر و ذرّۂ خاک تیری بود و نبود مَیں ہی ہوں



صدرِ بزمِ شہود مَیں ہی ہوں خاکِ چشمِ حسود مَیں ہی ہوں
ہے ازل سے بلند ذوق مرا یعنی وقفِ صعود مَیں ہی ہوں



مَیں نہ آنی ہوں اور نہ فانی ہوں جلوۂ حُسنِ جاودانی ہوں
اے کفِ خاک مختصر یہ ہے نے زمانی ہوں نے مکانی ہوں



مطربِ بزمِ زندگانی ہوں بادۂ تندِ کامرانی ہوں
خاکِ تیرہ! ہے شمع تو جس سے مَیں وہی نورِ آسمانی ہوں



بے نشاں کی ہیں نشانی ہوں مَیں بھی اک سازِ لن ترانی ہوں
مادہ مَیں نہیں ہوں اے ناداں! مَیں نوائے نغمۂ غیر فانی ہوں



غیر فانی ہوں، جاودانی ہوں ایک اعجازِ کن فکانی ہوں
خاک ہوں مَیں نہ باد ہوں واللہ آگ بخدا ہوں میں نہ پانی ہوں



زندگی کا قیام ہے مجھ سے زندگی کا دوام ہے مجھ سے
مَیں حقیقت ہوں، ماسوا موہوم صبح مجھ سے ہے شام ہے مجھ سے



تیری ناموس و نام ہے مجھ سے تو جہاں میں امام ہے مجھ سے
مَیں ہی اس میکدے کی رونق ہوں خم و مینا و جام ہے مجھ سے



یہ قعود و قیام ہے مجھ سے اور یہ نازِ خرام ہے مجھ سے
مرے صدقے میں تو حکیم ہوا تیرا زورِ کلام ہے مجھ سے



دیوِ فطرت غلام ہے مجھ سے یہ بلا تیری رام ہے مجھ سے

توسنِ دہر کا ہوں میں کوڑا　　زیر یہ بدلگام ہے مجھ سے



میں ترا درد بھی دوا بھی ہوں　　میں مرض بھی ترا شفا بھی ہوں
اہرمن بھی ہوں میں فرشتہ بھی　　بولہب بھی ہوں مصطفیٰ بھی ہوں



ابتدا بھی ہوں انتہا بھی ہوں　　وا ں بھی ہوں دل سے کچھ سوا بھی ہوں
گو توہم کی لوٹ ہوں لیکن　　میں حقیقت کا آئینہ بھی ہوں



مدعی بھی ہوں مدعا بھی ہوں　　میں منادی بھی ہوں ندا بھی ہوں
اس زمان و مکاں کے قلزم میں　　میں ہی کشتی بھی ناخدا بھی ہوں



باوفا بھی ہوں بے وفا بھی ہوں　　رحمتِ حق بھی ہوں بلا بھی ہوں
عکس ہوں میں آئینِ روشن کا تیری　　یعنی دشمن بھی آشنا بھی ہوں



تیرا سرمایۂ الست ہوں میں　　تیرا دستِ کشاد و لبست ہوں میں
سرد و گرم زمانہ ہے مجھ سے　　اک جہانِ بلند و پست ہوں میں

———(٥)———

"خودی" اور "خودسری"

(جناب مرزا عزیز فیضانی داراپوری)

ہے بہرِ شکم جو نوکری ہے　　اور دل کے لئے سخنوری ہے
دن کو ہیں ملازم اور شب کو　　ہم ہیں شانِ قلندری ہے
موجود ہوں گنج و مال تو کیا　　عنقا دل کی تونگری ہے
ہوتا ہے دروغ کو فروغ اب　　کھیتی اُس کی ہری بھری ہے
علم اور خرد ہوئے ہیں محکوم　　زر ہی کی جہاں میں سروری ہے
ہر شخص مخالفت میں دیں کی　　با وصفِ ضُعف بھی جری ہے

اک پیر سے کل ہوئی ملاقات　　مانی ہوئی جن کی بزتری ہے
پُوچھا کہ خلافِ شرع کیوں ہو　　بولے، منزل یہ دوسری ہے

خود اپنے بنا رہے ہیں معبود　　اب قوم کا پیشہ آزری ہے
فیضِ نُورِ خودی سے ذرّہ　　رشکِ خورشیدِ خاوری ہے
جو چیز مگر ہے آپ کے پاس　　وہ کب ہے خودی وہ خودسری ہے
خود رکھتے ہیں سر ہم اُس کے در پر　　دشمن کی بھی کیا فسوں گری ہے
بازو ہے نہ ذوالفقار باقی　　اِتنا ہے کہ نعرہ حیدری ہے
اُمیدِ غزل عزیز سے کیا　　وہ تو اِس عیب سے بَری ہے

مکتبہ پیغام حق

پیغام حق کے خریدار حضرات سے درخواست ہے کہ اُن کو ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی جس کتاب کی ضرورت ہو وہ ہم سے طلب فرماویں۔ ہمارے ہاں سے کتابیں خریدنے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کتابوں پر داغ دھبے نہ ہوں گے اوراق پھٹے ہوئے نہ ہوں گے اور محصولڈاک اور پیکنگ وغیرہ کے اخراجات کم سے کم لئے جاویں گے۔

علاوہ ازیں دار المصنفین اعظم گڈھ ادارہ ترجمان القرآن لاہور، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی اور دیگر اداروں کی تصانیف بھی ہمارے ہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اور انہی اداروں کی قیمت پر مہیا کی جاتی ہیں۔

ذیل کے رسائل اور کتب بھی ہمارے ہاں موجود ہیں:-

ہندو مسلم سوال کا واحد حل۔ یہ پمفلٹ اُردو اور انگریزی میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوا ہے اور مفت تقسیم کیا جا رہا ہے صرف محصولڈاک کے لئے ا رفی پمفلٹ کے حساب سے بھیج کر جتنے پمفلٹ منگوانا چاہیں منگوالیں۔

داغِ محبت۔ ایک جرمن خاتون کا روزنامچہ ہے جس سے آپکو مغربی زندگی کا بھیانک منظر نظر آئے گا کتاب کئی لحاظ سے سبق آموز، دلچسپ اور مفید ہے۔ رعائتی قیمت مع محصول ڈاک ۶ ر

عرب کا چاند۔ ایک ہندو مصنف نے حضور رسالتمآب کی سیرت پر منصفانہ نگاہ ڈال کر اس کتاب میں اپنی عقیدتمندی کا اظہار کیا ہے۔ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے رعایتی قیمت مع محصولڈاک ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/)

ملنے کا پتہ:- دفتر پیغام حق۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

یادِ اقبال



حصہ اوّل

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی وفات پر ہندوستان بھر کے انشا پردازوں اور اہلِ ذوق شاعروں نے مرثیے لکھ کر جس طرح اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم مسلمان مفکرین کے دل و دماغ پہ کس طرح حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ اور ان کی شاعری، فلسفہ اور تعلیمات نے کتنے دلوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ ہمارے خیال میں ہندوستان بھر کے کیا دُنیا بھر کی کسی شخصیت کے مرثیے اتنی کثرت سے اتنی شخصیتوں نے اس قدر گہرے تاثر کے ماتحت کبھی نہیں لکھے۔ اہلِ ذوق کی خاطر ان مرثیوں کو "اقبال اکیڈیمی" نے کتابی شکل میں طبع کر دیا ہے۔ حصہ اوّل چھپ چکا ہے اور ذیل کے پتہ سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ محصول ڈاک پانچ آنے۔ خرچ وی۔ پی تین آنے۔

ملنے کا پتہ:-

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاجپورہ لاہور

Registered No. L. 4584

جلد ۲ عدد ۳

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

غلام سرور فگار

ظفر منزل تاجپورہ لاہور

سالانہ قیمت

عوام سے دو روپے بارہ آنے | رؤساء سے پانچ روپے

فہرست مضامین

جلد (۲) | اپریل سنہ ۱۹۴۰ء | عدد (۴)

افتتاحیہ:۔

کانگریس کے صدارتی خطبہ پر ایک نظر	ایڈیٹر	۲

مقالات:۔

مدافعانہ جنگ	سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور	۱۷
اسرارِ خودی	غلام سرور فگار	۲۵
تمدن و سیاست پر رہبانیت کا اثر	جناب مرزا عزیز فیضانی دارا پوری	۴۱
السحر الحلال فی کلام علامۃ الاقبال	حافظ سراج الدین محمود بی۔ اے بی۔ ٹی۔ بہاول پور	۴۷

منظومات:۔

ذوق و شوق	غلام سرور فگار	۵۲
حقائق	جناب ابن حزیں سیالکوٹی	۵۵
اقبالؒ کی آرامگاہ	جنابہ بشیر النساء بیگم بشیر	۵۷
سامانِ جنوں	جناب مرزا عزیز فیضانی دارا پوری	۵۹

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع ہوا

افتتاحیہ



سخنہائے گفتنی

کانگریس کے صدارتی خطبہ پر ایک نظر

پچھلے مہینہ ایسٹر کی تعطیلات میں اُدھر رام گڑھ میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجتماعِ عظیم ہوا اور اِدھر لاہور میں دریائے راوی کے کنارے آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر پشاور سے لے کر راس کماری تک کے مسلمان مندوبین اور رہنماؤں کی ایک ہنگامہ خیز کانفرنس منعقد کی۔ رام گڑھ میں مولنا ابوالکلام آزاد نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا جس کا نصف سے زیادہ حصّہ اس مقصد پر حاوی تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی ترغیب دی جائے اور لاہور میں مسٹر محمد علی جناح نے جن کو ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کا قائداعظم کہا جاتا ہے اپنے صدارتی خطبہ میں زیادہ تر اس بات پر زور دیا کہ کانگریس ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے اسلئے مسلمانوں کو آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہئے کیونکہ اسے اُن کی واحد نمائندگی کا حق حاصل ہے اب اگر مشکل ہے تو مسلمانوں کیلئے۔ اُنکی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ کدھر کا رُخ کریں اور آزادی کی نیلم پری سے وہ کس طرح ہمکنار ہوں کانگریس اُنکا ہاتھ پکڑ کر منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہے یا مسلم لیگ۔ دونوں طرف کے مسلم زعما گلا پھاڑ پھاڑ اُنہیں دعوتِ شرکت دے رہے ہیں اور اُنکے نفع و نقصان کو اُنکی آنکھوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں لیکن وہ ہیں کہ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَا اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَا اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ۔ اس حقیقت کو وہ بھی سُن رہے ہیں کہ آزادی ایک

کا پیدائشی حق ہے لیکن دُنیا پر وسیع نظر ڈالنے کے باوجود اس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلم لیگ اور کانگریس اپنا نصب العین ایک ہی بتلاتے ہیں اور اپنے دلآویز مظاہروں اور طویل قرار دادوں سے عوام کی توجہات کو اپنی طرف مائل کرنے کی سعی کرتے ہیں لیکن حیرت اسوقت ہوتی ہے جب اُنکی عملی زندگی ایکدوسرے کو ناقابلِ صلح مدِمقابل ظاہر کرتی ہے اور ان کے رہنما اپنے پلیٹ فارموں پر کھڑے ہوکر ایکدوسرے کے لائحہ عمل پر سخت سے سخت نکتہ چینی کرتے ہیں اور جانبین کے تاریک پہلوؤں پر اس حد تک زور دیتے ہیں کہ ان کے خیال میں اُس میں کوئی بھی مفید پہلو نہیں ہوتا۔

ایسی صورت میں جبکہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی ناؤ منجدھار میں ہو اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف اس اُمید میں دیکھ رہے ہوں کہ کوئی ایسا ملاح نظر آئے جو اُنکو نہ صرف اس منجدھار سے نکالے بلکہ منزلِ مقصود تک رہنمائی کرے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج کی صحبت میں اُن کو بتایا جائے کہ دورِ حاضرہ کی اس حق و باطل کی آویزش میں ان دونوں جماعتوں کے مسلکوں کی حقیقت کیا ہے۔

کانگریس نے جن حالات کے ماتحت اسکو ضروری سمجھا کہ امسال کانگریس کا صدر کسی مسلمان کو بنایا جائے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس منتظمہ میں بھی گذشتہ سالوں سے زائد مسلمان ممبروں کو نامزد کیا جائے اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں کی صدارتیں اور مجالس منتظمہ میں بھی اِن ہی کو زیادہ حقِ نیابت دیا جائے وہ یہ کہ سب سے پہلے مسلم لیگ کا منہ بند کیا جاسکے دوسرے عام مسلمانوں کو اس کا ثبوت بہم پہنچایا جائے کہ کانگریس ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے جو مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں میں سے کسی کی بھی حق تلفی کرنا نہیں چاہتی تیسرے حکومت پر بھی واضح کیا جائے کہ کانگریس مسلمانوں ایسی بڑی اقلیت کے ساتھ اتنی رواداری برتتی ہے کہ وہ بطیبِ خاطر اسکی ہمنوائی کا دم بھرتے ہیں۔

مولنا ابوالکلام ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جن کے علم و فضل کا نقارہ ایک مدت سے ہندوستان کی فضا میں بج رہا ہے اور آپ خود بھی اپنے تبحرِ علمی اور دقتِ نظری کے اعتبار سے مسلمانوں میں منفرد سمجھے جاتے تھے اور مسلمانوں کے

دلوں میں آپ کو کافی گنجائش تھی کانگرس کے کارپرداز جو بڑے مردم شناس واقع ہوئے ہیں انہوں نے مولنا موصوف کو امسال کرسی صدارت کو زینت دینے کیلئے منتخب کیا اور لاریب اُنکی انتخابی نظر کا یہ قابل تعریف کارنامہ ہے کیونکہ مسلمانوں میں آپکے پلّے کا اسوقت کوئی عالم دین نہیں تھا مولنا موصوف جیسے کہ آپ خود اپنے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں گذشتہ بیس سال سے کانگریس کے مقاصد کے ساتھ متفق الرائے چلے آتے ہیں اور اسکی کئی ایک پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں اکثر اوقات آپکے ناخنِ تدبیر سے مدد لی جاتی رہی ہے اس خطبۂ صدارت میں آپنے جن باتوں پر زور دیا ہے اُن میں سے زیادہ تر آپکا تخاطب مسلمانوں سے ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) ہندوستان کے مسلمانوں پر "اقلیت" کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

(۲) اگر مسلمان اپنے سیاسی مستقبل کو درخشاں بنانا چاہتے ہیں تو ان کیلئے سوائے اسکے کوئی راستہ نہیں کہ اپنی قسمت کی باگ ڈور کانگرس کے ہاتھ میں دیدیں اس وقت کانگرس جس نمائندہ مجلس CONSTITUENT ASSEMBLY کی تجویز کر رہی ہے مسلمانوں کے فلاح و بہبود کا اس میں کثرت سے سامان موجود ہے۔

(۳) یہاں کے مسلمان ہندوستانی مسلمان ہیں اور ہندوستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کے عنصر ہیں۔

(۴) مسلمانوں کو اپنی گذشتہ تہذیب و معاشرت کے دلخوش کن خواب نہیں دیکھنے چاہئیں اسلئے کہ مسلمان اب ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں جنکی زبان، شاعری، ادب، معاشرت، لباس، رسم و رواج اور روزانہ زندگی میں یہاں کی مشترک زندگی کی چھاپ لگ چکی ہے گنگا اور جمنا کی دو دھاروں کی طرح اب ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبیں آپس میں ایک ہو گئی ہیں

"اقلیت" کے سلسلہ میں مولنا موصوف نے سیاسی بول چال میں اسکی ایک انوکھی تعریف یہ کی ہے "ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسرے کی تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت نہیں ہوتی بلکہ اس سے مقصود وہ جماعت ہے جو اتنی کمزور ہو کہ تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر وہ اپنے مفاد کی حفاظت نہ کر سکے"۔ مولنا موصوف نے خاص مسلمانوں کیلئے یہ فارمولا وضع کیا ہے ورنہ اگر وہ دنیا بھر کی آئینی

مجالس پر سرسری نظر ڈالئے کہ وہ کس طرح چل رہی ہیں تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اقبالؒ نے جو یہ رائے قائم کی ہے اسکی اصابت میں رتی بھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے ؎

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

دور کیوں جاتے ہو ہندوستان کی موجودہ قانون ساز مجالس ہی کو لیجئے مسلمان تو ہندوستان میں ایک چوتھائی ہیں ان قانون ساز مجالس میں جس جماعت کے ممبروں کی تعداد برسرِ اقتدار جماعت کی تعداد سے تین چوتھائی بھی ہو اس کی کوئی تجویز قابلِ تسلیم نہیں سمجھی جاتی خواہ افادی اعتبار سے کتنی اہم کیوں نہ ہو جب یہ کیفیت ہو کہ محض شماری برتری پر قوموں کی قسمتوں کے فیصلوں کا انحصار ہو تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اقلیت میں نہیں۔ رہا یہ کہ مختلف زمانوں کی اقلیتوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں دکھائے ہیں بالخصوص مسلمان تو ہمیشہ اقلیت میں ہی رہے ہیں اور اسلام کے ابتدائی دور میں باوجود انتہائی اقلیت مخالفین کی کثرت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ہر ہر قدم پر نصرت وکامرانی حاصل ہوتی تھی۔ تاریخ اسلام اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے لیکن کیا مولانا موصوف نے کبھی ادھر بھی توجہ کی کہ اسلام کے ابتدائی دور کی اقلیت میں کونسی امتیازی خصوصیت تھی جسکی وجہ سے وہ ٹڈی دل مخالفین پر چھا گئی اور آج دنیا میں جو ستر اسی کروڑ مسلمان نظر آرہے ہیں۔ یہ ان صالح جوانمردوں کے کارناموں اور ان کے سرفروشانہ مظاہروں کی باقیات ہیں۔ دراصل آج ہندوستان کے مسلمانوں کی اقلیت میں وہی روح پھونکنے کی ضرورت ہے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں تھی اور وہ روح عشقِ خدا اور حضرت محمد صلعم کی تھی مولانا موصوف مسلمانوں کی اس اقلیت کی فطری صلاحیتوں سے اس کی تو قوی امید رکھتے ہیں کہ وہ مخالفین کی کثرتِ تعداد پر غالب آسکتی ہیں لیکن کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ نے ان فطری صلاحیتوں کو بکار لانے کیلئے بھی کوئی منظم جدوجہد کی۔ بقول آپ کے آپ کو تیس سال ہو گئے ہیں کہ ایک ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے سوچنا شروع

دلوں میں آپ کو کافی گنجائش تھی کانگریس کے کارپرداز جو بڑے مردم شناس واقع ہوئے ہیں انہوں نے مولنا موصوف کو امسال کرسی صدارت کو زینت دینے کیلئے منتخب کیا اور لاریب انکی انتخابی نظر کا یہ قابل تعریف کارنامہ ہے کیونکہ مسلمانوں میں آپکے پلے کا اسوقت کوئی عالم دین نہیں تھا مولنا موصوف جیسے کہ آپ خود اپنے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں گذشتہ بیس سال سے کانگریس کے مقاصد کے ساتھ متفق الرائے چلے آتے ہیں اور اسکی کئی ایک پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں اکثر اوقات آپکے ناخنِ تدبیر سے مدد لی جاتی رہی ہے اس خطبۂ صدارت میں آپنے جن باتوں پر زور دیا ہے اُن میں سے زیادہ تر آپکا تخاطب مسلمانوں سے ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) ہندوستان کے مسلمانوں پر "اقلیت" کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

(۲) اگر مسلمان اپنے سیاسی مستقبل کو درخشاں بنانا چاہتے ہیں تو ان کیلئے سوائے اسکے کوئی راستہ نہیں کہ اپنی قسمت کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھ میں دیدیں اس وقت کانگریس جس نمائندہ مجلس CONSTITLLENT ASSEMOLY کی تجویز کر رہی ہے مسلمانوں کے فلاح و بہبود کا اس میں کثرت سے سامان موجود ہے۔

(۳) یہاں کے مسلمان ہندوستانی مسلمان ہیں اور ہندوستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کے عنصر ہیں۔

(۴) مسلمانوں کو اپنی گذشتہ تہذیب و معاشرت کے دلخوش کن خواب نہیں دیکھنے چاہئیں اسلئے کہ مسلمان اب ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں جنکی زبان، شاعری، ادب، معاشرت، لباس، رسم و رواج اور روزانہ زندگی میں یہاں کی مشترک زندگی کی چھاپ لگ چکی ہے گنگا اور جمنا کی دو دھاروں کی طرح اب ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبیں آپس میں ایک ہوگئی ہیں

"اقلیت" کے سلسلہ میں مولنا موصوف نے سیاسی بول چال میں اسکی ایک انوکھی تعریف یہ کی ہے "ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسرے کی تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت نہیں ہوتی بلکہ اس سے مقصود وہ جماعت ہے جو اتنی کمزور ہو کہ تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر وہ اپنے مفاد کی حفاظت نہ کر سکے"۔ مولنا موصوف نے خاص مسلمانوں کیلئے یہ فارمولا وضع کیا ہے ورنہ اگر وہ دنیا بھر کی آئینی

مجالس پر سرسری نظر ڈالتے کہ وہ کس طرح چل رہی ہیں تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اقبالؒ نے جو یہ رائے قائم کی ہے اسکی اصابت میں رتی بھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے ؎

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش　　ہرچند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں　　بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

دُور کیوں جاتے ہو ہندوستان کی موجودہ قانون ساز مجالس ہی کو لیجیے مسلمان تو ہندوستان میں ایک چوتھائی ہیں ان قانون ساز مجالس میں جس جماعت کے ممبروں کی تعداد برسراقتدار جماعت کی تعداد سے تین چوتھائی بھی ہو اس کی کوئی تجویز قابل تسلیم نہیں سمجھی جاتی خواہ افادی اعتبار سے کتنی اہم کیوں نہ ہو جب یہ کیفیت ہو کہ محض سرشماری پر قوموں کی قسمتوں کے فیصلوں کا انحصار ہو تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اقلیت میں نہیں۔ رہا یہ کہ مختلف زمانوں کی اقلیتوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں دکھائے ہیں بالخصوص مسلمان تو ہمیشہ اقلیت میں ہی رہے ہیں اور اسلام کے ابتدائی دور میں باوجود انتہائی اقلیت مخالفین کی کثرت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ہر ہر قدم پر نصرت وکامرانی حاصل ہوتی تھی۔ تاریخ اسلام اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے لیکن کیا مولانا موصوف نے کبھی ادھر بھی توجہ کی کہ اسلام کے ابتدائی دور کی اقلیت میں کونسی امتیازی خصوصیت تھی جسکی وجہ سے وہ ٹڈی دل مخالفین پر چھا گئی اور آج دنیا میں جو ستر اسی کروڑ مسلمان نظر آ رہے ہیں۔ یہ ان صالح جوانمردوں کے کارناموں اور اُن کے سرفروشانہ مظاہروں کی باقیات ہیں۔ دراصل آج ہندوستان کے مسلمانوں کی اقلیت میں وہی روح پھونکنے کی ضرورت ہے جو قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں میں تھی اور وہ روح عشقِ خدا اور حضرت محمد صلعم کی تھی مولانا موصوف مسلمانوں کی اس اقلیت کی فطری صلاحیتوں سے اس کی تو توقع امید رکھتے ہیں کہ وہ مخالفین کی کثرت تعداد پر غالب آ سکتی ہیں لیکن کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ نے ان فطری صلاحیتوں کو بکار لانے کیلئے بھی کوئی منظم جدوجہد کی۔ بقول آپ کے آپ کو تیس سال ہو گئے یہاں کہ ایک ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے سوچنا شروع

کیا تھا اور آپ کو سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نظر نہیں آیا تھا کہ کانگرس کے ساتھ مل کر ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش کریں میرے خیال میں مولانا موصوف نے بیس سال کا یہ طویل اور قیمتی وقت محض کانگرس کا آلۂ کار بننے میں ضائع کر دیا اور آپ نے نہ صرف انفرادی خودی کے جوہر کو نقصانِ عظیم پہنچایا بلکہ مسلمانوں کی جماعتی خودی پر بھی ضرب کاری لگائی آپ کو چاہئے تھا کہ جس اقلیت کی نام نہاد نمائندگی کا آپ اور آپ کے دوسرے رفقاء دم بھرتے ہیں کانگرس کی کثرت میں شامل ہونے سے پہلے آپ اس اقلیت کی فطری صلاحیتوں کے جوہر کو چمکاتے جس کی خود اعتمادی پر آج بھی آپ کو بھروسہ ہے کہ وہ کسی کثرت کے مقابلہ میں پسماندہ نہیں ہے اقلیت کی صحیح پوزیشن کا آپ کو اس وقت اندازہ ہو سکتا ہے جب آپ کانگرس کی معینہ راہِ عمل سے قدرے ہٹ کر مسلمانوں کے مفاد کی کوئی تجویز کانگرس کی مجلس عاملہ میں کثرت رائے سے فیصلہ کرنے کے لئے پیش کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اقلیت کی اس نام نہاد نمائندگی کی قدر و منزلت ایک ایسی جماعت کے نزدیک کیا ہے جس نے محض اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لئے آپ کو اور آپکے دیگر رفقاء کو اپنے ساتھ ملا رکھا ہے اور جب تک آپ اسکی مشینری کے پرزے بن کر کام کرتے رہیں گے اُسے آپ سے کوئی تعرض نہ ہوگا لیکن جب آپ نے ذرا بھی انحراف ورزی کی آپ کو نکال کر باہر پھینک دیا جائیگا اور آپ کی جگہ ایک دوسرا اَن فٹ (FIT) کر دیا جائیگا۔ کیونکہ کانگرس کا اپنی گذشتہ ۴۵ سالہ زندگی میں یہی دستور چلا آتا ہے اقلیتوں کے معاملہ میں وہ بڑی دریادل واقع ہوئی ہے یہاں تک کہ اُسکے رہنما BLANK CHEQUE بھی اقلیتوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے رہے ہیں اگرچہ اسے معرضِ عمل میں آنے کا موقعہ نہیں دیا گیا تاہم اقلیتوں کے بڑھتے ہوئے مطالبات کی رَو کو روکنے کے لئے اس سے مؤثر کوئی حربہ نہیں ہو سکتا تھا۔

موجودہ وقت میں نمائندہ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY کے ڈھونگ کو کھڑا کرنے کیلئے کانگرس نے اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے تحفظ کا جو یقین دلایا ہے مولانا موصوف نے اپنے خطبہ صدارت میں اس طرح اعادہ کیا ہے۔

"آج بھی اُس نے (کانگرس نے) نمائندہ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY کے سلسلے میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے ...... وہ یہ ہے کہ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں اُنکے نمائندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رائیوں کے سوا اور کسی رائے کا بوجھ نہ ہوگا جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے فیصلہ کا ذریعہ نمائندہ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY کی کثرت رائے نہیں ہوگی خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہوسکے تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرلیا جاسکتا ہے جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کرلیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے ورنہ اسکا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔

نمائندہ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY میں مسلمانوں کی اقلیت یا دوسری اقلیتوں کا سرمایۂ حیات مضمر ہے یا نہیں یہ ایک ثانوی چیز ہے پہلی چیز یہ ہے کہ آیا موجودہ حالات کے ماتحت ہندوستان میں نمائندہ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY کا قیام ہو بھی سکتا ہے یا نہیں اور کیوں ہو نہیں سکتا؟

اس قسم کی نمائندہ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY ایک قسم کا انقلابی تصوّر IDEOLOGY REVOLUTIONARY ہے جسکے عالم وجود میں لانے کے دو وجوہ ہوتے ہیں ایک تو یہ آزادی کی جدوجہد کے لئے بنیادی اصولوں کے وضع کرنے کا کام دیتی ہے دوسرے کسی نئے تعمیری آئین کو بنانے کا ذریعہ اسے ٹھیرایا جاتا ہے لیکن دونوں صورتوں میں اسکی بڑی ضرورت ہے کہ عوام کے مشاعر اور معتقدات میں کامل یکجہتی ہو اور اُنکے پیش نظر ایک متحدہ قومی محاذ ہو جسکی عنان ایسے رہنماؤں کے ہاتھوں میں ہو جن پر عوام کو اعتماد کامل ہو۔ انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء، انقلاب جرمنی ۱۸۴۸ء اور انقلاب روس ۱۹۱۷ء کے موقعوں پر ہمیشہ اس کا عام تقاضا رہا ہے کہ نئے آئین کو کسی ایسی نمائندہ مجلس CONSTITUENT ASSEMBLY کے ذریعہ وضع کرنا چاہئے جو عوام کے منتخبہ نمائندوں پر مشتمل ہو۔

ہندوستان کے حالات مندرجہ بالا تینوں ممالک سے قطعاً مختلف ہیں نہ یہاں اُن ممالک کا سا انقلابی

جذبہ کارفرما ہے اور نہ افراد میں اتنی یکجہتی اور مقاصد میں اتفاق ہے کہ وہ اپنے رہنماؤں پر اعتماد کامل کر سکیں جو نمائندہ مجلس CONSTITUENT ASSEMBLY کے لئے شرطِ اولین ہے گاندھی جی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "ہریجن" میں جو مقالہ اس موضوع پر سپرد قلم کیا تھا اسمیں حکومتِ برطانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس سے استدعا کی تھی کہ وہ بجائے ایک نئی گول میز کانفرنس ROUND TABLE CONFERENCE کے نمائندہ مجلس CONSTITUENT ASSEMBLY قائم کرے لیکن گاندھی جی کو چاہئے تھا کہ وہ ملک کی مختلف جماعتوں سے اسکی اپیل کرتے نہ کہ حکومت برطانیہ سے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو نمائندہ مجلس CONSTITUENT ASSEMBLY حکومت برطانیہ کی زیر نگرانی قائم ہوگی اُس سے کیا مفید نتیجہ مترتب ہو سکتا ہے

ہندوستان میں سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی ہے لیکن کانگرس نے مولنا موصوف ایسے چند ایک مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر یہ سمجھ لیا کہ وہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی ہے اسلئے مسلمانوں کی کسی دوسری جماعت سے استصواب رائے کی اسے ضرورت نہیں ہے یہ کانگرس کے کارپردازوں کی تنگ نظری تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عام مسلمانوں کی ہمدردیوں کو کھو بیٹھی اور مسلم لیگ جو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت ہے خم ٹھونک کانگرس کے مقابلہ کے لئے میدان میں اُتر آئی اور اس طرح ہندوستان کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو جو پہلے ہی سے کانگرس کے مخالف تھا اسکے کافی وجوہ بہم پہنچ گئے کہ وہ نمائندہ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY کے وجود کو اپنے لئے غیر مفید بتائے گاندھی جی نے جس خطرے کے پیش نظر اقلیتوں سے اپیل نہیں کی تھی بالآخر وہی سامنے آیا اور اُن کی وہ سکیم جس کا نفاذ وہ حکومت برطانیہ کے مبارک ہاتھوں سے کرانا چاہتے تھے دھری کی دھری رہ گئی۔

مولنا موصوف نے تسلیم شدہ اقلیتوں کے لئے نمائندہ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY میں جن مراعات کی وضاحت کی ہے وہ گاندھی جی کے ایک مقالہ کی صدائے بازگشت ہے جو انہوں نے "ہریجن" میں سپرد قلم

کیا تھا۔ یہ بات ایک معمہ سا ہو کر رہ گئی ہے کہ ایک بیکار کثرت میں ایک ایسی سادہ لوح اقلیت اپنی شخصیت کو کس طرح قائم رکھ سکتی ہے جو اپنی روایتی اسلامی خصوصیتوں سے قطعاً عاری ہو چکی ہو اور اسکی رضامندی کا کس طرح پاس رکھا جا سکتا ہے جبکہ اکثریت کی یہ خواہش ہو کہ اقلیت اپنے دل میں کوئی ایسی خواہش پیدا ہی نہ کرے جو اکثریت کیلئے وجہ نارضامندی ہو۔ اگر نمائندہ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY کے عالم وجود میں لانے کا شوق ہی ہے تو سب سے پہلے ہندوستان میں ایسی فضا پیدا کرنے کی ضرورت ہے لیکن گاندھی جی بخوبی جانتے تھے کہ ایسی فضا پیدا کرنا اُنکے اختیار سے باہر ہے تعجب ہے کہ مولنا موصوف اس رازِ درون پردہ کو نہیں سمجھ سکے جس کو ٹریبیون نے بھی اپنے افتتاحیہ کے آخری حصہ میں ظاہر کر دیا مولنا موصوف کے خطبہ کے اس حصّے سے کہ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کے فیصلہ کا ذریعہ مجلس کی کثرت رائے نہیں ہوگی بلکہ خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی مدیر ٹریبیون نے اختلاف رائے رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ مذہبی امور میں ایسا ہو سکتا ہے لیکن دیگر سیاسی اور معاشرتی امور میں یہ کلیہ قائم نہیں رہ سکتا لیکن اسکو کیا کیا جائے مسلمانوں کے سیاسی و معاشرتی امور مذہب کے تابع ہیں۔

مولنا موصوف کو اپنے اختیار کئے ہوئے مسلک کی تائید میں کوئی ایسی بات بھی کہنے میں باک نہیں ہے جو خواہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو آپ کا سیاسی عقیدہ یہ ہے کہ آپ ہندوستانی مسلمان ہیں اور ہندوستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپ نے اسلام کو ملکی حدود میں مقید کر دیا ہے آپکے نزدیک اسمیں کوئی ہرج نہیں اگر مختلف ممالک کے رہنے والے مسلمان اپنے آپکو وہاں کے ملکوں کے ساتھ منسوب کر دیں اس طرح مسلمانوں کو ایرانی مسلمان، افغانی مسلمان، جاپانی مسلمان، چینی مسلمان وغیرہ وغیرہ سینکڑوں نسبتی ناموں اور لسانی اور لونی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مولنا موصوف نے اسلامی تعلیمات کے سر پر ایک کاری ضرب لگائی ہے جس کے زخم کا مندمل ہونا دشوار ہوگا جس طرح مشرق و مغرب سب خدا کے ہیں اسی طرح خدا نے اسلام کو بھی عالمگیر اصول دیئے ہیں اور مسلمان کو ہندی، ایرانی، تورانی، افغانی وغیرہ کہلانے کے بجائے مردِ آفاقی قرار دیا ہے اور اسکی اس خصوصیت کو دنیا میں امتیازی درجہ بخشا ہے حضرت محمد صلعم جنکے اسوۂ حسنہ کو مسلمان اپنا شعارِ زندگی سمجھتے ہیں

سب سے پہلے انہوں نے خود اس زرین اصول پر عمل کیا اور اسکے بعد اہل عرب کے دلوں سے اس تنگ خیالی کو نکالا جس نے عربوں کو قبیلے قبیلے میں تقسیم کر رکھا تھا آنحضرت صلعم نے عربوں کو ایسی تعلیم دی کہ وہ انسانوں کی عام سطح سے بلند ہو گئے اس سے عرب کی نسلی اور وطنی عصبیت پر بڑی سخت چوٹ لگی۔ اہل عرب عرب کی تنگ حدود سے نکلے اور جہاں کہیں بھی گئے انسانی اخوت کا پیغام اقصائے عالم میں دیتے گئے اور خدا کی بادشاہت کو قائم کرتے گئے جیسے کہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

جوہر ما با مقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست — رومی و شامی گلِ اندامِ ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مرز و بوم او بجز اسلام نیست

دراصل مسلمان کا مرز و بوم اسلام ہے اور اسلام کسی مقام کا پابند نہیں اسلئے مسلمان کو بھی کسی مقام سے نسبت نہیں ہو سکتی یہ مقامی نسبت مادہ پرستوں کی ایجاد ہے جنکا سرمایۂ حیات سوائے املاکِ عالم کے کچھ نہیں ہے اور جنکے دلوں میں مساکن اور وسائل معیشت کے سوا کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے خدا کو انہیں سے کوئی بھی بات پسند نہیں ہے اسلئے مسلمانوں کو بھی اس نے مادی اشیاء کیساتھ زیادہ انہماک رکھنے کی ممانعت کی ہے اور فرمایا ہے۔ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ (اے میرے وہ بندو جو مجھ پر ایمان لائے میری زمین بہت وسیع ہے پس کسی خاص مقام کی پابندی تمہیں میری پرستش نہ روکے تم بہرحال میری ہی عبادت کرو خواہ اس مقصد کیلئے تمہیں اس وسیع زمین کے کسی خطہ میں جانا پڑے کیونکہ ہر شخص کو مرنا ہے پھر ہماری ہی طرف بالآخر تم لوٹ آؤگے)

اس آیت شریف میں مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ تمام روئے زمین انکا وطن ہے جہاں کہیں بھی وہ چلے جائیں جو رشتہ انہوں نے خدا کیساتھ قائم کیا ہے وہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا اور رشتہ دین اسلام کے پیرکار ہونیکا ہے جو تمام مقامی تفرقوں کو مٹا دیتا ہے۔

جب مسلمان ہندوستانی مسلمان نہیں ہو سکتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہو جسطرح اسلام نے قیدِ مقام کی سختی سے مذمت کی ہے قومیت کے اس غلط تصور کو بھی پرودۂ باطل ٹھیرایا

ہے خدا نے دنیا کے انسانوں کو صرف دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیاطین اور صاف صاف کہدیا ہے کہ حزب الشیاطین والے نامراد رہتے ہیں اور حزب اللہ والے فلاح و بہبود پاتے ہیں اور جو لوگ حزب اللہ میں سے ہوکر حزب الشیاطین میں بھی شامل رہیں انکی گمراہی لازمی ہے شیطان اُنپر ضرور غالب آجائیگا اور اگر وہ یہ اُمید رکھتے ہوں کہ اُن سے ملکر کسی متحدہ مقصد کو حاصل کریں تو یہ ایک خام خیالی ہے چنانچہ فرمایا ہے۔ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ۔ (تم سے نہ یہودی راضی ہونگے اور نہ نصاریٰ جبتک کہ تم اُنکے طریقہ کی پیروی قبول نہ کرلو صاف صاف کہدو کہ سیدھا راستہ خدا کا ہے ورنہ اگر کہیں تم نے انکی خواہشات کی پیروی قبول کرلی درآنحالیکہ تمہارے پاس راہِ راست کا علم آچکا ہے تو اللہ کی پکڑ سے کوئی حامی مددگار تمہیں نہ بچا سکے گا)

یہ اسلام کا ایک دائمی اصول ہے جو قیدِ زمان و مکان کا پابند نہیں اور مولنٰا موصوف کی اس متحدہ قومیت کے شیرازہ کو درہم برہم کرنے کیلئے بادِ تند کا حکم رکھتا ہے جو آپنے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین قائم کرنیکا عزم کر رکھا ہے اور جسے آپ ناقابلِ تقسیم قرار دیتے ہیں افسوس ہے کہ اسلام تو یہ کہتا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو لیکن مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا عنصر بنے رہنے میں ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی نجات کا راز پوشیدہ ہے درآنحالیکہ اسلام میں اس قسم کی متحدہ قومیت کا کوئی وجود نہیں ہے

آج گیارہ سو سال ہوگئے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی میل جول چلا آتا ہے لیکن اِنکے دلوں میں وہ اتحاد قائم نہیں ہوسکا جسکو روحِ یگانگت کہنا چاہئے اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ مشترکہ اخلاقی شعور پیدا نہیں ہوسکا جو افراد کو کسی جماعت کیساتھ متحد کرنے کیلئے ضروری ہوتا ہے اسکی اُمید بھی کیسے رکھی جاسکتی ہے جبکہ معتقدات میں بعد المشرقین ہو اسکا ثبوت آئے دن کے وہ مناقشات ہیں جو ذرا ذرا سی بات پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا ہوجاتے ہیں گذشتہ ۳۵ سال سے کانگرس کے رہنما اسکی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے متنازعہ امور حل ہوں لیکن نہیں ہوسکے اور میرے خیال میں نہ کبھی ہوسکتے ہیں کیونکہ جبتک مسلمان مسلمان ہیں اور ہندو ہندو ہیں ایسا ہونا ممکن نہیں مسلمان توڈنکے کی چوٹ

سے اسکا اظہار کرتے ہیں کہ اسلام ایک مسلمانکی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہے اور کسی پہلو کو بھی کسی دوسرے زاویہ نظر سے نہیں جانچا جا سکتا لیکن ہندو بظاہر تو اسکا اعادہ کرتے جاتے ہیں کہ انکے مذہب کو دنیاوی معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہے کیونکہ مذہب خدا اور انسان کے درمیان ہی رابطہ رکھنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن علاوہ ہر معاملہ کو اپنے مذہبی تعصب کی عینک سے دیکھتے ہیں جہاں اس قسم کی منافقانہ چالیں رات دن چلی جاتی ہوں اتحاد عمل کیسے ہو سکتا ہے اور مسلمان ایسی متحدہ قومیت کے فریب میں کیسے آ سکتے ہیں جسکی بنیاد ہی غلط تصورات پر ہو۔

مولنا موصوف خطبے کے آخری حصہ میں بالکل جذباتی رو میں بہ گئے ہیں اور کانگرس کی انتہائی حمایت کے جوش میں آپکی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں کہ مسلمانوں کو اب اپنی گذشتہ تہذیب و معاشرت کے دلخوش کن خواب نہیں دیکھنے چاہئیں انکی زندگی کے ہر پہلو پر یہاں کی مشترکہ زندگی کی چھاپ لگ چکی ہے وغیرہ وغیرہ یہ مولنا موصوف کے خیالات ہیں اس سے ایکماہ قبل پروفیسر یو۔ این بال کے نام سے ایک مضمون "ہندوستانی مسئلہ" کے عنوان سے ٹریبون میں شائع ہوا تھا پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔

"نسلی اعتبار سے ہندوؤں اور کثیر التعداد مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے جو پہلے ہندو تھے اور بعد میں اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہو گئے جس طرح عیسائیت یورپین تہذیب سے خلا ملا نہیں کر سکتی اسی طرح اسلام کو بھی عربی یا ایرانی تہذیبوں کے ساتھ رشتہ اتحاد نہیں جوڑنا چاہئے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مسلمانوں میں سوائے اسکے کوئی مشترک بات پائی نہیں جاتی کہ وہ بھی انکی طرح خدا کی توحید اور حضرت محمد صلعم کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں . . . . "

مولنا موصوف کا مفہوم بھی اس سے ملتا جلتا سا ہے آپکے نزدیک نہ مسلمانوں کا کوئی اپنا علم ادب ہے نہ شاعری ہے نہ معاشرت ہے نہ لباس نہ رسم و رواج اور نہ روزانہ زندگی کا کوئی مخصوص طرز ہے چونکہ ہندوستانکی قوموں کیساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے اب مسلمانوں کی زندگی اپنے تمام پہلوؤں میں اُن جیسی ہی ہو گئی ہے اسلئے انکو چاہئے کہ اسی کو اپنا لیں سبحان اللہ کتنا معقول طریق استدلال ہے میں یہ مانتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کے اکثر پہلوؤں میں یہاں کی بود و باش اور باشندوں کیساتھ میل جول کی وجہ سے ایسی باتیں پیدا ہو گئی ہیں جو ہندوؤں یا دیگر اقوام کی سی ہیں لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ اسکے جواز کا فتویٰ دیدیا جائے اور مسلمانوں کو انکی گذشتہ تہذیب و معاشرت کے دلخوش کن خواب دیکھنے سے روکا جائے ایک بالغ نظر

اور دقیقہ رس مسلمان ہندوستان کے مسلمانوں کی اس افتاد حالت کو انکا زوال قرار دیگا اور اسی تہذیب و معاشرت کی جانب عود کرنے کی انکو تلقین کریگا جسکا نمونہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل حضرت محمد صلعم اور صحابہ کرام اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہما نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اسی زبان اسی شاعری اور ادب کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دینے کی ہدایت کریگا جو ہمارے رگ و ریشے میں ایک ایسی روح پھونکدے کہ ہم اپنی مخفی قوتوں کو ابھار کر تسخیر کائنات کے مقصد میں کامیاب ہوسکیں نہ ایسی زبان شاعری اور ادب اختیار کریں جو فلسفۂ ویدانت کی پروردہ ہو اور جسکے نشے نے مسلمانوں کو زندگی ہی میں ذوق حیات سے بیگانہ کردیا ہو اقبال شعر و ادب میں مسلمانوں کی بے حسی کو دیکھکر فرماتے ہیں۔

اے میان کیسہ ات نقد سخن — بر عیار زندگی او را بزن

فکر روشن بین عمل را رہبر است — چوں درخش برق پیش تندر است

فکر صالح در ادب می بایدت — رجعتے سوئے عرب می بایدت

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد — تا دمد صبح حجاز از شام کرد

از چمن زار عجم گل چیدۂ — نو بہار ہند و ایران دیدۂ

اندکے از گرمئ صحرا بخور — بادۂ دیرینہ از خرما بخور

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ شعر و ادب انسانی سیرت و کردار کی تشکیل میں بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے دنیا بھر کی حکومتیں اسے اپنے مقاصد کے پروپاگنڈہ کا ذریعہ قرار دیتی ہیں ہندوستان کے ہندو بھی دل سے چاہتے ہیں کہ مسلمان یہاں کے علم و ادب کے اثر کو قبول کرتے رہیں لیکن اقبال نے اس حقیقت کو کماحقہ سمجھ لیا تھا اسلئے انہوں نے مسلمانوں کو ادب میں فکر روشن اور فکر صالح پیدا کرنے کی رغبت دلائی اور اسکا سرچشمہ عرب کے ریگستانوں میں بتایا لیکن مولانا موصوف ہندوؤں کے اس فریب میں آگئے اور اسلامی تہذیب و معاشرت کے اس دور انحطاط کو اسلامی تہذیب و معاشرت کا بدل قرار دینے لگے مولانا موصوف کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تہذیب و معاشرت غیر اسلامی ہے اگر اسکی روک تھام نہ کی گئی تو عنقریب اسمیں ہندو دیو لیوں کے رقص و سرود کے وہ عناصر بھی شامل ہونے والے ہیں جو ہندوؤں کی عبادات کے اجزائے لاینفک ہیں چونکہ آپنے اس خطبہ

کے اخیر پہ فرمایا کہ میں مذہب میں تجدید کا قائل نہیں لیکن معاشرت میں ترقی سے انکار کرنے کو ظلم سمجھتا ہوں اسلئے کیا اس قسم کی ترقیٔ معکوس پر بھی جواز کا فتویٰ دینگے۔

مولانا موصوف نے اپنے خطبہ میں شروع سے اخیر تک متعدد بار اس امر پہ زور دیا ہے کہ جن خیالات کا اظہار وہ اس پلیٹ فارم سے کر رہے ہیں اس سے پہلے گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں تحریر و تقریر کے ذریعہ کر چکے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا اگر مولانا موصوف اپنے گذشتہ مسلک کی بحث کو نہ چھیڑتے کیونکہ کسی سیاستدان کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی معینہ راستے کا پابند ہو جائے ملکی حالات کے ماتحت وہ اپنے مسلک کو بدلتا رہتا ہے جیسے کہ برطانیہ کے مشہور و معروف وزیر اعظم مسٹر ڈزرائیل نے کہا ہے کہ سیاسیات کا میدان متلون مزاج لوگوں کا مرغزار ہے لیکن مولانا موصوف نے خواہ مخواہ ایک نئی بحث کو چھیڑ دیا ہے جبکہ آپکو اسکا علم ہے کہ ابھی تک آپکی گذشتہ تحریریں کتابی صورت میں محفوظ ہیں جو آپکے اس دعویٰ کو باطل قرار دینے میں ممد ثابت ہو سکتی ہیں

مولانا موصوف نے اس خطبہ میں "مسلمانانِ ہند کیلئے ایک بنیادی سوال" کی ذیلی سرخی کے ماتحت اپنے خیالات کا اظہار ایک طویل بیان میں کیا ہے جسکا ملخص یہ ہے "تقریباً تیس برس ہوئے میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے اس مسئلہ پہ پہلی مرتبہ غور کرنیکی کوشش کی میں بہت جلد ایک آخری نتیجے پہ پہنچ گیا اور اسی نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہیں کھول دیں میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کیساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں اور اسکی رفتار سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے اسلئے ہمیں چاہیئے کہ دل سے شکوک اور خوف کے خیالات کو نکالکر ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اُٹھاتے بڑھتے جائیں میں اپنے ہم مذہبوں سے اپیل کرتا ہوں کہ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے ہم وقتی جذبات کی رَو میں بہ کر طے نہیں کر سکتے ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہے مگر انہیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیئے وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملہ پہ غور کریں وہ اسکے سوا کوئی راہِ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔"

بقول مولانا یہ تیس سال کے سوچ بچار کا نتیجہ ہے لیکن افسوس ہے کہ مولانا موصوف اپنے اُن خیالات کو بھول گئے جنکا اظہار ان تیس سالوں کے دوران میں ۱۹۲۱ء میں آپنے جمعیۃ العلماء کے صدارتی خطبہ میں کیا تھا

"حضرات علمائے کرام و ارکانِ جمعیۃ۔ اسوقت ایک نئی آزمائش ہمارے طریقِ عمل کیلئے درپیش ہے مہینے مدتوں کا

غفلت کے بعد قومی و اجتماعی اعمال کی کشمکش میں قدم رکھا ہے اسلئے سب سے پہلے ہماری نظر آجکل کے مجلسی اور اجتماعی کاموں کے طرق و اسلوب پر پڑتی ہے اور تقلید و محاکات کا جذبہ بے اختیار اُنکی جانب کھینچنے لگتا ہے لیکن میں آپکو یاد دلاؤنگا کہ آپکی راہ ان سب راہوں سے بالکل الگ ہے اور کتاب اللہ کی ہدایت اور حکمتِ نبوت کی سنت نے آپکو دنیا اور دنیا والوں کے تمام ٹھہرے ہوئے طریقوں اور قاعدوں سے مستغنی کر دیا ہے آپ اسلئے نہیں آئے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے طریقوں کی تقلید کریں بلکہ آپکو علم و شریعت اسلئے دیا گیا ہے تاکہ دنیا کی آنکھیں آپکی طرف اُمید و مطلب سے اُٹھیں اور آپکی ہدایت اُن کیلئے اتباع و تقلید کا پیام ہو آپکے پاس اللہ کی کتاب ہے اور اسکے رسول کی سُنت ہے اور ان دو چیزوں سے بڑھ کر اور کونسا مبدء علم اور سرچشمہ حکمت ہو سکتا ہے جو انسانی اعمال کے تمام اصول و فروع کیلئے دنیا میں وجود رکھتا ہو دنیا میں علم و یقین صرف وحی الٰہی اور علوم و اعمالِ نبوت ہیں اسکے سوا علم و یقین اس آسمان کے نیچے موجود نہیں"۔

قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ ان دونوں تحریروں کو بغور پڑھیں اور خود بھی اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ مولانا ابوالکلام کے خیالات میں کسقدر تضاد پایا جاتا ہے دونوں وقتوں میں آپکے نزدیک غبار آلود فضا اور نازک وقت ہے لیکن ایک وقت تو اسکے سوا کوئی راہِ عمل سامنے نظر نہیں آتی کہ ہم ہندوؤں کیساتھ جس کشتی میں سوار ہیں انہی کیساتھ اور انہی میں سے ایک ملاح کی مدد اور رہنمائی لے کر اس منزلِ مقصود پر پہنچنے کی کوشش کریں جو اُنھوں نے متعین کی ہے اور یہ مولانا موصوف کے تیس سالہ تدبر و تفکر کا نتیجہ ہے جو انھوں نے ہندستانی مسلمان ہونیکی حیثیت سے کیا لیکن اسی دوران میں دوسرے وقت وہ اس جامہ کو اتار کر جب جمعیۃ العلماء کے سٹیج پر آتے ہیں تو آپکو اپنی راہ دوسرے مجلسی اور اجتماعی اداروں سے بالکل الگ تھلگ نظر آتی ہے اور وہ راہ کونسی ہے؟ کتاب اللہ کی ہدایت اور حکمتِ نبوت کی سُنت اور دنیا اور دنیا والوں کے ٹھہرے ہوئے طریقوں اور قاعدوں سے آپکو نفرت ہو جاتی ہے اور دنیا کی رہنمائی کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے

ہندستان کی متحدہ قومیت کا راگ الاپتے ہوئے آپ نے اپنے اس صدارتی خطبہ میں فرمایا ہے "میں مسلمان ہوں اور فخر کیساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں ..... لیکن ان تمام احساسات کیساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کیساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں میں ہندستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں ... مسلمان اور ہندو گنگا اور جمنا کی دھاروں کی طرح پہلے الگ الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا"۔

لیکن یہ سالہ موسوم "مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب" میں بھی مولانا موصوف کے خیالات اسی موضوع پر ملاحظہ فرمایئے کہ لسین نگی کی حقیقت نے آپ پر کیا راز منکشف کیا اور اسلام کی روح نے آپکی کیا رہنمائی کی اور اس ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا اس میں کیا حشر ہوتا ہے۔

"اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو جاہلیت اور حیات جاہلی سے تعبیر کیا ہے"

"قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی اسلئے ہیں تاکہ انکے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو"۔

"پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اسکی موت جاہلیت کی موت ہوگی اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپکو مسلمان سمجھتا ہو"

اب بتایئے مولانا موصوف ہی کے اس بیان کیمطابق ہندوستان کی اس ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کے جواز میں کیا فتویٰ دیا جا سکتا ہے جسکا عملی عنصر ہونا تو درکنار آپ اسوقت امام ہیں تو ایسے شخص کیلئے جو اسلامی جماعت سے کٹ کر ایک غیر اسلامی جماعت کی امامت قبول کرے مولانا موصوف ہی کے لفظوں میں اسکی کیا سزا ہے قارئین کرام اوپر کا بیان پڑھ کر خود اسکو تجویز کر سکتے ہیں۔

اسکے علاوہ ۱۹۲۱ء کا خطبۂ صدارت جو آپنے جمعیۃ العلماء میں پڑھا تھا اس میں بھی انہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"حضرات! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کروں جسکو میں علیٰ وجہ البصیرت آج تمام اعمال اسلامیہ کیلئے بمنزلہ اساس و اصل کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ برس کے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بغیر اسکے کبھی عقدہ کا حل نہیں ہو سکتا میرا اشارہ مسئلہ نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمال حیات کیلئے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں بھی متفرق اور الگ الگ نہ ہوں یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں جابجا اجتماع پر زور دیا ہے اور کفر و شرک کے بعد کسی بدعملی سے بھی اس قدر اصرار اور تاکید کیساتھ نہیں روکا، عقیدۂ توحید سے لیکر تمام عبادات و اعمال تک یہی حقیقت مرکزی جلوہ طرازی کر رہی ہے"۔

یہ بارہ برس کے غور و فکر کا نتیجہ ہے اور وہ بیس برس کے غور و فکر کا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ شوق امارت ہی ان تمام

(باقی بر صفحہ ۹۰)

الجہاد فی الاسلام

مدافعانہ جنگ

(از جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور)

(۶)

حفاظتِ امن دشمنوں کی ایک اور قسم وہ ہے جو دارالاسلام کے اندر رہ کر یا باہر سے آکر اس میں فساد پھیلاتی ہے ڈاکے ڈالتی اور قتل و غارت کا بازار گرم کرتی ہے اور امن و امان میں خلل برپا کرتی ہے۔ ان کے متعلق قرآن مجید میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ:-

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْۤا اَوْ یُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵:۵)	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں۔ اور زمین میں لوٹ مار سے فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا صلیب پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں۔ یا وہ زمین سے نکال دیئے جائیں (خواہ قید کی صورت میں خواہ اخراج کی صورت میں)، یہ رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے۔ اور (اس کے علاوہ) آخرت میں بھی ان کے لئے بڑا عذاب ہے سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پہلے کہ تم ان پر قدرت پاؤ (یعنی گرفتار کرو) توبہ کریں تو جان لو کہ اللہ

بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں یحاربون اللہ و رسولہ کے الفاظ سے جہلا کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن سے مسلمانوں کی باقاعدہ لڑائی ہو۔ لیکن دراصل خدا اور رسول کے ساتھ محاربہ کرنے سے مراد وہی سعی فساد فی الارض ہے جس کا ذکر تشریح کے طور پر اس فقرہ کے بعد ہی کیا گیا ہے۔ یہ آیت جس موقع پر اُتری تھی اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم فسادیوں اور امن و آئین کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے لئے ہے، چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو کر مدینہ میں رہنے لگے۔ مگر وہاں کی آب و ہوا انہیں موافق نہ آئی۔ اور وہ بیمار پڑ گئے۔ (ایک روایت کے مطابق ان کے رنگ زرد پڑ گئے۔ اور پیٹ بڑھ گئے تھے) اس لئے آنحضرت صلعم نے ان سے فرمایا۔ لو خرجتم الی ذودلنا فشربتم من البانہا و ابوالہا۔ اگر تم ہمارے اونٹوں میں جاکر رہو۔ اور ان کے دودھ اور دوا کے طور پر اُن کے پیشاب پیو تو تمہاری صحت درست ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ مدینہ سے باہر اونٹوں کی چراگاہوں میں پہنچے۔ اور جب آرام ہو گیا تو رسول اللہ کے چرواہوں کو قتل کر کے اونٹوں کو ہانک لے گئے۔ اور اسلام سے پھر گئے۔ ان کی اس حرکت کی جب آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے لوگوں کو بھیج کر انہیں پکڑ منگایا، ان کے ہاتھ پاؤں کٹوائے۔ ان کی آنکھیں نکلوائیں۔ اور انہیں دھوپ میں چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ صحیح بخاری میں بھی مختلف طریقوں سے اسی مضمون کی روایتیں درج ہیں۔ اور امام علیہ الرحمہ نے ان کو قول اللہ عز وجل انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ الآیہ کے زیر عنوان درج کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کے حوالہ سے آنکھیں اندھی کرانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ کے چرواہوں کی آنکھیں سلائی پھیر کر پھوڑ دی تھیں۔ اس لئے آپ نے ان سے آنکھوں کا قصاص لیا تھا۔ ابو داؤد اور نسائی میں ابو الزناد کے طریقہ سے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ یہ آیت انہیں عرنیوں کے باب میں نازل ہوئی تھی۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ کا بھی یہی بیان ہے، اگرچہ علمائے مجتہدین

کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ یہ آیت ان عرینہ والوں کے حق میں نہیں اتری۔ لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ عبرتناک سزائیں جو تجویز کی گئی ہیں۔ یہ انہیں لوگوں کے لئے ہیں جو دارالاسلام کے امن میں لوٹ مار اور قتل و غارت سے خلل برپا کریں۔ اور سزاؤں کے مختلف مدارج نوعیتِ جرم کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تفصیل فقہائے اعلام نے بوضاحت بیان فرمائی ہے۔

مظلوم مسلمانوں کی حمایت

مدافعانہ جنگ کی ایک اور صورت جس میں مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اپنی کمزوری و بیچارگی کے باعث دشمنوں کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے۔ اور اس میں اتنی قوت نہ ہو کہ اپنے آپ کو چھڑا سکے۔ ایسی حالت میں دوسرے مسلمانوں پر جو آزاد ہوں اور جنگ کی قوّت رکھتے ہوں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اُسے اس ظلم سے نجات دلانے کے لئے جنگ کریں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ:-

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا (۱۰:۴)	اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے جنگ نہیں کرتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کسی کو ولی اور اپنی ہی طرف سے کسی کو مددگار بنا۔

دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ اس اعانت کی ضرورت بیان کی ہے اور اس طرح اس کی تاکید فرمائی ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ	جو لوگ ایمان تو لارہے ہیں مگر دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام میں نہیں آئے ان کی ولایت کا کوئی تعلق تم سے نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ البتہ اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے بسوائے اس صورت کے جبکہ وہ ایسی قوم کے خلاف مدد مانگیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ (اور حدود الٰہی کا خیال رکھو

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (۸: ۱۰)

کیونکہ) اللہ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اسے خوب دیکھتا ہے۔ جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے ولی و مددگار ہیں پس اگر تم (مسلمانوں کی مدد) نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا۔

اس آیت مبارکہ میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کے تعلقات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ پہلے وما لکم من ولایتھم من شئی سے یہ بتایا گیا ہے کہ جو مسلمان دارالکفر میں رہنا قبول کرلیں یا رہنے پر مجبور رہوں ان سے دارالاسلام کے مسلمانوں کے تمدنی تعلقات نہیں رہ سکتے یعنی نہ وہ باہم رشتہ قائم کر سکتے ہیں نہ انہیں ایک دوسرے کا ورثہ یا ترکہ مل سکتا ہے۔ نہ فے اور غنیمت سے ان کو کوئی حصہ پہنچ سکتا ہے۔ اور نہ صدقات کے مصارف میں وہ داخل ہو سکتے ہیں لیکن ولایت کے یہ تمام تعلقات منقطع کر دینے کے باوجود ایک تعلق یعنی نصرت و مددگاری کا تعلق پھر بھی منقطع نہیں کیا اور وان استنصروکم فی الدین سے صاف طور پر بتلا دیا کہ یہ نصرت کا تعلق دین کے ساتھ قائم ہے جب تک کوئی شخص مسلمان ہے خواہ وہ دنیا کے کسی کونہ میں ہو اس سے مسلمانوں کا تعلق نصرت و مددگاری کسی حال میں منقطع نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس کے دین کو کوئی خطرہ ہو یا اس پر ظلم ہو اور وہ دینی رشتہ کا واسطہ دے کر مدد مانگے۔ تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس کی مدد کو پہنچیں بشرطیکہ جس کے خلاف مدد مانگی گئی ہو اس سے مسلمانوں کا معاہدہ نہ ہو۔ کیونکہ معاہدہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے لئے عہد کی پابندی اپنے مسلمان بھائی کی مدد سے زیادہ ضروری ہے اور ان کے لئے جائز نہیں ہے کہ معاہدہ کی مدت منقضی ہونے سے پہلے اس کی مدد کریں۔ یہ حکم بیان کرنے کے بعد اس نصرت و اعانت کی ضرورت جتائی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ دیکھو یہ کفار اسلام کے مٹانے میں ایک دوسرے کی کیسے مدد کرتے ہیں۔ اور اپنی آپس کی مخالفتوں اور دشمنیوں کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں کس طرح ایک ہو جاتے ہیں۔ پس اگر تم بھی دینی رشتہ کو ملحوظ رکھ کر آپس میں ایک دوسرے کے مددگار نہ ہو تو زمین میں کیسا فتنہ و فساد عظیم برپا ہو۔ فتنہ کا لفظ جیسا کہ آگے چل کر ہم بتشریح بیان کریں گے، قرآنی اصطلاح

میں غلبۂ کفر اور پیروانِ دین حق کے مبتلائے مصیبت و ذلت ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی طرح فساد بھی ہدایت پر ضلالت کے غالب ہونے اور نیکی و صلاح کار کے مٹ جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی کسی جماعت کے مٹائے جانے یا اس کے راہِ حق سے بھٹکا دیئے جانے کو فتنہ و فساد سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کو مسلمانوں کا فرض قرار دیتا ہے۔

دفاع کی غرض وغائت

اب دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں۔ ایک غائر نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں، اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے۔ خواہ باہر سے خواہ اندر سے، اس کا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں۔ اللہ کو مسلمانوں سے جو خدمت لینی ہے اس کے لیے اولین ضرورت ان کا فتنوں اور رخنشوں سے محفوظ رہنا اور ان کی دینی و سیاسی طاقت کا مضبوط رہنا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مٹنے سے نہ بچائیں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کی فتنہ پردازیوں سے غفلت برت کر اپنے تئیں ان قومی امراض کا شکار ہو جانے دیں جنہوں نے اگلی ظالم قوموں کو ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی میں مبتلا کیا تو ظاہر ہے کہ وہ صرف خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہ ڈالیں گے، بلکہ انسانیت کی اس خدمت عظیم کو انجام دینے کے قابل نہ رہیں گے۔ جس کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور یہاں کا صرف اپنے اوپر نہیں بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا پس ان کو کھول کھول کر نہایت وضاحت کے ساتھ ان دشمنوں کے نشانات بتائے گئے ہیں جو ان کی بربادی کا موجب بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں، اور ایک ایک کا دھڑ توڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ وہ دُنیا سے ہدایت کے نور کو مٹانے اور عالمگیر اصلاح کے کام میں روک پیدا کرنے کے قابل نہ رہیں۔ پھر اس کے لئے صرف اسی وقت تلوار اُٹھانے کی ہدایت نہیں کی گئی جبکہ بدی اپنا سر نکالے۔ اور فتنہ پردازی شروع کر دے، بلکہ اس کے مقابلہ پہ ہر وقت کمربستہ و مستعد رہنے

کی تاکید کی گئی ہے۔ تاکہ اسے سر نکالنے کی جرأت ہی نہ رہے، اور اس پر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اس کا دف اندر ہی اندر مرجائے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ	اور ان کے مقابلہ کے لئے جس قدر تمہارے امکان میں ہو
مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ	سامانِ جنگ اور ہمیشہ محافظت کرنے والے گھوڑے (یعنی
بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ	سوار) مستعد رکھو اس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن اور
مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ	ان کے سوا دوسرے اعدا کو جنہیں تم نہیں جانتے۔ مگر اللہ انہیں
يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ	جانتا ہے۔ مرعوب وخوف زدہ کردو گے۔ اس کام میں جو کچھ تم
سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ	فی سبیل اللہ خرچ کرو گے وہ تمہیں دُنیا میں امن وامان اور
لَا تُظْلَمُوْنَ ۔	ترقیِ اسلام کی صورت میں اور آخرت میں خوشنودیِ الٰہی کی صورت
(۸:۶۰)	میں، پورا کا پورا واپس مل جائے گا۔ اور تم پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہ آیت بتلاتی ہے کہ مسلمانوں کی جنگی ضروریات کے لئے اس قسم کی عارضی فوج ردیف (MILITIA) کافی نہیں ہوسکتی جو خاص ضرورت کے موقع پر جمع کی جائے اور ضرورت رفع ہونے کے بعد منتشر کردی جائے بلکہ انہیں مستقل فوج مرابط (STANDING ARMOY) رکھنی چاہیے جو ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس رہے۔ اس کے الفاظ پر غور کرنے سے عجیب عجیب معانی ظاہر ہوتے ہیں۔ سامانِ جنگ کی نوعیت کو صرف لفظ قوۃ سے بیان کیا جو پہلی صدی ہجری کے تیروں اور دبابوں پر، چودھویں صدی کی توپوں، ہوائی جہازوں اور آبدوز کشتیوں پر اور اس کے بعد آنے والی صدیوں کی بہترین حربی اختراعات پر یکساں حاوی ہے۔ ما استطعتم کے لفظ نے قوۃ کی کمیت کو مسلمانوں کی قدرت واستطاعت پر موقوف کردیا یعنی اگر وہ ایک فوجِ گراں مہیا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں تو ان کو وہی کرنی چاہیے۔

لیکن اگر ان میں اتنی قوت نہ ہو۔ اور وہ بڑی بڑی توپیں، بڑے بڑے جنگی جہاز، بڑے بڑے مہلک آلاتِ جنگ حاصل نہ کرسکیں تو ان سے یہ فرض ساقط نہیں ہوجاتا۔ بلکہ انہیں ہر اس وسیلہ جنگ کو اختیار کرنا چاہیئے۔ جو دشمنانِ حق سے مقابلہ کرنے میں کام آسکے، اور جسے حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ممکن ہو پھر "رباط الخیل" کے مستعد رکھنے کی مصلحت بتلاتے ہوئے ترھبون عدو اللہ و عدوکم کے بعد وآخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم کے الفاظ جو فرمائے ان میں سیاست کا یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی فوجی طاقت کو مضبوط رکھتی ہے تو اس سے صرف یہی فائدہ نہیں ہوتا کہ جو طاقتیں اس کی علانیہ دشمن ہوں وہ اس سے مرعوب وخوف زدہ رہتی ہیں، بلکہ رفتہ رفتہ لوگوں پر اس کی ایسی دھاک جم جاتی ہے کہ اس کے ساتھ دشمنی کرنے کا خیال بھی دلوں میں نہیں آتا۔ اور وہ سرکش قوتیں جو اسے کمزور اور غافل دیکھ کر حملہ کردینے میں ذرا تامل نہ کریں، اس کی اس طرح مطیع اور دوست بنی رہتی ہیں کہ اسے ان کی طبیعت میں چھپی ہوئی سرکشی کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اس کے بعد علم الاقتصاد کی اس حقیقت کو ذہن نشین کیا ہے۔ کہ اس حفظ ماتقدم کی تیاری میں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اسے یہ نہ سمجھو کہ وہ تم سے ہمیشہ کے لئے ضائع ہوگیا اور اس کے فوائد سے تم محروم ہوگئے۔ بلکہ درحقیقت وہ تمہیں واپس ملتا ہے اور اس صورت میں واپس ملتا ہے کہ تم پر ظلم نہیں ہوسکتا۔ اور ظلم سے محفوظ رہنے کی صورت میں تمہیں پُرامن زندگی کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یوف الیکم وانتم لا تظلمون میں دُنیا و آخرت دونوں میں فوائد حاصل ہونے اور دونوں میں ظلم سے بچے رہنے کا وعدہ مضمر ہے۔ اور درحقیقت اس جملہ سے دونوں مقصود ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کے دین کی بہتری وہی ہے جو دُنیا کی بہتری ہے، اور ان کی دُنیا کی بدتری وہی ہے جس کا نتیجہ دین کی بدتری ہے +

(بقیہ از صفحہ ۲۰)

"...... ہماری کامیابی کا انحصار تین چیزوں پر ہے اتحاد، ڈسپلن DISCIPLINE اور گاندھی جی کی رہنمائی پر اعتماد"

اور اسکے برخلاف ۱۹۲۱ء کے جمعیۃ العلماء کا خطبہ صدارت[1] قرآن مجید کی اس آیت پر ختم کیا تھا۔ "یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ...... الخ (سورہ آل عمران)" "اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنا دلی دوست اور راز دار ہمدم نہ بناؤ وہ تمہاری تباہی میں کوئی کمی کرنیوالے نہیں جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے انہیں وہی اچھی لگتی ہے انکی دشمنی تو انکی باتوں سے ہی ظاہر ہے لیکن جو کچھ انکے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو ہمنے فہم و بصیرت کی نشانیاں تم پر واضح کر دیں دیکھو! تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم ان سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تمہیں (ایک لمحہ کیلئے بھی) دوست نہیں رکھتے تم اللہ کی کتاب پر ایمان رکھنے والے ہو جتنی کتابیں بھی نازل ہوئی ہیں (لیکن) وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف جوش غضب میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں (غور کرو ایسے لوگوں کو اپنا ہمراز بنانا اور قوم کے بھیدوں اور تدبیروں سے آگاہ کر دینا کیونکر جائز ہو سکتا ہے) تم ان سے کہدو کہ (جاؤ) اور جوش غضب میں اپنے آپکو ہلاک کر ڈالو۔ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو انسان کے سینہ میں پوشیدہ ہوتا ہے اگر تمہارے لئے کوئی بہتری کی صورت ہو جائے تو وہ انہیں بری لگتی ہے اور اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچے تو وہ بڑے ہی خوش ہوتے ہیں (چنانچہ وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی تدبیروں میں برابر لگے رہتے ہیں) لیکن یاد رکھو اگر تم مصائب و مشکلات میں ثابت قدم رہے اور تقویٰ کی راہ اختیار کی تو انکا مکر و فریب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا جیسے کچھ بھی انکے کرتوت ہیں خدا کی قدرت انہیں گھیرے ہوئے ہے۔"

اب قابل غور یہ امر ہے کہ ان دونوں میں سے مسلمانوں کے لئے قدرت کا کونسا فیصلہ ہے جس پر انہیں رضامند ہونا چاہئیے مولانا موصوف کے خطبے مولانا موصوف کا وہ ارشاد جو کانگرس کے اس صدارتی خطبے کے خاتمے پر ہے یا وہ آیت جو جمعیۃ العلماء کے صدارتی خطبہ کے خاتمہ پر مولانا موصوف نے ارشاد فرمائی تھی چونکہ آخری فیصلے کو پہلے کے فیصلے پر حق فائق ہوتا ہے اسلئے مولانا موصوف کے نزدیک تو مسلمانوں کی قسمت پر یہ مہر لگ چکی ہے کہ انکا شمار ہندوستان کی متحدہ قومیت میں ہوگا اور جو حال یہاں کے ہندوؤں کا ہوگا وہی انکا ہوگا مگر چونکہ مسلمانوں کا خدا اور اسکے رسول حضرت محمد صلعم اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان ہے اسلئے وہ اس آیت کے ایک ایک شوشے کا جان و دل سے احترام کرتے ہیں اور اپنے لئے اسی کے فیصلہ کو تمام فیصلوں سے زیادہ صحیح اور قابل عمل سمجھتے ہیں

میرا خیال تھا کہ اسی صحبت میں مسلم لیگ کے خطبہ صدارت پر بھی رائے زنی کرونگا لیکن رسالے کی ضخامت اسکی متحمل نہیں ہو سکتی اسلئے اشاعت آیندہ میں اس فرض کو سرانجام دوں گا۔ ایڈیٹر

---

[1] تشریحی اضافہ از مولانا ابوالکلام آزاد،

مقالات

اسرارِ خودی

تسخیرِ کائنات اور خودی

(غلام سرور نگار)

(۴)

از محبت چوں خودی محکم شود | قوتش فرمانده عالم شود
پنجهٔ او پنجهٔ حق می شود | ماه از انگشتِ اُو شق می شود
در خصوماتِ جہاں گردد حکم | تابعِ فرمانِ اُو دارا و جم

اس سے پہلے یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے کہ دُنیا کی ہر چیز میں خودی موجود ہے یہ دوسری بات ہے کہ موجودات میں عدم قوتِ شعور یا کمی و بیشیِ قوتِ شعور کی وجہ سے خودی کو اپنی نمود کے موقعے یا تو ملتے ہی نہیں اور اگر ملتے بھی ہیں تو اُن کی پائداری کا تمام تر انحصار اُس شئے کی قوتِ شعور پر ہوتا ہے جو خودی کی حامل ہوتی ہے لیکن انسان کے وجود میں آکر خودی کو اپنے شعور کا بہترین موقعہ ملتا ہے اگرچہ شیطان بھی خودی کا مظہر اتم ہے لیکن شیطان اور انسان میں یہی ایک فرق ہے کہ وہاں خودی متمردانہ پہلو اختیار کر لیتی ہے اور یہاں اس کا جوہر آرزو و جستجو اور عشق و محبت کے دامن میں تربیت پا کر تمام کائنات کو مسخر کر لیتا ہے صوفیائے کرام نے خودی کے مسئلہ میں یہی غلطی کھائی کہ وہ شیطانی خودی اور انسانی خودی میں حدِ فاصل

مقرر نہ کر سکے اور اُن کی نگاہیں اس باریک مگر اہم مسئلہ کی تہ تک نہ پہنچ سکیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُنہوں نے خودی کے خلاف بلا امتیازِ خیر و شر فتویٰ دے دیا اور اسلام کو بھی نفیِ خودی کے رنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اسلام کے نام لیواؤں میں کروڑوں تک کی تعداد میں اضافہ ہونے کے باوجود روحِ اسلام کی عالمگیر گرفت رفتہ رفتہ ڈھیلی پڑتی گئی اور مسلمانوں کا شیرازۂ ہستی اس طرح منتشر ہو کر رہ گیا کہ دنیا میں نہ اُن کی خلافت رہی اور نہ مذہب مسلمانوں کی اس عالمگیر تباہی کے اسباب کو اگر نہیں سمجھے تو وہ صوفیائے کرام اور آئمۂ دین جنہوں نے خودی کے وجود کو اسلامی تعلیمات کے قطعاً منافی قرار دیا۔

اقبالؒ کے نزدیک اسلام کی روح کا انحصار ہی نورِ خودی اور نارِ خودی پر ہے اور یہ شیطانی خودی سے اِن معنوں میں مختلف ہے کہ وہ عشق و محبت سے قطعاً عاری ہے اور یہ جب عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو انسانی زندگی کو اپنے عالمِ وجود میں آنے کے حقیقی منشا کو پورا کرنے کا موقعہ ملتا ہے اور وہ حقیقی منشا کیا ہے؟ تسخیرِ کائنات ـــــــ یعنی نظامِ عالم کے تمام مخفی اور ظاہری قوےٰ کو انسان اپنے تصرّف میں لے آتا ہے جب اسے یہ قوّت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ بلا شرکتِ غیرے دُنیا پر حکومت کرتا ہے، زمین و آسمان رات دن اس کے آستانہ پر سربسجود رہتے ہیں اور قوانینِ قدرت کا مدار اُس کی رضامندی پر ہوتا ہے دراصل نیابتِ الٰہیہ کا یہی مفہوم ہے جس کو اقبالؒ نے اپنے اِس انسانی تصوّرِ خودی میں پیش کیا ہے اور اسلامی تعلیمات کو اس کا حامل قرار دیا ہے آپ کے خیال میں جب تک انسان کے اندر خودی نہ ہو اور وہ خودی عشق و محبت سے مستحکم نہ ہو وہ نیابتِ الٰہیہ کے فرائض کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ لیکن جب اُس کی رگ و پے میں یہ قوّت سرایت کر جاتی ہے تو اس کے تمام جسم میں ایک فوق العادت کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور چونکہ خودی انسان کو خدا سے قریب تر کر دیتی ہے اسلئے وہ اُن خصائص کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جو شانِ کبریائی کا جُزو ہوتے ہیں۔

حضرت محمد صلعم کے وجود مبارک میں خودی نے اپنے اُس منتہائے مقصود کو پا لیا تھا جس کے لئے وہ اس سے قبل ہزاروں پیغمبروں کے وجود میں یکے بعد دیگرے گشت لگاتی رہی لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری اور آخر حضرت محمد صلعم کے وجود مبارک میں خودی کو اپنا شعور اس حد تک حاصل ہؤا کہ خدا کو انہیں خاتم النبیین کہنا پڑا۔ دوسرے لفظوں میں اس کے بعد خودی کو دُنیا میں کوئی ایسی مکمل اور جامع شخصیت نہیں ملے گی جو حق کو اس طرح اپنے اندر جذب کرلے کہ حق خود یہ کہنے پر مجبور ہوجائے کہ جس نے حضرت محمد صلعم کے ہاتھ پر بیعت کی اُس نے میرے ہاتھ پر بیعت کی اور جس کی انگلی میں تسخیر فطرت کی وہ قوت تھی کہ اشارہ کرتے ہی چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے بادشاہ تو صرف اپنی اپنی سلطنتوں کے اندر ہی حاکم مجاز ہوتے ہیں اور اُن کی اطاعت و فرمانبرداری کا سکّہ رواں ہوجاتا ہے لیکن جس شخص کی خودی عشق سے مستحکم ہوجاتی ہے وہ تمام روئے زمین کا شہنشاہ کہلاتا ہے اور دُنیا کے بڑے بڑے بادشاہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور اس کو اپنے باہمی نزاعات میں حَکَم مانتے ہیں جیسے کہ حضرت محمد صلعم تھے جو نہ صرف روئے زمین کے شہنشاہ تھے بلکہ دونوں جہاں کے شہنشاہ تھے

با تو می گویم حدیثِ بوعلیؒ در سوادِ ہند نام اُو جلی

ایسی شخصیتوں میں سے اقبالؒ حضرت بوعلی قلندرؒ کے ایک واقعہ کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ایک بوریا نشین فقیر کے خوف سے ایک شہنشاہِ وقت پر کس طرح لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت بوعلی قلندرؒ کا ایک مریدِ خاص کسی ضرورت سے بازار گیا۔ جب وہ بازار میں جا رہا تھا تو اس کے عقب میں حاکمِ شہر بھی اپنے خادموں اور چوبداروں کے ہمراہ آرہا تھا جلودار نے اس کو آگے آگے جاتے دیکھ کر آواز دی "ارے بے وقوف! راستہ چھوڑدے" لیکن وہ درویش عالمِ محویت میں تھا اس لئے جلودار کی آواز سے اُس کے کان پر جوں بھی نہ چلی اس پر ایک چوبدار نے آگے بڑھ کر درویش کے سر پر لکڑی دے ماری۔ درویش نے جا کر حضرت بوعلی قلندرؒ کے

حضور میں اس کی فریاد کی اور رویا۔ حضرت بو علی قلندرؒ کو بڑا غصہ آیا اور اپنے منشی کو حکم دیا کہ ایک فقیر کی طرف سے شہنشاہِ وقت (جہانگیر) کو حکمنامہ لکھے اور تمام واقعہ تحریر کرنے کے بعد اُس کو تاکید کی جائے کہ ایسے حاکم کو سزا دی جائے جس کے چوبدار سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے ورنہ اُس کی سلطنت چھین کر کسی دوسرے کو شہنشاہ بنا دیا جائے گا۔ جب یہ حکمنامہ جہانگیر کے پاس پہنچا تو پڑھتے ہی خوف کے مارے اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ اس حاکم کو فوراً طلب کیا اور قید خانے میں ڈال دیا اور حضرت بو علی قلندرؒ سے عذرِ تقصیر کی۔ حضرت امیر خسروؒ کو بطور سفیر حضور اقدس میں بھیجا انہوں نے جب حضرت بو علی قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک نغمۂ دلفروز سُنایا تو فقیر کا تمام غصہ فرو ہو گیا۔

یہ ہے اس خودی کا اثر جو عشق کی پروردہ ہوتی ہے۔ دیکھا ایک فقیر کی معمولی سی تہدید نے ایک شہنشاہِ وقت کے ایوانِ جاہ و عظمت میں کس طرح تہلکہ مچا دیا تھا اور اُسے اپنے قصور کی عذر خواہی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نظر نہ آئی۔ یہ فقر کے معجزات کا ایک ادنےٰ سا پہلو ہے لیکن اس سے فقر اور سلطانی کے مابین ایک امتیازی فرق کا پتہ چلتا ہے۔ فقر خودی کی قاہری کا وہ مقام ہے جہاں عشق فقیر کو ظلِ سبحانی بنا دیتا ہے اور اس کے قلب و نگاہ میں وہ بے پناہ قوت آجاتی ہے کہ عالم کن و بیان اور نوامیسِ جہاں دونوں پر وہ حکمرانی کرتا ہے۔

نفی خودی کی اختراع

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اثباتی خودی ایسی مفید چیز کو ترک کر کے اس کی ضرورت کس کو محسوس ہوئی کہ نفی خودی ایسی غیر مفید چیز کی اختراع کرے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ یہ اُن قوموں کی اختراع ہے جو مغلوب ہو گئی تھیں۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ غالب قوموں نے انہیں مغلوب کر لیا ہے اور اب اُن میں مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی تو اُن کے ذہن میں یہ بات آئی کہ تعلیم و تدریس کے ذریعہ غالب قوموں

کے اخلاق میں تبدیلی کرنی چاہئے تاکہ اُن کی جنگجویانہ روح ہی ختم ہو جائے اور لشکر کشی کا جذبہ ہی فنا ہو جائے اور غالب و مغلوب دونوں ایک سطح پر آجائیں۔ اس سلسلہ میں اقبالؒ نے بھیڑوں اور شیروں کے ایک قصے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک چراگاہ خوب ہری بھری تھی اس وجہ سے وہاں پر بھیڑوں کے ریوڑ کے ریوڑ چرنے کے لئے آتے تھے اور نہایت بے فکری سے چرتے تھے آخر کار بھیڑوں کی بدقسمتی دیکھئے کہ شیروں نے اُن کو تاکا اور اُن پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔

جذب و استیلا شعارِ قوّت است　　　فتح رازِ آشکارِ قوّت است

شیر قوی تھے اور قوّت کا یہ خاصہ ہے کہ ہر کمزور کو دبالے اور اس کو اپنا مطیع و منقاد بنالے اس لئے شیروں نے اپنی قوّت کے بل پر جنگل میں کوس من الملک بجایا، اور کمزور بھیڑوں کو اس آزادی اور فارغ البالی سے محروم کر دیا جو انہیں اس سے پہلے حاصل تھی یہاں تک کہ تمام چراگاہ بھیڑوں کے خون سے رنگین ہو گئی۔ جب شیروں کے ظلم وستم کی کوئی حد نہ رہی اور بھیڑوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو ایک بوڑھی اور تجربہ کار بھیڑ نے دوسری بھیڑوں کو سمجھایا کہ اس طرح تقدیر کی شکوہ سنجی اور قسمت کی مرثیہ خوانی سے کچھ کام نہیں چلے گا بلکہ اس طوفانِ عظیم کے روک تھام کی تدابیر سوچنی چاہئیں کیونکہ کمزور آدمیوں پر جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ اپنی عقل کی شاطری سے بہانہ سازیاں کرتے ہیں اور داؤ پیچ سے کام لیتے ہیں۔

بہرِ حفظِ خویش مردِ ناتواں　　　حیلہ ہا جوید ز عقلِ کارداں
در غلامی از پئے دفعِ ضرر　　　قوّتِ تدبیر گردد تیز تر
پختہ چوں گردد جنونِ انتقام　　　فتنہ اندیشی کند عقلِ غلام

اقبالؒ نے یہاں نفسیاتِ غلامی کے ایک بے حد اہم مسئلے کی جانب اشارہ کیا ہے غلامی میں انسانوں کے اندر سے جب عسکری روح رخصت ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ قوّتِ فہم و تدبیر میں تیزی

آجاتی ہے اور غلام قوم اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے رات دن نئی نئی باتیں سوچتی رہتی ہے اور اُن کو بروئے کار لانے کے لئے موقع پیدا کرنے کی سعی کرتی رہتی ہے۔ جیسے کہ آج کل ہندوستان کی غلام قوموں میں سے ہندو نت نئی کرشمہ سازیوں سے اپنے مفاد کے تحفظ کا ڈھونگ رچاتے ہیں کبھی چرخہ، کبھی عدم تعاون اور کبھی عدم تشدد۔ یہ تمام حربے اُن اقوامِ مغلوبہ کا امتیازی کیرکٹر ہوتا ہے جن کے دل اور بازوؤں میں مقابلہ کی ہمت اور طاقت باقی نہیں رہتی جب اِن تدبیروں سے اُن کو کامیابی نظر نہیں آتی تو اُن کے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جس کو انسانی اخلاقِ فاضلہ کی فہرست سے قلمزد کر دیا گیا ہے وہ کونسا جذبہ ہے؟ جنونِ انتقام —— جب یہ جذبہ اُن کی گفتار و کردار کی انگیخت کا باعث بنتا ہے تو ملک میں ریشہ دوانیوں اور فتنہ پردازیوں کا ایک جال پھیل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اقوامِ غالبہ اس میں پھنس کر رہ جاتی ہیں

گفت با خود عقدہ ما مشکل است   قلزمِ غم ہائے ما بے ساحل است
میش نتواند بزور از شیر است   سیم ساعد ما و اُو پولاد دست

اس بوڑھی بھیڑ نے اپنے دل میں سوچا کہ جس مصیبت میں ہم گرفتار ہیں اس کی کوئی انتہا نہیں ہے بھیڑوں میں اتنی طاقت تو ہے نہیں کہ وہ مقابلہ میں کھڑے ہو کر شیروں کو نیچا دکھائیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ وعظ و تلقین سے بھیڑوں کی فطرت کو بھیڑیوں میں بدل دیا جائے اور اُن کے دل اور بازوؤں میں اتنی قوت پیدا کر دی جائے کہ وہ شیروں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں لیکن یہ قرینِ قیاس ضرور ہے کہ شیروں پر ایسا جادو پھونکا جائے کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہو جائیں۔

اس عزم کو دل میں پختہ کر کے وہ بھیڑ اپنے ریوڑ سے روانہ ہوئی جب وہ شیروں کے پاس پہنچی تو ملہمانہ انداز میں اس نے اُن خونخوار جانوروں کو اس طرح مخاطب کیا۔

"اے جنگجو اور کاذب قوم! تُو قیامت کے دن سے بے خبر ہے، مَیں روحانی قوت کی حامل ہوں

اور تمہارے پاس خدا کی طرف سے بھیجی گئی ہوں میں اندھوں کی آنکھوں کا نور ہوں۔ صاحب شریعت ہوں اور مامور من اللہ ہوں۔ تم کو لازم ہے کہ اپنے ناپسندیدہ عملوں سے توبہ کرو تم نقصان میں ہو، فائدے کی فکر کرو۔ سنو! جو کوئی بھی ننگ خور ہے وہ بدبخت ہے اگر زندگی کا استحکام چاہتے ہو تو اس کا راز نفیٔ خودی میں پوشیدہ ہے نیکوں کی روح گھاس پھوس سے اپنی غذا حاصل کرتی ہے اور گوشت کا تارک خدا کی نظروں میں مقبول ہوتا ہے دانتوں کی یہ تیزی تم کو دنیا میں رسوا اور تمہاری عقل کی آنکھوں کو اندھا کر دے گی۔ جنّت کے مستحق صرف ضعیف ہیں اور قوت میں سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہیں جاہ و جلال کی تلاش ایک فتنہ ہے اور تنگدستی امیری سے بہر نوع بہتر ہے، دانہ جب تک علیٰحدگی پر قانع رہتا ہے بجلی کی زد سے محفوظ رہتا ہے لیکن اگر خرمن میں آکر مل جائے تو یہ اس کے افلاسِ عقل کی دلیل ہے اگر تم عقلمند ہو تو صحرا بننے کی کبھی خواہش نہ کرو اور ذرّہ بن کر ہی زندگی بسر کرنے کو موجب فخر سمجھو کیونکہ اس صورت میں تم آفتاب کے نور سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہو۔ تم بھیڑوں کو ذبح کرکے اپنے جامہ میں پھولے نہیں سماتے اگر تم اپنی قدر و قیمت معلوم کرنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے اپنے آپ کو ذبح کرو کیونکہ جبر، قہر، انتقام اور اقتدار زندگی کی بنیادوں کو ناپائدار بنا دیتا ہے دیکھتے نہیں کہ سبزہ جتنا پامال ہوتا ہے زیادہ بڑھتا ہے اور بار بار اُگتا ہے اگر تم عقلمند ہو تو اپنے آپ سے غافل ہو جاؤ اور اگر اپنے آپ سے غافل نہیں ہو تو تمہاری دیوانگی میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ آنکھیں، کان اور لب بند کرو تاکہ تمہاری قوتِ فکر فلک رسا ہو۔ دُنیا کی یہ چراگاہ کچھ حقیقت نہیں رکھتی، اے نادانو! اس موہوم شئے پہ دل مت لگاؤ"۔

شیروں کا گروہ پہلے ہی لوٹ مار سے خستہ اور درماندہ تھا اور ان کے دلوں میں آرام طلبی جاگزیں ہو چکی تھی یہ خواب آور نصیحت اُن کے دل میں اُتر گئی اور اپنی خامکاری کی وجہ سے وہ بھیڑ کے دھوکے میں آگئے نتیجہ یہ نکلا کہ بھیڑوں کا شکار کرنے والوں نے خود بھی بھیڑوں کے مسلک کو اختیار کر لیا اور

گھاس پھوس اُن کی طبیعت کو بھا گئی یہاں تک کہ وہ جوہر فطرت جو شیروں کی زندگی کا امتیازی پہلو تھا اب خوف بن گیا۔ گھاس پھوس سے نہ اُن کے دانتوں کی وہ تیزی رہی اور نہ ان کی آنکھوں میں شرارے برسانے والی وہ ہیبت جس کو دیکھ کر دل لرز جاتے تھے اُن کا دل سینے میں مُردہ ہو گیا اور دل کے مردہ ہونے سے وہ خود بھی مُردہ ہو گئے نہ کوشش کامل کا وہ جنون رہا اور نہ تقاضائے عمل کی سرگرمی، اقتدار، عزم، استقلال، اعتبار، عزت اور اقبال تمام خصائص ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، آہنی پنجوں میں بالکل طاقت نہ رہی اور دل جسم میں اس طرح بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا جس طرح قبر میں مُردہ، جب جسمانی قوت گھٹی تو دل خوف سے لبریز ہو گیا اور خوف نے ہمت کے سرمایہ کو لوٹ لیا اور جب ہمت جواب دے چکی تو کوتہ دستی، بے دلی اور دُوں فطرتی ایسے سینکڑوں امراض پیدا ہو گئے۔

یہ اس بھیڑ کے پند و نصائح کا اثر تھا جس نے شیروں ایسے خونخوار جانوروں کو خود فراموشی کی نیند سُلا دیا اور وہ اپنی اس زوال پذیر حالت پر اتنا مطمئن ہو گئے کہ اِسی کو تہذیب شیراں کہنے لگ گئے۔

افلاطون اور ادبیات اسلامیہ

اقبالؒ کے نزدیک کسی قوم کی تاریخ فکر و عمل کی تعمیر و تخریب میں اس قوم کے ادیبوں اور اُن کے ادبی کارناموں کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے مختلف زمانوں میں تہذیب و تمدن کی ساخت و پرداخت میں اس زمانہ کے ادیبوں نے جو کارہائے نمایاں دکھائے ہیں تاریخ عالم اُس کی شاہد ہے جس قوم کو وہ خواب غفلت میں سُلانا چاہتے ہیں اُس کو میٹھی میٹھی لوریاں سُنانا شروع کر دیتے ہیں، نشاط انگیز اور کیف پرور نغموں سے اُس کے دل اور دماغ کو ماؤف کر دیتے ہیں اور اُس کی نگاہوں کے سامنے زندگی کا ایسا تصوّر پیش کرتے ہیں کہ وہ ایک محفل رقص و سرود بن کر رہ جاتی ہے اور جس قوم کی مخفی قوتوں سے وہ اس طرح کام لینا چاہتے ہیں کہ اُس سے دُنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہو وہ اپنے سوز نفس سے اُس میں ایک تازہ روح پھونک دیتے ہیں اور جوشیلی تحریروں اور شعلہ طراز رجزیات سے اُس کے جذبات کو اُبھارتے ہیں۔

اقبالؒ نے اس عنوان کے ماتحت افلاطونِ یونانی کے علاوہ خواجہ حافظ شیرازی پر بھی تنقید کی تھی لیکن ہندوستان کے کور ذوق صوفیوں اور اُن کے فدروانوں کی کج فہمی کی وجہ سے اقبالؒ کو اپنی مثنوی کا وہ حصّہ حذف کرنا پڑا جس کا تعلق براہِ راست خواجہ حافظؒ سے تھا حالانکہ یہ امر واقعہ ہے کہ اس طرح حذف کر دینے سے نفسِ مضمون میں کوئی فرق نہیں آیا در اصل یہ افلاطونِ یونانی کے خیالات کا ہی اثر ہے جو عجمیوں کے افکار و اعمال کو صدیوں سے محیط ہے اور خواجہ حافظؒ شیرازی کے اندر بھی افلاطونِ یونانی کی وہی روح کار فرما رہی جو اسلامی تصوّف کا لباس پہن کر اشعارِ دلپذیر کی صورت میں اربابِ ذوق کی محفلوں کو گرمانے کا باعث ہوئی ۔ اقبالؒ پہلا شخص نہیں ہے جس نے خواجہ حافظؒ کے اوپر یہ اعتراض کیا ہے ۔ شہنشاہ اورنگزیب نے تو اپنے عہد میں حافظؒ کا کلام پڑھنے کی حکماً ممانعت کر دی تھی اور خواجہ الطاف حسین حالی نے بھی حیاتِ سعدی میں اس کی یوں تصریح کی ہے

"خواجہ حافظ کی غزل مجالس اور محافل میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہے اور اس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں ۔ وہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے عشقِ حقیقی کے ساتھ عشقِ مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دُنیا کی نعمتوں سے افضل بتاتی ہے ۔ مال و دولت علم و ہنر، نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ، زہد و تقویٰ غرضکہ کسی شئے کو نظر بازی اور شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی ۔ وہ عقل و تدبیر، مآل اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس اور جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے اور آزادگی، رسوائی، بدنامی وغیرہ کو جو عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے ۔ دولتِ دُنیا پر لات مارنا، عقل و تدبیر سے کام نہ لینا، توکّل و قناعت کے نشہ میں اپنی ہستی کو مٹا دینا اور جوہر انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصوّر باندھے رکھنا، علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حبابِ اکبر جاننا، حقائق اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا، کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا، جو کچھ ہاتھ لگے اس کو فوراً کھو دینا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں اس سے مستفاد

ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطبع بیحد مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حُسن و جمال اور مزامیر کی نے اُن کو اور لے اُڑتی ہے اور اُن کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں جن کی تمام عمر حقائق و معارف کے بیان کرنے میں گذری ہے اور جن کا شعر شریعت کا لُبِ لباب اور طریقت کا رہنما اور عالمِ لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دل نشین ہو جاتے ہیں"۔

مسلمانوں پر ایک عرصہ سے جو جمود و سکون کی حالت طاری ہے اقبالؒ کے نزدیک اس کی ذمہ داری کافی حد تک ادبیاتِ اسلامیہ پر عاید ہوتی ہے خاص کر وہ ادبیات جو خواجہ حافظؒ ایسے شعرا کے نتائجِ افکار ہیں جن میں افلاطونی روح سائر و دائر ہے چنانچہ لکھتے ہیں ۔

راہبِ اوّل فلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
رخشِ اُو در ظلمتِ معقول گم — در کہستانِ وجود افگندہ سُم
آنچناں افسونِ نامحسوس خورد — اعتبار از چشم و گوش و ہوش بُرد
گفت سرِّ زندگی در مُردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است

افلاطون کو راہب اوّل اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے حقائق اشیاء کی معرفت سے نفرت دلائی اگرچہ اس سے قبل ہندوستان میں بھی رہبانیت کا دَور دَورہ تھا لیکن افلاطون نے اس کی تدوین و ترتیب اور تجدید میں جو مؤثر اسلوب اور پیرایہ اختیار کیا وہ اسی کا حصہ تھا اور اس وجہ سے اس کو فلسفۂ رہبانیت کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے، جیسے کہ سطورِ ماسبق کی حکایت سے ظاہر ہے کہ ایک بھیڑ نے شیروں کی فطرتِ درندگی کو کس طرح وعظ و تلقین سے تبدیل کر دیا تھا اقبالؒ

افلاطون کا شمار بھی بھیڑوں کے اسی ریوڑ میں کرتے ہیں کیونکہ دونوں کی تعلیمات میں مطابقت تامہ موجود ہے افلاطون نے اتنا فریبِ عقل کھایا کہ اُس کا سمندِ فکر ظلمتِ معقول میں گم ہو گیا اور اس نے اشیاء کے وجود سے انکار کر دیا اس نے دُنیا اور اس کی جملہ موجودات کو موہوم قرار دے دیا اور انسان کے محسوسات سے منکر ہو گیا اس کے نزدیک ہاتھ، آنکھیں اور کان وغیرہ تمام اعضا غیر اعتباری حیثیت رکھتے ہیں اور اس حقیقت کو معلوم کرنے کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں جو غیر مرئی ہے اس نے اس کا غیر مبہم الفاظ میں اعلان کر دیا کہ زندگی کا راز مرنے میں پنہاں ہے اور زندگی اسی وقت اپنے مقصدِ حقیقی کو پا سکتی ہے جب وہ دُنیا سے کنارہ کشی کر لے۔

بر تخیّلہائے ما فرمانرواست　　　جامِ اُو خواب آور و گیتی رُباست

گوسفندے در لباسِ آدم است　　　حکمِ اُو بر جانِ صوفی محکم است

اقبالؒ کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلامی تصوّف اور اس کی ادبیات پر اسی کے تخیّل کی فرمانروائی ہے اور بہ حقیقت اسلامی تصوّف و فکر کی تاریخ پر نظر غائر ڈالنے اور اس کی تعلیمات کا افلاطون کے افکار کے ساتھ موازنہ کرنے سے ہر شخص پر واضح ہو سکتی ہے افلاطون کے بعد کی اکثر عجمی و غیر عجمی تصنیفات خواہ وہ خالص تصوّف کے رنگ میں ہوں یا اشعار کی دلپذیر صورت میں یا قرآن مجید اور حدیث کی تفسیریں یا علم کلام اور فقہ کے مباحث ہوں ان سب کا سر رشتہ افلاطونی فلسفہ سے جا ملتا ہے افلاطون (۴۲۹ —— ۳۴۸) قبل مسیح کے دَوران میں دُنیا میں موجود تھا لیکن اس سے قریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اسلام کو جس متصوّفانہ رنگ میں پیش کیا ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا ماخذ افلاطونی فلسفہ ہے اور ابن عربی کے سو سال بعد جب امیر سید حسینؒ نے چودہ سوال لکھ کر ایک گشتی خط ایران کے تمام صوفیائے کرام کے نام روانہ کیا اور اُن سوالات کے جوابات کی خواہش ظاہر کی تو علامہ

محمود شبستری نے جو جوابات دیئے اور بعد میں اُن کو "گلشنِ راز" کے نام سے شائع کیا اُس سے بھی اس کی تائید مزید ہوتی ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ مولنا جلال الدین رومیؒ نے جو ابن عربیؒ کے ہم عصر تھے اپنی شہرہ آفاق مثنوی لکھ کر افلاطون کے جملہ خیالات کی تردید کی لیکن اُن کی وفات کے بعد سے آج تک مثنوی مذکور کی جتنی شرحیں کی گئی ہیں اُن میں وہی افلاطونی ناویۂ نظر ملحوظ رکھا گیا ہے ہندوستان میں مثنوی مولانائے رومؒ کی جس شرح کو زیادہ ترین صحت سمجھا جاتا ہے وہ مولنا بحرالعلومؒ کی ہے لیکن اُس کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شروع سے اخیر تک اس میں ابن عربیؒ کی پیروی کی گئی ہے اور اُنہی کی فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم کی عبارتوں کے حوالوں سے مولنا بحرالعلومؒ نے اپنی شرح کے پیٹ کو بھرا ہے اور قرآن مجید، مثنوی مولنا رومؒ اور ابن عربیؒ کی فتوحات اور فصوص کے مابین توافقِ کامل پیدا کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے۔

اقبالؒ کی نظیر گذشتہ صدیوں کے فضلاء اور حکماء اور ائمہ دین میں اس لحاظ سے بھی کم ملتی ہے کہ اسلامی تعلیمات پر کئی صدیوں سے جو گمراہ کُن فلسفے اور تصوّف کے حجابات پڑے ہوئے تھے اقبالؒ مقابلتاً اُن کو اُٹھانے میں زیادہ کامیاب ہوئے ہیں نہ صرف آپ نے موجودہ زمانہ کے اسلامی اور غیر اسلامی مفکّرین کے نظریوں کی تردید کی ہے اور اُن کے ادبی شہ کاروں کے جوابات قرآن مجید اور حدیث نبویؐ کی روشنی میں لکھے ہیں۔ بلکہ قدماء کے وہ مسلّمات جو صدیوں تک اسلامی تعلیمات کا جزو لاینفک رہے ہیں اُن کا تجزیہ کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دیا ہے اور صوفیوں کو بتا دیا ہے کہ تم جس میکدے کے جام سے مست ہو رہے ہو اور جس ساقی کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر رہے ہو وہ دراصل ایک بھیڑیا ہے جس نے انسانی ملبوسات کو پہن رکھا ہے۔

عقل خود را بر سرِ گردوں رساند عالمِ اسباب را افسانہ خواند
کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات

افلاطون کہتا ہے کہ "ذاتِ کُل" ہی حقیقی چیز ہے اُس کے علاوہ کائنات اور اس کی جملہ موجودات اجزائے موہوم ہیں اور اِن کا مقصد یہ ہے کہ "ذاتِ کُل" میں مل کر اپنی ہستی کو فنا کر دیں اور یہی ہمارے صوفیائے کرام کا مسلک ہے اِن کا "ہمہ اوست" اور افلاطون کا "ذاتِ کُل" ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت حکمتِ او بود را نابود گفت

فطرتش خوابید و خوابے آفرید چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید

افسوس کہ افلاطون نظریۂ حیات کو نہ سمجھ سکا اور ہستی کو نیستی سے تعبیر کرنے لگا اس سے بڑھ کر کسی کی کور ذوقی کا کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ وہ موجود کو لاموجود کہے اور نقصان کو نفع پر ترجیح دے در اصل یہ اس کی ذہنی افتاد تھی جس کی وجہ سے وہ گمراہ ہو گیا اور زندگی اور کائنات کے تصوّر کو ایک خواب سمجھا جس میں قوتِ واہمہ کی کارفرمائیاں ایسی اشیاء کو ذہن کے سامنے لا کر پیش کر دیتی ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا اور انسان دھوکے سے اُن کو حقیقی سمجھ لیتا ہے افلاطون نے کائنات کا ایسا ہی تصوّر اپنے ذہن میں قائم کیا۔

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود جانِ اُو وارفتۂ معدوم بود

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

افلاطون کی یہ بدقسمتی تھی کہ وہ ذوقِ عمل سے محروم رہا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس عقیدہ کا پابند ہو گیا تھا کہ "نفئ عمل" کے ذریعہ ہی اُس "ذاتِ کُل" تک رسائی ہو سکتی ہے اور چونکہ وہ "ذاتِ کُل" غیر مرئی ہے اس لئے مرئی صورت میں اُس تک رسائی محال ہے جسدِ خاکی اس کے راستے میں زبردست رکاوٹ ہے جب تک اسے معدوم نہ کیا جائے "ذاتِ کُل" میں فنا ہونے کا امکان نہیں ہے۔ اس کا مسئلہ اعیانِ نامشہود فلسفہ کا مشہور مسئلہ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تمام

اشیار کا معیارِ حقیقی ہے اور قدرت میں جو کچھ اصل ہے اور خیالات اور قوانین کا جو بھی مجموعہ ہے سب کا منبع خدا ہے کائنات کی جملہ موجودات موہوم ہیں انسان بھی موہوم ہے اور اس کے جملہ اعضاء جوارح بھی بیکارِ محض ہیں غرضکہ دُنیا کی تمام اشیار عدم آباد میں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تصوف کا "ہمہ اوست" اور "ہمہ از وست" افلاطونی عقیدہ" اعیانِ نامشہود" کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ محمود شبستریؒ کا شعر ملاحظہ ہو۔

باصلِ خویش راجع گشت اشیا
ہمہ یک چیز شد پیدا و پنہاں

جس کا مطلب یہ ہے کہ اشیائے کثرت کا نام عالم ہے جو حقیقت میں عدم ہے (یعنی کوئی ہستی نہیں رکھتا) اور سب کا اصل حق تعالےٰ ہے کیونکہ حقیقت میں ہر ایک چیز کا حاصل اُسی کی ہستی ہے اور عالم جو خود نیستی ہے خدا تعالےٰ کی ہستی سے ہست ہے (ہمہ از اوست) سب کا رجوع اسی کی طرف ہے (ہمہ اوست) بلکہ درحقیقت سب کچھ وہی ہے۔

افلاطون اور محمود شبستریؒ کے عقائد کا موازنہ کر کے دیکھیئے۔ کیا کوئی فرق نظر آتا ہے پھر اگر اقبالؒ یہ کہتے ہیں کہ تصوف اور اسلامی ادبیات تمام افلاطونی عقائد کے آئینہ دار ہیں تو اس میں غلط بات کون سی ہے؟

اقبالؒ کے خیال میں افلاطون اور اس کے متبعین نے تصورِ کائنات کی بابت جو غلطی کھائی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کا صحیح تصور کرنے میں قاصر رہے اسی لئے وہ "ذاتِ کُل" "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ سب سے پہلے اس حقیقت کی کُنہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے جسے وہ اِن فلسفیانہ اور صوفیانہ اصطلاحات سے مخاطب کرتے ہیں اقبالؒ کے نزدیک "ذاتِ کُل" کا کوئی وجود نہیں اور نہ اس ترکیب کا اطلاق خدا پر ہو سکتا ہے۔

کائنات افراد کے مجموعہ کا نام ہے جس میں خدا بھی ایک فرد ہے لیکن دوسرے افراد اور خدا میں یہ فرق ہے کہ وہ فردِ کامل ہے اور دوسرے افراد ابھی تکمیل کی منزلوں سے گذر رہے ہیں جس طرح ہر چیز میں خودی پائی جاتی ہے اور اس کے آثار عیاں ہیں خدا بھی کائنات کی کامل خودی کا نام ہے جو ہر جگہ بنفسِ نفیس موجود نہیں ہوتا وہ ایک ذاتِ بسیط ہے جو تعیّنات کی صورت میں منبسط ہے وہ ایک طاقتور ہستی ہے جو ایک مرکز سے محیطِ فطرت کے تمام نقطوں پر ضبط و اختیار رکھتی ہے جس طرح ایک انگارہ اپنی حد کے اندر قائم رہنے کے باوجود دُور تک حرارت پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ مظاہرِ کائنات محض وہم ہی وہم نہیں سب کے اندر حیاتِ حقیقی یعنی خودی موجود ہے اور یہی ان کی زندگی کی کفیل ہے۔

اقبالؒ کے اس تصورِ خدا اور نظریۂ کائنات کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ افلاطون اور صوفیائے کرام کے عقائد اور اقبالؒ کے عقائد میں کتنا بُعد المشرقین ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است　　　مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است

وہی لوگ اس دُنیا کو پسند کر سکتے ہیں جن کے جسم میں زندہ جان ہو یعنی خودی کا جوہر اُن کے رگ وپے میں خونِ حیات کو سرگرمِ عمل رکھے اُنہیں دُنیا کی جملہ اشیاء میں ایک زندگی نظر آتی ہے خواہ وہ جمادات ہوں یا نباتات یا حیوانات وہ ان سب کے اندر ارتقائی منازل کی جانب صعود کرنے والی حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو کسی خیالی دُنیا کے طالب ہوتے ہیں اور اسی کے تصوّر میں اپنی زندگی کے دن بسر کرتے ہیں۔ چونکہ دل اُن کے پہلو میں سل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اس لئے اُنہیں دُنیا کی جملہ اشیاء بے کیف نظر آتی ہیں اور مجبور ہو کر اُنہیں عالمِ اعیان کی جانب متوجہ ہونا پڑتا ہے وہ دُنیا کی مہمات سے اس لئے بھاگتے ہیں کہ اُن میں تابِ مقاومت نہیں ہوتی اور اُن کی سہولت پسندیاں اور سہل انگاریاں اُنہیں اُس قطرے کی طرح نشاطِ گُم

کی عادی بنا دیتی ہیں جس کا مقصد ہی دریا میں فنا ہو جانا ہو وہ ہر ذرّے میں آفتاب کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور شرارِ سنگ میں جلوہ طور کا مشاہدہ کر کے مستِ اَلست ہو جاتے ہیں کاش کہ وہ عالم امکان کی اہمیّت سے واقف ہوں کہ خدا خود اسے کتنا پسند کرتا ہے اور اپنے پیغمبروں کو بھیج کر اس میں کونسی روح پھونکنا چاہتا ہے ؟ وہ زندگی کی روح ہے جس سے خدا اس عالم امکان کو زینت دینا چاہتا ہے اور جس چیز میں جتنی زیادہ زندگی ہو اس کی بارگاہ میں اتنی ہی زیادہ مقبول ہوتی ہے لیکن مُردہ دل جو عالم اعیان کے شیدائی ہیں وہ اس حقیقت کو کیا جانیں۔

آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام لذّتِ رفتار بر کبکش حرام

اقبالؒ نے اس شعر اور اس کے بعد کے چھ سات اشعار میں اُن مُردہ دلوں یعنی اعیانِ نامشہود کے قائلین کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اُن کی دُنیائے تصوّر میں کس طرح ہر چیز پر سکون وجمود کی ایک کیفیّت طاری ہوتی ہے اور ان کے اس قسم کے خیالات کی نشر واشاعت قوموں کی زندگی کے لئے کتنی مہلک ثابت ہوتی ہے ۔

باقی آئندہ

تمدن و سیاست پر رہبانیت کا اثر

از مرزا عزیز فیضانی دارا پوری

سیاست کا آغاز اور محل تمدن و معاشرت ہیں۔ اور رہبانیت در اصل تمدن کی ضد اور اس کا الٹ ہے یعنی رہبانیت اختیار کرنے پر سب سے پہلے جس چیز پہ زد پڑتی ہے وہ تمدن ہی ہے

صاحب قاموس نے تمدن کی تعریف میں لکھا ہے "تمدن تمصر" یعنی تمدن مصر یا شہر بنانے کا نام ہے۔ گویا باہم مل جل کر اور آبادیاں بنا کر رہنا۔ نہ کہ الگ تھلگ ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں ڈیرا لگانا۔ اور معاشرت کے متعلق کہا ہے "معاشرت المخالطۃ" یعنی باہم مخلوط ہونا نہ کہ کٹ جانا پس ظاہر ہے کہ رہبانیت کا سب سے پہلے تمدن و معاشرت ہی پہ حملہ ہو سکتا تھا اور ہوا۔

تمدن کے لئے مل جل کر رہنا بلکہ ایک دوسرے کی احتیاج بھی لازمی ہے۔ اور رہبانیت کے ہاں چونکہ یہ اصول ہی نہیں تمدن کو اس سے بے اندازہ نقصانات پہنچے۔

رہبان کا دعوئے تو یہ ضرور ہے کہ وہ سب سے مستغنی اور بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صحیح نہیں۔ اتنا درست ہے کہ ضروریات کو کم کرنے کی وجہ سے وہ احتیاج کو کم از کم حد تک لا سکتا ہے مگر یہ کہ وہ بالکل مستغنی ہو جائے قابل تسلیم نہیں۔ یہ شان صرف خدا کے بے نیاز ہی کی ہے اور کسی کی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ محتاج سب لوگ اللہ ہی کے ہیں جیسے کہ فرمایا ہے

یا ایھا الناس انتم الفقراء واللہ ھو الغنی الحمید یعنی اے لوگو! تم سب محتاج ہو اور اللہ ہی فقط غنی و حمید ہے
مگر دُنیا جائے اسباب و وسائل ہے۔ یہاں ضرور ہی کسی نہ کسی ذریعہ سے کام چلیں گے۔ لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ نکتے کی بات ہے اور غور و فکر کی شرط کیونکہ مخلوقات کے کام تو الگ رہے۔ خود خالق کائنات نے بھی اپنے قدرتی امور کے اظہار اور ان کی سرانجام دہی کے لئے یہی قرار دیا کہ ہمہ تن اطاعت اور سراسر فرمانبردار ملائکہ کے ذریعہ بہت کچھ ہوا کرے۔ یہ باوجود قدرت "کن فیکون" مصلحت اور حکمت کے طور پر ایک سنت جاریہ ہے۔

بہرحال رہبانیت کا دعوائے استغنا اصولی اور عملی طور پر بھی باطل ہے۔ اور تمدن و احتیاج لازم و ملزوم۔ احتیاج سے تو تمدن کی صورت خود بخود پیدا ہو جائے گی اور تمدن اختیار کرتے ہی احتیاج کا سلسلہ بھی شروع کرنا پڑے گا۔

(۲)

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک مکتوب میں اسی احتیاج کے متعلق نہایت عمدہ بحث کی ہے اور آیہ مبارکہ یا ایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المومنین (یعنی اے نبیؐ تجھے اللہ کافی ہے اور مومنوں میں سے جو تیرا اتباع کریں) سے لطیف دلیل پیدا کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلعم کے ضروری امور کی کفایت میں (اور بموجب حکم وشاورھم فی الدین کہ ان سے امر میں مشورہ کر لیا کرو۔ مشاورت میں بھی) مومنوں کو دخل دیا ہے۔ تو پھر اوروں کی ضروریات میں کیا مضائقہ ہے بعض فقراء طریقت کو اس بات پر مصر جانتے ہیں کہ کسی کی احتیاج نہ ہو۔ (یعنی سب سے الگ رہیں سب سے بے تعلق رہیں۔ اور عملاً رہبان بن جائیں ورنہ میل جول ہوگا تو احتیاجی تعلقات ضرور قائم ہونگے) مگر بقول مجدد علیہ الرحمۃ یہ کوئی درویشی نہیں۔ کیونکہ احتیاج جو تمام ممکنات کا ذاتی خاصہ ہے اسی میں انسان کی خوبی ہے۔ اسی سے ذلت و بندگی پیدا ہوتی ہے۔ جو طریقت کے لئے مفید ہے۔ برعکس اس کے استغنا

سے طغیانی و سرکشی مترتب ہوتی ہے جو طریقت کے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتی ہے اس پر امام ربانیؒ آیہ ذیل بطور دلیل لائے ہیں :-

ان الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ (یعنی انسان یقیناً سرکشی اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے پر استغنا پاتا ہے۔

پس دنیوی تمدن کے بقاء کے لئے ہی نہیں بلکہ خود درویشی و رہبانیت کے مقصود یعنی ولایت و قربِ الٰہی کے لئے بھی استغنا کی جگہ احتیاج مابین یا دوسرے لفظوں میں تمدنی اور سوشل تعلقات کی اشد ضرورت ہے۔ پس اگر رہبانیت کو عمل میں یا ازہان میں جگہ دی جائے گی تو ایک طرف تمدن کو نقصان پہنچنا لازمی امر ہوگا۔ تو دوسری طرف خود طریقت پر بھی بُرا اثر پڑے گا۔ اور یہی کہا جائے گا کہ ؏

نہ خدا ہی ملا نہ یہ دُنیا ہی نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

(۳)

تمدن کی ضد ہونے کی وجہ سے رہبانیت انجام کار ضد سیاست بھی ہے۔ وہ تو گویا سیاست کی جڑ پر کلہاڑا رکھ دیتی ہے۔ اور اگر اس کی ابتدا ترکِ تمدن سے ہے تو انتہا ترکِ سیاست پر۔

سیاست کی تعریف میں صاحب قاموس نے کہا ہے "لست الرعیۃ سیاسۃ" یعنی میں نے رعیت کی سیاست کی۔ گویا اُسے امر و نہی کی۔

ظاہر ہے کہ ان امور کو تمدن لازم ہے یعنی جب تک انسان مل جل کر تمدن اختیار نہ کریں گے اور منظم ہو کر ایک حکومت اور رعیت کی صورت اختیار نہ کریں گے، امر و نہی اور سیاست کا اطلاق کیا معنی

پس راہبانہ خیالات کا یہ اثر ہُوا کہ عملی رہبان سے ذہنی رہبان تک سب کی طبائع سیاسیات سے متنفر ہو کر بھاگ گئیں اور اس طرح اقوام کو بہت سے ایسے لوگوں کی خدمات سے محروم ہونا پڑا جو خدا پرستی اور اخلاص کی دولت سے مالا مال ہونے کی وجہ سے کام آتے اور خدا جانے ان میں کئی صاحب تدبیر نکلتے جو اپنی قوم کی مشکل کشائی کر سکتے۔

(۴)

سیاست پر اثرات کی فہرست اسی قدر طویل ہے جس قدر کہ خود سیاست کثرت امور کے اعتبار سے طویل ہے۔ آخر جس گھر میں زیادہ دولت ہوگی چوری ہو جانے سے نقصان بھی اسی گھر کا زیادہ ہوگا۔ سب سے بڑی اور بنیادی چیز تنظیم ہے۔ کیونکہ جب تک یہ نہ ہو سیاست کا ظہور و نفاذ ہی ناممکن ہے اور رہبانیت زدہ دماغ سب سے پہلے تنظیم ہی کو توڑتے ہیں۔

کسی قوم کی تنظیم کے لئے تین طاقتوں کا باہم مربوط ہونا لازمی ہے۔ امارت۔ علم۔ ارشاد رسول عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے دنیا اس نکتہ سے آگاہ ہی نہیں تھی کہ سیاست و ریاست کے بقاء و تحفظ اور قیام و استحکام کے لئے ان تینوں طاقتوں کا ایک نظام کے ماتحت کام کرنا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ صرف ہمارے ہی مذہب کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے دین اور سیاست کو باہم ملا دیا۔ بلکہ دونوں کی الگ الگ کسی طرح تقسیم ہی نہیں کی۔ پس یہاں امارت کے ساتھ علم اور ارشاد جب تک نہ ملیں گے کام بے نظام ہوگا۔

سب سے پہلے یعنی سرور کائنات صلعم اور خلافت راشدہ کے زمانے میں یہ تینوں ارکان ایک نظام میں شامل تھے بلکہ ایک ہی وجود میں جمع ہوتے تھے۔ خلیفہ ایک ہی وقت میں بادشاہ بھی تھا۔ عالم و مفتی بھی اور تزکیہ نفس کرنے والا روحانیت سکھانے والا یعنی ولی بھی۔ حضورؐ کی شان ہے " یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم " یعنی وہ ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں (علم) اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں (ارشاد) اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ حضورؐ ہی خلیفۃ اللہ اور صاحب حکومت و سیاست بھی تھے

یہی رنگ خلفائے راشدین میں بھی قائم رہا کیونکہ وہ منہاج نبوت پر تھے۔ مگر اس کے بعد کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ یہ رنگ قائم نہ رہ سکا۔ نظام دو حصوں میں بٹ گیا۔ امراء الگ ہوگیا

اور صاحب تعلیم و تزکیہ الگ۔ کچھ تو اس لئے کہ منہاج نبوت پر رہ سکنے کی طاقت ہی بوجہ بُعد زمانہ نبوت کم رہ گئی۔ دوسرے وسعت حدود سلطنت و آبادی بھی اسی کی مقتضی تھی

نتیجہ اس علیحدگی کا بھی بُرا ہی تھا۔ مگر اس کے بعد ار انقلاب آیا۔ اور تعلیم و تزکیہ بھی الگ الگ ہو گئے۔ علماء ہی میں سے بعض لوگ جنہیں دوسرے علماء کی دنیا پرستی اور حکّام کی ہاں میں ہاں ملانا نظر آیا۔ تو بجائے اس کے کہ اصلاح کے لئے کوشش کرتے اور مصائب برداشت کرتے سیاست ہی سے رُوٹھ گئے۔ اور الگ ہو کر تزکیہ کا کام کرنے لگے۔ گویا یہ ایک قسم کی رہبانیت کی صورت تھی جس نے اپنے اس عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ سیاست کو مذہب کا حصہ ہی نہیں سمجھتی جبھی تو اُسے غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا۔

اب صورت یہ تھی کہ بادشاہ الگ۔ علماء جدا اور صاحبانِ تزکیہ علیحدہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تینوں آزاد ہو گئے اور بلا خوف لومۃ لائم اور بلا خطرۂ اعتراض جو چاہا کرنے لگے تنظیم برباد ہو گئی۔ غالباً بعد کے سلاطین کی دُنیا پرستی کو دیکھ کر اور اپنے میں قوّت مقابلہ نہ پا کر اہلِ تقویٰ الگ ہو گئے ہوں گے! اپنے آپ کو تو شاید انہوں نے بچا لیا۔ مگر قوم کو ظالم امراء اور خود غرض رہنماؤں کے حوالے کر گئے۔ ایسی حالت میں رہبانیت اختیار کرنا خدا کی رضا کا موجب کیسے ہو سکتا ہے! اور پھر اس میں کمال کیا ہے۔ آخر بزدلی ہی تو ہے بالکل ازکم ضعف و معذوری غنیمت ہے کہ بقول کسے طمع کے لئے ہی سہی مگر بعض علماء پھر بھی امراء کے ساتھ تو رہے کچھ نہ کچھ فائدہ تو ظاہر ہے۔ کہ سلاطین کو ڈر رہا۔ اور اسی طرح کچھ نہ کچھ اصلاح ہوتی رہی۔ اگر وہ بھی خلوت نشین ہو جاتے تو خدا جانے کیا ہوتا۔

تفرقہ کا یہ نقصان کیا کم ہے کہ علماء سلاطین اور فقراء تینوں باہم ایک دوسرے سے متنفر ہو گئے! اور ایک دوسرے سے بے نیاز اور الگ تھلگ۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ امارت اور تزکیہ نفس کے کام بھی دراصل علم پر مبنی ہے۔ وہ ہیچ۔ گویا تعلیم کے ساتھ ہی یہ دونوں کام بھی علماء ہی کے تھے۔ مگر بعض علماء

بھی یہ سمجھنے لگ گئے ہیں۔ کہ اُن کا کام صرف پڑھنا پڑھانا ہے اور بس۔ اسی طرح امیر و درویش بھی سمجھنے لگے۔

غرض سیاسیات اور علم و تزکیہ کو نقصان پہنچا۔ تو انہی ارکان ثلاثہ کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ جب بھی دین میں فساد رونما ہوا انہی تینوں کی عنایت سے ؎

وَھَلْ اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ   وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَّرُھْبَانُھَا

(یعنی دین میں فساد ہمیشہ ملوک، احبار یعنی علماء اور رہبان یعنی درویشوں سے ہوا ہے)

اس میں شک نہیں کہ دین کے فساد کا باعث بادشاہ اور علماء بھی ہوئے ہیں مگر ان کے لئے الگ موضوع درکار ہے۔ اس کتاب کا موضوع صرف رہبانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ گو خود غرض علماء اور قائدین بھی اپنے فائدہ کے لئے تفرقہ کا بیج بوتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح تنظیم کی صورت پیدا نہیں ہونے دیتے مگر یہ حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ ذمہ دار رہبان ہے اور رہبانیت۔ کیونکہ خود غرضی کے باوجود امراء و قائدین اور علماء پھر بھی تنظیم کی ضرورت کے قائل تو ہیں تنظیم کا نام تو زندہ رکھتے ہیں۔ شاید آج نہیں تو کل اچھے رہنما پیدا ہو جائیں کم از کم ان سے سُن کر اور لوگ اس کی ضرورت کے تو قائل ہو جاتے ہیں۔ مگر رہبان اور رہبانیت تو تنظیم کی جڑ ہی کو اکھیڑنے والی چیز ہے یہاں تک کہ جو لوگ ذہنی رہبانیت کا شکار ہیں گو وہ رہتے جماعت ہی کے اندر ہیں۔ مگر انفرادی اور الگ تھلگ زندگی کے اس قدر شدت سے قائل ہیں کہ تنظیم کا تصور بھی ان کے پاس تک نہیں بھٹک سکتا۔

بہرحال تمدن وسیاست پر رہبانیت کے خیالات کا زبردست اثر پڑا ہے اور نتیجہ تباہی خیز ہوا ہے حیرت ہے کہ تمدن کی اتنی بڑھتی ہوئی رَو اور اتنی "تیز روشنی" کے زمانے میں بھی (کیونکہ لوگ اسے روشنی کا زمانہ کہتے ہیں) دُنیا کے ایسے گوشے موجود ہیں جہاں رہبانیت زدہ اذہان کا دَور دورہ ہے۔ غالباً اسے موجودہ اہل دُنیا کی دُنیا پرستی کا ردّ عمل کہا جا سکے گا یا کچھ اور۔ جو کچھ ہو خدا بچائے +

السحر الحلال فی کلام علامۃ الاقبالؒ

(حافظ سراج الدین صاحب محمود بی۔ اے۔ بی۔ ٹی بہاولپور)

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

خدا نے انسان کو پیدا کیا اور شیطان نے اسے اقوام میں تقسیم کر دیا پھر نسل و رنگ اور خون کے امتیاز نے اسے اس حد تک گمراہ کر دیا کہ ہر گروہ نے اپنی گمراہیوں کو بھی خوبیوں سے تعبیر کرنا شروع کر دیا اس باب میں یورپ کی کارفرمائیاں اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں لیکن اسلام کسی ایسی مصنوعی اور خود ساختہ حدود کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے ملتِ بیضا اسلامیہ کو کسی فرد یا گروہ کی لغزشوں کی شناخت میں کبھی دشواری پیش نہیں آسکتی خواہ وہ فرد یا افراد اُمّ القرا مکہ معظمہ کے باشندے ہی کیوں نہ ہوں ؟

شریف حسین کے نسلی شرف و مجد سے کون انکار کر سکتا ہے ؟ پھر وہ دُنیا کے مقدس ترین خطہ کا حکمران ہونے کی حیثیت سے جس عزت و عظمت کا حامل تھا اس سے انکار کی کیسے گنجائش ہو سکتی ہے لیکن بایں ہمہ یہ سب برکات بھی اسے اس کے اعمال و افعال کے نتائج سے نہ بچا سکیں اسلام کی نظر میں راہِ حق و صداقت سے انحراف کرنے والوں میں اُسکا شمار ہوا اور اس کے برعکس ترک و تاجیک کا شمار مجاہدین اسلام میں کیوں ؟

عرب کی آتشیں سرزمین کے آتش فشاں میدانوں میں سورج غروب ہوچکا تھا دن بھر آگ کی طرح تپنے والی سرزمین کی ریت اب ٹھنڈی ہونی شروع ہوچکی تھی بدؤں کے خیموں میں آج خاص طور پر چہل پہل نظر آرہی تھی شیخ قبیلہ کے بڑے خیمے میں ساحر انگلستان کرنل لارنس کی جادوگری سب خورد وکلاں کو مسحور کرچکی تھی۔ معمر شیخ غیر فانی دوستی اور لازوال محبت کا عہدو پیمان مستحکم کرچکا تھا تمام قبائل کے شیوخ یہاں اس وقت موجود تھے۔ شیخ الشیوخ خاموشی کے ساتھ اٹھا اور تمام حاضرین کے سامنے اپنے مصنوعی دانتوں کا ست منہ سے نکال کر پتھروں کی امداد سے چکنا چور کر دیا۔ کیونکہ یہ مصنوعی سٹ دشمن ترک جمال پاشا کا عطیہ تھا جس کی قوم کو خاک وخون میں لوٹانے کا اس وقت سب عزم کر رہے تھے پھر کس طرح ممکن تھا کہ اس قومی دشمن کی یادگار کو اپنے منہ میں رہنے دیا جاتا۔ ساحر فرنگ اپنی کامیابی پر خوش تھا اور اس دوستی اور اخلاص پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے خاص انگلستان کا بنا ہوا سٹ جیب سے نکال کر شیخ الشیوخ کی خدمت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہا تھا ؎

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دینِ مصطفٰےؐ

ترکوں کے خلاف اعلان جنگ ہوچکا ہے شریف حسین کے بدو اپنی وحشت وبربریت کے ساتھ مدینہ منورہ کے محافظ فخری پاشا کے چند مجاہدین کے خلاف نبرد آزما ہیں یہ چند انسان کسی طرح بھی اس انبوہ کثیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ گولے اور گولیوں کی بارش ہو رہی ہے اعراب حسینی کی گولیاں عین حرم نبوی تک پہنچ رہی ہیں لیکن اس کی پرواکسے ہے ترک بچے اور عورتیں بھی اس خوفناک گولہ باری کی نظر ہوجاتی ہیں اور بعین اخیر تک یہ آگ وخون کا کھیل جاری رہتا ہے ؎

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دینِ مصطفٰےؐ

امیر عبدالکریم بطل جلیل مجاہد اعظم مراکش اپنی جان نثاریوں اور سرفروشیوں کی بدولت خوشنودی حق حاصل کرلیتا ہے۔ مٹھی بھر مجاہدین کی امداد سے بے دین اور ظالم ہسپانوی نصاریٰ کے تفوق کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

ہسپانوی اقتدار کے خاتمہ میں فرانس اپنی عظمت و اقتدار کا چراغ گل ہوتا ہوا دیکھتا ہے اور بغیر کسی جائز یا ناجائز سبب کے اس مجاہد اسلام کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا ہے ۔

اسلام کا یہ غیور اور شجاع فرزند اپنی اس مختصر سی جمعیت کو ساتھ لے کر فرانسیسی عظمت و اقتدار کے قلعہ کو بھی مسمار کرنا شروع کر دیتا ہے ۔ قریب تھا کہ سرزمین مراکش دشمنانِ دین کے ناپاک قدموں سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے کہ ناموس دینِ مصطفےٰ کو فروخت کرنے والے آگے بڑھتے ہیں ۔ بہتر ہے کہ ان کی دین فروشی کی داستان کو "انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا" کے مصنف کے الفاظ میں ہی بیان کی جائے :-

"قریب تھا کہ فرانسیسیوں کو سخت شکست ہو لیکن عین وقت پر غیر مجاہد قبائل کا ایک سیلاب مجاہدین کے خلاف کھڑا ہو گیا کیونکہ ان کی طرف سے پہلے ہی اطمینان حاصل کر لیا گیا تھا اسی کا نتیجہ امیر عبد الکریم کی شکست اور گرفتاری ہوا ۔"

عظمتِ اسلام کی نعش دشمنوں کے سامنے آغشتہ بخاک و خون پڑی ہوئی ہے جزیرہ ری یونین میں آج بھی تنہائی و بے کسی اس مردِ مجاہد کے سرہانے کھڑی آٹھ آٹھ آنسو بہایا کرتی ہے اس لئے کہ ؎

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ

لارڈ ایلن کی فاتحانہ یلغاریں بحیرۂ احمر کے کناروں سے جا ٹکرائیں جرنیل نورالدین پاشا کی مجاہدانہ سرفروشیوں پر پانی پھر گیا ترکی افواجِ قاہرہ شکستوں پر شکستیں کھاتی ہوئی اسکندرونہ کی دیواروں کے نیچے آ پہنچی ۔ ایک بوسیدہ سے خیمے میں ایک مریض مجاہد سخت بخار میں مبتلا ہے تمام جسم بھٹی کی طرح تپ رہا ہے شکست خوردہ افواج کے فرار کا شور و شغب اسے آنکھ کھولنے پر مجبور کرتا ہے وہ اٹھ کر سنتری سے دریافت کرتا ہے کہ یہ شور و شغب کیسا ہے ؟ حضور والا ہمیں شکستیں ہو رہی ہیں اور ہماری افواج فلسطین و شام سے فرار ہو کر یہاں پہنچ رہی ہیں اور دشمن ان کے تعاقب میں ہے !

ایک سو پانچ درجہ بخار میں مبتلا مریض جھپٹ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے (یہ مصطفےٰ کمال تھا) گھوڑے پر سوار

ہو کر سفر قرامین کے سامنے آتا ہے ان کو ان کا فرض یاد دلا کر اپنے گرد جمع کر لیتا ہے اور فاتح لارڈ ایلن بی کے سامنے آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے بایں ہمہ کرب و اضطراب شمشیر بدست اور سر بکف ہو کر دشمنوں کو آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے۔ بس خبردار جو اس سے ایک انچ بھی آگے بڑھے ؎

خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

عسکی شہر پر یونانیوں کا ٹڈی دل لشکر بڑھا چلا آ رہا ہے۔ قلیل التعداد ترک ان کو روکنے کی کوششوں میں منہمک ہیں لیکن ان کی سخت ترین جدوجہد بھی ناکامی کا منہ دیکھ رہی ہے آخر ترک اور یونانی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ترک نیم مدہوشی کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر خون کے سمندر میں غوطہ زن ہیں ان کے ذی ہوش افراد البتہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں کہ دشمنوں کی یہ تعداد ضرور اپنا اثر دکھا کر رہے گی اس لئے وہ ہر ممکن احتیاط اور قابلیت سے کام لے رہے ہیں ایک ترک افسر نے عزم آہنی کے ساتھ یونانی صفوف کو چیرنا شروع کیا وہ بڑھتا ہوا یونانی سپہ سالار تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس کو قتل کر کے یونانیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دے یہ بڑا خوفناک کام تھا لیکن ترک مذکور برابر بڑھتا چلا گیا گولیوں اور گولوں کی اس پر بارش ہو رہی تھی شاید دشمن اس کے ارادے کو بھانپ گئے تھے لیکن بایں ہمہ اس کے عزم و ارادے میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ جرنیل عصمت پاشا دور ایک پہاڑی پر کھڑا دوربین سے دیکھ رہا تھا اس نے جرنیل نورالدین پاشا کو ادھر متوجہ کیا فاتح قطالعمارہ نے ایک ہی نظر میں اس کی نازک اور خوفناک پوزیشن کو بھانپ لیا وہ اس وقت دشمن کے نرغہ میں آ چکا تھا اور یونانیوں نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا تھا نورالدین پاشا نے احکام صادر کر دیئے ایسے مجاہد فی سبیل اللہ کو یوں یکہ و تنہا چھوڑ دینے والی قوم پر غضب خداوندی نازل ہوا کرتا ہے بہادر ترکو بڑھو اور اس شیر اسلام کو بچانے کی جدوجہد کرو۔ ایک ساعت میں ہزاروں ترک اس سرفروش مجاہد تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس جگہ سخت گھمسان کا رن پڑا۔ ترکوں نے

دشمنوں کے خون سے میدان کو لالہ زار بنا دیا لیکن ان کو خود بھی اس جگہ سخت نقصان اٹھانا پڑا ایک ہزار ترک سپاہی کھیت رہے لیکن وہ اپنے اس بطلِ جلیل کو بچانے میں کامیاب ہو گئے ؎

خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

نہر سقاریہ پر تین لاکھ یونانی سپاہ کے مقابلہ میں مصطفےٰ کمالؒ صرف ساٹھ ہزار جانبازوں کی جمعیت رکھتا تھا۔ تکمیل انتظام اور ترتیب صفوف کے تمام مراحل طے ہو جانے پر جنگ شروع ہو گئی فیلڈ مارشل فوزی چقماق عقب میں ایک ٹیلہ پر کھڑا نگرانی کر رہا تھا اس نے دیکھا کہ ترکی مغربی لائن ٹیڑھی ہونی شروع ہو گئی ہے اس نے اس حصہ کے جرنیل کے ذریعہ اس صف کے کرنیل کو احکام بھجوائے کہ لائن کو ہر حالت میں سیدھا رکھا جائے ڈیڑھ گھنٹے کی سخت خوفناک جد وجہد بھی اس باب میں کامیاب نہ ہو سکی ترکی جرنیل نے بار بار اس امر کے احکام صادر کئے کہ لائن کو سیدھا کر دیا جائے مگر دشمن کا زور لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا تھا اس لئے یہ بات ممکن نہ ہو سکی۔ ترکی جرنیل عقاب کی طرح اپنی جگہ سے جھپٹا اور چشم زدن میں اس صف کے سر پر تھا اس نے خود اپنے ہاتھ سے پستول کے ساتھ اپنے ہی کرنیل کا سر اڑا دیا اور خود کمان ہاتھ میں لے کر دو گھنٹے کی خوفناک کشمکش کے بعد ترکی لائن کو سیدھا کر دیا

خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

ان واقعات کو بار بار پڑھو۔ سوچو اور غور کرو پھر دیکھو کہ اس مطالعہ کے بعد حضرت علامہ مرحوم و مغفور کے ان الفاظ میں کس قدر سحر بھرا ہوا ہے ؎

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰؐ

خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

منظومات

ذوق و شوق

(غلام سرور نگار)

دکھا کے دُور ہی سے جامِ ارغواں ساقی دل و جگر کو مرے کر گیا جواں ساقی
مَیں اس کو ڈھونڈنے نکلوں بھی تو کدھر جاؤں خبر نہیں ہے، کہاں مَیں ہوں اور کہاں ساقی
نہیں ہے بادہ و مینا سے کچھ غرض مجھ کو جہاں کی جان ہے اور میری جانِ جاں ساقی
گرا کے خرمنِ ہوش و خرد پہ برقِ جمال شکیب و صبر کا لے اور امتحاں، ساقی
میں کیا کروں پہ نہیں ضبط و اختیار مجھے ترے فراق میں زیبا نہیں فغاں، ساقی
جھکایا جس پہ سر اپنا جہاں کے شاہوں نے مری نظر میں ہے وہ سنگِ آستاں، ساقی
مجھے بھی اُس کا نظارہ میسّر آجائے جہاں میں پیدا کیا تُو نے جو جہاں، ساقی
تو آ کہ دید کو میری ترس گئیں آنکھیں کہ مَیں بھی ہوں تری محفل کا رازداں، ساقی
غزل سرائی مری سازِ آرزو کی نوا جلا رہی ہے مجھے آتشِ نہاں، ساقی
مَیں تیری نذر کو لایا ہوں آبگینۂ دل نہیں ہے اس کوئی اور ارمغاں ساقی
خودی کی پھونک سکے اِک روحِ جاوداں اسمیں عطا کر اس کو بھی پھر عمرِ جاوداں ساقی

نہیں ہے حد کوئی اس ذوق و شوق کی اقبالؔ
دکھائے جا وہی اندازِ دلستاں ساقی



بہت بلند ہے گلشن سے آشیاں تیرا — زماں بھی تیرا، مکاں اور لامکاں تیرا
محمدؐ عربی کا تو عاشقِ زندہ — جہانِ عشق ترا، حسنِ جاوداں تیرا
تری متاعِ غم و درد و شوق کو لے کر — رواں ہے مشرق و مغرب سے کارواں تیرا
ڈبو دے خشک و تر کائنات کو اس میں — یہ بحرِ عشق و محبت جو ہے رواں تیرا
کیا ہے رازِ خودی عام اس قدر تو نے — کہ ذرہ ذرۂ ہستی ہے رازداں تیرا
حیات کیا ہے خودی کی نمودِ رندانہ — خودی ہے جوہرِ ہستی کا اک نشاں تیرا
نقاب اُلٹ کے ذرا دیکھ اپنے چہرے کا — کھڑا ہے کب سے تماشائی اک جہاں تیرا

اسے بھی رازِ حقیقت کا کچھ بتا اقبالؔ
شہیدِ ذوقِ تجسس ہے اک جواں تیرا



پھر سمندِ شوق کو آ کر مرے مہمیز کر — دشت کے ذروں کو پھر مہرِ تجلی ریز کر
پھر بدل دے قوتِ تخلیق سے راہِ حیات — ساری دنیا میں بپا طوفانِ رستاخیز کر
پھونک پھر اس قلبِ افسردہ میں روحِ حیدریؓ — بے نوا کو وارثِ تختِ جم و پرویز کر
خود فراموشی سے خالی عاشق و معشوق ہوں — جوشِ عرفانِ نفس سے عشق کو لبریز کر
جذبِ مستی میں کھڑے ہیں پھر سراپا انتظار — یا الٰہی اپنے بندوں سے نقاب پرہیز کر
اپنے جلووں سے منور کر کے دل کی کائنات — اور بھی رفتارِ ذوقِ جستجو کو تیز کر

کیمیائے عشق ہے اقبالؔ تیری مشتِ خاک
میری ہستی کو بھی نذرِ آتشِ تبریز کر



میں سمجھا دوں کس طرح پھر ترانۂ شبانہ — ہے اسی کے دم سے میری یہ نوائے عاشقانہ
مرے سازِ زندگی کو ہمہ تن گداز کرکے — یہ نکل رہا ہے پیہم ترے عشق کا ترانہ
وہ حقیقت اپنے جلووں کو دکھا کے چھپ گئی ہے — شب و روز جس کی آمد کا تھا منتظر زمانہ
دلِ بے قرار یہ بھی کوئی زندگی ہے تیری — نہ نگاہِ قہرمانہ، نہ ادائے دلبرانہ
میں سناؤں اُن کو کیسے یہ پیامِ بزمِ ہستی — رہے عمر بھر جو سنتے شبِ عیش کا فسانہ

ترے آتشیں ترانے میں مدام گا رہا ہوں
ہو مجھے بھی تاکہ حاصل تب و تابِ جاودانہ



مدت سے تھا محروم نوا سازِ خودی کا — ہستی کے تھا سینے میں نہاں رازِ خودی کا
کس مطربِ مشتاق کی یہ زخمہ دری ہے — پھر ساز ہوا زمزمہ پروازِ خودی کا
پامالِ عمل کر دیا دنیا نے سکوں کو — حامل ہے یہ رہوارِ تگ و تازِ خودی کا
پھر عاشق و معشوق ہوئے زندۂ جاوید — مسکن ہوا یہ جلوہ گہِ نازِ خودی کا
آنے لگیں ہر سُو سے انا الحق کی صدائیں — اڑنے لگا افلاک پہ شہبازِ خودی کا

اقبال ترے ذوقِ نظر کا یہ اثر ہے
ہر ذرۂ ہستی ہوا ہمراز خودی کا

حقائق

قوۃ القوات

میں ۔ من یا انا

(جناب امین حزیں سیالکوٹی)

مخزنِ اسرارِ قدرت کی کلید ساغرِ تقویمِ احسن کی نبیذ
جوہرِ آئینۂ حُسنِ ازل شعلۂ سینائے اسباب و علل
طورِ کُن کی مشعلِ مہر آفریں خاتمِ اِنَّا عَرَضنا کا نگیں
نغمۂ ہستی کا سازِ دلنواز غزنویٔ بودِ دُنیا کا ایاز
خانۂ امکاں کا مہمانِ عزیز ارتقا کے جسم کی جانِ عزیز
عَلَّمَ الاسماء کے بادہ کا خُم نغمۂ سازِ اَلَستُ بِرَبِّکُمْ
صدرِ بزمِ عالمِ مافی الصُّدُور جس کے تہذیب و تمدن ہیں ظہور
سِرِّ مکنونِ حدوثِ فلسفی یعنی میں ۔ من یا انا کی وہ پری

ق

سینۂ جسمِ بشر میں ہے جو بند اور ہے یزداں بہ کف جس کی کمند

شان میں آیا ہے جس کی مَن عَرَف ۔۔۔ سِرّ ہٗ کے دُرِّ یکتا کی صدف
درحقیقت قوۃ القوات ہے ۔۔۔ ماسوا مجموعۂ طامات ہے

کاش تو "میں" کو کما ہی جانتا
اپنے اس ہمزاد کو پہچانتا

کام لے 'میں' سے بڑی طاقت ہے 'میں' ۔۔۔ لفظِ بے معنی نہیں قوت ہے 'میں'
'میں' بہار بوستانِ ہست ہے ۔۔۔ دم قدم سے 'میں' کے شانِ ہست ہے
دشتِ ہستی میں یہی وہ آب ہے ۔۔۔ جو پیاسوں کے لئے بیتاب ہے
چشمۂ حیواں ہے اس ظلمات میں ۔۔۔ 'میں' شعاعِ ماہ ہے اس رات میں
تابع فرماں ہیں اس کے خشک وتر ۔۔۔ 'میں' حقیقت میں ہے شاہِ بحر و بر
مادّہ معمول ہے عامل ہے 'میں' ۔۔۔ مادّہ مجہول ہے عاقل ہے 'میں'
'میں' کے بربط کا بجانا سیکھ تو ۔۔۔ 'میں' سے ہی 'میں' کا ترانہ سیکھ تو
گو یہ نغمہ، نغمۂ خاموش ہے ۔۔۔ جوش ہے! واللہ! سراپا جوش ہے!
وجد میں آجائے گی رگ رگ تری ۔۔۔ ہو کے بےخود گائے گی رگ رگ تری
سنتِ منصور کی تجدید کر! ۔۔۔ یعنی 'میں' کی روز و شب تمجید کر
'میں' کا قائل ہو کہ ہے ایماں یہی ۔۔۔ 'میں' کا ہی ہو جا کہ ہے ایقاں یہی

کافرِ مَن نیست اِلّا جاہلے
آنکہ نشناسد گُہے را از گِلے

اقبالؒ کی آرامگاہ

(بشیر النسا بیگم بشیر)

(۱)

ملت کی بے حسی سے تنگ آکے سو گیا ہے دُنیا کی شورشوں سے اُکتا کے سو گیا ہے
آہستہ چل صبا یاں، کیا تجھ کو ہو گیا ہے؟

پچھلے پہر کی کوئل! اے صبح کی مؤذن! کیوں شور کر رہی ہے؟ بیچین ہے تو کس بن!
آ دیکھ، اس جگہ پر، وہ تیرا ہمنوا ہے

اے چاند تجھ کو جس نے "شاعر کا دل" کہا تھا "قومی نشاں" کا تجھ کو منصب عطا کیا تھا
وہ میرِ کارواں اب مرقد میں جا بسا ہے

(۲)

ساکت ہے کیوں ہمالہ، اب کس کا منتظر ہے! اُس رفعتِ بیاں پر، اب کون مقتدر ہے
وہ نغمہ سنج تیرا خاموش ہو گیا ہے

اے آب رودِ گنگا، وہ دن ہیں یاد تجھ کو؟ کیا کیا جتا رہا تھا، اک خوش نہاد تجھ کو
فطرت کا وہ سندیسی، دُنیا سے جا چکا ہے

اے شام کی دلہن کو مہندی لگانے والے! اُس کو ذرا جگا دے، سب کو جگانے والے
مور اور چکور جاگے، اقبالؔ سو رہا ہے

(۳)

اقبالؔ! قوم تیری، بیدار ہو رہی ہے تُو سو گیا تو اب وہ، ہشیار ہو رہی ہے
اُٹھ دیکھ، جوش تیرا، ہر دل میں رونما ہے
پھر ایک بار کہہ دے "ہندوستاں ہمارا" "ہندوستاں ہمارا! سارا جہاں ہمارا"
ہاں اُٹھ، تری صدا کو عالم ترس رہا ہے
لاہور کی زمیں ہے، اقبال مند کتنی وابستگی سے تیری، ہے سربلند کتنی
اب کعبۂ عقیدت، یہ شہر بن گیا ہے
قلب و نظر کی دولت اک آہِ صبح گاہی فقرِ غیور سے ہے پیدا جلالِ شاہی
مردِ فقیر "شاہی مسجد" جگا رہا ہے

———(٥)———

سامانِ جنون

(از مرزا عزیز فیضانی دارالہدیٰ)

زندہ دل کو رکھ لیا اُلفت نے زنداں کیلئے
مُردہ دل کو مرگ نے شہرِ خموشاں کے لئے

ڈھونڈیئے دامن کے پُرزے اور پھر سلوائیے
کیجئے سامانِ جنونِ فتنہ ساماں کے لئے

کب ہُوا اُن کے لئے تو آہ! اے جوشِ جنوں!
تو گریباں کے لئے ہے یا بیاباں کے لئے

ہاں نہ خالی ہاتھ جائے عشق کے دربار سے
"پھر جنوں نے ہاتھ پھیلائے گریباں کیلئے"

پوچھیئے تو کس لئے دُنیا میں آیا تھا غریب
راحتِ دُنیا تو ہے سب میر و سلطاں کیلئے

جو بھی چیز ایجاد کی وہ سر بسر سامانِ موت
عقل نے کیسے کیا کیا نوعِ انساں کیلئے

پھر نکل آیا جنونِ عشق کے میداں میں دل
پھر بڑھے غازی نے بوسے تیغِ بُرّاں کیلئے

گھر اگر جنّت بنالے کوئی عزم و خُلق سے
کس لئے مرتا رہے پھر حور و غلماں کے لئے

دامنِ امّید کو جانے نہ دیجے ہاتھ سے
یاس و حرماں رہنے دیجے یاس و حرماں کیلئے

اِک بلا کا ہے سفر درپیش، ابھی منزل کہاں
اس جگہ غفلت نہیں موزوں حُدی خواں کیلئے

آ گیا وقتِ اذاں مطرب سے کہدو چُپ رہے
اب حُدی خوانی مناسب ہے غزلخواں کیلئے

وقتِ بیداری غزل خواب آور و شیریں عزیزؔ
عیب ہے، ذلّت کا باعث ہے سخنداں کے لئے

بقیہ از صفحہ ۱۶

بے راہرویوں کا باعث ہے۔ ملٹن نے تو اپنی "گمشدہ بہشت" میں کہا ہے "بہشت کی غلامی سے دوزخ کی بادشاہت بہتر ہے" لیکن مولانا موصوف اسکے قائل ہیں "حزب اللہ کی خدمت سے حزب الشیاطین کی امارت بہتر ہے"۔

ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا

ایکطرف تو یہ ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص جماعت سے کٹ گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اور اسکی موت بھی جاہلیت کی موت ہوگی اور دوسری طرف کانگریس کا امیر بنکر اس بات کو فخریہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ کیا اسلام کی یہی شاندار روایتیں ہیں جن پر آپ عمل کر رہے ہیں کیا آپکا رویہ اسلام کیلئے باعث شرم نہیں ہے اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا آپ ہی کے الفاظ ہیں مضامین آزاد حصہ سوم ملاحظہ ہو کانگریس کے ساتھ شمولیت کی بابت کیا ارشاد ہوتا ہے۔

"اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اسکے پیروؤں کو اپنی پولیٹکل پالیسی قائم کرنے کیلئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے مسلمانوں کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں انکو کسی جماعت میں شامل ہونیکی ضرورت نہیں وہ دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنیوالے اور اپنی راہ پر چلانیوالے ہیں ..... ہم تو خدا ایسے مسلمانوں کی بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انہوں نے اپنے سامنے دو ہی راستے دیکھے یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگریس میں شرکت"

اب مولانا موصوف سے دریافت کیجئے کہ آپنے کونسا راستہ اختیار کیا ہے اور آپکے دل میں کبھی اسکا خیال آیا کہ جس اسلام کو آپ اتنا ارفع و اعلیٰ سمجھتے تھے اسکا تو آپ کچھ نہیں بگاڑ سکے البتہ آپنے اپنے آپکو اس درجہ سے گرا لیا جو مسلمانوں میں آپکو حاصل تھا اور زمانہ مستقبل میں حاصل ہونے والا تھا افسوس کہ آپ سب کچھ جانتے ہوئے گمراہ ہو گئے۔

مولانا موصوف نے کانگریس کے اس صدارتی خطبے کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے "ہماری اس ایکہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں بنا کرتے ہیں اب ڈھانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ہندوستانی قوم اور ایک ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں علیحدگی کا کوئی بناوٹی عمل ہمارا اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہئے"

باقی ص۲۲ پر ملاحظہ فرمائیے

سال رواں کا زبردست علمی و مذہبی کارنامہ

ندوۃ المصنفین دہلی کی چار اہم کتابیں

اسلام میں غلامی کی حقیقت

غلامی کی حقیقت اور اس کے متعلق تمام ضروری مسئلوں کی تفصیل پر پہلی محققانہ کتاب ہے۔ جہاں تک اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کا تعلق ہے اب تک کسی زبان میں اس درجہ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔

یورپ کے ارباب تالیف و تبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے کے لیے جن حربوں سے کام لیا ہے اُن میں سلیوری کا مسئلہ بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے۔ اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ کر جدید ترقی یافتہ ملکوں میں اسلامی تبلیغ کے لیے بڑی رکاوٹ ہو رہی ہے بلکہ مغربی قہر و غلبہ کے سبب ہندوستان کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے اثر پذیر ہے "غلامی" جیسے اہم مسئلہ پر اگر آپ ستھری اور نکھری ہوئی اُردو میں دلچسپ، مفید اور موثر بحثیں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت، طباعت، کاغذ اس قدر اعلیٰ کہ لیتھو پریس اس کی مثال مشکل ہی سے پیش کر سکتا ہے۔ قیمت مجلد ۵؎، غیر مجلد ۴؎

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام

اس کتاب پر مفصل تبصرہ کے دوران میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایڈیٹر صدق فرماتے ہیں "قابل مبارکباد ہے وہ ادارہ جس نے "اسلام میں غلامی کی حقیقت" کے بعد ایسی مفید اور قابل قدر کتاب کا انتخاب اشاعت کے لیے کیا۔ اس کتاب میں مغربی تہذیب تمدن کی ظاہر آرائیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ موجودہ عیسائی قوموں کی مادی ترقیاں اسلامی تعلیمات ہی کے تدریجی آثار کا نتیجہ ہیں۔ مجلد سنہری ۴؎

اسلام کا اقتصادی نظام

اس کتاب میں اسلام کے پیش کیے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے۔

اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے تنگ آئی ہوئی قوموں کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نظام عمل ہے جسے اختیار کر کے ایک انسان کو انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔ آپ اگر اسلام کی اقتصادی وسعتوں کا مکمل نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ صفحات ۳۶۴۔ قیمت مجلد ۴؎ غیر مجلد ۳؎ کتابت طباعت اعلیٰ ولایتی کاغذ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریریں جنہیں پہلی مرتبہ اُردو میں منتقل کیا گیا ہے، انکے ساتھ سوشلزم کے حالات اور اُس کی موجودہ رفتار ترقی کے متعلق مترجم کی جانب سے ایک مبسوط اور محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ کتابت طباعت، کاغذ نہایت عمدہ صفحات ۲۴۴ مجلد سنہری ۳؎، غیر مجلد ۲؎

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

آزاد ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کی ممکن عملی تشکیل پر پہلا بصیرت افروز مضمون صفحات ۴۸ قیمت ۳؎

مینجر ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی

خداؐ ۔ رسولؐ ۔ امّت

خداؐ کا کلام پاک ہمارے پاس موجود ہے بس اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ قرآن حکیم کیا ہے مسلمانوں نے اس کی تفسیر میں کس قدر انہماک دکھایا۔ کونسی چیزیں تفسیر کے حق میں امراض ہیں اور صحیح تفسیر کا معیار کیا ہے، تو آپ کتاب

فنّ تفسیر

کا مطالعہ فرمائیں (صفحات ۲۰۰۔ طباعت وکتابت تسلی بخش (قیمت ۲؍ رعایتی ۱؍۰

رسول پاکؐ کی سیرت پاک اور حضورؐ کی صداقت و فضیلت پر اپنے تو شہادت دیتے ہیں۔ مگر بیگانوں، دشمنوں اور خصوصاً مشرکین قریش کی گواہی دلکش نظم کے پیرائے میں معلوم کرنی ہو تو نظم

شہادت اعدا بر فضیلت مصطفےٰ

ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت صرف ۰؍

(۲) حضورؐ کے کمال مدارج کا ایک نمونہ معراج جسمانی ہے اس کے لئے نقلی و عقلی دلائل درکار ہوں تو پنجابی منظوم

سی حرفی فیضانی بر معراج جسمانی

پڑھیے۔ کتابت طباعت وغیرہ وغیرہ۔ سرورق عکسی۔ قیمت صرف ۱؍

(۳) حضورؐ کے ۴۰ ارشادات عالیہ یعنی احادیث پاک کا اگر حسین و دلکش مجموعہ منظوم و منثور ترجمہ کے ساتھ دیکھنے کا شوق ہو تو

اربعین فیضانی (سراسر عکسی۔ رنگین)

دیکھیے جو اعلےٰ طباعت کا بہترین نمونہ ہے۔ قسم اوّل ہفت رنگہ قیمت ۵؍ قسم دوم قیمت ۲؍۰

امّت کے حالات کا نقشہ ملاحظہ کرنا ہو تو غم ملت میں ڈوبا ہوا

نغمۂ درد

پڑھیے۔ جو غفلت زدہ دلوں کو بھی غمخواری ملّت کے لئے بیدار و بے تاب کر دیتا ہے۔ قیمت صرف ۰؍

(۲) مسلمانانِ پنجاب کی مذہبی و اقتصادی حالت خصوصاً رسم و رواج قرض وغیرہ کا اندازہ لگانا ہو اور انکی اصلاح مقصود ہو تو نہایت سوز و درد اور محنت و کاوش سے لکھی ہوئی منظوم کتاب

فتنۂ رسومات

خریدیے جس میں نصیحت۔ عبرت وغیرہ کا سرمایہ دلچسپ انداز میں موجود ہے صفحات ۹۲ سرورق عکسی قیمت صرف ۴؍

یہ سب

تصنیفات فیضانی

(۱) اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاجپورہ لاہور (۲) مرزا محبوب عالم مبارک محلہ اسلامیہ پارک لاہور سے مل سکتی ہیں

Registered No. L. 4684

جلد ۲ عدد ۵ — مئی ۱۹۳۵ء



در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت (گرامی)

ماہنامہ پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے افکار عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

غلام سرور فگار

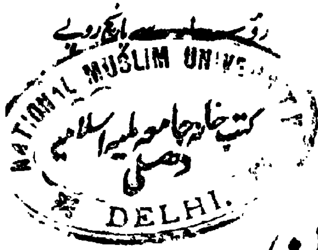
ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت سالانہ ۳ روپے بارہ آنے — قیمت فی پرچہ ۴ آنے

سالانہ قیمت

عوام سے دو روپے بارہ آنے

روؤسا سے پانچ روپے



فہرست مضامین

جلد (۲)	مئی سنہ ۱۹۴۰ء	عدد (۵)

افتتاحیہ:۔

قرآن اور گیتا کے خدا میں فرق — ایڈیٹر — ۲

مقالات:۔

اسرار خودی — غلام سرور فگار — ۱۴

مصلحانہ جنگ اور اسکی حقیقت۔ — سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور — ۲۵

ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر — علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ (ترجمہ) مولنا ظفر علی خان — ۳۳

السحر الحلال فی کلام علامۃ الاقبال — حافظ سراج الدین محمود بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ بہاولپور — ۴۸

منظومات:۔

اے وادیٔ پنجاب — غلام سرور فگار — ۵۲

ذوق وشوق — غلام سرور فگار — ۵۴

خطاب بہ مسلم — ازجناب امین حزیں سیالکوٹی — ۵۶

نقد و نظر — ایڈیٹر — ۵۸

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہوکر دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع ہوا



سخنہائے گفتنی

قرآن اور گیتا کے خدا میں فرق!

دُنیا میں جب کسی قوم پر ادبار آتا ہے تو عملی اور فکری دونوں قوتوں کے اعتبار سے اس میں ایک انحطاطِ عظیم رونما ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتی کہ اپنے زمانہ کی اس اخلاقی اور سیاسی شعور کا احساس کر سکے جو اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہو رہا ہو یہی نہیں بلکہ وہ اس پر دل سے رضامند ہو جاتی ہے کہ اپنے اس دَورِ انحطاط کو اپنی ہی تہذیب سمجھے۔

مسلمانوں کی دو صد سالہ حکومت کے بعد جن عناصر نے ہندوستان کے مسلمانوں کی کایا پلٹ دی اُن میں جہاں برطانوی سیاست دانی کو دخل ہے وہاں ہندوؤں کی ریشہ دوانیاں بھی بہت بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہیں۔ مسلمانوں کی سادہ لوحی سے ہندوؤں کی ذہانت نے جس قدر فائدہ اُٹھایا ہے برطانوی سیاست دان اس سے محروم رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی مُلک میں صدیوں تک کی بودوباند کے بعد ہندوؤں نے مسلمانوں کے مزاج سے پوری پوری واقفیت حاصل کر لی ہے اور اب وہ اتنے نبّاض ہو گئے ہیں کہ تقاضائے وقت کے ماتحت مسلمانوں کے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز کر دیتے ہیں جو بظاہر خوش ذائقہ اور مفید معلوم ہوتا ہے لیکن اثر کے اعتبار سے ایسا زہر یلا کہ اُس کا تریاق

ڈھونڈھے سے کہیں نہیں مل سکتا۔

مسلمانوں کے اس دورِ انحطاط میں ہندوستان کی آزادی کا جو اہم مسئلہ چھڑا ہوا ہے اس کی قیادت کی عنان بھی ہندوؤں نے اپنے ہاتھوں میں سنبھال رکھی ہے، اب مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے جو ہتھکنڈے وہ اختیار کر رہے ہیں اُن میں سے مہلک ترین وہ ہے جو مسلمانوں کے معتقدات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ گاندھی جی اس نفسیاتی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جس شخص یا جماعت کو قابو میں لانا ہو سب سے پہلے اس کے ذہن اور قوتِ فکر پر قابو پانا چاہئے اور جب اس میں کامیابی حاصل ہو جائے تو پھر عملی قوتیں خود بخود اس کے تابع ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی اکثر ایسے جذباتی افکار کا اظہار کرتے رہتے ہیں جن کا مقصد سادہ لوح مسلمانوں کی توجہات کو اپنی طرف کھینچنا ہوتا ہے۔

اس کا اظہار تو گاندھی جی کئی مرتبہ کر چکے ہیں کہ مسلمان میرے بھائی ہیں لیکن حال ہی میں اُنہوں نے ایک ایسے متنازعہ مسئلے کا باب کھول دیا ہے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافی اعتقادات کا سنگِ اساس ہے اس سے میری مراد ذاتِ باری تعالےٰ کا تصور ہے ۱۴ اپریل کو گاندھی جی نے ایک بیان شائع کیا ہے جو مسلم لیگ کے اس ریزولیوشن کے خلاف ہے جس کا مقصد ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان کے نظریے کی تشکیل ہے مسئلہ کے اس پہلو سے ہمیں اس وقت کوئی بحث نہیں ہے۔ اپنے بیان کی تائید میں جو زبردست دلیل انہوں نے پیش کی ہے وہ ہماری بحث کا موضوع ہے اور وہ یہ ہے۔

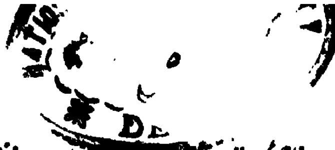
"ہندوستان کی اس قسم کی تقسیم کا اقرار کرنا میرے نزدیک خدا سے انکار کرنا ہے کیونکہ میرا یہ دلی عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا گیتا کا بھی خدا ہے"۔

یہ ہندوؤں کی ذہنیت کا ایک ادنےٰ سا کرشمہ ہے کہ وہ ہر حالت کے ماتحت اپنے آپ کو معذور ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ گاندھی جی جیسا دقیقہ شناس شخص اس حقیقت سے کبھی بے خبر نہیں ہو سکتا کہ گیتا اور قرآن مجید کی تعلیمات میں زمین آسمان کا فرق ہے اور جب تعلیمات

میں اتنا فرق ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں کے ذات باری تعالٰے کے تصوّر اور اُس کی تشکیل ایک ہو۔ اس اختلاف کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا خدا مختلف زمانوں میں اپنی ذات کے متضاد تصور کو پیش کر سکتا ہے ہرگز نہیں خدا جو ازلی اور ابدی ہے اُس کی ذات کا تصور ناقابلِ تغیّر ہے

مذاہبِ عالم پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے تصوّر کی بابت ہمیشہ دو نظریّے کارفرما رہے ہیں ایک یہ کہ بانی مذہب نے خود اپنی ضرورت اور ماحول کے مطابق خدا کا تصوّر گھڑ لیا ہو اور دوسرے خدا نے خود اپنے آپ کو دُنیا میں متعارف کیا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اوّل الذکر نوعیت کے خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں بانیوں کو کتنی دقّتیں پیش آئی ہوں گی۔ اور منطقی دلائل، فلسفیانہ موشگافیوں اور اپنی قوّتِ متخیّلہ پر اُنہیں کتنا زور دینا پڑتا ہوگا۔ ثانی الذکر صورت اس مسئلہ کا آسان ترین حل ہے کیونکہ جو خدا خود اپنے آپ کو متعارف کرتا ہے وہ اپنی شخصیت کو منوانے کا ذمہ دار اور اپنے ہر قسم کے صدورات کا خود ہی محافظ ہوتا ہے۔ اس لئے آئندہ سطور میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے سلسلہ میں منجملہ دیگر امور کے یہ بنیادی حقیقت بھی پیشِ نظر رہے گی۔

مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ قرآن مجید حضرت محمد صلعم کے ذہن کی تخلیق نہیں ہے بلکہ لفظ بلفظ الفائے ربّانی ہے جب یہ صورت ہے تو اس میں ذاتِ باری تعالیٰ کا جو بھی تصوّر ہے خدا نے خود اس کو دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے جس طرح آنحضرت صلعم سے پہلے جتنے نبی دُنیا میں آتے تھے لوگ اُن سے یہ سوالات کیا کرتے تھے۔ روح کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ اسی طرح مشرکین نے آنحضرت صلعم سے بھی سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ قرآن مجید میں خدا نے متعدد مقامات پر مشرکین کے اس قسم کے سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔ اور اپنی ذات کا تصوّر ایسے سادہ اور بلیغ الفاظ میں ادا کیا ہے کہ اس کے اثبات کے لئے فلسفیانہ موشگافیوں کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اس نے سب سے پہلے انسان ہی کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ تم خود اس کا زندہ ثبوت ہو میں نے تمہیں اپنی صورت



پر خلق کیا ہے اور تمہیں دُنیا میں اپنا نائب قرار دیا ہے اور وہ علم دیا ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو نہیں دیا یہ کہہ کر معترضین کا مُنہ بند کر دیا اور پھر مخاطب کر کے کہا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ "اے پیغمبر یہ لوگ جو تم سے خدا کا حال پوچھتے ہیں، تو تم ان سے کہو کہ وہ اللہ یگانہ ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ کوئی اس کی برابر یہ کا ہے"

اسلام سے پہلے لوگوں نے سینکڑوں معبود بنا رکھے تھے جس کی بنا پر وہ مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو چکے تھے اب خدا نے اپنی یکتائی کا اعلان کر کے اُن سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے اپنے معبودوں کو چھوڑ کر ایک معبودِ حقیقی کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیں۔ دوسرے لفظوں میں تمام اختلافات مٹا کر تمام دُنیا کے انسان ایک ہی سطح عبودیت پر آجائیں اور دوئی کو ترک کر کے ایک خدا کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لیں تاکہ سینکڑوں ملّتوں کے بجائے دُنیا میں ایک ہی ملّت کا وجود رہ جائے اور وہ ایک ایسی ملّت ہو جس میں یکتائی کا رنگ اتنا غالب ہو کہ اسکے افراد کے جملہ افکار و اعمال میں خدا کی شانِ احدیت پائی جائے اور ان کے دلوں میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو جائے کہ ہم سب کا خدا ایک ہے، ہم سب اس کے نزدیک برابر ہیں اس لئے ہمارا مقصد بھی ایک ہی ہونا چاہیئے اور اس کے حصول کے لئے ہمیں جو کوشش کرنی چاہیئے وہ پوری یکجہتی اور ایک ہی دستور العمل کے ماتحت ہونی چاہیے چنانچہ جن لوگوں نے خدا کے اس تصوّر کو قبول کیا اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑا کہ وہ بے نیاز ہے اور بندوں سے کسی چیز کا حاجت مند نہیں بلکہ جو لوگ اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں اس کے خزانوں کے دروازے ان کے لئے رات دن کھُلے رہتے ہیں چنانچہ جنہوں نے خدا کی یکتائی اور صمدیت کو جانا وہ اپنے سروں کو اس کے سامنے جُھکا کر کہنے لگے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں)، اس ایمان محکم کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خدائے یکتا کی شانِ صمدیت کو بھی اپنے اندر

جذب کر کے خود بھی سراپا خیر ہو گئے یہ خدا ہی کی شانِ صمدیت کا اثر تھا جو حضرت علیؓ میں اتنی طاقت آگئی تھی کہ اُنھوں نے نانِ شعیر پہ زندگی بسر کرتے ہوئے درِ خیبر کو اکھیڑ ا پھینکا تھا اور مرحب کے سر کو اڑا دیا تھا۔ اگر وہ دنیاوی اسباب کے محتاج رہتے تو کبھی ایسے کاموں کو سرانجام نہ دے سکتے جو بظاہر ناممکن نظر آتے تھے خدا کی یہ بے نیازی اس کے ماننے والوں کو بھی بے نیازی کی تعلیم دیتی ہے یہاں تک کہ بادشاہِ وقت کو بھی اپنے خاطر میں نہیں لاتے چنانچہ امام مالکؒ جو مدینہ میں رہتے تھے خلیفہ ہارون الرشید نے آپ کی خدمت میں عراق تشریف لانے کی استدعا کی تاکہ وہ آپ سے درس حدیث پڑھ سکے اور اس سلسلہ میں آپ کی بڑی تعریف و توصیف کی لیکن آپ نے جواب میں یہ کہا کہ میں حضرت محمد صلعم کا خادم ہوں اور اس کے علاوہ میرے دل میں کوئی خواہش نہیں میں یثرب کی رات کو عراق کے دن پہ ترجیح دیتا ہوں۔ میں یہاں آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہوں کیا تم مجھے اپنا غلام بنانا چاہتے ہو یہ نہیں ہو سکتا کہ خادم ملت تمہارا خادم ہو۔ اگر دین کا علم حاصل کرنے کی خواہش ہے تو خود میرے حلقہ درس میں آؤ۔ یہ تھی وہ شانِ بے نیازی جو خدائے بے نیاز سے رشتۂ محبت استوار کرنے سے انسان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ کہہ کر خدا نے اپنے آپ کو رنگ و نسل کے دائرہ سے بالاتر کر کے ایک غیر مادی رنگ میں پیش کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگلی اُمتیں اپنے نبیوں کو خدا کا بیٹا کہنے لگ گئیں تھیں اور یہ بات عام ہوتی جا رہی تھی جس کے روک تھام کی بڑی ضرورت تھی خدا نے جہاں اپنے آپ کو رنگ و نسل سے بالاتر کیا وہاں انسانوں کو بھی ہدایت کی کہ تم بھی اس قسم کی باہمی تفریق کو روا نہ رکھنا اور رنگ و نسل کی بنا پہ بنی نوع انسان کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم نہ کرنا دنیا کا جو انسان تمہارے ساتھ ایمان میں متفق ہے وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کے بعد وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ کہا اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین نے ایسی اشیاء کو خدا کا شریک اور سہیم قرار دے دیا تھا جو یا تو ان کے اپنے ہاتھوں

کی بنائی ہوئی تھیں یا وہ زوال پذیر اور فنا ہونے والی تھیں خدا نے مشرکین کے اس عقیدہ کی مذمت کرتے ہوئے اہلِ ایمان کو اس کی ترغیب دی کہ جیسے دُنیا میں میرے برابر کا کوئی نہیں ہے تمہیں بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے اندر وہ خصائل اور قوّت پیدا کرنی چاہیئے جس سے تم بھی دنیا میں منفرد ہو جاؤ اور بجائے بندہ آفاق ہونے کے میری طرح تم بھی صاحبِ آفاق کہلاؤ۔

خدا نے اس نہایت ہی مختصر سی سورت میں اپنی وحدانیت، شانِ بے نیازی، رنگ و نسل سے بے تعلقی اور اپنی برتری کا جو تصوّر پیش کیا ہے اس کی حقیقت اُس وقت تک بے معنی ہے جب تک خدا کے اس تصوّر کو ماننے والے ان خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے افکار و اعمال کے ذریعہ اس کا اظہار نہ کریں۔ مسلمانوں میں اس کی بیشتر نظیریں ملتی ہیں کہ اُنھوں نے اس پر عمل کیا۔ حضرت محمد صلعم، صحابہ کبارؓ، خلفائے راشدینؓ اور دیگر ائمہ کرام، اولیائے اُمت اور مجتہدین وقت کے مستند باشان کارناموں سے اُن کے سوانح حیات اور اسلامی تاریخ لیریز ہے۔

اپنی ذات کے تصوّر کے علاوہ خدا اپنی قدرت کا بھی اظہار کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے جن چیزوں کو اپنا معبود سمجھ رکھا تھا اُن پر اس بات کو واضح کرنا ضروری تھا کہ یہ چیزیں سب بے حقیقت ہیں اور ان کے قبضۂ قدرت میں کچھ بھی نہیں۔ قرآن مجید میں خدا نے اس قسم کے ادّعا کا ذکر کئی مقامات پہ کیا ہے جس میں مشرکین سے دریافت کیا ہے کہ کیا تم کو معلوم ہے آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے آسمان سے تم لوگوں کے لئے پانی کس نے برسایا ہے اور پھر پانی کے ذریعہ سے یہ خوشنما باغ کس نے اُگائے ہیں یہ تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ تم اِن درختوں کو اُگا سکو۔ کیا تم بتا سکتے ہو زمین کو کس نے آدمیوں اور جانوروں کے ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور اس کے بیچ بیچ ندی نالے بنائے اور اس کے لئے اٹل پہاڑ اور میٹھے اور کھاری دو سمندروں میں حدِ فاصل رکھی، کون ہے جو تم لوگوں کو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہ دکھاتا ہے اور کون ہے جو مینہ برساتا ہے، کون ہے جو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے یہ ظاہر کرنے

کا مطلب یہ ہے کہ سوائے خدا کے کوئی نہیں ہے جو ایسا کر سکے نیز اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ان اشیاٗ کے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائے اور جو لوگ فائدہ نہیں اٹھاتے وہ کفرانِ نعمت کرتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں ہے۔

اپنی قدرت کو ظاہر کرنے کے بعد خدا نے یہ ضروری سمجھا کہ انسان کو اپنی صفات کی بھی معرفت کرائے چنانچہ قرآن مجید میں جابجا اس کا ذکر ہے کہ میں رحمان ہوں، رحیم ہوں، قہار ہوں، جبار ہوں، قدوس ہوں، عزیز ہوں، متکبر ہوں، حکیم ہوں وغیرہ وغیرہ اس سے ایک تو مقصد خدا کا بندوں کو اپنی معرفت سے روشناس کرانا ہے اور دوسرے انہیں بھی بندۂ مولا صفات بنانا ہے۔ اگرچہ بظاہر ان میں سے اکثر صفاتِ باری تعالےٰ متضاد کیفیات کی آئینہ دار ہیں لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ ایک ہی ذات کے مختلف آیات ہیں۔ وہی ان سب کا مبدء ہے۔ اور وہی مرجع۔ اس کی ذات سے الگ کوئی دوسری طاقت نہیں ہے جس کی جانب ان کو منسوب کیا جائے انسان کو دنیا میں اپنا نائب مقرر کرکے اس کی تاکید کی کہ وہ بھی اپنے اندر خالقِ حقیقی کی یہی صفات پیدا کرے۔

یہ ہے قرآن مجید کے خدا کا تصور جو خدا نے خود پیش کیا ہے اور حضرت محمد صلعم نے اپنے قلبی احساسات اور زندگی کے عملی پہلوؤں میں اس کو متشکل کر کے دنیا میں پہلے اس کی خود نظیر قائم کی اور پھر اجتماعی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک امت بنا کر اس کے وجود میں اسی روح کو پھونکا اور اس کے سیاسی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، اقتصادی غرضکہ جملہ معاملات پر اس کو پھر حاوی کر دیا۔

اب لیجئے گیتا کے خدا کا تصور۔ اس میں خدا کا تصور ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ وشنو کا اوتار ہے جس نے کرشن جی کا روپ دھارن کیا ہے اور وہ ہر زمانے میں مختلف روپ دھارن کرتا رہتا ہے وہ دنیا میں قوی ترین ہے ازلی ہے ابدی ہے دنیا کو قائم رکھنے والا ہے سب سے برتر ہے اگرچہ وہ دنیا کی ہر چیز میں سائر و دائر ہے لیکن سب سے جدا ہے ہر چیز اس کے اندر ہے لیکن وہ کسی چیز میں جاگزیں نہیں

وہ تمام موجودات میں سے اعلیٰ ترین ہے وہ دنیا کو پیدا کرتا ہے زندہ رکھتا ہے اور فنا کرتا ہے وہ ہر خواہش سے پاک ہے لیکن اس کی تمام سرگرمیاں صرف دُنیا کے لئے ہیں۔

یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ یہ تصوّر کرشن جی کے تخیّل کی تخلیق ہے جو گیتا کا ہیرو ہے۔ اس تصوّر کو انھوں نے اپنی ضرورت اور ماحول کے مطابق جامہ پہنایا اور وہ جامہ کون سا تھا جو اس کو پہنایا گیا، وہ انسانی جامہ تھا جس کے اندر وحشیانہ قوّت کی رُوح پھونکی گئی اور محبّت کی رُوح کو اس کے اندر سے ہمیشہ کے لئے خارج کر دیا گیا گیتا کے گیارھویں باب میں کرشن جی اپنے خدا کی شکل کو ارجن کی رُوحانی آنکھوں کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسا انسانی ڈھانچہ نظر آتا ہے جو تمام دُنیا کو محیط ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑا جس کی کئی آنکھیں، کئی منہ، کئی بازو اور کئی سینے ہوتے ہیں سر تا پا شعلے کی طرح فروزاں بلکہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جسم میں سینکڑوں آفتاب سما گئے ہیں اس کی لمبی لمبی ٹانگیں اور بازو اور بڑے بڑے دانت اور منہ میں سے آگ کے شعلوں کا نکلنا ایک خوفناک منظر پیش کرتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ اس کے ہاتھوں اور گلے میں زیور ہوتا ہے۔ اس خوفناک منظر کو دیکھ کر ارجن دہشت زدہ ہو جاتا ہے اس کا جسم خوف کے مارے کانپنے لگ جاتا ہے اور اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھ جاتا ہے اس بے بسی کی حالت میں وہ زمین پر گر پڑتا ہے اور رحم کا طلبگار ہو کر کہہ اٹھتا ہے "میں نے وہ چیز دیکھی ہے جو آج تک کسی نے نہیں دیکھی میرا دل خوش ہے لیکن خوف کے مارے بیٹھا جاتا ہے"

گیتا میں خدا کا یہ خوفناک تصوّر یقیناً قوّتِ متخیّلہ کا ایک زبردست کارنامہ ہے جسکی بنا پر کرشن جی خود وشنو کے رُوپ میں خدا بن بیٹھے اور برہما جو اس سے پہلے ویدوں کا خدا مانا جاتا تھا اُسے اپنا نائب قرار دیا

یہ دعویٰ کہ گیتا میں خدا کا تصوّر توحید پر مبنی ہے قطعاً غلط ہے اس لئے کہ کرشن جی اپنے آپ کو

ایک اعلیٰ ترین خدا قرار دیتے ہیں یہ کہیں نہیں کہتے کہ میں ہی ایک خدا ہوں یا میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے جو توحید کی شرطِ اوّل ہے گیتا میں کرشن جی نے علاوہ برہما کے دیگر دیوتاؤں کی پرستش کی بھی عام اجازت دے رکھی ہے جہاں یہ کیفیت ہو کہ ایک بڑا خدا اپنے ماتحت کئی چھوٹے چھوٹے خدا رکھتا ہو اور اسی میں اپنی شانِ جبروت سمجھتا ہو وہاں توحید کا کیا ذکر؟

گیتا کے خدا کا تصوّر، اس کی شکل اور اس کی وحدانیت کا رنگ تو آپ نے دیکھ لیا اب اس کے عملی پہلو پر نظر ڈالئے جس کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ وہ خود تو خواہشات سے پاک ہے لیکن اس کی تمام سرگرمیاں دنیا کے لئے ہیں گیتا کے خدا نے دُنیا کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ایک روح اور دوسری مادہ اور ساتھ ہی یہ حکم لگا دیا یہ "دُنیا دُکھوں کا گھر ہے انسان خواہشات کی بنا پر اس کے جال میں پھنستا ہے اس لئے ان خواہشات کو سینے کے اندر ہی دفن کر دینا چاہئے دُنیا کے تمام کام اپنے طور پر ہو رہے ہیں انسان کو ہرگز یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ میں بھی کچھ کر رہا ہوں کسی فعل کا اپنے آپ کو ذمہ وار ٹھہرانا سخت غلطی ہے جو لوگ روشن دماغ ہیں وہ اِن آنکھوں سے دیکھنے، اِن کانوں سے سُننے، اِس ناک سے سونگھنے، اس منہ سے بولنے اور اِن ہاتھوں سے کام کرنے کے باوجود سمجھتے ہیں کہ میں کچھ نہیں کر رہا بلکہ میرے حواس مصروفِ کار ہیں اور حواس کا مصروفِ کار رہنا کوئی بُری بات نہیں کیونکہ یہ حواس بھی مادّی ہیں اور دنیا اور اس کے جملہ کاروبار بھی مادّی۔ دنیا کے کاروبار سے اپنا تعلق ظاہر کرنا گناہ ہے"

"انسان کے کاروبار کا حلقہ اس کی اس ذات تک محدود ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے اُس حلقہ کار سے اسے باہر نہیں جانا چاہئے خواہ اسے اس حلقہ کار سے نفرت ہی کیوں نہ ہو اور اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہو مرتے دم تک اسے اس کا پابند رہنا چاہئے اگر وہ اس کو چھوڑ دے گا تو اس کی روح کی نجات خطرے میں ہو جائے گی اس کا مطلب یہ ہے کہ برہمن کو اپنا کام کرنا چاہئے، کشتری

کو اپنا اور شودر کو اپنا "

" انسان کی نجات کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا سے بالکل بے تعلق ہو کر یعنی دنیا کی خوشی، رنج، فتح و شکست، بھوک اور سیری، گرمی اور سردی کے اثر وغیرہ وغیرہ سے بالاتر ہو کر یوگی بن جائے، اور یوگ کے طریقوں پر عامل ہو اور بس "

قارئین کرام گیتا کے متصوّرہ خدا کی تعلیم سے بھی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ انسان کے دنیا میں گی بسر کرنے کے لئے کہاں تک زہرِ قاتل کا حکم رکھتی ہے اس تعلیم کے مطابق انسان کی انفرادی حیثیت سے تو موت واقع ہو جاتی ہے لیکن اجتماعی دنیا میں تو وہ پیدا ہی نہیں ہوتا ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ایک ویرانہ ہے جس میں انسان آج پیدا ہوا اور کل مر گیا ان معنوں میں اُس کی زندگی کتے کی زندگی سے بھی بدتر ہے اور خدا کے تخلیقِ کائنات کی حیثیت بھی بچوں کے گھروندے بنانے سے زیادہ نہیں رہتی۔

میرے نزدیک خدا کے تصور کی اہمیت کا معیار انسان ہے دیکھنا صرف یہ ہے کہ کس خدا نے انسان کی عظمت و برتری کو دنیا میں قائم رکھنے کے لئے اس کے سامنے بہترین دستورالعمل پیش کیا اور اس کے مقابلہ میں دنیا کو کیا حیثیت دی جو خدا یہ کہتا ہے کہ میں نے دنیا اور اس کی جملہ موجودات کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے اور انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ان کو اپنے تصرّفات میں لائے اور اس طرح اپنی مخفی قوتوں کو معرضِ عمل میں لائے۔ اس خدا کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انسان اور اس دُنیا کو بیکار پیدا نہیں کیا بصورتِ دیگر خدا کے تصوّر کو کبھی قبول نہیں کیا جا سکتا اور کہا جائے گا کہ ایسا خدا اور مذہب کسی انسان کی ذہنی اختراع ہے۔

گاندھی جی گیتا کے جس خدا کی بابت کہتے ہیں کہ یہ وہی ہے جو قرآن کا ہے مسلمان اس کو ماننے کے لئے کبھی تیار نہیں۔ گیتا اس وقت بھی موجود ہے جو شخص اس میں غور کرے گا اس کو معلوم ہو جائے گا کہ گاندھی جی کا یہ کہنا کچھ تو اُن سادہ لوح مسلمانوں کی خاطر ہے جن کو انہوں نے اس وقت اپنے ساتھ ملا رکھا ہے

اور کچھ دوسرے مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرنا ہے جو حالتِ تذبذب میں ہیں ورنہ حقیقت سے اس کو کوئی تعلق نہیں میں نے سطورِ ما سبق میں گاندھی جی کے اس فقرے کی قلعی کو کھول دیا ہے اور قرآن مجید اور گیتا کی رُو سے بتا دیا ہے کہ دونوں کے خدا کے تصوّر میں کتنا فرق ہے اور کیوں ہے؟

یہ اُن مسلمانوں کے اتحاد کا صلہ ہے جو آج کل کانگرس کے ساتھ شریک کار ہیں غالباً اُن کا بھی یہی عقیدہ ہوگا۔ وہ دن دُور نہیں جب گاندھی جی یہ کہہ کر مسلمانوں کو تبدیلِ مذہب پر اُکسانے لگیں کہ جو اسلام کی تعلیمات ہیں وہی ویدوں کی تعلیمات ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائیں۔ یہی وہ خطرات ہیں جن کے پیشِ نظر ہم مسلمانوں کو خبردار کر رہے ہیں کہ تم کانگرس کے دامِ تہ ور تہ میں نہ آنا کیونکہ اُس کی یہ دلی خواہش ہے کہ ہندوستانی متحدہ قومیّت کے نشہ میں مسلمانوں کو اُن کے مذہب و اخلاق اور تہذیب و معاشرت سے بالکل بیگانہ بنا دیا جائے یہاں تک کہ اُن کی زندگی کا کعبۂ مقصود بجائے مکہ معظمہ کے ہردوار یا بنارس ہو جائے۔

لیکن اسلام کے لئے یہ پہلا مرحلہ نہیں ہے اس قسم کے کئی مرحلے اس ساڑھے تیرہ سو سال کے عرصہ میں اُسے پیش آ چکے ہیں اور جب تک باطل کا وجود دنیا میں باقی رہے گا پیش آتے رہیں گے جس طرح حق ہمیشہ فتحیاب رہا ہے اور باطل کے ساتھ اس کی شرکت نہیں ہو سکی اسی طرح اب بھی نہیں ہو سکتی اقبالؒ نے اسی نکتہ کو ذیل کے شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے

شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اور قرآن مجید میں بھی صراحتاً اس کا ذکر آیا ہے۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (تم ایسا ہرگز نہ پاؤ گے کہ کوئی جماعت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان بھی رکھتی ہو اور پھر اللہ اور رسول کے دشمنوں کے ساتھ دوستی بھی رکھے،

یہ گاندھی جی کی اسلام کی تعلیمات سے ناواقفیت کا سبب ہے کہ وہ ایسا گمراہ کن پراپگنڈہ شروع کر دیتے ہیں۔ کاش کہ وہ نیک نیتی سے اسلام کا مطالعہ کرتے تو یہ حقیقت اُن پر آئینہ ہو جاتی کہ حق حق ہے اور باطل باطل اس لئے جو حق کا خدا ہے وہ باطل کا خدا نہیں ہو سکتا اور نہ حق اور باطل دونوں کے مابین اتحاد کی کوئی صورت ممکن ہے خواہ وہ سیاسی ہی کیوں نہ ہو۔

تصحیح:۔ اپریل کے پرچہ میں صفحہ ۲۱ سطر ۲ میں شہنشاہِ وقت کے آگے بریکٹ میں بجائے جہانگیر کے علاؤالدین خلجی پڑھا جائے۔ اور اسی طرح اسی صفحہ پر چوتھی سطر میں "جب یہ حکمنامہ جہانگیر کے پاس پہنچا" کے بجائے "علاؤالدین خلجی کے پاس پہنچا" پڑھا جائے۔

ایڈیٹر

اسرارِ خودی

ادبیاتِ اسلامیہ کی اصلاح

(غلام سرور نگار)

(۵)

گرم خوں انساں ز داغِ آرزو　　آتش ایں خاک از چراغ آرزو

انسان کا شرف اور اُس کی فضیلت اسی میں ہے کہ وہ داغِ آرزو کے سوز سے پیہم جلتا رہے اس کی آرزوؤں کی کوئی انتہا نہ ہو حُسن کی شوخیاں اورعشق کی گرمیاں اس کے داغِ آرزو کو زیادہ روشن اور زیادہ گہرا بناتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ داغ شعلے کی طرح بھڑک اُٹھے اور اُس کی مُشتِ خاک کو سراپا آتش بنا دے۔

از تمنائے بجام آمد حیات　　گرم خیز و تیز گام آمد حیات

آرزو آفرینیوں ہی سے انسان زندگی کے مقصد کو پا سکتا ہے اور اسی کے زورِ نفس سے اُس کے خون میں حرارت پیدا ہوتی ہے اور وہ پیکارِ حیات میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیتا ہے۔ یہ ایک ایسا فطری جذبہ ہے جو دُنیا کی ہر چیز میں موجود ہے اور اُن کی زندگی کا تمام تر انحصار اسی پر ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام جو دینِ فطرت ہے اُس نے ترکِ خواہشات کی سختی سے مخالفت کی ہے

اور رہبانیت کو انسانی زندگی میں کوئی جگہ نہیں دی۔ اقبالؒ کے نزدیک ایک روح ایسی ہے جو انسان کے وجود کی مشینری کو چلاتی ہے اور دوسرے روح وہ ہے جو انسان کی زندگی کو مصروفِ عمل رکھتی ہے مؤخر الذکر روح تمنّا ہے ورنہ اوّل الذکر روح کے اعتبار سے انسان اور دیگر حیوانات وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہے انسان کی زندگی کا مقصد محض زندہ رہنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے

زندگی مضمونِ تسخیر است وبس آرزو افسونِ تسخیر است وبس
زندگی صید افگن ودامِ آرزو حُسن را ازعشق پیغامِ آرزو

خدا نے انسان کو مخاطب کرکے فرمایا سَخَّرْنَا لَکُمْ مَافِی الْاَرْضِ جمیعاً اور انسان کو بھی اپنی زندگی کا مقصد یہی سمجھنا چاہئے کہ وہ کائنات کی تمام مخفی قوّتوں کو تسخیر کرے لیکن جب تک تمنّا روح انسان کے وجود میں سرگرم کار نہ ہو اس کی عملی قوّتیں کبھی بیدار نہیں ہوسکتیں اور نہ اُن میں دوامی حرکت نشوونما پاسکتی ہے دوسرے لفظوں میں تمنّا ایک ایسی روحِ عمل ہے جس کی تاثیر سے انسان میں وہ قوّت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

از چہ رُو خیزد تمنّا دمبدم ایں نوائے زندگی را زیر وبم
ہرچہ باشد خوب و زیبا و جمیل در بیابانِ طلب ما را دلیل
نقشِ اُو محکم نشیند در دلت آرزوہا آفریند در دلت
حُسن خلاقِ بہار آرزو ست جلوہ اش پروردگارِ آرزو ست

اب سوال یہ ہے کہ یہ تمنّا کس طرح پیدا ہوتی ہے جس پر زندگی کے مقاصد کی کامیابی اور ناکامیابی کا انحصار ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیز بھی دُنیا میں حسین ہو جاذبِ توجّہ ہوتی ہے اور انسان کے ذوقِ جستجو کو تیز کرتی ہے اس کا نقش انسان کے دل میں مضبوطی سے جاگزیں ہوجاتا

ہے اور اس کے دل میں ایک دنیائے آرزو پیدا ہو جاتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ حُسن کا جلوہ آرزو کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حُسن کیا چیز ہے جس کی بے پناہ طاقت انسان کو بے قرار آرزو کر دیتی ہے۔

ہیگل کے نزدیک "حُسن" حواس کے تصورات کے مادّی مظاہرہ کا نام ہے انسان کا ذہن مختلف صورتوں کی تشکیل کرتا ہے اور کائنات میں جو صورت اس کی ذہنی صورت کے مشابہ نظر آتی ہے اس کے ساتھ اُسے بلا ارادہ وابستگی ہو جاتی ہے ورنہ حُسن کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے۔

کانٹ جسے فلسفۂ جمالیات کا بانی کہا جاتا ہے اس کی رائے یہ ہے کہ حُسن کے معروضی اور موضوعی دونوں پہلو ہیں یعنی جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں اور اس سے ہمیں جمالی مسرّت حاصل ہوتی ہے تو اس چیز کو حسین، جمیل اور خوبصورت کے لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں جہاں معروض یعنی وہ چیز جس کی طرف دیکھا جائے جاذب ہوتی ہے وہاں موضوع یعنی دیکھنے والے یا محسوس کرنے والے کی رغبت اور طبیعت کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ جس چیز کو ہم آج حسین دیکھتے ہیں کچھ دنوں بعد ہماری نظروں سے وہ گر جاتی ہے تو کیا وہ چیز فی الحقیقت حُسن سے عاری ہو گئی۔ نہیں، یہ ہمارے جذبی مطالبہ کی کمی کا باعث ہے کہ ہم اُس چیز سے پہلے کی طرح متاثر نہیں ہو سکتے۔

اقبالؒ بھی اگرچہ حُسن کے اس موضوعی اور معروضی ربط و تعلق کے کسی حد تک قائل ہیں اور اس کے جلوے کو پروردگارِ آرزو قرار دیتے ہیں لیکن آپ کے نزدیک انسان کی قوّت شعور جب مدارج علیہ پر فائز ہو جاتی ہے تو وہ خود خلاقِ حُسن بن جاتا ہے۔

سینۂ شاعر تجلّی زارِ حُسن　　خیزد از سینائے اُو انوارِ حُسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر　　فطرت از افسونِ اُو محبوب تر

از دلش بلبل نوا آموخت است ۔ غازہ اش رخسارِ گُل افروخت است

سوزِ اُو اندر دلِ پروانہ ہا ۔ عشق را رنگیں ازو افسانہ ہا

بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش ۔ صد جہانِ تازہ مضمر در دلش

در دماغش نادمیدہ لالہ ہا ۔ ناشنیدہ نغمہ ہا، ہم نالہ ہا

آپ شاعر کو قوتِ شعور کی ترقی کے اس مقام پر پیش کرتے ہیں جہاں جذبی مطالبہ اس کی فطرت کے ساتھ اس طرح مل جاتا ہے کہ موضوع اور معروض کا فرق مٹ جاتا ہے جہاں تک حُسن کے معروضی پہلو کا تعلق ہے اقبالؒ کا یہ نظریہ ہے کہ دنیا تغیّر پذیر ہونے والی صورت کا نام ہے اس لئے حُسن بھی اس اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا چنانچہ بانگِ درا میں "حقیقتِ حُسن" کے عنوان سے جو نظم آپ نے کہی ہے اُس کے پڑھنے سے حُسن کی حقیقت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور حُسن کے زوال پذیر ہونے کی وجہ اقبالؒ کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا خالق زمانہ ہے لیکن اس کے برعکس شاعر کا ذوقِ حُسن نگاہِ حق کا پروردہ ہے اس لئے آشنائے زوال نہیں ہو سکتا۔

شاعر کی تخیلی دنیا کا تصوّر اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ اُس کی نگاہ جس چیز پر پڑ جاتی ہے اسے حسین سے حسین تر بنا دیتی ہے وہ فطرت کے حسین جلووں کو اپنی شخصیت میں جذب کر کے اُن کے پیکر میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے جس سے اہلِ نظر کو وہ زیادہ محبوب دکھائی دیتے ہیں فطرت بھی ایسے شاعر کے انتظار میں مضطرب رہتی ہے جو نہ صرف خود اس کے حُسن کی قدردانی کرے بلکہ اپنے ذوقِ حُسن سے اس کو زیادہ حسین بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔

نہ جانے کتنی مدت سے بلبل آہ و پکار کر رہا ہے پھول صحنِ چمن میں کھل رہے ہیں اور پروانہ شمع پر فدا ہو رہا ہے اور دنیا اس نظّارے کو کب سے دیکھتی چلی آئی ہے لیکن اگر سب سے پہلے کسی نے بلبل کی نوا میں اپنے نالہ ہائے جانگداز کے اثر کو بھر اور پھول کی رعنائیوں میں اپنی حُسنِ نگاہ سے شوخیاں

پیدا کیں اور پروانے کے دل کی آگ کو اپنے سوزِ دروں سے اور بھڑکایا اور اس طرح گل و بلبل اور پروانہ و شمع کے عشق کی داستان کو صفحۂ عالم پہ رنگین کیا تو وہ شاعر کا فنِ کمال تھا بلکہ بلبل و گل اور شمع و پروانہ کی ترجمانی تک ہی اس کے تخیّل کی پرواز محدود نہ رہ سکی وہ خود کبھی بلبل تنہا بن کر شاخِ گل پر نغمہ پیرا ہوا اور کبھی پھول کی طرح بطنِ شاخ سے پھوٹا، کبھی پروانہ وار شمعِ ملّت پہ نثار ہوا اور کبھی شمع کی مانند خود گذاری کا باعث ہوا اور کبھی شبنم کے رنگ میں گل پر ٹپکا۔ یہ ہے شاعر کی معجزہ نمائی جس سے نہ صرف وہ خود زندۂ جاوید ہوا بلکہ اس نے اِن چیزوں کو بھی زندہ جاوید کر دیا

طرفہ افسوں نقش او برما دمد ۔۔۔ خامہ اش کوہے بہ موئے می کشد

فکرِ اُو با ماہ و انجم ہم نشیں ۔۔۔ زشت را ناآشنا خوب آفریں

شاعر اپنے عالمِ خیال میں سینکڑوں دنیاؤں کی تخلیق کرتا ہے جس کا تصوّر انسانوں کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ وہ انہیں ایسے پھولوں سے آراستہ کرتا ہے کہ انسانوں کی نگاہیں اُن کی رنگینوں سے قطعاً ناآشنا ہوتی ہیں اور بلبل ان میں اس طرح نغمہ سرائیاں اور نالہ وزاریاں کرتے ہیں کہ کانوں نے کبھی سُنے نہیں ہوتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کی تخلیق کا تعلق بے بنیاد مخلوقات ہنر سے ہوتا ہے یہ ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ شاعر خلاقِ معانی ہوتا ہے اس کا شدّتِ احساس مظاہرِ فطرت اور اس کی پیدا کی ہوئی دنیاؤں کے مابین ایک روحانی رابطہ قائم رکھتا ہے، وہ اپنی قوّتِ وجدان کے ذریعہ اِن چیزوں کی روح پر قابو پالیتا ہے اور پھر اُن تمام کیفیات کو اپنے مخصوص کائناتی تصوّر کے رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے جو اہلِ نظر کو کسی فوق البشر کا کارنامہ معلوم ہوتی ہیں، شاعر فطرت کی اُچاٹ کر دینے والی یک رنگی کو چھوڑ کر خواہ آسمان پر بھی کیوں نہ چلا جائے وہاں بھی اس کے پیشِ نظر وہی زمینی مسرّت اور مسائل حیات ہوتے ہیں جن کا حل وہ عالم علوی کی ارواح سے چاہتا ہے چنانچہ جاوید نامہ اس کا زندہ ثبوت ہے۔

شاعر اپنے زورِ تخیل سے عجیب و غریب نقوش ہمارے سامنے پیش کرتا ہے یہ ہماری کوتہ بینی ہوتی ہے کہ ہم اُن کو بے بنیاد سمجھنے لگ جاتے ہیں ورنہ اُن کو حقائق اشیاء سے ایک گہرا تعلق ہوتا ہے اور ہم اُسے معلوم کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہماری نگاہ حقیقت بیں ہو وہ جب کہتا ہے کہ میں نے ایک نگاہ سے دونوں جہاں کا نظارہ کیا ہے اور عشق کی وادی اگرچہ بہت دُور و دراز ہے لیکن کبھی سو سال کی مسافت ایک آہ میں ہی طے ہو جاتی ہے تو ہم ان باتوں کو سُن سُن کر باور نہیں کرتے رات کو وہ ستاروں کا ہم نشیں ہو کر ہمیں بہجت افروز نغمے سُناتا ہے۔ صبح کو ہماری بے حسی پر شبنم کے آنسو روتا ہے اور شام کو شفق کی سُرخی سے ہمارے پژمردہ دلوں کو خونِ شہادت کی یاد دلاتا ہے اُس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ہر چیز میں افادی پہلو مضمر ہے جس درخت کی لکڑی کا منبر نہ بن سکے وہ اس سے تختۂ دار بنا لیتا ہے، کائنات کا تاریک سے تاریک اور روشن سے روشن پہلو اس کی نظروں میں زندگی کا بیکراں جذبہ لئے ہوتا ہے وہ موجودات کی متضاد کیفیات کو وحدتِ فکری کی ایک سطح پر لا کر اُسے فلسفۂ حیات کا سنگِ اساس قرار دیتا ہے۔

خضر و در ظلماتِ او آبِ حیات		زندہ تر از آبِ چشمش کائنات

وہ خضرِ وقت ہوتا ہے لیکن ایسا خضر نہیں جو سکندرِ اعظم کو چشمۂ آبِ حیواں کے کنارے تک لے جا کر پیاسا واپس لے آتا ہو وہ ایسے آبِ حیات پر موت کو ترجیح دیتا ہے جس کی جستجو میں خضر کا احسانمند ہونا پڑے وہ اپنے سینے کی وادی سے چشمۂ زندگی کو جاری کر دیتا ہے جس کا پانی آنکھوں کے راستے بہہ کر تمام دنیا کو سیراب کرتا ہے اور جو شخص ایک قطرہ بھی پی لیتا ہے اُسے حیاتِ دوام حاصل ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک اس چشمۂ آبِ حیواں کا دہانہ شاعر کی آنکھ کی پُتلی ہوتی ہے اقبالؒ نے بانگِ درا میں شاعر کی حقیقت کو اس طرح واضح کیا ہے ؎

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم

منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

شاعر جب قوم کے دردِ محبت سے بے قرار ہو کر اشکبار ہوتا ہے تو اس سے قوم کے خزاں رسیدہ چمن میں ایسی بہار آجاتی ہے کہ اس کے پھول پھر کبھی پژمردہ نہیں ہوتے۔ قوم و ملت کے لئے دراصل ایسے ہی خضر کی ضرورت ہوتی ہے جس کا تعلق اس کے ساتھ ایسا ہو جیسا کہ انسان کے جسم کے ساتھ اس کی آنکھ کا ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے اپنی نظم موسومہ "خضرِ راہ" میں خود خضر بن کر جس طرح قوم کی رہنمائی کی ہے وہ اس کا زندہ ثبوت ہے۔

ما گراں سیریم و خام و سادہ ایم — در رہِ منزل ز پا اُفتادہ ایم
عندلیب اُو نوا پرداخت است — حیلۂ از بہرِ ما انداخت است
تا کشد مارا بہ فردوسِ حیات — حلقۂ کامل شود قوسِ حیات

مسلمان اس وقت غفلت کی نیند میں ہیں اور اُن کے قدم منزل کی جانب نہیں اُٹھتے یہ اُن کی خامکاری اور سادہ لوحی کا ثبوت ہے لیکن شاعر بلبل بن کر شاخِ گل پر نغمہ سرائی کر رہا ہے اور باآوازِ بلند کہہ رہا ہے ؎

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دِل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دِل ہوں

اُس نے یہ انداز کیوں اختیار کیا ہے اور یہ حیلہ سازی کس لئے کر رہا ہے؟ اس لئے کہ

مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرے اور اُس فردوسِ حیات کی جانب اُن کی رہنمائی کرے جو اُن کا مقصدِ وحید ہے اور جسے وہ فراموش کر چکے ہیں شاعر اس لئے نغمہ سرائی نہیں کر رہا کہ خدانخواستہ اپنے کمالِ فن کی داد کا طالب ہے بلکہ اس کے دل کی آنکھیں اس کو اچھی طرح دیکھ رہی ہیں کہ قوم میں ایک انتشارِ عظیم واقع ہو چکا ہے وہ اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کر رہا ہے کہ اس ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار لے جانا چاہیئے۔ اور وہ قطار کونسی ہے ؟ وہ قطار وہی ہے جس کی زمام آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے قافلہ سالار کے ہاتھوں میں تھی اور اس قطار میں صحابۂ کبار رضی اللہ عنہم ایسے محبّانِ صادق شامل تھے۔ وہ یارانِ نجد کے اس حلقہ کو حلقۂ کامل قرار دیتا ہے اور اس نغمہ سرائی سے اس کی یہ غرض ہے کہ مسلمان جن میں کمان کی طرح لچکنے کی صلاحیت موجود ہے اُن کی زندگی کے دونوں سروں کو اس حلقۂ کامل کے ساتھ ملا دے اور اس کی زندگی کے دونوں سروں سے مراد ——— دین اور دنیا ہے ——— یعنی انہیں سعادتِ دارین حاصل ہو یہ ہے اُس کے فردوسِ حیات اور حلقۂ کامل کا تخیّل ۔ ان دونوں میں دراصل کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ کسی مسلمان کے لئے فردوسِ حیات یہی ہے کہ اس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں میں شمار کرانے کا فخر حاصل ہو جائے دوسرے لفظوں میں تکمیلِ انسانیت کے وہ تمام مدارج طے کرلے جن کی بنا پر اُسے مردِ کامل کہا جا سکے اور جب وہ مردِ کامل بن جائے تو کاملین کے حلقہ میں اُسے خود بخود جگہ مل جائے گی ۔

کاروانہا از درائش گام زن — درپئے آوازِ نائش گام زن
چوں نسیمش در ریاضِ ما وزد — نرمک اندر لالہ و گُل می خزد
از فریبِ اُو خود افزا زندگی — خود حساب و ناشکیبا زندگی
اہلِ عالم را صلا بر خواں کند

آتشِ خود را چو باد ارزاں کند

اقبالؒ کہتے ہیں کہ ایسے شاعر کی آواز کبھی بیکار نہیں جاتی کارواں ضرور خواب غفلت سے بیدار ہو کر اُس کی آواز پر گامزن ہو جاتے ہیں لیکن شاعر اپنی قوم کو بیدار کرنے کے لئے کسی ایک ڈھنگ پر قائم نہیں رہتا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بلبل اور اس کی نغمہ سرائیوں سے اُکتا جاتا ہے اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ہوا کو اپنی پیغام رسانی کا وسیلہ بنانے کے بجائے وہ خود ہی بادِ نسیم کیوں نہ بن جائے تاکہ آہستگی سے انسانوں کے دلوں میں گھس کر انکے جذباتِ زندگی کو برانگیختہ کرے شاعر کی اِن فریب کاریوں سے یعنی کبھی بلبل بن کر شاخِ گل پر نغمہ سرائی کرنے اور کبھی بادِ نسیم بن کر اُن کے دلوں کو گدگدانے سے زندگی میں خود افزائی کا احساس پیدا ہوتا ہے، وہ محاسبہ نفس کرنے لگ جاتی ہے اور بیقرارِ عمل ہو جاتی ہے شاعر اس طرح تمام دُنیا کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کی صلائے عام دیتا ہے اور اپنی آتشِ عشق کو ہوا کی طرح ارزاں کر دیتا ہے اور ہر شخص کے سینہ کو اُس کے ایک ایک شرارے سے آتشکدۂ غم و عشق بنا دیتا ہے۔

وائے قومے کز اجل گیرد برات　　　　شاعرش وا بوسد از ذوقِ حیات

یہاں سے اقبالؒ اس قوم کی بدقسمتی پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں جس کا شاعر ذوقِ حیات سے بیگانہ ہو کر نفیٔ حیات کی تلقین کرنی شروع کر دیتا ہے اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں جو انسانی زندگی کے لئے بمنزلہ زہر ہوتی ہیں اُن کو تریاق کی صورت میں پیش کرتا ہے وہ اپنے شعروں کے ذریعہ پھولوں کی بے ثباتی کے ایسے نقشے کھینچتا ہے کہ بلبل کا دل مردہ ہو کر رہ جاتا ہے نہ وہ عشق کی ہنگامہ خیزی رہتی ہے اور نہ حُسن کی شوخی۔ پہلے وہ انہیں چیزوں کے زور سے محوِ پرواز رہتا تھا لیکن اب اُسے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے پَر تیغ کر دیئے ہیں اور اس کے بازوؤں کی قوت سلب کر لی ہے سرو جس کی خوبی یہ ہے کہ وہ صحنِ چمن کا ایک آزادہ رَو سربلند اور سدابہار پودا ہے اس کو ایسی پابند، تنہا اور اُداس صورت میں

پیش کرتا ہے کہ اس کی تمام خوبیاں خاک میں مل جاتی ہیں، شہباز جو فطرتاً خود دار، قانع حوصلہ مند اور جری واقع ہوا ہے وہ شاعر اس کے کیریکٹر کو ایسے الفاظ و معانی میں بیان کرتا ہے کہ اس کی حقیقی رُوح فوت ہو جاتی ہے اور وہ کبوتر سے بھی فرومایہ نظر آنے لگتا ہے ایسا شاعر اس قوم کے لئے سمندر کی اُن تین پریوں کی مانند ہوتا ہے جنہیں عربی میں بنات البحر کہتے ہیں اور ملاحوں کے توہمات کی رُو سے اُن کا آدھا جسم مچھلی کا ہے اور آدھا انسان کا اور جہاز راں اُن کی خوش آوازی سے بے راہ ہو کر غرق ہو جاتے ہیں۔ وہ قوم کی کشتیٔ حیات کو بھی اپنے دلکش مگر زندگی کی قوتوں کو مُردہ کر دینے والے نغموں سے غرق کر دیتے ہیں وہ اپنے اشعار کی شہنائی کے ذریعہ دُنیا کی بے ثباتی کا جادو پھونکتے ہیں اور انسانوں کو اس سے نفرت کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور اہلِ محفل کو ایسی شراب دیتے ہیں کہ جس سے نہ صرف دنیا اور خدا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے آپ کا بھی اُنہیں ہوش نہیں رہتا اور زندگی کو ایک خواب سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اقبالؒ ایسے شعراء کو قوم کے لئے پیغامِ فنا قرار دیتے ہیں اور اکی تاکید کرتے ہیں کہ ان کے اشعار پڑھنے اور اُن کا اثر قبول کرنے سے پرہیز لازم ہے۔

اے ز پا اُفتادۂ صہبائے اُو صبحِ تو از مشرقِ سینائے اُو

مسلمانوں کو مخاطب کر کے اقبالؒ کہتے ہیں کہ تمہاری موجودہ پست حالی اور تباہی کا باعث اسی قسم کے شعراء ہیں جنہوں نے کانوں کے راستے زہر پلا کر تمہارے دل کی گرمی کو سلب کر لیا ہے اور عمل کے میدان سے بیزاری کی وجہ سے تم اتنے کمزور ہو گئے ہو کہ تمہارا وجود اسلام کے لئے باعثِ ننگ ہے اب لے دے کے تمہارا مشغلہ خدا سے شکوے اور شکایت کرنا رہ گیا ہے تم نے اُس عشق کی بھی ہیئت منقلب کر دی ہے جو مسلمانوں کے لئے باعثِ فخر تھا اور جس کی قوت سے مسلمانوں نے اپنی عظمت و شوکت کا سکہ دنیا پر بٹھایا تھا۔

اقبالؒ کا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط کا باعث وہ عجمی شعرا اور متصوفین ہیں جن کے

خیالات نے اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں پر خواہ بالواسطہ اثر کیا یا بلاواسطہ۔ اب اس ذلت کی حالت سے نجات پانے کی آپ یہ صورت بتاتی ہے۔

اے میاں کیسہ ات نقدِ سخن بر عیارِ زندگی او را بزن
فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است چوں درخشِ برق پیشِ تندر است
فکرِ صالح در ادب می بایدت رجعتے سوئے عرب می بایدت

مسلمانوں کو اس کی تمیز کرنی چاہئیے کہ فکرِ صالح اور فکرِ غیر صالح میں کیا فرق ہے اور ان دونوں میں سے عمل کی رہبری کرنے کے قابل کون سا ہے اور اس کا سرمایہ کہاں دستیاب ہو سکتا ہے اقبالؒ کے نزدیک مسلمانوں کے پاس ابھی تک وہ سرمایہ موجود ہے لیکن اُن کی قوتِ تمیز میں نقص آگیا ہے جس کی وجہ سے وہ فکرِ صالح اور فکرِ غیر صالح میں امتیاز نہیں کر سکتے اگر وہ بجائے عجم کے عربی علم وادب کی جانب توجہ کریں تو یقیناً انہیں وہ سرمایۂ حیات دستیاب ہو جائے جو اسلام کی حقیقی عظمت کا آئینہ دار ہے اور اس عظمت کو دیکھ کر اُن کے دلوں میں وہ قوت آسکتی ہے جو انہیں پیکارِ حیات کے قابل بنا دے ۔

باقی آئندہ

الجہاد فی الاسلام

مصلحانہ جنگ اور اس کی حقیقت

(از جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور)

(۷)

اب غور کرنا چاہیئے کہ مدافعانہ جنگ کے ان احکام سے مسلمانوں کی جس قومی قوت کو مٹنے اور تباہ ہونے سے بچایا گیا ہے اس کا مصرف کیا ہے؟ آیا اس قوت کو بچانا فی نفسہ مقصود ہے؟ یا درحقیقت اس سے کچھ اور کام لینا ہے جس کے لئے اس کا فتنوں سے محفوظ رہنا ضروری ہے؟ گذشتہ صحبتوں میں جو ہم بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں کہ مسلمان اپنی قومی طاقت کو کھو کر اس "اصلی خدمت" کو انجام دینے کے قابل نہیں رہ سکتے جس کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے، تو اس سے ہمارا مقصد دراصل اسی سوال کا جواب دینا تھا۔ وہ مواقع کسی تفصیلی گفتگو کے متحمل نہ تھے اس لئے صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا۔ مگر اب ہم بحث کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں اس گرہ کو کھولنے سے سوء فہم کی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن مجید جو کتاب مجمل ہونے کے باوجود اسلامی تعلیم کے ایک ایک پہلو کی تفصیل کا حامل ہے وہ مقصد بھی بیان کرتا ہے جس کے لئے مسلمان پیدا کئے گئے ہیں اور وہ "اصلی خدمت" بھی بیان کرتا ہے جس کو انجام دینے کے لئے ان کی قوت کے تحفظ میں یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے :-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۳: ۱۱۰)

تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کی خدمت وہدایت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی کو روکتے اور اللہ پہ ایمان رکھتے ہو۔

اس ارشاد میں اخرجت للعرب یا اخرجت للعجم، یا اخرجت للمشرق نہیں کہا گیا ہے بلکہ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کسی خاص نسل یا خاص ملک کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور وہ بنی نوع انسان کی خدمت یہ ہے کہ وہ نیکی کا حکم کریں۔ اور بدی سے روکیں۔

ایک قوم کی زندگی کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی خدمت کرنا، یہ ایک ایسی بات ہے جس کے تخیل سے قومیت ووطنیت کی فضا میں پرورش پانے والے تنگ دماغ آشنا نہیں ہیں وہ "قوم پروری" یا "وطن پروری" کو تو خوب جانتے ہیں۔ اور "قوم پرستی" تو گویا ان کے تخیل کی معراج ہے، مگر جغرافی ونسلی حدبندیوں سے بالاتر ہوکر سارے عالم انسانی کی عملی خدمت انجام دینا اور اسی کو پوری قوم کا مقصدِ حیات قرار دینا اس کی رسائی سے بہت دُور ہے، اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس کی تشریح کرنی چاہیئے کہ یہ اخرجت للناس کیا چیز ہے۔

اجتماعی فرائض کا اخلاقی تخیل

اگر انسان کی جبلّی خواہشات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصلیت کے اعتبار سے اس کی کوئی خواہش ایسی نہیں ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے حیوانات میں بھی موجود نہ ہو جس طرح ایک انسان اچھی اچھی خوش ذائقہ غذائیں کھانے کی خواہش رکھتا ہے اسی طرح ایک گھوڑے کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُسے خوب ہری ہری گھاس کھانے کو ملے جس طرح ایک انسان اپنے ابنائے جنس پر غلبہ وقوت حاصل کرنے سے خوش ہوتا ہے اسی طرح ایک مینڈھے کے لئے بھی اس سے زیادہ خوشی کا موقع اور کوئی نہیں ہوتا کہ کوئی مینڈھا اس کی ٹکر کا مقابلہ نہ کرسکے جس طرح ایک

انسان اپنی جان کی حفاظت کے لئے مدافعت اور بچاؤ کی تدبیریں کرتا ہے۔ اسی طرح ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے پس مجرد خواہشات کے اعتبار سے انسان اور حیوان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ جو چیز اسے ادنٰے درجہ کے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ حیوانات کی زندگی کا منتہائے مقصود ان خواہشات کا پورا کر لینا ہے۔ مگر انسان کی زندگی کا مقصد اُن خواہشات کا حصول نہیں ہے بلکہ وہ ایک بلند تر نصب العین کے لئے ایک لازمی وسیلہ کے طور پر ان کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان کے سامنے فی الحقیقت حیوانی مقاصد سے بلند کوئی انسانی نصب العین نہ ہو اور وہ اپنی ذہانت اور اُس عقل کو جو خدا نے اسے عطا کی ہے۔ صرف ایسے وسائل اور طریقے تلاش کرنے میں صرف کرے جن سے وہ زیادہ اچھی طرح اپنی حیوانی خواہشات کو پورا کر سکتا ہو۔ تو وہ ایک اعلٰے درجہ کا حیوان تو ضرور بن سکتا ہے۔ مگر ایک اعلٰے درجہ کا انسان نہیں بن سکتا۔

انسان اپنے بقائے حیات کے لئے روزی کمانے پر مجبور ہے کہ نہ کمائے گا تو بھوکوں مر جائے گا، عوارض طبعی سے محفوظ رہنے کے لئے مکان بنانے، کپڑے پہننے، اور دیگر وسائلِ حفاظت مہیا کرنے پر مجبور ہے کہ نہ کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ اور اسی طرح وہ اپنے دشمنوں سے اپنے آپ کو بچانے پر بھی مجبور ہے کہ اس کوشش میں دریغ کرے گا تو ذلت و مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا لیکن محض ان ضروریات کو پورا کر لینا فی نفسہٖ کوئی مقصود نہیں ہے بلکہ وہ ذریعہ ہے اس بلند مقصد کے حصول کا جس تک پہنچنا انسانی زندگی کا اصلی مطمح نظر ہے پس سچا انسان وہ ہے جو اپنی ذات کے حقوق صرف اس لئے ادا کرتا ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنے شہر، اپنی قوم، اپنے ملک، اپنے ابنائے نوع اور اپنے خدا کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہو جائے، اور اپنے ان فرائض کو بہتر طریقہ سے انجام دے سکے جو کائنات اور خالقِ کائنات کی طرف سے اُس پر عائد ہوتے ہیں۔ انسانیت کا اصلی معیار انہی حقوق اور فرائض کو سمجھنا اور پوری طرح ادا کرنا ہے۔ اور انسان پر اپنی ذات کے حقوق ادا کرنا اسی لئے فرض کیا گیا ہے کہ اس کے ذمہ صرف اپنے ہی حقوق نہیں ہیں بلکہ دوسروں کے

حقوق بھی ہیں۔ اور اگر وہ اپنا حق ادا نہ کرے گا تو دوسروں کے حقوق بھی ادا کرنے سے قاصر رہے گا

جب افراد کے لئے انسانیت کا یہ معیار صحیح ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ مجموعہ افراد کے لئے بھی یہی معیار صحیح نہ ہو۔ جماعت بن جانے سے آدمیت میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، اس لئے بنی آدم کی اجتماعی شرافت کا معیار بھی وہی ہونا چاہئے جو انفرادی شرافت کا ہے۔ اگر ایک آدمی جس کی زندگی کا نصب العین اپنی تن پروری اور اپنی خدمت نفس کے سوا کچھ نہ ہو۔ ہماری نظروں میں ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ وقعت نہیں پا سکتا۔ تو یقیناً ایک ایسی انسانی جماعت بھی متمدن جانوروں سے زیادہ وقعت کی مستحق نہیں ہے جس کی کوششوں کا دائرہ صرف اپنی صلاح و فلاح، اپنی ترقی و بہبود، اور اپنے امن و چین تک محدود ہو اور عام انسانی فلاح سے اس کو کچھ مطلب نہ ہو۔ اگر ایک ایسے آدمی کو جو اپنے گھر کی آگ بجھانے، اپنے حقوق کی حفاظت کرنے، اور اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی مدافعت کرنے میں تو خوب مستعد ہو لیکن دوسرے کا گھر جلتا دیکھ کر، دوسرے کے حقوق پامال ہوتے اور دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو لٹتے دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہوتا ہو۔ ہم ایک بہترین آدمی کہنا تو درکنار ایک اچھا آدمی، بلکہ "آدمی" کہنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ تو ایک ایسی قوم یا ایسی جماعت کو ہم بہترین یا کم از کم شریف قوم کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ جو اپنا گھر بچانے، اپنی حفاظت کرنے اور اپنے سے بدی و شرارت کو دفع کرنے کے لئے تو سب کچھ کرنے پر تیار ہو۔ مگر جب دوسری قوموں پر بدی کا غلبہ ہو، دوسری قومیں شیطانی قوتوں کی سرکشی سے تباہ ہو رہی ہوں، اور دوسری قوموں کی اخلاقی، مادی اور روحانی زندگی برباد ہو رہی ہو۔ تو وہ ان کی نجات، ان کی آزادی اور ان کی صلاح و فلاح کے لئے کوشش کرنے سے انکار کر دے جس طرح افراد پر اپنے نفس ہی کے نہیں بلکہ اپنے ابنائے نوع اور اپنے خدا کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جنہیں ادا کرنا ان کا فرض ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک قوم پر بھی اپنے خالق اور اپنی وسیع انسانی برادری کی طرف سے کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور وہ ہرگز ایک شریف قوم کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ جب تک

کہ وہ ان حقوق کو ادا کرنے میں اپنی جان و مال اور زبان و دل سے جہاد نہ کرے۔ اپنی آزادی کو محفوظ رکھنا اپنے استقلال کی حمایت کرنا۔ اور اپنے آپ کو شرارت کے تسلط سے بچانا یقیناً ایک قوم کا پہلا فرض ہے لیکن صرف یہی ایک فرض نہیں ہے جس کو ادا کرکے اسے مطمئن ہو جانا چاہئے بلکہ اس کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ اپنی حاصل کردہ قوت سے تمام نوع بشری کی نجات کے لئے کوشش کرے۔ انسانیت کی راہ سے ان تمام رکاوٹوں کو دُور کرے جو اس کی اخلاقی و مادّی اور روحانی ترقی میں حائل ہوں، اور ظلم۔ و طغیان بدی و شرارت۔ اور فتنہ و فساد کے خلاف اس وقت تک برابر جنگ کرتی رہے جب تک یہ شیطانی قوتیں دُنیا میں باقی ہیں۔

اجتماعی فرائض کے متعلق اسلام کی اعلےٰ تعلیم

افسوس ہے کہ دُنیا کے کم نظر گیانیوں نے اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار اور اجتماعی زندگی کے اس اعلےٰ نصب العین کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اگر کسی نے کوشش کی بھی تو اس کی نظر کچھ زیادہ دُور تک نہیں جا سکی۔ یہ لوگ افراد کے اخلاقی فرائض پر جب بحث کرتے ہیں تو انسانیت ہی کے نہیں بلکہ عالم مادّی کے ذرّہ ذرّہ کے حقوق بھی گنا جاتے ہیں۔ مگر جب اجتماعی زندگی کا سوال ان کے سامنے آتا ہے تو انسانیت کے وسیع تخیل کے لئے ان کے دماغ تنگ ہو جاتے ہیں اور اجتماعی فرائض کو قومیت یا وطنیت کے ایک محدود دائرے میں سمیٹ کر وہ اس قوم پرستی یا وطن پرستی کی بنیاد ڈال دیتے ہیں جو تھوڑے سے تغیر کے بعد آسانی کے ساتھ قومی و وطنی عصبیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ تنگ نظری ہی دراصل انسانیت کی اس غیر طبعی تقسیم کی ذمہ وار ہے جس کی بدولت ایک نسل یا ایک زبان یا ایک قومیت رکھنے والے انسان اپنے دوسرے ابنائے نوع کو دائرۂ انسانیت سے خارج سمجھتے ہیں، اور ان کے حقوق کو سمجھنا اور ادا کرنا تو درکنار۔ انہیں ان کے پامال کرنے میں بھی اخلاق و شرافت کا کچھ ٹوٹا نظر نہیں آتا۔

قرآن مجید نے اپنے ارشاد اخرجت للناس سے دراصل اسی انسانیت کی غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کیا ہے۔ اور اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار کو پیش کر کے عالمگیر خدمت انسانی کے اس اعلےٰ نصب العین کی طرف امت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے جو ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک حق پرست قوم کی فرض شناسی کے لئے قومیت کا میدان بہت تنگ ہے، وہ ایک نسل یا ایک زبان یا ایک ملک کی قید بھی برداشت نہیں کر سکتی اس کے لئے خشکی و تری کی حد بندیاں سمتوں اور جہتوں کی تقسیمیں بھی بے معنی ہیں کہ ایشیا اور یورپ یا شرق و غرب کا امتیاز اس کے ادائے فرض میں حائل ہو سکے اس کے نزدیک تو تمام انسان اور آدم کے تمام بیٹے اور بیٹیاں برابر ہیں اس لئے ان سب کی خدمت کرنا یعنی ان سب کو نیکی کا حکم کرنا اور سب کو بدی سے روکنا اور شر سے بچانا اس کا فرض ہے۔ اس اعلیٰ تعلیم کو اس نے مختلف مؤثر پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ اور تنگ خیالی کے طلسم کو توڑ کر فرض شناسی کے ایک وسیع عالم کی راہیں کھول دی ہیں

چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

وَكَذَالِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲:۱۴۳) — اس طرح ہم نے تم کو ایک بہترین عادل امت بنایا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر نگراں رہو۔ اور رسول تم پر نگراں رہے۔

اور اسی مضمون کی تشریح سورۂ حج میں اس طرح کی گئی ہے کہ :-

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ — اور اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تم کو اسی کام کے لئے مخصوص کر لیا ہے اور تم پر دین کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا اور یہ وہی ملت ہے جو تمہارے باپ ابراہیم کی تھی اللہ نے تمہارا نام اس سے پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی مسلم (اطاعت گذار) رکھا ہے تاکہ رسول تم پر نگراں رہے اور تم دنیا کے لوگوں پر

فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ (۲۲:۱۰) نگران رہو پس نماز کو قائم کرو، زکوۃ دو، اور اللہ کے راستہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو

ان دونوں آیات کو جو ایک دوسری کی تشریح و تفسیر کرتی ہیں۔ ملا کر پڑھو۔ تو حقیقت واضح ہو جائیگی کہ یہاں بھی مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اسی عالمگیر خدمت انسانی کو بتایا ہے۔ فرمایا کہ تم ایک بہترین گروہ ہو جسے افراط و تفریط سے ہٹا کر عدل و توسط کی راہ حق پر قائم کیا گیا ہے۔ تمہیں اللہ نے خاص اس کام کے لئے منتخب فرمایا ہے کہ اس کی خاطر حق کی حفاظت حق کی اعانت اور حق کی بلند سازی کے لئے کوشش کرنے میں اپنی ساری قوتیں وقف کر دو۔ اور اسی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لو تمہارے دین کو اللہ نے تنگ نہیں کیا۔ بلکہ اس میں احکام کے اعتبار سے آسانیاں اور حدود کے اعتبار سے فراخیاں رکھی ہیں۔ پھر اس کا دائرہ اتنا وسیع رکھا ہے کہ نسل، رنگ، زبان، قومیت اور وطنیت کی قیود اس کی برکتوں کو عام ہونے سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ اور اس میں کوئی چھوت چھات یا ورن آشرم کی قید نہیں رکھی گئی۔ اور نہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں یا اسرائیل کے بھٹکے ہوئے اونٹوں کی کوئی تخصیص کی گئی ہے۔ کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کا حق ادا کرنے سے روک سکے بس اب تمہارا کام یہ ہے کہ تمام دنیا والوں کی دیکھ بھال کرو، ان کے اعمال کی نگرانی رکھو اور ان پر اللہ کے گواہ، اس کے محتسب اور اس کے دیدبان بنے رہو۔ کیونکہ تمہیں اسی عام نگرانی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

پھر ایک دوسرے طریقہ سے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۲۲:۶) اگر ہم ان کو زمین میں طاقت بخشیں گے۔ تو وہ نماز قائم کریں گے زکوۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے۔ اور بدی کو روکیں گے۔

یہاں الناس کی بجائے الارض کا لفظ استعمال کیا۔ اور مسلمانوں کی طاقت و قوت کا فائدہ یہ بتایا کہ وہ زمین میں نیکی کو قائم کریں گے۔ اور بدی کو مٹائیں گے۔ سو اس سے بھی یہی بتانا مقصود ہے۔ کہ مسلمانوں کا کام

صرف عرب، یا صرف عجم، یا صرف ایشیا، یا صرف مشرق ہی میں اقامتِ صلوۃ، ایتائے زکوۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا نہیں ہے بلکہ کرۂ زمین کے چپّہ چپّہ اور گوشہ گوشہ میں ان کو پہنچنا چاہئے۔ معمورۂ ارضی کے ہر دشت وجبل اور بحروبر میں نیکی کا جھنڈا لئے ہوئے بدی کے لشکروں کا تعاقب کرنا چاہئے۔ اور اگر دُنیا کا کوئی ایک کونہ بھی ایسا باقی رہ گیا ہو جہاں منکر (یعنی برائی) موجود ہو تو وہاں پہنچ کر اس کو مٹانا۔ اور معروف (نیکی) کو اس کی جگہ قائم کرنا چاہئے۔ اللہ کو کسی خاص ملک یا خاص نسل سے واسطہ نہیں ہے وہ اپنی تمام مخلوق کا یکساں خالق اور سب سے یکساں خالقیت کا تعلق رکھتا ہے اس لئے وہ کسی خاص ملک میں فتنہ وفساد پھیلنے کو بُرا نہیں سمجھتا۔ بلکہ زمین میں خواہ کسی جگہ بھی فساد ہو اس کے لئے یکساں ناراضی کا موجب ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں فساد فی العرب یا فتنہ فی العجم کہیں نہیں آیا بلکہ ہر جگہ ارض کا لفظ استعمال کیا گیا ہے الفسدات الارض یسعون فی الارض فسادا۔ تکن فتنۃ فی الارض۔ پس وہ اپنے لشکر حق یعنی امت مسلمہ کی خدمت کو قومیت ونسل کی حدود میں مقید نہیں کرتا۔ بلکہ اس رحمت کو تمام روئے زمین کے بسنے والوں کے لئے عام کرتا ہے۔

ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

اس وقت ہندوستان میں گذشتہ چند سال سے مسئلہ قومیت پر بڑی لے دے ہو رہی ہے اور مسلمان بھی بر خود غلط قومیت پرستوں کی تقلید میں اس مسئلہ کے جدید نظریہ کی رو میں بہے جا رہے ہیں اگر اس کا اثر عوام کے دائرہ عمل تک ہی محدود رہتا تو اتنا خطرناک نہیں تھا اور اس کا ازالہ بڑی سہولت سے ہو سکتا تھا لیکن جن اسلامی اربابِ فکر و نظر سے اس کی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اس مسئلہ کی بابت صحیح رائے قائم کر سکیں گے وہ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور اب وہ غلط فہمی نہیں رہی بلکہ ماحول کے اثرات کے ماتحت اس نے ان کے ذہن میں ایک یقینی درجہ حاصل کر لیا ہے، چنانچہ وہ علانیہ طور پہ اس کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ جن کو قدرت نے فطرتاً ذوقِ صحیح بخشا تھا آغازِ کار ہی سے اس نظریہ کی بنیادی غلطی کو سمجھ گئے تھے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جبکہ آپ نے ابھی زندگی کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنی شروع کی تھی اور اپنی ان مثنویوں کی تدوین میں مصروف تھے جن میں آپ اپنے نظریہ کے مبادیات کی تشریح کرنا چاہتے تھے ذیل کا مقالہ انتہائی غور و فکر کے ساتھ لکھا تھا اور اسے آپ نے علی گڈھ کالج میں پڑھا تھا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان

سے اُردو میں کیا تھا اس مقالے میں بتایا گیا ہے کہ قومیت کا اسلامی تصوّر کیا ہے؟ اور دوسری اقوام کے تصوّر سے کن معنوں میں مختلف ہے؟ ایڈیٹر

انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو لوٹتے وقت جب ہماری نظر ارتقار کی الم ریز جھلملیوں میں سے جھینتی ہوئی اُن کے رزمیہ بین السطور پر پڑتی ہے تو کسی خواب کے گریز پا نظّاروں کی طرح ہم گذری ہوئی قوموں اور سلطنتوں اور تمدنوں کے کھنڈروں کو پے بہ پے نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہوتا دیکھتے ہیں جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ قدرت کی قوّتوں کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے نہ اقوام کی منزلت اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کئے جا رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی منزلِ مقصود بہت ہی دُور ہے جسے مقاصدِ انسان کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں لیکن ؎

آدمی زادہ طرفہ معجونیست

باوجود حالاتِ گردوپیش کی نامساعدت کے اس کی تخییل جو عقل کی آئینہ بردار ہے اسے اپنی ہستی کا کامل تر جلوہ دکھا دیتی ہے اور اُن ذرائع کی دریافت پر آمادہ کرتی ہے جو اس تصویرِ مثالی میں جس کے خط و خال اس کی شانِ اکملیّت کو چھپائے ہوئے ہیں جان ڈال سکیں۔ دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان بہت ہی کمزور و ناتواں ہے اپنے بچاؤ کے لئے وہ قدرتی حربوں سے مسلح نہیں کیا گیا۔ وہ بصارتِ شبینہ سے محروم ہے اس کی قوّتِ شامہ اور طاقتِ گریز بہت کم ہے لیکن پھر بھی زندگی کی آزادیوں اور پہنائیوں کی جستجو میں اس نے اپنی اَن تھک سرگرمیوں کو ہمیشہ سے وقف کئے رکھا تاکہ قوانینِ قدرت کی کنہہ اور طرزِ عمل سے واقف ہو کر وہ رفتہ رفتہ اُن اسباب پر حاوی ہو جائے جو خود اس کے ارتقار پر مؤثر ہیں۔

قانون انتخاب فطری کے کشتافِ عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادہ کی تاریخ کا عقلی تصوّر

قائم کرنے کے قابل ہو گیا حالانکہ پہلے اس تاریخ نے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق الادراک سلسلہ سے زیادہ نہ تھی جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غائت کے فرداً فرداً ماورا ایام کے سراپا اسرار بطن سے پیدا ہو کر گہوارۂ شہود میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے اس قانون کے معانی کی تنقید جب اور بھی زیادہ دقتِ نظر کے ساتھ کی گئی اور ان فلاسفہ نے جن کی خیال آفرینیاں ڈارون کے مقدمۂ حکمت کا تتمہ ہیں جب حیات کی ہیئت اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقائق کا انکشاف کیا تو مدنی زندگی کے عمرانی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق انسان کے تصورات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔

علم الحیات کے اصولوں نے حال میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ فرد فی نفسہٖ ہستیٔ اعتباری ہے یا یوں کہئے کہ اس کا نام اُن مجرّداتِ عقلیہ کی قبیل سے ہے جن کا حوالہ دے کر عمرانیات کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے بالفاظِ دیگر فرد اس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے بمنزلہ ایک عارضی و آنی لمحہ کے ہے۔ اس کے خیالات، اس کی تمنائیں اس کے طرزِ ماند و بود، اس کے قوائے دماغی و جسمانی، بلکہ اس کے ایامِ زندگانی کی تعداد تک اس جماعت کی ضروریات و حوائج کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہیں جس کی حیاتِ اجتماعی کا وہ محض ایک فردی مظہر ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ بر سبیلِ اضطرار و بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے انجام دے دیتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے مقاصد کو جماعت کے مقاصد سے تخالفِ کلّی بلکہ تضادِ مطلق ہے۔ جماعت کی زندگی بلا لحاظ اپنے اجزائے ترکیبی یعنی افراد کی زندگی کے بالکل جداگانہ ہوتی ہے اور جس طرح ایک جسمِ ذوی الاعضا مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہیں اسی طرح ایک قوم جو مخالف قوتوں

کے اثرات سے سقیم السحان ہو گئی ہو بعض دفعہ خود بخود ردِ عمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے یا کوئی نئی تخیل نمودار ہوتی ہے یا ایک ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک بر روئے کار آتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم کے قوائے ذہنی و روحانی تمام طاغی و سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانے اس موادِ فاسد کو خارج کر دینے سے جو قوم کے نظامِ جسمانی کی صحت کے لئے مضر تھا قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں اور اس کی اصل توانائی اس کے اعضاؤں عود کر آتی ہے اگرچہ قوم کی ذہنی و دماغی قابلیت کا دارا افراد ہی کے دماغ میں سے ہو کر بہتا ہے لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی نفسِ ناطقہ جو مدرک کلیات و جزئیات اور خبیر و مربہ ہے بجائے خود ضرور موجود ہوتا ہے "جمہوری رائے اور قومی فطنت" وہ جملے ہیں جن کی وساطت سے ہم موہوم و مبہم طور پر اس نہایت ہی اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ قومی ہستی ذوی العقل اور ذوی الارادہ ہے۔ اژدھامِ خلائق، جلسۂ عام، جماعتِ انتظامی، فرقۂ مذہبی اور مجلسِ مشاورت وہ مختلف ذرائع ہیں جن سے قوم اپنی تدوین و تنظیم کا کام لے کر وحدتِ ادراک کی غایت کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قومی دماغ تمام ان مختلف خیالات کی خبر یا علم رکھتا ہو جو ایک وقتِ خاص میں افراد کے دماغوں میں موجود ہوتے ہیں اس لئے کہ خود افراد کا دماغ بھی کامل طور اپنی ادراکی حالتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اجتماعی یعنی قومی دماغ کے بہت سے احساسات و مقامات و تخیلات قومی حاسہ کی دہلیز سے باہر رہتے ہیں قوم کی ہمہ گیر دماغی زندگی کا فقط ایک جزو محدود دروازے کے اندر قدم رکھتا ہے اور قومی ادراک کی تابناک شعاعوں سے منور ہوتا ہے اس انتظام کی بدولت مرکزی اعضا کی توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار غیر ضروری جزئیات پر صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قوم ایک جداگانہ زندگی رکھتی ہے

یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض ایک مجموعہ ہے اصولاً غلط ہے اور اسی لئے تمدنی و سیاسی اصلاح کی تمام وہ تجاویز جو اس مفروضہ پر مبنی ہوں بہت احتیاط کے ساتھ نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر ہے۔ اس کی ماہیت پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود و لامتناہی ہے اس لئے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ عمرانی حدِ نظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جزو متصور ہونے کے قابل ہیں۔ علم الحیات کے اکتشافاتِ جدیدہ نے اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اُٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس میں وہ افراد ابھی پیدا نہیں ہوئے جو اس کے موجودہ افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری اغراض ان غیر محدود و نامشہود افراد کی اغراض کے تابع بلکہ اُن پر نثار کر دی جاتی ہے جو نسلاً بعد نسلٍ بتدریج ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور علم الحیات کی اس حیرت انگیز حقیقت کو وہ شخص بنگاہِ استغنا نہیں دیکھ سکتا جس کے پیش نظر سیاسی یا تمدنی اصلاح ہے۔ مَیں اپنی قوم کی موجودہ عمرانی حرکت پر اسی پہلو سے نظر ڈالنا چاہتا ہوں یعنی اس کی تنقید استقبالی طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے لئے سب سے زیادہ مہتم بالشان عقدہ نقطہ یہ عقیدہ ہے (خواہ اس کی نوعیت تمدنی قرار دی جائے خواہ اقتصادی خواہ سیاسی) کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ مٹنے یا معدوم ہو جانے کے خیال سے قومیں بھی ویسی ہی خائف ہیں جیسے افراد کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی قابلیتوں اور استعدادوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی غایت الغایات سے کرنا چاہیے۔ ہم کو لازم ہے کہ اپنے محاسن کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر ضرورت آ پڑے تو نئے

محاسن پیدا کریں اس لئے کہ بقول نیٹشا کے کسی قوم کی بقار کا دارومدار محاسن کی مسلسل وغیر منقسم تولید پر ہوتا ہے۔ کائنات یقیناً جناب باری تعالےٰ کی حکمت بالغہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر اس کا مفہوم سرتاسر انسانی ہے لیکن اس تبصرہ کے آغاز سے پہلے میں چند تمہیدی امور پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ بحث میرے نزدیک جماعت مسلمین کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ امور جن پر میں ترتیب وار نظر ڈالوں گا حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ جماعت مسلمین کی ہیئت ترکیبی۔

۲۔ اسلامی تمدن کی یکرنگی۔

۳۔ اس سیرت کا نمونہ جو مسلمانوں کی قومی ہستی کے تسلسل کے لئے لازمی ہے۔

اولاً مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان نہ اشتراک وطن نہ اشتراک اغراض اقتصادی بلکہ ہم لوگ اسی برادری ہیں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قوت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قسم کے خصائل مخصوصہ و شمائل مختصہ پر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا اس کی پولٹیکل نشو و نما میں

بہت بڑا حصّہ لیا لیکن اسلامی علوم وفنون اور فلسفہ وحکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام اور یہ وہ کام ہے جو نفس ناطقہ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قوم عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی ایک آنی وعارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرار کا تبسّم تھا لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کا جولانگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خالص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسّی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے۔ قومیت کا ملکی تصوّر جس پر زمانہ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے اس میں شک نہیں کہ قومیت کے جدید تصوّر نے چھوٹے چھوٹے پولیٹیکل حلقے قائم کرکے اور اُن میں رقابت کے صحیح القوام عنصر کو پھیلا کر جس تمدّنِ جدیدہ کی شاخ میں بوقلمونی کا پیوند لگایا ہے، دُنیا کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچایا ہے لیکن بڑی خرابی اس تصوّر میں یہ ہے کہ اس میں غلو اور افراط کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے اس نے پولیٹیکل سازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس نے فنونِ لطیفہ وعلومِ ادبیہ کو خاص خاص قوموں کی خصوصیات کی میراث قرار دے کر عام انسانی عنصر کو اس میں سے نکال دیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصوّر سے پیدا ہوتا ہے ایک طرح سے ایک مادّی شئے کا تالیہ ہے جو سراسر اصول اسلام کے خلاف ہے اس لئے کہ اسلام دُنیا میں ہر طرح کے شرکِ خفی وجلی کا قلع وقمع کرنے کے لئے نمودار ہوا تھا لیکن اس سے یہ نہ گمان کیا جائے کہ مَیں جذبۂ حُبّ وطن کا سرے سے مخالف ہوں اُن قوموں کے لئے جن کا اتّحاد حدود وارض پر مبنی ہو اس جذبہ سے متاثّر ہونا ہر طرح سے حق بجانب ہے لیکن مَیں ان لوگوں کے طرزِ عمل کا یقیناً

مخالف ہوں جو اس امر کے معترف ہونے کے باوجود کہ جذبۂ حبِّ وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے ہم مسلمانوں کی عصبیت کو نام دھرتے ہیں اور اسے وحشیانہ تعصّب کہہ کر پکارتے ہیں حالانکہ ہماری عصبیت ایسی ہی حق بجانب ہے جیسی اُن کی وطن پرستی ۔ عصبیت سے بجز اس کے کچھ مراد نہیں کہ اصولِ حبِّ نفس بجائے اس کے کہ ایک فرد واحد میں ساری و دائر ہو ایک جماعت پر اپنا عمل کرتا ہے ۔ حیوانات کی تمام نوعیں کم و بیش ضرور متعصّب ہوتی ہیں ۔ اور اگر انہیں اپنی انفرادی یا اجتماعی ہستی برقرار رکھنی ہے تو ضرور ہے کہ ان میں عصبیت موجود ہو ۔ اقوامِ عالم پر نظر ڈالئے ۔ ایک قوم بھی ایسی نہ ہوگی جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجئے وہ بہت ہی کم متاثر ہوگا اس لئے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مَس نہیں کیا جو اس کی قومیت کی روحِ رواں ہے لیکن ذرا اس کے تمدن، اس کے ملک یا پولیٹکل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار پہ تو حرف گیری کر دیکھئے پھر اس کی جبلّی عصبیت کا شعلہ بھڑک نہ اُٹھے تو ہم جانیں ۔ بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیّت کا انحصار اس کے معتقداتِ مذہبی پر نہیں ہے بلکہ جغرافی حدود یعنی اس کے ملک پر ہے پس جب آپ اس خاص خطۂ زمین پر جسے اس نے اپنے تخیّل میں اپنی قومیّت کا اصلی اصول قرار دے رکھا ہے معترض ہوتے ہیں تو آپ اس کی عصبیت کو واجبی طور پر برانگیختہ کرتے ہیں ۔ لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے ۔ ہماری قومیّت ایک شے معهود فی الذہن ہے موجود فی الخارج نہیں ہے بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آ کر جمع ہو سکتے ہیں وہ مظاہرِ آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشراقی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو بُرا کہنا ہماری آتشِ عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے تو میری دانست میں یہ برافروختگی اس فرانسیسی کے غصہ سے کچھ کم واجبی نہیں ہے جو اپنے وطن کی بُرائیاں سُن کر

بھڑک اُٹھتا ہے۔ عصبیت سے صرف قوم کی پاسداری مراد ہے۔ دوسری اقوام کو بنگاہِ تنفر دیکھنا اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ بزمانۂ قیامِ انگلستان جب کبھی مجھے کسی خاص مشرقی رسم یا طرزِ عمل کو کسی انگلش لیڈی یا جنٹلمین کے سامنے بیان کرنے کا اتفاق ہوا تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس پر اظہارِ تعجب نہ کیا گیا ہو جس سے مجھے رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے نزدیک ہر غیر انگلش خیال گویا داخلِ عجائباتِ قدرت ہے۔ مجھے انگریزی قوم کا یہ وطیرہ نہایت ہی ناپسند ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ قوم پیرایۂ تخیل سے عاری ہے جس خاک سے شیکسپیئر، شیلی، کیٹس، ٹنی سن اور سوئبزن پیدا ہوئے ہوں وہ بھلا خیال آفرینیوں اور ذہانت آرائیوں سے کیونکر معرّا ہو سکتی ہے البتہ یہ بات ہمیں ماننی پڑتی ہے کہ انگلستان کا طریقۂ ماند و بود اور طرزِ غور و فکر وہاں کے آئین و قوانین اور اس کے رسم و رواج اس ملک کے رہنے والوں کی زندگی کے اجزائے لاینفک بن گئے ہیں۔

غرض مذہبی خیال بلا اس دینی اکتناز کے جو افراد کی آزادی میں غیر ضروری طور پر خلل انداز ہو اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا مدار علیہ ہے۔ آگسٹس کونٹ کا قول ہے "چونکہ مذہب ہماری کُل ہستی پر حاوی ہے لہٰذا اس کی تاریخ ہماری نشو و نما کی پوری تاریخ کا خلاصہ ہونی چاہیے"۔ یہ قول جیسا ہماری قوم پر صادق آتا ہے ویسا کسی اور قوم پر نہیں آتا لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا انتہائی مدار علیہ محض وہ چند معتقدات ہیں جن کی بنا نوعیت مابعد الطبیعی ہے تو کیا یہ بنیاد نہایت ہی متزلزل نہیں ہے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ علوم جدیدہ تیز با ترقی کر رہے ہیں اور ہر بات کے حسن و قبح کو پرکھنا اور معقولات اور منطقی استدلال سے قدم قدم پر کام لینا ان علوم کا لازمہ قرار دیا گیا ہے مشہور فرانسیسی مستشرق رینان کا یہی خیال تھا اور دبے الفاظ میں اس نے یہ اُمید ظاہر کی تھی کہ

اسلام ایک دن دُنیا کے ایک بڑے حصے کی عقلی و اخلاقی پیشوائی کے منصب اعلےٰ سے گر جائیگا جن اقوام کی اجتماعی زندگی کا اصل اصول حدودِ ارضی سے وابستہ ہو انہیں معقولیت سے خائف نہیں ہونا چاہئیے لیکن ہمارے حق میں یہ خطرناک دشمن ہے اس لئے کہ یہ اسی اصول کو مٹانا چاہتا ہے جس پر ہماری قومی ہستی مبنی ہے اور جس نے ہمارے اجتماعی وجود کو قابلِ فہم بنا رکھا ہے۔ تعقل دراصل تجزیہ ہے اور اسی لئے معقولیت سے اس قومی شیرازہ کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے جو مذہبی قوت کا باندھا ہوا ہے اگرچہ اس میں شک نہیں ہے کہ ہم معقولیت کا توڑ عقلی حربوں سے کر سکتے ہیں لیکن میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعتقاد یعنی ہمہ گیر وفاق کا وہ نکتہ جس پر ہماری جماعت کی وحدت منحصر ہے ہمارے لئے اپنے مفہوم کے لحاظ سے عقلی نہیں بلکہ قومی ہے مذہب کو فلسفہ نظری بنانے کی کوشش کرنا میری رائے میں بے سود محض بلکہ لغو و مہمل ہے اس لئے کہ مذہب کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لئے ایک مربوط و متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب سیرتِ انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا کر کے اس شخص کے اثر کے لحاظ سے جو اس سیرت کا مظہر ہے اس نمونہ کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے۔ اور اس طور پر چونکہ وہ ایک نئی دنیا کو نیست سے ہست کرتا ہے لہٰذا اس پر مابعد الطبیعات کا اطلاق ہوتا ہے۔ میری مراد اُن تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصوّر اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں بالفاظِ دیگر اسلامی تصوّر ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر

کرتے ہیں جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔

ثانیاً:-

معتقدات مذہبی کی وحدت جس پہ ہماری قومی زندگی کا دارومدار ہے اگر مضاف سے تعبیر کی جائے تو اسلامی تہذیب کی یکرنگی بمنزلہ اس کے مضاف الیہ کے ہے۔ محض اسلام پہ ایمان لے آنا اگرچہ نہایت ضروری ہے لیکن کافی اور مکتفی نہیں ہے قومی ہستی میں شریک ہونے کی غرض سے ہر فرد کے لئے قلب ماہیت لازمی ہے اور اس قلب ماہیت کے لئے خارجی طور پر تو ارکان و قوانین اسلام کی پابندی کرنی چاہئے اور اندرونی طور پہ اس یکرنگ تہذیب و شائستگی سے استفادہ کرنا چاہیے جو ہمارے آباو اجداد کی متفقہ عقلی تحریک کا ماحصل ہے۔ اسلامی جماعت کی تاریخ پہ جس قدر زیادہ غور کیا جائے گا اسی قدر یہ تاریخ حیرت انگیز و تعجب خیز نظر آئے گی۔ اس دن سے جب کہ اسلام کا سنگِ بنیاد رکھا گیا سولھویں صدی کے آغاز تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا اگرچہ اس ہمہ گیر شغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہو سکتی تھی لیکن پھر بھی اسلامی دنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈ نکالا اور ان پہ اپنی طرف سے معتد بہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کے علاوہ ایک ایسے جامع و مانع نظام فقہ کو مدوّن کیا جو اسلامی تمدن کا غالباً سب سے زیادہ گرانمایہ ترکہ ہے۔ جس طرح جماعت مسلمین ان اختلافات کو جن کی بنا رنگ و خون پہ ہو تسلیم نہیں کرتی اور دنیا کی تمام نسلوں کو انسانیت کے ہمہ گیر

خیال کے مسلک میں منسلک کرنا اپنی غایت سمجھے ہوئے ہے اسی طرح مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالمگیر ہے اور اُن کا وجود اور نشو و نما کسی ایک قوم خاص کی دماغی قابلیتوں کا مرہونِ منّت نہیں ہے البتہ ایران اس تہذیب و شائستگی کی نشو و نما کا جزوِ اعظم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ اہم واقعہ کون سا ہے تو میں بلا تامّل اس کا جواب دوں گا۔ کہ فتح ایران۔ معرکۂ نہاوند نے عربوں کو نہ صرف ایک دلفریب زمین کا مالک بنا دیا بلکہ ایک قدیم قوم پر مسلط کر دیا جو سامی اور آریہ مسالے سے ایک نئے تمدّن کا محل تعمیر کرنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ ہمارا اسلامی تمدّن سامی تفکّر اور آریہ تخیّل کے اختلاط کا ماحصل ہے جب ہم اس کے خصائل و شمائل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نزاکت اور دلربائی اسے اپنی آریہ ماں کے بطن سے اور اس کا وقار و متانت اسے اپنے سامی باپ کے صُلب سے ترکہ میں ملا ہے۔ فتح ایران کی بدولت مسلمانوں کو وہی گرانمایہ متاع ہاتھ آئی جو تسخیر یونان کے باعث اہلِ روما کے حصہ میں آئی تھی اگر ایران نہ ہوتا تو ہمارے تمدّن کی تصویر بالکل یک رُخی ہوتی۔

یہاں ضمناً اس امر کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ قوم جس کے اختلاط نے عربوں اور مغلوں کی شکل ہی بدل دی عقلی و اوراکی لحاظ سے مُردہ نہیں ہے۔ ایران جس کی پولیٹیکل آزادی کو رُوس کی غاصبانہ آرزوؤں نے معرضِ خطر میں ڈال رکھا ہے ابھی تک اسلامی تہذیب کا بڑا مرکز ہے اور ہم لوگوں کی دلی تمنّا ہے کہ اسلامی دنیا میں اس کا وہ درجہ جو اب تک قائم رہتا چلا آیا ہے بدستور قائم رہے۔ ایران کے شاہی خاندان کے لئے ایران کی پولیٹیکل آزادی کا فقدان فقط اس کا ہم معنی ہوگا کہ زمین کا ایک ٹکڑا اس کے قبضہ سے نکل گیا۔

لیکن اسلامی تہذیب کے لئے یہ واقعہ تیرھویں صدی کے تاتاری حملہ سے بھی زیادہ بلاخیز و مصیبت ہوگا۔ بہرحال یہ ایک پولٹیکل بحث ہے جس میں میں اس وقت نہیں پڑنا چاہتا میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جماعتِ مسلمین کا زندہ رکن بننے کے لئے انسان کو مذہبِ اسلام پر بلاشرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں پوری طرح سے رنگنا چاہئے "صِبْغَۃَ اللہ" کے اس خُم میں غوطہ لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان دو رنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جائیں۔ ان کا ذہنی منظر ایک ہو، وہ مظاہر آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں، اشیاء کی ماہیت اور قدر و قیمت کو اس اندازِ خاص کے ساتھ جانچیں جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا مابہ الامتیاز ہے اور جو مسلمانوں کو ایک غایت مختتمہ و مقصد معینہ کے پیرائے سے آراستہ کرکے انہیں "کُلُّ مومنٍ اخوۃٌ" کی کتاب کے اوراق بنا دیتا ہے

ثالثاً:۔

شقِ ثانی کے تحت میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہوگیا ہوگا کہ اسلامی سیرت کے نمونے کی نمایاں خصوصیات کیا کیا ہونی چاہئیں لیکن یہ جتا دینا ضروری ہے کہ سیرت کے وہ مختلف نمونے جنہیں ایک قوم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے محبت و اتفاق کی کورانہ قوتوں ہی کا ماحصل نہیں ہیں۔ زمانۂ حال کا علم عمرانیات ہمیں یہ نکتہ سکھاتا ہے کہ قوموں کا اخلاقی تجربہ خاص خاص قوانینِ معینّہ کا تابع ہوا کرتا ہے۔ زمانۂ قبل تاریخ میں جب زندہ رہنے کے لئے انسان کو سخت جد و جہد کرنی پڑتی تھی اور دماغی قابلیتوں کے مقابلہ میں وہ جسمانی قوتوں سے زیادہ کام لیتا تھا تو اسی شخص کی سب تعریف و تقلید کرتے تھے جو شجاع ہوتا تھا۔ جب جہدِ للبقا کی کشمکش فرو ہوئی اور خطرہ زائل ہوگیا تو دورِ شجاعت گیا اور باصطلاحِ گڈنگس دورِ مروّت آیا جس میں جرأت و دلاوری اگرچہ پھر بھی مستحسن سمجھی جاتی تھی لیکن انسانی سیرت

کا ہر دلعزیز اور عام پسند نمونہ وہ شخص متصور ہوتا تھا جو نشاط عمر کی ہر صنف کا رسیا ہو اور فیاضی اور ایثار اور ہم نوالگی اور ہم پیالگی کے گوناگوں اوصاف سے متصف ہو لیکن چونکہ ان دونوں اسالیب کا میلان غلو و افراط کی جانب تھا لہٰذا ان کے عمل کا رد ایک تیسرے نمونہ یا اسلوب نے کیا جس کی غایت الغایت ضبطِ نفس ہے اور جو زندگی پر زیادہ متانت اور تقشّف کے ساتھ نظر ڈالتا ہے۔ ہندوستان میں جب ہم اسلامی جماعت کی ارتقائی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تیمور اسلوب اوّل کا مظہر نظر آتا ہے بابر اسالیب اوّل و دوم کے امتزاج کو ظاہر کرتا ہے جہانگیر اسلوب ثانی کے سانچے میں خصوصیت کے ساتھ ڈھلا ہوا ہے اور عالمگیر جس کی زندگی اور کارنامے میری دانست میں ہندوستان کی اسلامی قومیت کی نشوونما کا نقطۂ آغاز ہیں اسلوب ثالث کا چہرہ کشا ہے۔ اُن لوگوں کے نزدیک جنھوں نے عالمگیر کے حالات تاریخ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سُنے ہیں عالمگیر کا نام سفاکی و قساوت، جبر و استبداد، مکاری و غداری اور پولیٹکل سازشوں اور منصوبوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ خلط مبحث کا خوف مانع ہے ورنہ میں متعاصرانہ تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر سے ثابت کرتا کہ عالمگیر کی پولیٹکل زندگی کی وجوہ تحریک سراسر جائز و حق بجانب تھیں۔ اس کے حالات زندگی اور اس کے عہد کے واقعات کا بنظر انتقاد مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین واثق ہو گیا ہے کہ جو الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں وہ واقعات متعاصرہ کی غلط تعبیر اور اُن تمدنی و سیاسی قوتوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جو ان دنوں سلطنتِ اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی تھیں میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں۔

اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہماری قومی ہستی کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہ آئے تو ہمیں ایک ایسا اسلوب سیرت تیار کرنا چاہیئے جو اپنی خصوصیات مختصّہ سے کسی صورت میں بھی علیحدگی نہ اختیار کرے اور خذ ما صفا ودع

ماکدہ کے زرّیں اصول کو پیش نظر رکھ کر دوسرے اسالیب کی خوبیوں کو اخذ کرتے ہوئے ان تمام عناصر کی آمیزش سے اپنے وجود کو کمال احتیاط کے ساتھ پاک کر دے جو اس کی روایاتِ مسلّمہ و قوانینِ منضبط کے منافی ہوں ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی عمرانی رفتار کو نگاہ غور سے دیکھنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جو قوم کے اخلاقی تجربہ کے مختلف خطوط کا نقطۂ اتصال ہے ۔

....

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں بوجہ اس حقیقت سے اختلاف کے جو وہاں کے عقلی حوالی میں سارِی دوائر ہے اس اسلوب سیرت کی ضرورت کا اعلان ایک شاعر کی زبردست تخمیل نے بلند آہنگی کے ساتھ کیا ہے جناب مولنا اکبر الہ آبادی جنہیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے اپنے بذلہ سنجانہ پیرایہ میں اُن قوّتوں کی ماہیّت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں جو آج کل مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں ۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لہجہ پر نہ جائیے ان کے شباب اور قہقہے آنسوؤں کے آئینہ بردار ہیں ۔ وہ اپنے نہاں خانۂ صنعت میں اُس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک آپ اُن کا مال خریدنے کے لئے ذوقِ سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ آئیں ۔ غرض اس جماعت میں جس کے اجزائے ترکیبی کی نوعیت واحد ہو خیالات و جذبات کا تعلق یہاں تک گہرا ہوتا ہے کہ اگر اس جماعت کے ایک حصّہ کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو اس خواہش کے برلانے کا سامان یک بیک دوسرا حصّہ پیدا کر لیتا ہے ۔

السحر الحلال فی کلام علامۃ الاقبال

(حافظ سراج الدین محمود بی اے. بی. ٹی بہاولپور)

(۲)

مسلمانے کہ داند رمز دیں را　　نشاید پیش غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بکام اُو نہ گردد　　بہ کام خود بہ گرداند زمیں را

سرور کائنات سرکار دو عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے استراحت فرما رہے تھے اس وقت آنحضرت صلعم تنہا تھے۔ ایک کافر جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا اس موقع پر پہنچا اور تلوار کھینچ کر ارادۂ فاسد سے کھڑا ہو گیا۔ حضور انور صلعم بیدار ہوگئے تو اُس نے کہا "محمد (صلعم) اب بتا کہ تجھے کون بچا سکتا ہے؟"

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "اللہ"

کافر پر ایسی حیرت طاری ہوئی کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔

وفاتِ قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام عرب پر ارتداد کے بادل چھا گئے۔ کفر کی گھنگھور گھٹا چاروں طرف سے اُمڈ آئی۔ بدوی قبائل ہر طرف سے مدینہ منورہ پر چڑھ دوڑے تاکہ اسلام کے نرم و نازک پودے کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیں ہر جگہ بغاوت ہو گئی تمام مقامات مسلمانوں

کے ہاتھ سے نکل گئے یہ سخت خوفناک اور نازک وقت تھا۔ صحابہ کرامؓ بھی کچھ گھبرائے یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نرمی برتنے کی استدعا کی۔ (۱) جیش اسامہ کو فی الحال روک لیا جائے (۲) مرتدین کو زکوٰۃ معاف کر دی جائے

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا۔ جس جیش کو حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمایا ہے ابو بکر اسے نہیں روک سکتا خواہ تمام دنیا مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لئے کیوں نہ چڑھ دوڑے۔

(۲) اگر ابو بکرؓ تنہا بھی رہ گیا اور سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو خدا کی مدد سے تن تنہا سب سے جہاد کرے گا اور مرتدین کو زکوٰۃ میں سے اونٹ کے باندھنے کی ایک رسّی بھی معاف نہیں کی جائے گی۔

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را　　نشاید پیشِ غیر اللہ جبیں را

سرزمین افریقہ کے دُور و دراز اور گھنے جنگلوں میں حضرت عقبہؓ بن نافع بربرہ کے لاتعداد لشکروں کے درمیان گھر گئے ان کے ساتھ چند مسلمان بھی تھے یہ حالت دیکھ کر حضرتؓ نے فرمایا

"مسلمانو! ہمارا وقت آگیا ہے! اس لئے اپنے میان توڑ ڈالو اور شمشیریں باہر نکال لو۔ تلوار اس وقت تک ہاتھ سے نہ چھوٹے جب تک کہ ہاتھ میں جنبش کرنے کی سکت باقی رہے۔ الوداع۔ ہم سب حوضِ کوثر پر اکٹھے ہوں گے"۔

سخت خوفناک اور گھمسان کا رن پڑا۔ حضرت عقبہؓ اور ان کے تمام ساتھی شہادت کا تاج پہن کر جنت الفردوس کو سدھار گئے لیکن بربریوں کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد ان میں مسلمانوں کے مقابلہ میں جم کر لڑنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را　　نشاید پیشِ غیر اللہ جبیں را

طارق بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے سرزمین ہسپانیہ میں داخل ہو گئے ان

کے ساتھ صرف بارہ ہزار سپاہ تھی وہ دشمن کی سرزمین میں داخل ہو چکے تھے اپنے مرکز سے دُور پہنچ کر سلسلہ رسل و رسائل منقطع کر چکے تھے سامنے سے دشمن ایک لاکھ تیس ہزار جرّار لشکر لئے بڑھا چلا آرہا تھا وہ اپنے گھر میں اور یہ اپنے گھر سے دُور تھے۔ رنگ و نسل مذہب و قوم کسی قسم کا دنیاوی رشتہ اہلِ ملک کے ساتھ نہیں تھا قلیل التعداد ہونے کے باوجود اس سرزمین کا ذرّہ ذرّہ انکا اور انکے ساتھیوں کا جانی دشمن اور خون کا پیاسا تھا کہیں سے کسی قسم کی امداد کا ملنا قطعاً ممکن نہیں تھا وہ یہ سب کچھ جانتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ اُنہوں نے واپسی کا راستہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے مسدود کر دیا تمام جہازوں کو آگ لگوادی تاکہ واپس ہو کر جان بچانے کا تخیل ہی اُن میں سے کسی کے ذہن میں نہ آسکے کیونکہ ؎

اگر گردوں بکام او نہ گردد به کام خود به گرداند زمیں را

حضرت عقبہؓ نے افریقہ کے گھنے جنگلوں میں اسلامی چھاؤنی کی بنیاد ڈالنی چاہی یہ تمام جنگل درندوں اور حشرات الارض سے بھرا پڑا تھا لیکن اس کے سوا کوئی دوسری موزوں جگہ بھی نہیں تھی۔ سامنے سے بربریوں کے بڑھے چلے آنے کی اطلاعات پہنچ رہی تھیں آپ ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہوئے اور پکار کر باآواز بلند کہا:

"اس جنگل کے رہنے والو! ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں ہم اس جگہ اسلامی چھاؤنی کی بنیاد رکھنے والے ہیں اس لئے اس جگہ کے تمام درندوں اور حشرات الارض سے ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ اس جگہ کو خالی کر دیں ہم تم کو صرف تین دن کی مہلت دے سکتے ہیں اس کے بعد جو بھی تم میں سے یہاں پایا گیا ہم اسے قتل کر دیں گے"

تم تعجب نہ کرو یہ آواز ایک مردِ حق پرست کی تھی انسان جب خدا کا ہو جائے تو تمام مخلوق اس کا حکم ماننے پر مجبور ہے۔ دنیا نے دیکھا اور حیرت و استعجاب سے دیکھا کہ درندے اور حشرات الارض بھاگے جا رہے تھے اور اپنے بال بچّوں تک کو ساتھ لئے چلے جا رہے تھے

تین دن گذرنے نہیں پائے کہ جنگل خالی ہو گیا اور یہ جگہ فسطاط یعنی خیموں کی چھاؤنی کہلانے لگی۔

اگر گردوں بکام او نہ گردد بکام خود بہ گرداند زمیں را

پانی پت کے وسیع میدان میں ایک سو اٹھارہ راجے مہاراجے اور تین لاکھ راجپوت جمع ہو چکے تھے۔ محمد غوری علیہ الرحمۃ کو یہ معلوم تھا جب کہا گیا کہ بچے چند نہیں آیا تو جواب ملا کہ ایک سو اٹھارہ کی بجائے اگر ایک سو نہیں ہو جائیں تو مسلمان کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ تاہم یہ تفوق خوفناک تفوق تھا مادی اسباب میں اس قدر قلت آج تک کبھی رنگ لائے بغیر نہیں رہی تھی۔ محمد غوری نے شیخ الاسلام کو اپنی عبا اتار کر دکھائی اس کے جسم پر وہی قمیص تھی جو سال گذشتہ کے جنگ کے وقت اس نے پہنی ہوئی تھی سلطان نے یہ دکھا کر کہا:۔

"مولانا! خدا کی قسم سال بھر سے میں نے اس قمیص کو اپنے جسم سے اس لئے کبھی جدا نہیں کیا کہ میں گذشتہ سال کی ذلت کو ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہ کر سکوں بھگوڑوں کو میں اس وقت معاف کرتا ہوں لیکن اب اُن کا فرض ہے کہ ؎

اگر گردوں بہ کام او نہ گردد
بہ کام خود بہ گرداند زمیں را

منظومات

اے وادیٔ پنجاب!

(غلام سرور فگار)

پنہاں پسِ مغرب ہُوا وہ مہرِ جہانتاب
طاری ہے ہر اک چیز پہ اک کیفیتِ خواب
اے وادیٔ پنجاب!
تھی اُس کی نوا حاملِ ہنگامۂ محشر
گریہ میں تھا سرمایۂ صد قلزمِ سیلاب
اے وادیٔ پنجاب!
روشن کیا جس نے یہ جہاں نورِ خودی سے
وہ بحرِ محبّت کا تھا اک گوہرِ نایاب
اے وادیٔ پنجاب!
دریاؤں کو بخشا اثرِ کوثر و تسنیم
اور اُس نے زمیں کو کیا افلاک کا ہم تاب
اے وادیٔ پنجاب!

نغمات سے خالی ہے فضا تیرے جہاں کی
ہے ساز تو کیا ؟ جب نہیں وہ صاحبِ مضراب
اے وادیٔ پنجاب!

آئے بھی تو کیا لذتِ مے نوشی و رقص آئے
ساغر تو ہیں ، نایاب ہے لیکن وہ مئے ناب
اے وادیٔ پنجاب!

اب کس سے سُنیں ہم غمِ ماضی کا فسانہ
اور کون کرے گا دلِ امروز کو بے تاب
اے وادیٔ پنجاب!

مَیں روتا ہوں ، رو تُو بھی اُسے اے دلِ راوی
اور خاک بہ سر تُو بھی ہو ، اے وادیٔ پنجاب!
اے وادیٔ پنجاب!!

ذوق و شوق

(غلام سرور فگار)

اک تازہ جنوں دے تو مرے قلب و نظر کو
صد چاک کروں پیرہنِ شمس و قمر کو

نالوں سے کروں سینۂ افلاک کو چھلنی
اور شوخیٔ پرواز سکھا دوں میں شرر کو

ہر صبح وہی دن ہے تو ہر شام وہی رات
اک گردشِ نو چاہیئے اس شام و سحر کو

جو عشق کی گرمی سے ہو بیتابِ تمنّا
طے کرتا ہے اک آن میں صد سالہ سفر کو

اک بانگِ انا الحق سے پھر اے مردِ قلندر
بیدار کر اس عشق کے خوابیدہ اثر کو

اقبالؔ کی نظروں میں جو ہو جائے یہ مقبول
لگ جائیں گے سو چاند مرے حسنِ ہنر کو

○

دل پہلو میں ہے، دل میں کچھ احساس نہیں ہے
خالق کی تمنّاؤں کا بھی پاس نہیں ہے

شہباز کی مانند تری رفعتِ پرواز
یہ صحنِ چمن تجھ کو مگر راس نہیں ہے

وہ فقر نہیں مکر ہے جس کو کہ ہے پیسِ مرگ
اک زندگیٔ نو کی اگر آس نہیں ہے

قایل نہیں ہے عفو کے اُس رند کی لغزش
مستی میں جسے ساقی کا کچھ پاس نہیں ہے

دل پہلو میں اور دل میں ہو گر درد و غم و شوق پھر کونسی شئے ہے جو ترے پاس نہیں ہے

اک حشر کیئے جاؤ بپا، اے دلِ بے تاب
اچھا ہے انہیں نالوں کا احساس نہیں ہے



دل کی مینا اور ہے، شیشے کی مینا اور ہے اِس کی صہبا اور ہے اور اُس کی صہبا اور ہے
ایک مستی ہے کہ مرہونِ خمار و خستگی جاودانی ہو اثر جس کا وہ نشّہ اور ہے
ایک ہی جلوہ ہے لیکن فرق اہلِ دید میں چشمِ بینا اور ہے اور قلب بینا اور ہے
کوہ و صحرا میں جو گم ہو وہ نہیں سودائے عشق کوہ و صحرا جس میں خود گم ہوں وہ سودا اور ہے
جس کی فطرت ہو امینِ قاہری و دلبری جس کا شیدائی ہے دل وہ روئے زیبا اور ہے
کس نے پھر یکسر بدل ڈالی مری بزمِ خیال اب تمنائی ہوں میں جس کا وہ دُنیا اور ہے
دمبدم ہو اور بھی یہ شعلۂ فرقت بلند میرے اِس دردِ محبّت کا مسیحا اور ہے

تُو نے اے اقبال پھونکا صُورِ اسرافیل کیا
عالمِ فکر و عمل کا اب تو نقشہ اور ہے

———(٥)———

خطاب بہ مسلم

(جناب امین حزیں سیالکوٹی)

اُٹھ مسلمِ خوابیدہ! یہ خوابِ گراں کب تک؟
مقہورِ زماں کب تک
مزدورِ جہاں کب تک
مسرُورِ زیاں کب تک
مخمورِ جناں کب تک
اُٹھ مسلمِ خوابیدہ! یہ خوابِ گراں کب تک؟

اُٹھ، اُٹھ، مئے ایقاں پی اے میکشِ دیرینہ!
تیرا دلِ بے کینہ
وحدت کا ہے گنجینہ
ہے طُور ترا سینہ
تُو عرش کا ہے زینہ
اُٹھ، اُٹھ، مئے ایقاں پی اے میکشِ دیرینہ!

اُٹھ دل سے مسلماں ہو کر عہدِ کہن تازہ

تو حق کا ہے آوازہ
عرفان کا دروازہ
اقوام کا شیرازہ
اللہ کا جمّازہ
اُٹھ دل سے مسلماں ہو کر عہدِ کہن تازہ

اُٹھ جاگ بہت سویا جینا ہے تو مسلم بن
کیوں دین سے ہے نفرت
مادے سے ہے یہی مامن
اے آہوئے شیر افگن
بے باک ہو، لا تحزن
اُٹھ جاگ بہت سویا جینا ہے تو مسلم بن

اُٹھ، ہوش میں آ مسلم یہ بے خبری کب تک؟
یہ بے بصری کب تک؟
کوتہ نظری کب تک؟
یہ در بدری کب تک؟
دریوزہ گری کب تک؟
اُٹھ، ہوش میں آ مسلم یہ بے خبری کب تک؟

نقد و نظر

متاعِ اقبالؒ مصنّفہ ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے لیکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن -
تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۰۴ صفحے قیمت ایک روپیہ مجلّد ڈسٹ کور
ملنے کا پتہ :- مینجر مکتبہ امداد باہمی، سٹی کالج، حیدرآباد دکن

زیرِ تبصرہ کتاب میں علامہ اقبالؒ کی شاعری کے جن مختلف پہلوؤں پر ایک اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں (۱) اقبالؒ کی شاعری اور اُس کا پسِ منظر (۲) اقبالؒ کا ذہنی ارتقاءؔ (۳) اقبالؒ کا شاعرانہ فلسفہ۔

فاضل مضمون نگار نے اِن عنوانات کے ماتحت جس ژرف نگاہی کے ساتھ علامہ اقبالؒ کے تینوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ اس سے اُن کے ذوقِ تحقیق کا ثبوت ملتا ہے پڑھنے کو اقبالؒ کا کلام سب لوگ پڑھتے ہیں اور اُس کے تاثر کے ماتحت جھوم بھی جاتے ہیں لیکن کتنا خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی نگاہوں کو اقبالؒ کے کلام کے الفاظ اور تاثیر کے پردے میں ایک ایسا جہانِ معنی دکھائی دیتا ہے جو زندگی کے حقائق و معارف سے لبریز ہوتا ہے۔ اشیاء پر سطحی نظر ڈالنے والے اس لذت سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ جن اہلِ ذوق کی یہ خواہش ہو کہ وہ اقبالؒ کی شاعری کے اِن تینوں پہلوؤں کی حقیقت کا مشاہدہ اپنی آنکھوں

سے کریں یہ مجموعہ اُن کے لئے آئینۂ اقبال نما ہوگا۔

سفینۂ حیات مصنفہ منشی غلام قادر صاحب فرخ امرتسری صفحات ۴۰ قیمت ۱۲

ملنے کا پتہ ۔ فرخ دار الاشاعت امرتسر

یہ سلسلۂ مطبوعاتِ ملّیہ ہند کا پہلا نمبر ہے جو اس دار الاشاعت کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ "سفینۂ حیات" آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ ہے اس وقت مسلم لیگ کی متعدد تاریخیں رائج ہیں مگر اس مختصر سی تاریخ کو کئی اعتبار سے اُن پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک تو اس کی جامعیت قابلِ تعریف ہے دوسرے مصنف کی زیادہ تر معلومات ذاتی ہیں۔ کیونکہ وہ خود کانگرس اور مسلم لیگ کے میدانوں کا شہسوار رہ چکا ہے۔ تیسرے جو رویہ اس کی ترتیب و تدوین میں ملحوظ رکھا گیا ہے اعتدال پسندی کا آئینہ دار ہے۔ چوتھے مصنف نے اپنے مخصوص زورِ بیان، ادبی اسلوب تحریر اور اشعار سے اس میں ایک ایسی روح پھونکی ہے جو پڑھنے والے پر بھی ایک خاص کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ پانچویں اپنے بیان کی تصدیق میں جابجا مستند حوالہ جات دیئے ہیں جن کا فراہم کرنا بڑے وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ مصنف کو ۱۹۰۵ء سے لے کر آج تک قومی تحریکات کے ساتھ انتہائی شغف رہا ہے

کتاب مذکور نو ابواب پر مشتمل ہے اور قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے اعتبار سے بھی بہتر ہے شائقین کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے لیکن جو صاحب ایک نسخہ منگوانا چاہیں اُنہیں ۵ کے ٹکٹ بھیجنے چاہئیں۔ ایک روپیہ سے کم کا وی۔ پی۔ پی روانہ نہیں کیا جاتا۔

اقبال مدیر جناب ظفر احمد صدیقی ایم۔ اے دعلیگ، تقطیع ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۸۴۔

قیمت سالانہ چار روپیہ۔ فی پرچہ ۶ ۔ مقام اشاعت :۔ شبلی روڈ۔ علی گڑھ

جیسے کہ اغراض و مقاصد سے ظاہر ہے یہ رسالہ حلقۂ اقبال علی گڈھ کی آواز ہے جس کا مقصد علامہ اقبالؒ کے پیغام کی اشاعت ہے اس وقت لاہور اور دہلی سے بھی اس مقصد کی اشاعت کے لئے رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ علی گڈھ بھی لاہور کی طرح علمی سرگرمیوں کا مرکز ہے علامہ اقبالؒ کے پیغام کی اشاعت کے لئے وہاں سے کسی رسالے کا شائع ہونا بسا غنیمت ہے۔

ہمارے ہاتھوں میں اس وقت رسالہ مذکور کا پہلا نمبر ہے۔ مضامین میں سے مولانا عبدالماجد دریابادی کا مضمون بعنوان "تمدنِ اسلام کا پیام بیسویں صدی کی دُنیا کے نام" بیحد قابل قدر اور اُن کے مخصوص مؤثر پیرایہ میں ہے۔ اس کے علاوہ باقی مضامین کے انتخاب اور اُن کی ترتیب سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے اس میں کافی سے زیادہ زور دیا گیا ہے یہ مسئلہ اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ازبس ضروری ہے لیکن ہمارے خیال میں جو چیز اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ مسلمانوں کے مذہبی اور ذہنی افکار کی تشکیل جدید ہے جس کے لئے کسی منظم کوشش کی ضرورت ہے ہمیں یقین ہے کہ رسالے کے بالغ نظر مدیر اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور وہ اس کی آئندہ اشاعتوں میں ایسے مضامین کے لئے زیادہ گنجائش نکالیں گے جو مسلمانوں کی ذہنی تربیت کے لئے تعمیری لائحہ عمل پیش کرتے ہوں۔ مسلمانوں کو اُن کی بے زری اتنا نقصان نہیں پہنچا رہی جتنا اُن کی کور ذوقی اور علامہ اقبالؒ نے اُن کے اس مرض کے لئے نسخہ تجویز کر دیا ہے اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس نسخہ کو استعمال کرائیں۔

نظم کا حصہ جو زیادہ تر فاضل مدیر کے افکار پر مشتمل ہے رسالے کی جان ہے خدا اُن کے زورِ قلم میں اضافہ کرے۔

رسالہ کی لکھائی، چھپائی اور کاغذ بدرجہ اوسط ہے اور ضخامت بھی کم ہے جس کے مقابلہ میں چار روپیہ قیمت بہت زیادہ ہے علامہ اقبالؒ کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن سے متعلقہ مطبوعات کی قیمتیں کم رکھی جائیں تاکہ عوام بھی خرید سکیں۔

خادم الحکمت

ایڈیٹر زبدۃ الحکماء ممتاز الاطبا حکیم ڈاکٹر دوست محمد صابر

پرنسپل شاہدرہ طبیہ کالج لاہور

تقطیع ۲۰×۲۶ ضخامت ۳۲ صفحات چندہ سالانہ دو روپے قیمت فی پرچہ ۳ ر ملنے کا پتہ۔ دفتر آل انڈیا انجمن خادم الحکمت فیض باغ۔ لاہور

یہ رسالہ جیسے کہ سرورق سے ظاہر ہے جناب حکیم سید فضل حسین صاحب امیر انجمن خادم الحکمت لاہور کے زیر سرپرستی شائع ہوتا ہے جو حضرت استاذ الاطبا حکیم احمدالدین مرحوم موجد طب جدید کے جانشین ہیں۔ اس رسالے کا مقصد ایک ایسے جدید طریق علاج کی اشاعت ہے جس کو موجد مرحوم نے تمام مروجہ طریقہ ہائے علاج کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مرتب کیا تھا اس وقت تک تین طریقہ ہائے علاج رائج تھے ایک ایلوپیتھی دوسرا ہومیوپیتھی تیسرا سوپیتھی لیکن جس طریق علاج کی اشاعت اس رسالے کا مقصد ہے اس کا نام فرد پیتھی ہے جس کے ذریعہ برخلاف دوسرے طریقوں کے مرض کی علامات کو افعال الاعضا کے ماتحت اعتدال پر لایا جاتا ہے در اصل یہ طریق علاج اول الذکر تینوں طریقہ ہائے علاج کے مجموعہ کا نام ہے۔

مارچ کے پرچہ میں فرد پیتھی کے مختلف موضوعات پر مضامین موجود ہیں لیکن جناب حکیم سید فضل حسین صاحب کا مضمون بعنوان "اکسیر الاکاسیر" بیحد پُر مغز ہے اس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کو اس فن میں کتنا تبحر علمی حاصل ہے اس کے علاوہ بھی جتنے مضامین ہیں اُن سے تحقیقی انداز ٹپکتا ہے چونکہ یہ طریق علاج جدید ہے اس لئے اس کو پیش

کرنے کے لئے جس کاوش طبع کی ضرورت ہے اس کا ثبوت اس رسالہ سے ملتا ہے علم طب سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

العلاج زیر نگرانی حکیم مولوی حاجی محمد عبداللہ صاحب روڑی تقطیع ۳۰×۲۰/۸ ضخامت ۴۰ صفحات۔ چندہ سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ فی پرچہ ۲؍

ملنے کا پتہ۔ مینجر العلاج روڑی ضلع حصار (پنجاب)

اس رسالہ کے جنوری ۱۹۴۰ء اور فروری ۱۹۴۰ء کے دو نمبر ہمیں موصول ہوئے ہیں زیر تبصرہ نمبروں میں ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کے خواص، مرکبات کے نسخے، مجرب کشتہ جات کے طریقے اور صنعت و حرفت کے پوشیدہ راز کے موضوعات پر مفید مضامین درج ہیں جو بڑی محنت سے فراہم کئے گئے ہیں۔ رسالہ مذکور کے کارکن بڑے دریادل واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنے خریداروں کو سال بھر میں چار خاص نمبر کتابی شکل میں پیش کریں گے۔ چنانچہ مارچ کا پہلا خاص نمبر "خواص شہد" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ شائقین کے لئے فائدہ اٹھانے کا بہترین موقعہ ہے۔

ہمارے خیال میں عام گھرانوں کو بھی اس قسم کے رسائل کا مطالعہ کرکے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ اِن میں روزمرہ کی بیشتر ایسی معلومات ہوتی ہیں جن کا طبیبوں نے بارہا تجربہ کیا ہوتا ہے۔

نگار

"گلبانگِ آزادی"

غلامی روح کی "سسکی" ہے اور آزادی اسکا "نغمہ"

دُنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو روح کے لئے بجائے نغموں کے سسکیاں پسند کرتا ہو، اور اس اعتبار سے "گلبانگِ آزادی" ہر ایک انسان کے لئے فطرتاً محبوب ترین چیز ہے، یہ آزادی کے موضوع پر ۷۵ معیاری رباعیوں کا بہترین مجموعہ ہے، جو "شاعر بُرہان" جناب نہالؔ سیوہاروی کی تراوشِ فکر ہیں! — ایک انسان کی سب سے بڑی خلش "غلامی" ہے اور کسی شاعر کی تخئیل میں بلند پروازیوں کے ساتھ جب یہ تڑپ شامل ہو جاتی ہے تو اس کی قوت بیاں کی سحر طرازیوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ "گلبانگِ آزادی" میں نہالؔ صاحب آپ کو شعر و شاعری کے اسی مقام ارفع پر نظر آئیں گے۔ غلام آباد ہند میں درحقیقت ان کے یہ روح پرور نغمے اس قابل ہیں کہ ہر شخص انہیں حرزِ جان بنا کر رکھے۔ اس مجموعہ کو "مکتبہ بُرہان" نے چھوٹے سائز پر اعلےٰ ترین کتابت و طباعت اور بہترین کاغذ کے ساتھ شائع کیا ہے جس کے شروع میں ۱۶ صفحات پر جناب مولانا سعید احمد صاحب ایم۔اے ایڈیٹر بُرہان کا فاضلانہ و عالمانہ مقدمہ ہے جسمیں صاحب موصوف نے اُردو شعر و شاعری کے ارتقائی رجحانات پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہوئے نہالؔ صاحب کے کلام پر بھی مختصر تنقید کی ہے۔ کتاب کی دیدہ زیبی کو بڑھانے کیلئے اسکی خوبصورت جلد پر سنہری حروف میں کتاب اور مصنف کا نام بھی موجود ہے قیمت صرف ۸/

ملنے کا پتہ: **مکتبہ بُرہان۔ قرول باغ۔ نئی دھلی**

اقبال اکیڈیمی لاہور کا پہلا شاہکار

یادِ اقبالؒ

حصہ اوّل

ہندوستان بھر کے مقتدر شعراء نے ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی رحلت پر جس گہرے تاثر و احساس کے ساتھ اظہارِ عقیدتمندی کیا ہے وہ اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ ہمارا یہ دعوےٰ ہے کہ ہندوستان تو درکنار دُنیا بھر کی کسی شخصیت کے متعلق اتنی کثرت سے مرثیے نہیں لکھے گئے۔ عوام تو عوام خاص بھی اس کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر ہیں کہ اگر ان نظموں کو یکجا کیا جائے تو اس کی کئی مجلّدات ہو سکتی ہیں۔ اقبال اکیڈیمی لاہور جس کا مقصد اقبالؒ کے حیات افروز پیغام کی نشر و اشاعت ہے اِس کے کارپردازوں نے سب سے پہلے "پیغام حق" ماہنامہ جاری کیا جو ایک سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ اب مہینوں کی تلاش و جستجو اور عرقریزی کے بعد یہ مجموعہ تیار کیا ہے۔ جس کا حصہ اوّل اقبالی ذوق رکھنے والے اصحاب کے دلوں کو گرمانے کے لئے شائع ہو چکا ہے۔ قیمت غیر مجلد عہ۔ مجلّد عہ

ملنے کا پتہ:۔

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

Registered No. L. 4584

جولائی ۱۹۴۰ء

جلد ۳ عدد ۱

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت (گرامی)



ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

غلام سرور فگار

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

سرورق یونین پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ لاہور میں طبع ہوا

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھہ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خار اشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

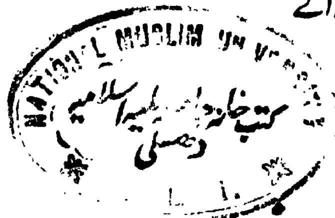
لیکن انسان کی کچھہ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انھی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بےجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

سالانہ قیمت

عوام سے دو روپے بارہ آنے — روساء سے پانچ روپے



فہرست مضامین

جلد (۲۳)	جولائی سنہ ۱۹۴۰ء	عدد (۱)

افتتاحیہ:-

سخنہائے گفتنی — سید محمد شاہ ایم۔اے — ۲

مقالات:-

اسلام کا نظریۂ سیاسی — سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور — ۹

فوائد فلسفہ (ترجمہ) — سید جمال الدین افغانی — ۳۹

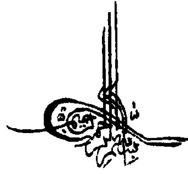
اقوال حضرت مجددؒ الف ثانی — جناب شیخ عبدالمالک صاحب پروپرائٹر کرنال شاپ لاہور — ۵۲

تمدنِ افرنگ — جناب مرزا محبوب عالم صاحب — ۵۴

منظومات:-

میکدۂ صوفی — مرزا عزیز فیضانی داراپوری — ۶۰

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر دفتر رسالہ پیام حق ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع ہوا



سخنہائے گفتنی

کانگرس نے گزشتہ چند سالوں سے دو لفظوں کا استعمال بہت زیادہ کر رکھا ہے فرقہ پرست (COMMUNALIST) اور خوشامد پسند (TOADY)۔ وہ شخص جو بدل وجان کانگرس کے ساتھ نہیں وہ خوشامد پسند (TOADY) ہے اور وہ مسلمان جو کانگرس کے تابع فرمان نہیں ہو وہ خوشامد پسند بھی ہے اور فرقہ پرست بھی ــــــ ہندوؤں کے محاورہ (PARLANCE) میں ہر ایک مسلمان فرقہ پرست (COMMUNALIST) ہے ــــــ یہ لفظ بطور گالی کے استعمال کیا جاتا ہے جس سے صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر ونائت (INEFRIORITY COMPLEX) کا احساس پیدا کیا جائے اُنہیں اخلاقی طور پر کمزور کر دیا جاوے اُن کے اندر اختلافات پیدا کئے جاویں اور بیرونی ممالک میں اُن کو بدنام کیا جاوے۔ اگر چند آدمی مل کر کسی شخص کو ہر وقت بُرے بُرے ناموں سے پکارنا شروع کر دیں تو خواہ وہ بچارہ کتنا ہی معصوم اور بے گناہ کیوں نہ ہو ایک دن اپنے دل میں ضرور محسوس کرنے لگے گا کہ اُس نے ضرور ہی کسی خوفناک جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ کانگرس نے مسلمانوں کے اندر اختلافات کے بیج بو دیئے ہیں اور اُن کے دماغوں میں ایک انتشار پیدا کر دیا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو ہندو یورپ، امریکہ یا مشرق بعید کی طرف جاتے ہیں وہ ہندوستانی مسلمانوں کو

بدنام کرنا اور اُنہیں دشمنِ وطن اور فرقہ پرست کے ناموں سے یاد کرنا اپنا اولین فرض قرار دے لیتے ہیں۔ یہ بھی ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کی ایک سازش ہے یہ پروپیگنڈا ایران، عراق، ترکی اور مصر جیسے اسلامی ممالک میں بھی پھیلایا گیا تھا اور کافی کامیاب ہو گیا تھا مگر بالآخر، رنذ ٹیبل کانفرنس نے اِس دہوکہ کے چہرہ سے نقاب کشائی کر دی۔

مگر یہ فرقہ پرستی (COMMUNALISIM) اور یہ فرقہ پرست ہے کیا چیز؟ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ یہ لفظ عام طور پر قومیت (NATIONALISM) کے مقابلہ پر بولا جاتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ قومیت کیا چیز ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو قوم پرست (NATIONALIST) کہتے ہیں اُن میں شاذ و نادر ہی کوئی ہوگا جو نیشنلزم کی صحیح تعریف کر سکے گا۔ اگر آپ کسی نیشنلسٹ کا جائزہ لیں تو آپ اُسے یا تو بدترین قسم کا فرقہ پرست پائیں گے یا بدحواس احمق دیکھیں گے۔ نیشنلسٹ مسلم اِس لفظ کو اِن معنوں میں استعمال کرتا ہے کہ وہ مادرِ وطن کی آزادی کا خواہاں ہے۔ یہ اِس لفظ کا سخت غلط استعمال ہے اور بہت زیادہ غلط فہمی کا باعث بن رہا ہے کیونکہ حُبِّ وطن اور قومیت دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ بانیٔ اسلام علیہ السلام محبِ وطن تھے اور اپنے ملک سے بہت محبت رکھتے تھے اور باوجود قلت اسباب کے آپؐ نے اپنے آبائی ملک کے آزاد اور زندہ رکھنے کے لئے رومن امپائر سے اعلان جنگ کیا مگر آپ قوم پرست نہ تھے درحقیقت آپ نے اپنے متبعین کے اتحاد کے لئے ایسی چیزیں مقرر فرمائی ہیں جن سے قومیت کی نفی ہوتی بلکہ جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

اتحاد کے دو دواعی انسانی اتحاد کے دو داعی (BASES) ہیں ایک خاندانی (RACIAL) دوسرا جذباتی (EMOTIONAL) تیسرا داعیہ جیسے ہندو سلسلوں کا خواب کہنا چاہئے اور جیسے پنڈت جواہر لعل نہرو اور اس کے متبعین اِس ملک میں پھیلا رہے ہیں وہ روٹی یا پیٹ کا سوال ہے۔ مگر یہ داعیہ اب تک قومی یا فرقہ وارانہ اتحاد کی کامیاب بنا نہیں بن سکا اور نہ یہ ممکن ہے کہ مستقبل میں بن سکے گا

کیونکہ انسان محض روٹی ہی سے زندہ نہیں رہتا۔ انسان کی زندگی اس کے علاوہ اور اس سے بلند تر چند معانی پر منحصر ہے جس کی خاطر درندوں تک روٹی کے خیال کو ذہن سے نکال دیتے ہیں۔ اور دنیا میں اُس شخص سے بڑھ کر کون کمینہ ہو سکتا ہے جو پیٹ کو ہر چیز پہ ترجیح دے اور جس کی نگاہ اس سے آگے اعلیٰ اور بلند فائدوں کے حصول پہ مرکوز نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ روٹی زندگی کے بقار کے لئے ضروری ہے مگر انسان کچھ ایسی طرح بنایا گیا ہے کہ وہ اُن بلند غیر مادی فائدوں کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اگر آپ اُن فائدوں کو حاصل کر رہے ہیں تو روٹی آپ کے پاس خود بخود اُن کے نتائج کے طور پر آجائے گی۔ کسی قوم کی تباہی اور موت کے بڑے بڑے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ان فوائد کو نگاہ سے اوجھل کر دے کیونکہ وہی تو دراصل اُس کے زندہ رکھنے کا مسالہ ہیں، اس کی اصل جان ہیں اور اُس کی زندگی اور اتحاد کا واحد داعیہ ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے من حیث الجماعت زوال پذیر ہونے کا یہی ایک باعث ہے کہ اُنھوں نے ان فوائد کو نگاہ سے اوجھل کر رکھا ہے۔ وہ طاقتور اور دولتمند رہے ہیں۔ اُنھوں نے اب اپنی طاقت بھی کھو دی ہے اور دولت بھی اور سرعت کے ساتھ اپنی آخری تباہی کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ صرف ایک چیز اُن کو بچا سکتی اور ایک مرتبہ پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرنے کی طاقت بخش سکتی ہے۔ اُنہیں اپنی قومی روح پہ قابض ہونا چاہیئے اُنہیں اس عظیم الشان اصول پر اپنی نگاہ کو مرتکز کرنا چاہیئے جو اُن کے اتحاد کی اصل بنا ہے اور جو اُنہیں ایک سیاسی جماعت (BODY - POLITICS) کی شکل دیتا ہے۔

بہت سی اقوام مثلاً انگریز، جرمن، اطالوی، فرانسیسی اور جاپانی خاندانی (RACIAL) اتحاد کی مثالیں ہیں۔ خود غرضانہ طمع اور باہمی نفرت اُن کی بڑی بڑی خصوصیتیں ہیں۔ جب وہ ایک دوسرے سے برسرپیکار نہیں ہوتے تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اُن کا باہمی حسد اور ایک دوسرے سے متضاد مفاد تمام دنیا کے لئے بے چینی، بدامنی اور تکلیف کا باعث بنے

ہوئے ہیں جس قومیت کی بنا خوف اور نفرت پر ہوگی وہ جنگ اور خونریزی کے سوا کوئی چیز پیدا ہی نہیں کر سکتی۔ جنگِ عظیم، اُس کے وہ اسباب جو اِس کے محرک تھے اور یورپ کی موجودہ حالت ایک صاحبِ نظر کو قومیت کی خرابیاں سمجھنے کے لئے کافی ہونا چاہئیں۔ اسی یورپین نمونہ کی قومیت ہے وہ جسے ہندو حضرات ہندوستان میں قائم کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔

اسلام تاریخِ عالم میں ایک نیا تجربہ تھا جس کے امکانات تاحال پورے پورے معرضِ ظہور میں نہیں آئے۔ اس نے خاندانیت (RACE) کو اتحاد کی بنا قبول کرنے سے ہمیشہ کے لئے انکار کر دیا۔ اس کو "جاہلیت" کا نام دے کر ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا اور اس کے بجائے جذباتی تخیل (EMOTIONAL ELEMENT) کے لئے جگہ بنائی۔ مثلاً ہر فرد کو یہ احساس دلایا کہ تمام اقوام اور تمام خاندان دراصل ایک ہی قوم ہیں اور تمام بنی نوعِ انسان دراصل ایک ہی خاندان ہے۔ خون یا خاندان کا احساس دراصل بہت ہی کمزور احساس ہے۔ یہ محض اُس وقت تک کام دیتا ہے جب تک کوئی اخلاقی یا روحانی اصول سامنے نہ ہو اور جونہی کہ کوئی بلند اصول انسان پر منکشف ہوا یہ احساس فوراً کافور ہو جاتا ہے۔ اس لئے انسانی اتحاد کی بنا صرف اس احساس پہ قائم کی جا سکتی ہے کہ ہر فرد یہ سمجھنے لگے کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ عرب، ترک، جرمن، فرانسیسی، ہندوستانی اور جاپانی محض امتیاز اور اشارے کے لئے نام ہیں مگر حقیقت میں سب کے سب ایک خاندان کے افراد ہیں۔ اس خیال کو ہر ایک فرد تک پہنچانے کی غرض سے اسلام نے اسے اپنے اعتقاد کا ایک جزو قرار دے لیا ہے۔ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ "تمہیں ایک نفسِ واحد سے پیدا کیا" بار بار قرآن میں آیا ہے۔ "دیکھو، عربوں کو غیر عربوں پر کوئی فضیلت نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے"۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے۔ غرضیکہ انسانی برابری اور برادری کا خیال یوں مسلمان کے ضمیر میں نقش کر دیا گیا ہے، لہٰذا خاندانی امتیازات اُس مسلمان کے لئے جو مسلمان پیدا ہوا ہو، مسلمانوں

کے اندر تربیت پاچکا ہو اور مسلمان ماحول کے اندر رہتا ہو بالکل عجیب و غریب چیز ہیں۔ برعکس اس کے مغربی قومی ممالک میں لوگوں کی زبان پر صرف یہ جملہ ہوتا ہے "میرا ملک خواہ وہ حق پہ ہے اور خواہ باطل پہ"۔ یہ احساس دراصل انصاف کی روح، انسانیت اور شرافت کے لئے موت کے مترادف ہے اور مسلمان کے ضمیر کے لئے بالکل اجنبی چیز۔ وہ اپنی محبت اور اپنی ہمدردی کو کسی ایک قوم کے دائرہ تک محدود نہیں کرسکتا اور خاندانی نفرت اُس کے لئے ناممکنات میں سے ہے۔ وہ اپنے تئیں دنیا بھر کا ایک شہری تصور کرتا ہے اُس کا دل اتنا وسیع ہے کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو گلے لگا سکتا ہے۔ وہ تمام خاندانوں کے لوگوں میں مل جل سکتا ہے۔ اُن سے بھائیوں کی طرح معانقہ کرسکتا ہے۔ اُن کی خوشیوں میں شامل اور اُن کی غمی میں برابر کا شریک ہو سکتا ہے اور یہ سب کچھ اُسی طرح جس طرح ایک قریبی رشتہ دار ہو۔ یہ ہے انسانیت کی آواز جس کے لئے قومیت (NATIONALISM) ایک زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

مسلمان کی فرقہ پرستی کا ایک پہلو یہ ہے۔ ہندو قوم پرست اُس کو بیرونی ممالک سے ہمدردی کرنے کا الزام بھی دے رہا ہے۔ مگر خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ مسلمان جو اس طرح اپنے تخیل کی نشوونما نہیں کرتا جو اُسی طرح کا نیشلسٹ بن گیا ہے جس طرح مغربی ممالک کے لوگ ہیں جو پہلے ہندوستانی ہو اور بعد میں کوئی اور چیز جس کی وفاداری اُس سیاسی جماعت یا اُس جغرافی حد تک محدود ہو جس کا وہ ایک فرد ہے تو ایسا مسلمان محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے طریقہ سے یقیناً ہٹ گیا ہے۔

ہندوؤں کی فرقہ پروری | ہندوستان میں بہت سی جماعتیں ہیں۔ ان میں ہندوؤں کو بہت بڑی اکثریت حاصل ہے۔ مگر اقلیتوں میں مسلمان ہی قابل ذکر اقلیت ہیں۔ دوسری اقلیتیں اتنی قلیل تعداد میں ہیں کہ کسی شمار میں نہیں آسکتیں۔ اس لئے ہندوستانی قومیت کا مسئلہ دراصل ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلق کا مسئلہ ہے۔

ہندو اس ملک میں کوئی تین ہزار سال سے ہیں مگر وہ کبھی بھی آزاد نہیں رہے حتیٰ کہ جب اُنکے حکمران

خود اُنہی کے اپنے خاندان سے تھے اُس وقت بھی وہ آزاد نہ تھے کیونکہ حکمرانی میں اُن کا کوئی حصہ نہ تھا۔ وہ کبھی بھی قوم نہیں بنے ۔ اُن کے اجتماعی نظام نے (SOCIAL SYSTEM) جو بیشمار ذاتوں کا ایک مجموعہ ہے اُنہیں کبھی بھی ایک متفق و متحد قوم نہیں بننے دیا۔ ہندوؤں کا آبائی ملک کوئی نہیں ہے۔ ہندو کا آبائی ملک اُس کی وہ ذات ہے جس کا وہ ایک فرد ہے۔ اُس کا ہمسایہ وہ شخص نہیں ہے جو اُس کے مکان کے پاس رہتا ہے یا اُسی محلہ کا باشندہ ہے اُس کا ہمسایہ اُس کا ہم ذات ہے خواہ وہ اُس سے کوئی ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہی کیوں نہ رہتا ہو۔ یہ عقیدہ کہ انسانی روح دائمی ہے اور کسی کی پیدا کردہ نہیں ہے اور اپنے کرموں کے مطابق ایک جسم سے دوسرے جسم میں چکر لگاتی رہتی ہے اجتماعی اور سیاسی خوبیوں کا جانی دشمن ہے اور ہندوستانیوں کے اندر جذبۂ حُبِ وطن پیدا ہونے نہیں دیتا ۔

اگر ہندوؤں میں کوئی ایسی بات ہے جو اُنہیں دوسری اقوام سے متمیز کرتی ہے تو وہ اُن کی خاندانی وابستگی ہے۔ وہ چار ہزار سال تک اِس ملک کے قدیم باشندوں کے ساتھ رہے ہیں مگر اُن کے ساتھ کبھی ملے جُلے نہیں بلکہ اُن سے ایسا ہی سلوک کرتے رہے ہیں جیسا کہ ناپاک جانوروں سے کیا جاتا ہے۔ اُن کو ہندوستان کے "اچھوت" کہہ کر پکارا جاتا ہے جو کسی انسانی حق کا استحقاق نہیں رکھتے اور اُنہیں اِس قدر ناپاک خیال کیا جاتا ہے کہ اُن کے چھُونے یا بعض اوقات محض سایہ سے بلند ذات کے ہندو اپنے آپکو پلید خیال کرنے لگتے ہیں۔ ہم مسلمان بارہ سو سال قبل فاتح کی حیثیت سے اِس ملک میں آئے۔ ہم نے یہاں حکمرانی کی مگر شروع سے اب تک ہندوؤں کا ہمارے ساتھ وہی سلوک رہا ہے جو اچھوتوں کے ساتھ ہے۔ ہم اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھا نہیں سکتے اُن کے گھروں کے اندر داخل نہیں ہو سکتے اور اگر ہم اُن سے ملیں جُلیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اُن کے گھر اور اُن کے جسم پلید کر دیئے ہیں۔ ہر ایک مسلمان ہندوؤں کی نگاہ میں اچھوت ہے بارہ سو سال تک ایک ہی ملک میں اکٹھے رہنے سہنے نے بھی ہندوؤں کی خاندانی وابستگی (RACIAL EXCLUSIVNESS) کو نہیں توڑا۔ ہندو پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا اور ہر اُس

شخص کے لئے جو ہندو پیدا نہیں ہوتا ہندو مت کے دائرے کے اندر کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہندوؤں کی خاندان پرستی یہودیوں کی خاندان پرستی سے بھی بڑھ گئی ہے۔

اگر آپ مراکو جائیں تو وہاں کے لوگ آپ کی بات سمجھ سکیں گے اور آپ اُن کی بات۔ اِسی طرح اگر آپ انگلینڈ یا جرمنی میں چلے جائیں تو آپ کو کوئی چیز اجنبی نظر نہیں آئے گی۔ مگر آپ کو کبھی کسی ہندو محلہ میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ کسی اجنبی ملک میں آگئے ہیں۔ وہ آپ کے جذبات کو نہیں سمجھیں گے اور آپ اُن کے جذبات اور تعصبات کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ یہ ہندوؤں کی فرقہ پرستی کی ایک تصویر ہے۔ الغرض تہذیبی نصب العین اور اجتماعی رواسم کے باب میں ہندو اور مسلمان بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اِس کے باوجود آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں فریب خوردہ مسلمان جو اپنے آپ کو آزاد اور نیشنلسٹ کے ناموں سے پکارتے ہیں اپنے بھائیوں سے کہہ رہے ہیں کہ آؤ ہندوؤں میں آکر مل جاؤ مگر جن میں یہ لوگ ملنا چاہتے ہیں کیا اُن کی طرف سے بھی اس قسم کی کوئی دعوت آئی ہے اور اگر آئی ہو تو کیا اُس کا اُنہوں نے کوئی عملی ثبوت دیا ہے۔ انگریز سے کچھ طاقت حاصل کرنے اور پھر اُس طاقت کو اپنی بہبود اور مسلمان کی تباہی کے لئے استعمال کرنے کے لئے آزادی ہند کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے اور مسلمان کو آزادی کے نام پر بیوقوف بنا کر شریک جنگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر بھولا بھالا مسلمان اِن چالوں کو مطلق نہیں سمجھتا۔

(باقی)

اسلام کا نظریہ سیاسی

(از جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور)

اسلام کے متعلق یہ فقرہ آپ اکثر سنتے رہتے ہیں کہ "یہ ایک جمہوری نظام ہے" پچھلی صدی کے آخری دور سے اس فقرے کا بار بار اعادہ کیا جا رہا ہے۔ مگر جو لوگ اس کو زبان سے نکالتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ان میں سے شائد ایک فی ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہوں نے اس دین کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو، اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ اسلام میں جمہوریت کس حیثیت سے ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ ان میں سے بعض لوگ تو اسلامی نظام جماعت کی چند ظاہری شکلوں کو دیکھ کر جمہوریت کا نام اس پر چسپاں کر دیتے ہیں! اور اکثر ایسے ہیں جن کی ذہنیت کچھ اس طور پر بنی ہے کہ دنیا میں (اور خصوصاً ان کے حکمرانوں میں) جو چیز مقبولِ عام ہو، اس کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں موجود ثابت کر دینا ان کے نزدیک اس مذہب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ شائد وہ اسلام کو اس یتیم بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو ہلاکت سے بس اسی طرح بچ سکتا ہے کہ کسی بااثر شخص کی سرپرستی اس کو حاصل ہو جائے۔ یا پھر غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ ہماری عزت محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ صرف اس طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلک میں دنیا کے چلتے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جھلک دکھا دیں۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جب دنیا میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہوا تو مسلمانوں میں کچھ لوگوں نے پکارنا شروع کیا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی

کا ایک جدید ایڈیشن ہے۔ اور جب ڈکٹیٹر شپ کا آوازہ اُٹھا تو کچھ دوسرے لوگوں نے اطاعتِ امیر، اطاعتِ امیر کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں، اور لگے کہنے کہ دیکھو، یہاں سارا نظامِ جماعت ڈکٹیٹر شپ ہی پر قائم ہے۔ غرض اسلام کا نظریہ سیاسی اس زمانہ میں ایک چیستاں، ایک چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گیا ہے جس میں سے ہر وہ چیز نکال کر دکھا دی جاتی ہے جس کا بازار میں چلن ہو۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ علمی طریقہ سے اس امر کی تحقیق کی جائے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے۔ اس طرح نہ صرف اُن پراگندہ خیالیوں کا خاتمہ ہو جائے گا جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، اور نہ صرف اُن لوگوں کا منہ بند ہو جائے گا جنہوں نے حال میں علی الاعلان یہ لکھ کر اپنی جہالت کا ثبوت دیا تھا کہ "اسلام سرے سے کوئی سیاسی و تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا" بلکہ درحقیقت تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کے سامنے ایک ایسی روشنی نمودار ہو جائے گی جس کی وہ سخت حاجتمند ہے، اگرچہ اپنی اس حاجت مندی کا شعور نہیں رکھتی۔

تمام اسلامی نظریات کی اساس سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں اِدھر اُدھر سے مختلف قسم کی چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں ان سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصولِ اوّلیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اصولِ اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں، اور جڑوں سے تنہ، اور تنے سے شاخیں، اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں، اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کیلئے ناگزیر

ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پا سکتے۔

انبیاء علیہم السلام کا مشن

اسلام کے متعلق یہ بات تو آپ مجملاً جانتے ہی ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا مشن ہے یہ صرف محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مشن نہیں ہے، بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں، ان سب کا یہی مشن تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی اجمالی طور پر آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب نبی ایک خدا کی خدائی منوانے اور اسی کی عبادت کرانے آئے تھے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اتریں سب کچھ اسی پردے کے نیچے چھپا ہوا ہے تجسس کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھئے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا، اور صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور آخر اس میں ایسی ایسی کونسی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مالکم من الٰہ غیرہ کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بن کر اس کو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی آج کل سمجھی جاتی ہے کہ مسجد میں خدائے واحد کے آگے سجدہ کر لو اور پھر باہر نکل کر حکومتِ وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی وفاداری و اطاعت میں لگ جاؤ، تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کے لئے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا ہے؟ آئیے ہم تحقیق کر کے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کا اور دنیا کی دوسری طاقتوں کا اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پہ یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین جن سے انبیاء کی لڑائی تھی، اللہ کے منکر نہ تھے۔ ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے، اور وہی زمین و آسمان کا خالق، اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ وہی پانی برساتا ہے، وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے، بتاؤ

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ ۔ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ کا ہے کہو، پھر تم غور نہیں کرتے

السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ؁ سَيَقُوْلُوْنَ
لِلّٰهِ ۔ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ؁ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ
شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؁
سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ؁

(المومنون - ۵)

ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں کا رب اور عرشِ عظیم کا رب
کون ہے؟ کہینگے اللہ کہو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے
پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب
کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اسکے مقابلہ میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا،
بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہینگے اللہ کہو پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیئے گئے ہو؟

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ؁ .... وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا ؁
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت - ۶)

اگر تم اُن سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کس نے
سورج اور چاند کو اپنا تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور کہینگے کہ خدا نے
پھر آخر یہ کدھر سے بھٹکائے جا رہے ہیں؟ .... اور اگر تم ان سے پوچھو کہ
کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے مری ہوئی زمین کو روئیدگی بخش دی؟
وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ؁ (الزخرف - ۷)

اور اگر تم ان سے پوچھو تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ
اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں، اور اس کے خالق ہونے اور مالک ارض و سما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے، لہٰذا ظاہر ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لئے تو انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اب پوچھئے کہ انبیاء کی آمد کس لئے تھی، اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟ قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیاء کہتے تھے جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور الٰہ بھی ہے۔ اس کے سوا کسی کو الٰہ اور رب نہ مانو مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ آئیے ذرا تجسس کریں کہ اس جھگڑے کی تہ میں کیا ہے؟ الٰہ سے کیا مراد ہے؟ رب کسے کہتے ہیں؟ انبیاء کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو الٰہ اور رب مانو؟ اور دُنیا کیوں اس پر لڑنے کھڑی ہو جاتی تھی؟

الٰہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں۔ مگر معاف کیجئے گا، معبود کے معنی آپ بھول گئے ہیں معبود کا مادہ عبد ہے۔ عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے۔ خدمت کے لئے کھڑا ہونا، احترام میں ہاتھ باندھنا، اعترافِ بندگی میں سر جھکانا، فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرنا، جس کام کا اشارہ ہو اسے بجا لانا، جو کچھ آقا طلب کرے اُسے پیش کر دینا، اس کی طاقت و جبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ بنائے اس کی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا، جہاں اس کا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا، یہ عبادت کا اصلی مفہوم ہے، اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح سے کرتا ہے۔

اور رب کا مفہوم کیا ہے؟ عربی میں رب کے اصلی معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اور چونکہ دُنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و فرمانبرداری کی جاتی ہے، لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال، اور صاحب خانہ کو رب الدار کہتے ہیں۔ آدمی جس کو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے، جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جس کی نگاہِ لطف کے پھر جانے سے خوف کرے کہ میری زندگی بگڑ جائے گی، جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جس کی فرمانبرداری و اطاعت کرے، وہی اس کا ربّ ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھیے اور پھر غور سے دیکھیے۔ انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الٰہ ہوں، اور میں تیرا رب ہوں، میری بندگی و عبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ پایا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آکر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر اُٹھتا ہے اور اُٹھ سکتا ہے۔ خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی۔ انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشِ اقتدار، یا خواہشِ استفاع

اُسے اس بات پر اُبھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے۔ ان سے اپنی بندگی کرائے۔ ان کے سر اپنے آگے جھکوائے۔ ان پر اپنا حکم چلائے۔ ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے۔ یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے جس کو کچھ طاقت، یا دولت، یا چالاکی و ہوشیاری، یا کسی نوع کا زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھ کے پھیل جائے اور آس پاس کے انسانوں پر جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بیوقوف، یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکہ جما دے۔

اس قسم کی ہوس خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں، اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے، یا جن کے پاس خدائی کے ٹھاٹھ جمانے کے لئے کافی ذرائع ہوتے ہیں، اس لئے وہ براہِ راست اپنی خدائی کا دعوے پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں)، اور مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی الٰہ ہے)۔ جب حضرت موسےٰؑ نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا اور اس سے کہا کہ تو خود بھی اللہ العالمین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں لہٰذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو (لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰـہًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ)۔ اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا جس سے حضرت ابراہیمؑ کی بحث ہوئی تھی۔ قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انہیں ذرا غور کے ساتھ پڑھئے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ ۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ	تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیمؑ سے حجت کی اس بارے میں کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے؟ اور یہ حجت کیوں کی؟ اسلئے کہ اللہ نے اسکو حکومت دے رکھی تھی جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ

ت - قَالَ اِبْرٰهِيْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ
شَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ
مَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ...
(البقرۃ ۲ - ۳۵)

ہے جسکے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت میرے ہاتھ ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے تو ذرا اسے مغرب کی طرف سے نکال کر لا۔ یہ سن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔

غور کیجئے! وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا؟ اس لئے کہ وہ اللہ کا منکر نہ تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ کائنات کا فرمانروا اللہ ہی ہے، سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً ارض بابل کے باشندوں کا مالک کون ہے۔ وہ اللہ ہونے کا دعوٰے نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعوٰے رکھتا تھا کہ اس ملک کے باشندوں کا رب میں ہوں اور یہ دعوٰے اس بنا پر تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی، لوگوں کی جانوں پر وہ قابض و متصرف تھا، اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پر لٹکا دے اور جس کی چاہے جاں بخشی کر دے، یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے، اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے تسلیم کرو، میری بندگی اور عبادت کرو۔ مگر جب حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں تو اسی کو رب مانوں گا اور اسی کی بندگی و عبادت بھی کروں گا جو زمین و آسمان کا رب ہے، اور جس کی عبادت یہ سورج کر رہا ہے، تو وہ حیران رہ گیا، اور اس لئے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیوں کر قابو میں لاؤں؟

یہ خدائی، جس کا دعوٰے فرعون اور نمرود نے کیا تھا، کچھ انہی دو آدمیوں تک محدود نہ تھی۔ دنیا میں ہر جگہ فرمانرواؤں کا یہی دعوٰی تھا اور یہی دعوٰی ہے۔ ایران میں بادشاہ کے لئے خدا اور خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور ان کے سامنے پورے مراسم عبودیت بجا لائے جاتے تھے۔ حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدائیگان (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا، اور نہ وہ خود اس کے مدعی تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں فرمانروا خاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے ــــــ چنانچہ سورج بنسی چندر بنسی آج تک مشہور ہیں ــــــ راجہ کو ان داتا یعنی رازق کہا

جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کئے جاتے تھے۔ حالانکہ پرمیشور ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پرجا ہی ایسا سمجھتی تھی۔ ایسا ہی حال دنیا کے دوسرے ممالک کا بھی تھا اور آج بھی ہے بعض جگہ فرمانرواؤں کے لئے اللہ اور رب کے ہم معنی الفاظ اب بھی صریحاً بولے جاتے ہیں، مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اسپرٹ وہی ہے جو ان الفاظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ اس نوع کے دعوائے خدائی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں اللہ اور رب ہونے ہی کا دعوےٰ کرے نہیں، وہ سب لوگ جو انسانوں پر اس اقتدار، اس فرمانروائی و حکمرانی، اس آقائی و خداوندی کو قائم کرتے ہیں، جیسے فرعون اور نمرود نے قائم کیا تھا، در اصل وہ اللہ اور رب کے معنی و مفہوم کا دعوےٰ کرتے ہیں چاہے الفاظ کا دعوےٰ نہ کریں۔ اور وہ سب لوگ جو ان کی اطاعت و بندگی کرتے ہیں وہ بہرحال ان کے اللہ اور رب ہونے کو تسلیم کرتے ہیں، چاہے زبان سے یہ الفاظ نہ کہیں۔

غرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہ راست اپنی الٰہیت اور ربوبیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی، اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ خود ایسا دعوےٰ لے کر اٹھیں اور اسے منوالیں البتہ چالاکی اور فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ عام انسانوں کے دل و دماغ پر جادو کر سکتے ہیں، سو ان ذرائع سے کام لے کر وہ کسی روح، کسی دیوتا، کسی بُت، کسی قبر، کسی سیارے، کسی درخت کو اللہ بنا دیتے ہیں، اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہیں نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں، یہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں، یہ تمہارے ولی اور محافظ و مددگار ہیں۔ ان کو خوش نہ کروگے تو یہ تمہیں قحط اور بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے انہیں خوش کر کے حاجتیں طلب کروگے تو یہ تمہاری مدد کو پہنچیں گے۔ مگر انہیں خوش کرنے اور ان کو تمہارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں۔ ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بن سکتے ہیں۔ ہماری بزرگی تسلیم کرو، ہمیں خوش کرو اور ہمارے ہاتھ میں اپنی جان مال آبرو سب کچھ دے دو۔ بہت سے بیوقوف انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں، اور یوں جھوٹے خداؤں کی آڑ میں ان پروہتوں اور پجاریوں اور مجاوروں کی خداوندی قائم ہوتی ہے۔

اسی نوع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعویذ گنڈوں اور منتروں کے وسیلے اختیار

کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ تم براہِ راست اللہ تک نہیں پہنچ سکتے، اس کی بارگاہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں، عبادات کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہوں گے، اور تمہاری پیدائش سے لے کر موت تک ہر مذہبی رسم ہمارے ہاتھوں سے انجام پائے گی۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل بن جاتے ہیں، عام لوگوں کو اس کے علم سے محروم کر دیتے ہیں، اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حلال و حرام کے احکام دینے شروع کرتے ہیں۔ یوں ان کی زبان قانون بن جاتی ہے، اور وہ انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بنا لیتے ہیں۔ یہی اصل ہے اس برہمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے، اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیادت کا سکہ جما رکھا ہے۔

اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں فتنہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے۔ مگر اب تو ہزار ہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو الٰہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، گویا کہ اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اس کا الٰہ اور رب نہ ہو۔ اگر اللہ کو نہ مانے گا، تب بھی اسے الٰہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں بہت سے آلہہ اور ارباب اسکی گردن پر مسلط ہو جائیں گے۔

غور سے دیکھئے۔ کیا روس میں کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی مجلس (POLITICAL BUREAU) کے ارکان باشندگان روس کے ارباب و آلہہ نہیں ہیں اور کیا اسٹالین اُن کا رب الارباب نہیں ہے؟ روس کا کونسا گاؤں اور کونسا زرعی فارم ایسا ہے جہاں اس خدائے روسیاں کی تصویر موجود نہیں؟ ابھی پولینڈ کے جس حصہ پر روس نے قبضہ کیا ہے اس میں سوویٹ سسٹم کی بسم اللہ آپ کو معلوم ہے کس طرح ہوئی؟ اسٹالین کی تصویریں ہزاروں کی تعداد میں درآمد کی گئیں، گاؤں گاؤں میں پہنچائی گئیں۔ تاکہ سب سے پہلے وہ اپنے الٰہ العظیم اور رب کبیر

سے واقف ہو لیں، تب ان کو دین بالشویکی میں داخل کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایک انسان کو یہ اہمیت کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی کو، خواہ وہ جماعت (COMMUNITY) کی نمائندگی ہی کر رہا ہو کروڑوں انسان کے دماغوں اور ان کی روحوں پہ اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ اس کی شخصیت کا جبروت اور اس کی کبریائی ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو جائے؟ اسی طریقہ سے تو شخصی اقتدار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ یونہی تو انسان انسانوں کا خدا بنتا ہے یہی تو وہ ڈھنگ ہیں جن سے فرعونیت اور نمرودیت کی اور زاریت و قیصریت کی جڑیں ہر زمانہ میں مستحکم ہوئی ہیں۔

اسی طرح اٹلی کو دیکھئے۔ وہاں فاشسٹ گرانڈ کونسل الہوں کا مجمع ہے اور مسولینی ان کا سب سے بڑا الٰہ۔ جرمنی میں نازی پارٹی کے لیڈر آلہہ ہیں اور ہٹلر ان کا الٰہ کبیر۔ انگلستان بھی اپنی ڈیموکریسی کے باوجود بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹروں اور چند اونچے طبقے کے امراء و مدبرین میں اپنے آلہہ رکھتا ہے۔ امریکہ میں وال اسٹریٹ کے چند مٹھی بھر سرمایہ دار تمام ملک کے ارباب و آلہہ بنے ہوئے ہیں۔

غرض آپ جدھر نظر ڈالیں گے کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہ ہے کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے کہیں ایک پارٹی نے الٰہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے! ور کہیں ایک ڈکٹیٹر مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرِي کی منادی کر رہا ہے۔ انسان کسی ایک جگہ بھی الٰہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کمینے کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے، یا ایک جاہل تنگ نظر آدمی کو وزیر اعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اوّل تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا۔ اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لئے جس علم کی ضرورت ہے، جس محیط اور تمام حقائق پر حاوی نگاہ کی ضرورت ہے، جس حکمت اور عدل اور بے خطا میزان کی ضرورت ہے، اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الٰہیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں انسانی

زندگی میں صحیح توازن کبھی قایم ہی نہ ہو سکا۔ وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتفاع، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ وہاں انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر ہی رہی۔ وہاں انسان کے دل و دماغ پر اور اس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عاید ہو کر رہیں جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقاء کو روک دیا کس قدر صحیح فرمایا اس صادق و مصدوق علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام نے :-

قال اللہ عز وجل انی خلقت عبادی	اللہ عز و جل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر
حنفاء فجاءتھم الشیاطین فاجتالتھم	شیطانوں نے آ کر انکو گھیر لیا۔ انہیں فطرت کی راہ راست سے ہٹا
من دینھم وحرمت علیھم ما احللت	لے گئے، اور جو کچھ میں نے ان کیلئے حلال کیا تھا، ان شیطانوں
لھم - (حاشیہ ثقافتی)	نے ان کو اس سے محروم کر کے رکھ دیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، یہ ہے وہ چیز جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیوں کی اصلی جڑ ہے۔ یہ اس کی ترقی کی راہ میں اصلی رکاوٹ ہے۔ یہ وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو، اس کی علمی و فکری قوتوں کو، اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو، اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو، اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اس روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الٰہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کی نجات کے لئے نہیں ہے، کیونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الٰہوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انسانی زندگی میں انبیاء علیہم السلام نے کی۔ وہ دراصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لئے یہ لوگ آئے۔ ان کا اصلی مشن یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے۔ ان جھوٹے خداؤں کی بندگی سے، اس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں۔ ان کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان، انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں انہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں، جو اس حد سے نیچے

گرا دیئے گئے ہیں، انہیں ابھار کر اس حد تک اٹھائیں، اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظام زندگی کا پابند بنادیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود، بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں۔ ابتدا سے جتنے نبی دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہ تھا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ "لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ یہی حضرت نوحؑ نے کہا، یہی حضرت ہودؑ نے کہا، یہی حضرت صالحؑ نے کہا، یہی حضرت شعیبؑ نے کہا[1]، اور اسی کا اعلان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہ:-

اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (ص۔ ۵)

میں تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں۔ کوئی الٰہ نہیں ہے بجز اس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے، جو رب ہے، آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ .... وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ۗ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف۔ ۷)

یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو...... اور سورج اور چاند اور تاروں کو سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ خبردار! خلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اسی کی۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ (انعام۔ ۱۳)

وہ ہے اللہ، وہی تمہارا رب ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ لہٰذا تم اس کی بندگی کرو۔ اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ (البینہ)

انسانوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں، سب کو چھوڑ کر صرف اسی کی اطاعت کریں۔

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ ہود رکوع ۴-۵-۶-۸

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران - ۷)

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنالے۔

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر اور اس کی ذہنی و مادی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کرایا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، اور وہ بوجھ ان پر سے اتارے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے۔ یہ انسان کے لئے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ۔ یعنی یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے۔

نظریہ سیاسی کا نقطۂ آغاز انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لئے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز و محور، اس کی روح اور اس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریہ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا اولین اصول یہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لئے جائیں کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں۔ وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (یوسف - ۵)

حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں۔ اسکا فرمان ہے کہ اسکے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ؟ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهٗ لِلّٰهِ (آل عمران - ۱۶)

وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہدو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ هٰذَا

اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہدیا کرو کہ یہ حلال ہے

حَلٰلٌ وَّھٰذَا حَرَامٌ (النحل - ۱۵) — اور یہ حرام +

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مائدہ ۲ - ۷) — جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی در اصل ظالم ہیں +

اس نظریہ کے مطابق حاکمیت (SOVEREIGNTY) صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز (LAW-GIVER) صرف خدا ہے۔ کوئی انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، بذات خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ ہی کے حکم کا پیرو ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (انعام-۵) "میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے"۔ عام انسان نبی کی اطاعت پر صرف اسلئے مامور ہیں کہ وہ اپنا حکم نہیں بلکہ خدا کا حکم بیان کرتا ہے +

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (النساء - ۹) — ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسلئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن (SANCTION) کے تحت اسکی اطاعت کی جائے +

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ (انعام - ۱۰) — یہی وہ لوگ ہیں جنکو ہم نے اپنی کتاب ہی حکم (AUTHORITY) سے سرفراز کیا اور نبوت عطا کی +

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ (آل عمران - ۸) — کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسکو کتاب اور حکم (AUTHORITY) اور نبوت سے سرفراز کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو +

پس اسلامی اسٹیٹ کی ابتدائی خصوصیات، جو قرآن کی مذکورہ بالا تصریحات سے نکلتی ہیں یہ ہیں کہ:-

(۱) کوئی شخص، خاندان، طبقہ، یا گروہ، بلکہ اسٹیٹ کی ساری آبادی مل کر بھی حاکمیت (SOVEREIGNTY) کی مالک نہیں ہے۔ حاکم اصلی صرف خدا ہے، اور باقی سب محض رعیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲) قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ سارے مسلمان مل کر بھی نہ اپنے لئے کوئی

قانون بنا سکتے ہیں، اور نہ خدا کے بنائے ہوئے کسی قانون میں ترمیم کر سکتے ہیں۔

(۳) اسلامی اسٹیٹ بہر حال اُس قانون پر قائم ہوگا جو خدا کی طرف سے اسکے نبی نے دیا ہے! اور اس اسٹیٹ کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہوگی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو۔

اسلامی اسٹیٹ کی نوعیت | ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ جمہوریت (DEMOCRACY) نہیں ہے۔ اس لئے کہ جمہوریت تو نام ہی اُس طرز حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیت حاصل ہو، انہی کی رائے سے قوانین بنیں اور انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدیل ہو جس قانون کو وہ چاہیں وہ نافذ ہو اور جسے نہ چاہیں وہ کتاب آئین پر سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے لہٰذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لئے زیادہ صحیح نام "الٰہی حکومت" ہے جس کو انگریزی میں (THEOCRACY) کہتے ہیں۔ مگر یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے، اسلامی تھیاکریسی اُس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اُس تھیاکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (PRIEST CLASS) خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے[1]، اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو تو الٰہی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا بخلاف اس کے اسلام جس تھیاکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو (THEO-DEMOCRACY) یعنی "الٰہی جمہوری حکومت" کے نام سے موسوم کروں گا۔ کیونکہ اس میں خدا کی

---

[1] عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور یہ کہہ کر انہیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھٰذا من عند اللہ۔

حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ (PARAMOUNTCY) کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت (LIMITED POPULAR SOVEREIGNTY) عطا کی گئی ہے۔ انہیں عاملہ یعنی (EXECUTIVE) مسلمانوں کی رائے سے بنے گی، مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات، اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے۔ اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص نسل یا طبقہ نہیں، بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے مگر جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، جہاں خدا اور اس کے رسولؐ کا حکم موجود ہو وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو، کسی لیجسلیچر کو، کسی مجتہد اور عالم دین کو، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں ایک سرمو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ تھیاکریسی ہے۔

ایک اعتراض آگے بڑھنے سے پہلے میں اس امر کی تھوڑی سی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ڈیموکریسی پر یہ حدود و قیود کیوں عائد کیے گئے ہیں۔ اور ان حدود و قیود کی نوعیت کیا ہے۔ اعتراض کرنے والا یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اس طرح تو خدا نے انسانی عقل و روح کی آزادی سلب کر لی، حالانکہ ابھی تم یہ ثابت کر رہے تھے کہ ایک خدا کی الٰہیت انسان کو عقل و فکر اور جسم و جان کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں انسان کی فطری آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کو محفوظ کرنے کیلئے لیا ہے۔ اس کا مقصد انسان کو بے راہ ہونے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے سے بچانا ہے۔

یہ مغرب کی نام نہاد ڈیموکریسی، جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکمیت (POPULAR SOVEREIGNTY) ہوتی ہے، اس کا ذرا تجزیہ تو کر کے دیکھیے۔ جن لوگوں سے مل کر کوئی اسٹیٹ بنتا ہے وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں اور نہ خود اس کو نافذ کرتے ہیں۔ انہیں اپنی حاکمیت چند منتخب لوگوں کے سپرد کرنی پڑتی ہے تاکہ انکی طرف سے وہ قانون بنائیں اور انہیں نافذ کریں۔ اسی غرض سے انتخاب کا ایک نظام مقرر کیا جاتا ہے۔ اس

انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت، اپنے علم، اپنی چالاکی، اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈا کے زور سے بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے ووٹ ہی سے ان کے الٰہ بن جاتے ہیں۔ عوام کے فائدے کیلئے نہیں بلکہ اپنے شخصی اور طبقاتی فائدے کے لئے قوانین بناتے ہیں، اور اُسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے، ان قوانین کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکہ میں ہے۔ یہی انگلستان میں ہے اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو آج جمہوریت کی جنت ہونے کا دعوٰی ہے

پھر اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں، تب بھی تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ یہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں دیکھتا۔ اس کا فیصلہ (JUDGEMENT) عموماً ایک طرفہ ہوتا ہے۔ اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ یہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لاگ رائے بہت کم قائم کر سکتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات عقلی و علمی حیثیت سے جو بات اس پر روشن ہو جاتی ہے اس کو بھی یہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں رد کر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں مگر طوالت سے بچنے کیلئے میں صرف امریکہ کے قانون منع شراب (PROHIBITION LAW) کی مثال پیش کروں گا۔ علمی اور عقلی حیثیت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شراب صحت کے لئے مضر ہے، عقلی و ذہنی قوتوں پر بُرا اثر ڈالتی ہے، اور انسانی تمدن میں فساد پیدا کرتی ہے۔ انہی حقائق کو تسلیم کر کے امریکہ کی رائے عام اس بات کے لئے راضی ہوئی تھی کہ منع شراب کا قانون پاس کیا جائے۔ چنانچہ عوام کے ووٹ ہی سے یہ قانون پاس ہوا تھا مگر جب وہ نافذ کیا گیا تو اُنہی عوام نے جن کے ووٹ سے وہ پاس ہوا تھا اس کے خلاف بغاوت کی۔ بدتر سے بدتر قسم کی شرابیں ناجائز طور پر بنائیں اور پئیں۔ پہلے سے کئی گنا زیادہ شراب کا استعمال ہوا جرائم میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ آخر کار انہی عوام کے ووٹوں سے وہ شراب جو حرام کی گئی تھی، حلال کر دی گئی۔ یہ حرمت کا فتویٰ حلت سے جو بدلا گیا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ علمی و عقلی حیثیت سے اب شراب کا استعمال مفید ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ صرف یہ

وجہ تھی کہ عوام اپنی جاہلانہ خواہشات کے بندے بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی حاکمیت اپنے نفس کے شیطان کی طرف منتقل کر دی تھی۔ اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا تھا، اور اس الٰہ کی بندگی میں وہ اُس قانون کو بدلنے پہ مصر تھے جسے انہوں نے خود ہی علمی و عقلی حیثیت سے صحیح تسلیم کر کے پاس کیا تھا۔ اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں جن سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضع قانون (LEGISLATOR) بننے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر اُس کو دوسرے الٰہوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ بن جائے گا۔ اپنے نفس کے شیطان کو الٰہ بنائے گا۔ لہٰذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے لئے اپنے مفاد میں مناسب حدیں لگا دی جائیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں "حدود اللہ" (DIVINE LIMITS) کہا جاتا ہے۔ یہ حدود زندگی کے ہر شعبے میں چند اصول، چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبے کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں۔ ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لئے ضمنی اور فروعی قاعدے (REGULATIONS) بنا سکتے ہو۔ مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں ہے۔ ان سے تجاوز کرو گے تو تمہاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہو جائیگا۔

حدود اللہ کا مقصد | مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق، زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حرمت، جوئے اور سٹے کی ممانعت، وراثت کا قانون، اور دولت کمانے جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کر کے چند سرحدی نشانات لگا دیئے ہیں۔ اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور ان کے اندر رہ کر اپنے معاشی معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی (PERSONAL LIBERTY) بھی محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ (CLASS WAR) اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے تسلط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ پر منتہی ہوتی ہے اسی طرح عائلی زندگی (FAMILY LIFE) میں اللہ نے حجاب شرعی، مرد کی قوامیت، شوہر بیوی اور

بچوں کے حقوق و فرائض، طلاق اور خلع کے احکام، تعدد ازدواج کی مشروط اجازت، زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کر کے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو مضبوط کرے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں، اور نہ انہی گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اُٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قصاص کا قانون، چوری کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا، شراب کی حرمت، جسمانی ستر کے حدود اور ایسے ہی چند مستقل قاعدے مقرر کر کے فساد کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیے ہیں۔

میرے لئے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش کر کے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن و اعتدال قائم کرنے کے لئے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے یہاں میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل، ناقابل تغیر و تبدل دستور (CONSTITUTION) بنا کر انسان کو دے دیا ہے جو اس کی روح کی آزادی کو سلب اور اس کی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا، بلکہ اس کے لئے ایک صاف و واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے اور اس کی قوتیں غلط راستوں میں ضائع نہ ہوں، اور وہ اپنی حقیقی فلاح و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا چلا جائے۔
اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پُرپیچ پہاڑی راستوں میں، جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان روکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی کو سلب کرنا ہے؟ نہیں۔ دراصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ، ہر موڑ اور ہر امکانی

خطرہ کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ تمہارا راستہ اُدھر نہیں اِدھر ہے، تمھیں اُس رخ پر نہیں اس رخ پہ مڑنا چاہئے تاکہ تو بسلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے۔ بس یہی مقصد اُن حدود کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لئے زندگی کے سفر کا صحیح رخ معیّن کرتی ہیں اور ہر پر پیچ مقام، ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اس طرف ہے، تمھیں اُن سمتوں پر نہیں بلکہ اس سمت پہ پیشقدمی کرنی چاہئے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابل تغیر و تبدل ہے۔ آپ اگر چاہیں تو ٹرکی اور ایران کی طرح اس دستور کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ مگر اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ قیامت تک کے لئے اٹل دستور ہے۔ اسلامی اسٹیٹ جب بنے گا اسی دستور کے ساتھ بنے گا جب تک قرآن اور سنت رسولؐ دنیا میں باقی ہے، اس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جا سکتی جس کو مسلمان رہنا ہو وہ اس کی پابندی پر مجبور ہے۔

اسلامی اسٹیٹ کا مقصد اس دستور کی حدود کے اندر جو اسٹیٹ بنے، اس کیلئے ایک مقصد بھی خدا نے معین کر دیا ہے، اور اس کی تشریح قرآن میں متعدد مقامات پہ کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید - ۳)	ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایتوں کیساتھ بھیجا اور انکے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں زبردست طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں۔

اس آیت میں لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے۔ اور رسولوں کا کام یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی واضح ہدایات اور اپنی کتاب آئین میں جو میزان اُن کو دی ہے، یعنی جس ٹھیک ٹھیک متوازن (WELL BALANCED) نظام زندگی کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی ہے، اسکے مطابق اجتماعی عدل (SOCIAL JUSTICE) قائم کریں۔ دوسری جگہ فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج - ۶)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن (حکومت) عطا کریں گے تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران - ۱۲)

تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوع انسانی کیلئے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس اسٹیٹ کا تخیل پیش کر رہا ہے اس کا مقصد محض سلبی (NEGATIVE) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی (POSITIVE) مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے اس کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے، ان کی آزادی کی حفاظت کرے اور مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائے۔ بلکہ اس کا مدعا اجتماعی عدل کے اُس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اس کا مقصد بدی کی اُن تمام شکلوں کو مٹانا اور نیکی کی اُن تمام صورتوں کو قائم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات میں بیان کیا ہے۔ اس کام میں حسب موقع و محل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائے گی، تبلیغ و تلقین سے بھی کام لیا جائے گا، تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائیں گے، اور جماعتی اثر اور رائے عام کے دباؤ کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

ہمہ گیر اسٹیٹ | اس نوعیت کا اسٹیٹ، ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (PERSONAL) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی

حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ مگر آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اس کلیت کے باوجود اس میں موجودہ زمانہ کی کلی (TOTALITARIAN) اور استبدادی (AUTHORITARIAN) حکومتوں کا سا رنگ نہیں ہے۔ اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت (DICTATOR SHIP) پائی جاتی ہے اس معاملہ میں جو کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظام حکومت میں قایم کیا گیا ہے، اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قایم کی گئی ہیں، انہیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل بے اختیار گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم و خبیر ہی وضع کر سکتا ہے۔

جماعتی اور مسلکی اسٹیٹ | دوسری بات جو اسلامی اسٹیٹ کے دستور اور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے اسٹیٹ کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہوا اور جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں، بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اس کی تفصیلات سے واقف بھی ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی نسلی، جغرافی، لونی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے۔ جو شخص بھی اسے قبول کرلے، خواہ وہ کسی نسل، کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس اسٹیٹ کو چلانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ مگر جو اسے قبول نہ کرے اسے اسٹیٹ کے کام میں دخیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمی (SUBJECT) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کے لئے اسلام کے قانون میں معین حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اس کی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے گی، اور اگر وہ کسی خدمت کا اہل ہوگا تو اس سے خدمت بھی لی جائے گی، لیکن بہرحال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ ایک خاص مسلک رکھنے والی پارٹی کا اسٹیٹ ہے۔ یہاں بھی اسلامی اسٹیٹ اور کمیونسٹ اسٹیٹ میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے لیکن دوسرے

مسلکوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ جو برتاؤ اشتراکی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے اس کو اس برتاؤ سے کوئی نسبت نہیں جو اسلامی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے۔ اسلام میں وہ صورت نہیں ہے جو کمیونسٹ حکومت میں ہے کہ غلبہ و اقتدار حاصل کرتے ہی اپنے تمدنی اصولوں کو دوسروں پر بجبر مسلط کر دیا جائے، جائدادیں ضبط کی جائیں، قتل و خون کا بازار گرم ہو، اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر زمین کے جہنم، سائبیریا کی طرف پھینک کر دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لئے جو فیاضانہ برتاؤ اپنے اسٹیٹ میں اختیار کیا ہے، اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو باریک خط امتیاز کھینچا ہے اسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں، اور زمین میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کا طریق کار کیا ہے۔

نظریۂ خلافت اب میں آپ کے سامنے اسلامی اسٹیٹ کی ترکیب اور اس کے طرز تعمیر کی تھوڑی سی تشریح کروں گا۔ یہ بات میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم خداوند تعالیٰ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے اٹھیں ان کی حیثیت کیا ہونی چاہئے، تو آپ کا ذہن خود بخود پکارے گا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہئیں۔ ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی ان کو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ (النور - ۷)	اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، اُسی طرح جس طرح اُن سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت اسلام کے نظریۂ ریاست (THEORY OF STATE) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کئے گئے ہیں:-

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت (SOVEREIGNTY) کے بجائے خلافت (VICEREGENCY) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پہ حکمراں ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ (VICEREGENT) ہونا چاہیئے جو محض تفویض کردہ اختیارات (DELEGATED POWERS) استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔

دوسری کانتہ کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا، بلکہ یہ کہا کہ ان کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے وہ عمومی خلافت {POPULAR VICEREGENCY} ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ہر ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جواب دہ ہے (کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ[1]) اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت کی حیثیت | یہ ہے اسلام میں ڈیموکریسی کی اصلی بنیاد عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

(۱) ایسی سوسائٹی جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو، طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہونگے فضیلت جو کچھ بھی ہوگی شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہوگی۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بتصریح بیان فرمایا ہے۔

لیس لاحد فضل علی احد الا بدین	کسی کو کسی پر فضیلت نہیں اگر ہے تو دین کے علم وعمل اور
وتقوی الناس کلھم بنو آدم وآدم	تقوی کے اعتبار سے ہے سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور

[1] مشہور حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں ہر شخص راعی ہے اور ہر راعی خدا کے سامنے اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔

من تراب۔	آدم مٹی سے بنے تھے۔
لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقویٰ۔	نہ کسی عرب کو عجمی پر فضیلت ہے، نہ عجمی کو عرب پر، نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنا پر ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب تمام عرب اسلامی اسٹیٹ کے دائرے میں آ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خاندان کو جو عرب میں برہمنوں کی سی حیثیت رکھتے تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا الآباء۔ ایھا الناس کلکم من آدم وآدم من تراب لا فخر للانساب۔ لا فخر للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔	قریش والو! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔ لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے نسب کا فخر ہیچ ہے۔ عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کوئی فخر نہیں۔ تم میں بزرگ وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

(۲) ایسی سوسائٹی میں کسی فرد، یا افراد کے کسی گروہ کے لئے اس کی پیدائش یا اس کے معاشرتی مرتبہ (SOCIAL STATUS) یا اسکے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں (DISABILITIES) نہیں ہو سکتیں جو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور اس کی شخصیت کے ارتقاء میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائٹی کے تمام دوسرے افراد کی طرح ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے راستہ کھلا ہوا ہونا چاہئے کہ اپنی قوت و استعداد کے لحاظ سے جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے بغیر اس کے کہ دوسروں کے اسی طور سے بڑھنے میں مانع ہو۔ یہ چیز اسلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ غلام اور غلام زادے فوجوں کے افسر اور صوبوں کے گورنر بنائے گئے اور بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے شیوخ نے ان کی ماتحتی کی۔ چمار جوتیاں

گانٹھتے گانٹھتے اُٹھے اور امامت کی مسند پر بیٹھ گئے۔ جولاہے اور بزاز مفتی اور قاضی اور فقیہ بنے اور آج ان کے نام اسلام کے بزرگوں کی فہرست میں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اسمعوا و اطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی۔ سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا سردار ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ بنا دیا جائے۔

(۳) ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا کسی گروہ (GROUP) کی ڈکٹیٹر شپ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمراں بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان، یا اصطلاحی الفاظ میں، تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لئے اس کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف اُن عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطلق العنان یعنی ڈکٹیٹر بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے کیونکہ ڈکٹیٹر شپ دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ ایک کلی اسٹیٹ ہے اور زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا دائرہ وسیع ہے، مگر اس کلیت اور ہمہ گیری کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون ہمہ گیر ہے جسے اسلامی حکمراں کو نافذ کرنا ہے۔ خدا نے زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق جو ہدایات دی ہیں وہ یقیناً پوری ہمہ گیری کے ساتھ نافذ کی جائیں گی مگر ان ہدایات سے ہٹ کر اسلامی حکمراں خود (REGIMENTATION) کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتا کہ فلاں پیشہ کریں اور فلاں پیشہ نہ کریں۔ فلاں فن سیکھیں اور فلاں نہ سیکھیں۔ اپنے بچوں کو فلاں قسم کی تعلیم دلوائیں اور فلاں قسم کی نہ دلوائیں جو اختیارات روس اور جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹروں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں، یا جن کو اتاترک نے ٹرکی میں استعمال کیا، اسلام نے وہ اختیارات امیر کو عطا نہیں کئے۔ علاوہ بریں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں ہر ہر فرد شخصی طور پر خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ یہ شخصی جواب دہی (PERSONAL RESPONSIBILITY) ایسی ہے جس میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں۔ لہٰذا اس کو قانون کی حدود کے اندر پوری طرح آزاد ہونا

چاہیئے کہ اپنے لئے جو راستہ چاہے اختیار کرے، اور جدھر اس کا میلان ہو، اپنی قوتوں کو اسی طرف بڑھنے کے لئے استعمال کرے۔ اگر امیر اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالے گا اور اس کی شخصیت کے نشو و نما میں حائل ہوگا تو وہ خود اس ظلم کے لئے اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفاء راشدین کی حکومت میں (REGIMENTATION) کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

(۴) ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہئے اس لئے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی خاص معیار ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

انفرادیت اور اجتماعیت کا توازن ایک طرف اسلام نے یہ کمال درجہ کی جمہوریت قائم کی ہے۔ دوسری طرف اس نے ایسی انفرادیت (INDIVIDUALISM) کا سد باب کر دیا ہے جو اجتماعیت (SOCIALISM) کی نفی کرتی ہو۔ یہاں فرد اور جماعت کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ نہ فرد کی شخصیت جماعت میں گم ہو جائے جس طرح کمیونزم اور فاشزم کے نظام اجتماعی میں ہو جاتی ہے، اور نہ فرد اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ جماعت کے لئے نقصان دہ ہو، جیسا کہ مغربی جمہوریتوں کا حال ہے۔ اسلام میں فرد کا مقصد حیات وہی ہے جو جماعت کا مقصد حیات ہے، یعنی قانون الٰہی کا نفاذ اور رضائے الٰہی کا حصول۔ مزید برآں اسلام میں فرد کے حقوق پوری طرح محفوظ کرنے کے بعد اس پر جماعت کے لئے مخصوص فرائض بھی عائد کر دیئے گئے ہیں اس طرح انفرادیت اور اجتماعیت میں ایسی موافقت (HARMONY) پیدا ہو گئی ہے کہ فرد کو اپنی قوتوں کے نشو و نما کا پورا موقع بھی ملتا ہے، اور پھر وہ اپنی ان ترقی یافتہ قوتوں کے ساتھ اجتماعی فلاح و بہبود میں مددگار بھی بن جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل بحث ہے جس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصد صرف ان غلط فہمیوں کا سد باب کرنا تھا جو اسلامی جمہوریت کی مذکورہ بالا تشریح سے پیدا ہو سکتی تھیں۔

اسلامی اسٹیٹ کی ہیئت ترکیبی | خلافت عمومی کے تصور کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے اس کو نظر میں رکھنے کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدر حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے، اُس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کر کے امانت کے طور پر اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اُس کے لئے "خلیفہ" کا جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی خلافت اس کی ذات میں مرتکز (CONCENTRATE) ہو گئی ہے۔

اب میں مختصر طور پر اس طرز حکومت کی چند خاص خاص تفصیلات بیان کروں گا تاکہ اس کا ایک واضح خاکہ آپ کے سامنے آجائے۔

(۱) امیر کا انتخاب ان اکرمکم عند اللہ اتقکم کے اصول پر ہوگا یعنی عام مسلمان جس کے کیرکٹر پر پوری طرح اعتماد رکھتے ہوں وہی اس منصب کے لئے چنا جائے گا۔ اور جب وہ چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سپید کے اختیارات ہوں گے۔ اس پر پورا بھروسہ کیا جائے گا جب تک وہ خدا اور رسولؐ کے قانون کی پیروی کرے گا اس کی کامل اطاعت کی جائے گی۔

(۲) امیر تنقید سے بالاتر نہ ہوگا۔ ہر عامی مسلمان اسکے پبلک کاموں ہی پر نہیں بلکہ پرائیویٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہوگا۔ وہ قابلِ عزل ہوگا۔ قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوگی۔ اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جا سکے گا، اور وہ عدالت میں کسی امتیازی برتاؤ کا مستحق نہ ہوگا۔

(۳) امیر کو مشورے کے ساتھ کام کرنا ہوگا مجلس شوریٰ ایسی ہوگی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس امر میں بھی کوئی شرعی مانع نہیں ہے کہ اس مجلس کو مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب کیا جائے، اگرچہ اس کی مثال خلافت راشدہ میں نہیں ملتی۔

(۴) عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔

قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کی رائے کے مقابلہ میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی طرف قلت ہے اور باطل کو اس لئے اختیار کیا جائے کہ ایک جم غفیر اس کی تائید میں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ مگر ہر صورت میں عامہ مسلمین اس بات پر نظر رکھیں گے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقویٰ اور خوفِ خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے، یا نفسانیت کے ساتھ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسندِ امارت سے نیچے بھی اتار لا سکتی ہے۔

(۵) امارت، یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا کسی ذمہ داری کے منصب کے لئے کوئی ایسا شخص منتخب نہ کیا جائے گا جو خود اس کا امیدوار ہو، یا کسی طور پر اس کے لئے کوشش کرے۔ اسلام میں امیدواری (CANDIDATURE) اور انتخابی پروپیگنڈا کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف ہدایت ہے کہ امیدوار کو کوئی منصب نہ دیا جائے۔ اسلامی ذہنیت اس بات کے خیال تک سے نفرت کرتی ہے کہ ایک منصب کے لئے دو، تین، چار امیدوار کھڑے ہوں، ایک دوسرے کے خلاف پوسٹر بازی، جلسہ بازی اور اخباری پروپیگنڈا کریں، ووٹروں کو طرح طرح سے بیوقوف بنائیں، کھانوں کی دیگیں چڑھائی جائیں، موٹریں دوڑیں، اور ان میں سے وہ امیدوار بازی لے جائے جو جھوٹ، فریب اور زرپاشی میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ یہ شیطانی ڈیموکریسی کے ملعون طریقے ہیں جن کا عشر عشیر بھی اسلامی حکومت میں برسرِکار آئے تو خلافت کی مجلس شوریٰ میں منتخب ہو کر جانا تو درکنار، ایسے لوگوں کو قاضی کی عدالت میں پیش کر کے سزا دلوادی جائے۔

(۶) اسلامی مجلس شوریٰ میں پارٹی بندی نہیں ہو سکتی۔ فرد فرد علیحدہ ہو گا اور حق کے مطابق رائے دیگا۔ اسلام میں اس کا موقع نہیں کہ آپ ہر حال میں اپنی پارٹی کے ساتھ رہیں خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ بلکہ اسلامی سپرٹ کا تقاضا یہ ہے کہ آج کسی کی رائے کو آپ حق پر پائیں تو اس کا ساتھ دیں، اور کل کسی دوسرے مسئلے میں اگر اسی شخص

کی رائے آپ کے نزدیک خلافِ حق ہو تو اس سے اختلاف کر دیں۔

(۷) اسلام میں عدالت کے شعبہ کو انتظامی شعبہ کے اثر سے کلیتہً آزاد رکھا گیا ہے۔ قاضی کا کام خدا کے قانون کو اس کے بندوں پر نافذ کرنا ہے۔ وہ عدالت کی کرسی پر امیر یا خلیفہ کے نائب کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ عزوجل کے نائب کی حیثیت سے بیٹھتا ہے۔ لہٰذا عدالت میں اس کے سامنے خود خلیفہ کی بھی کوئی وقعت نہیں کسی کو اپنی شخصیت یا اپنے خاندان یا اپنے عہدے کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ قاضی کے سامنے حاضر ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ ایک ادنے مزدور، ایک غریب کاشتکار، ایک فقیر بے نوا بھی اس کا حق رکھتا ہے کہ بڑے سے بڑے شخص حتیٰ کہ خود خلیفہ کے خلاف قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دے۔ اور قاضی کو پورے اختیارات حاصل ہیں کہ اگر مدعی کا حق ثابت ہو جائے تو خدا کا قانون خلیفہ پر بھی ٹھیک اسی طرح نافذ کر دے جس طرح ایک عامی مسلمان پر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر خود خلیفہ کو اپنی ذاتی حیثیت میں کسی کے خلاف شکایت ہو تو وہ اپنے حاکمانہ اختیارات استعمال کر کے خود اس شکایت کو رفع کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ از روئے آئین وہ مجبور ہے کہ ایک عام شہری کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

اس مختصر خطبہ میں میرے لئے موقع نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ کی تفصیلی صورت آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اس کی اسپرٹ اور اس کے طرزِ کارروائی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دورِ حکومت کی نظیریں پیش کرنا ضروری ہے، اور اس کی گنجائش یہاں نہیں ہے تاہم مجھے توقع ہے کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ اسلامی طرزِ حکومت کا ایک واضح تصور پیش کرنے کے لئے کافی ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

فوائدِ فلسفہ

(سید جمال الدین افغانیؒ)

الحکمۃ تنادی العلماء باعلیٰ صوتھا وتطالبھم بحقھا فی محکمۃ العقل (حکمت بلاتی ہے علماء کو اپنی بلند آواز سے اور طلب کرتی ہے اُن سے اپنا حق از روئے عقل۔

فلسفہ یعنی حکمت کیا ہے؟

اس کا مقصد اور فائدہ کیا ہے؟

عالمِ انسانی میں اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟

مسلمانوں میں اس کی نشر و اشاعت کا اصلی ذریعہ کیا رہا ہے؟

وہ کون سا نسخۂ گرامی اور کتاب جامع ہے جس میں ہم اس حکمت کو پا سکتے ہیں اور اس حکمت کا منتہا کہاں ہے؟

کیا فارابی اور ابن سینا کی تالیفات، ابن ماجہ اور ابن رشد کی تصنیفات، شہاب الدین مقتول، میر باقر اور مُلا صدر کی کتابیں اور وہ تمام رسائل اور تعلیقات جو فلسفہ سے متعلق ہیں اس کے حصول کے لئے کافی ہیں یا نہیں؟

اگرچہ متقدمین نے فلسفہ کی تعریف و تحدید شیریں، چست اور موزوں عبارتوں میں کی ہے لیکن وہ تعریفیں عجیب و غریب فنی اصطلاحوں، پیچیدہ ترکیبوں اور غیر مانوس وضعوں اور امور بدیعیہ کے ساتھ زیادہ شغف

رکھنے کی وجہ سے معلمین اور متعلمین کے مطلوب بالذات اور فلسفیوں اور منطقیوں کے آراء وافکار کو محیط ہو کر رہ گئی ہیں اور دوسروں کے لئے اُن کے مفاہیم اور معانی اتنے متروک اور عسیر الفہم ہوگئے ہیں کہ گویا دونوں کا مقصد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ جامعیت و مانعیت، ذکر جنسی شامل اور فصلی مانع کی بحثوں میں اُلجھے رہیں۔ میں ان سب کو نظر انداز کر کے ذیل میں اپنے خیالات کی وضاحت کرتا ہوں۔

فلسفے کا مقصد یہ ہے کہ حیوانی مدرکات کی تنگنائے سے نکل کر انسانی مشاعر کی وسیع وعریض فضا کی جانب پرواز کی جائے تاکہ اوہام بہیمیہ کی ظلمتوں کا ازالہ جبلّی وطبعی انوار سے ہو۔ دل اور آنکھوں کی کوری بصیرت اور بینائی میں تبدیل ہو اور جہل ونادانی بربریت اور وحشت کے دشت سے نکل کر دانش اور کامرانی کی مدنیّتِ فاضلہ میں داخل ہو، غرضیکہ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنایا جائے اور اُس کی زندگی کو ایک مقدّس عقلی زندگی کا جامہ پہنایا جائے نیز اس کا مقصد انسان کو عقل، نفس اور معیشت میں درجۂ کمال پہ پہنچانا ہے اور اس کے اطوارِ معیشت اور رفاہیت میں اس کی رہنمائی کرنا ہے جو زندگی کے کمالِ عقلی اور نفسی کے لئے شرطِ اعظم ہے، یہ انسان کی حرکاتِ عقلیہ اور اُن کو دائرہ حیوانی سے خارج کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے، قبیلوں اور قوموں کو وحشیانہ اور ادنے حالت سے متمدن اور شہری بنانے کا واحد ذریعہ ہے اور انشائے معارف، ایجادِ علوم اور اختراعِ صنائع وبدائع کی علّتِ اوّلین ہے کیونکہ انسان اپنے کمالِ معیشت میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ زراعت، باغبانی، پھلوں کی حفاظت، مویشی مہیا کرنے، نہروں کی دیکھ بھال، پُلوں کے بنانے، چشموں کے نکالنے اور کپڑے کے بُننے میں کوئی شایانِ شان اور دلپذیر طریقہ اختیار کرے، عمارتوں کی تعمیر میں جدّت پسندیاں دکھائے اور اپنی صحت کی حفاظت اور امراضِ جسمانی کا علاج بطریقِ احسن کرے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی یہ خواہش اس وقت تک پوری نہیں ہوسکتی جب تک وہ فصلوں، زمانوں اور فلکی حوادثات کی علومات حاصل نہ کرے، ارضی طبائع کو نہ پہچانے، ملکوں کے خواص اور ہوا کی تاثیرات کو

دہ جانے، مرکبات کے مزاجوں، بسائط کے فعل وانفعال اور ادویات کی ترکیب وتحلیل سے واقف نہ ہو اور مادی اشیاء کی شکست وریخت اور اُس سے بنی ہوئی اشیاء کے تراشنے خراشنے اور اُن کے محلِ استعمال اور تعدیل وموازنہ کی قابلیت نہ رکھے اگرچہ کسی انسان کے لئے اِن لاتعداد اُمور کی واقفیت اور معلومات ایک امرِ دشوار ہے لیکن اُن کے ساتھ تعاون اور تبادل جسے معاملہ داری کہتے ہیں اس کے لئے ناگزیر ہے۔

یہ ثابت ہوا کہ معیشت میں کمالِ انسانی اِن لاتعداد جزئیات کا محتاج ہے اس لئے انسان پہ واجب ہوا کہ وہ اِن جزئیات کو کسی قاعدۂ کلیہ اور قانونِ مسلمہ کی تحت میں لائے چونکہ انسان کے نزدیک قواعدِ کلیہ بہت سے ہیں۔ س لئے اس کے لئے یہ ضروری ہوا کہ سب سے پہلے وہ اِن جزئیات اور قواعدِ کلیہ کے باہمی توافق وتناسب کے پیشِ نظر ایسے کلیہ کا انتخاب کرے جس پر جملہ علوم وفنون کی بنیاد رکھی جاسکے اور ان کو یکجا کیا جاسکے جیسے کہ فن فلاحت ونباتات، علم حیوانات ومعالجہ، دواب، علمِ ہندسہ ومثلثات ومساحت، علم حساب و جبر ومقابلہ، علم طب وجراحت وتشریح وفزیالوجی، خواص ادویہ اور ان کی کیفیت ترکیب، علوم فلکی، جغرافیہ، اصطرلاب، بحری، معاون اور طبقات الارض، علم طبیعیت اور جرِ ثقیل، علم کیمیا (جس سے مراد مرکبات کی تحلیل، بسائط کی ترکیب اور ان کے خواص ہیں) علم تدبیرِ منزل، فنِ قوانینِ مدنیہ، نظاماتِ بلدیہ اور سیاستِ سلطنت غرضیکہ اِن سب فنون کا حقیقی مقصد ایک عملی شغل تھا اس لئے علم وعمل کے درمیان مطابقت اور موافقت پیدا کرنے کی سعی بلیغ کی گئی اور انسانوں کی جتنی زیادہ تعداد بڑھتی گئی معیشت کی ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

یہ تھا میرا مطلب جو میں نے کہا ہے کہ کمالِ معیشت تمام علوم ومعارف اور صنائع کو درجۂ کمال تک پہنچانے کا سب سے بڑا سبب ہے لیکن انسان کو چاہئے کہ معیشت میں قدرے آسائش حاصل ہونے کے بعد اپنے نفس کی جانب رجوع کرے اور اس حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے کہ وہ کمالِ معیشت جس سے تمام راحتِ بدنی تو حاصل ہوں لیکن اخلاق اور ملکاتِ باطنی میں نقص اور فساد رہے عین نقصان ہے چونکہ بزدل خطراتِ شدید سے گھبرا جاتا ہے حریص اور طامع کا تنورِ شکم کبھی نہیں بھرتا، حاسد دوسروں کو

فارغ البال دیکھ کر جل بھن جاتا ہے، مغلوب الغضب معمولی سی تحریک سے آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور بخیل اپنے بخل کی وجہ سے محروم لذت رہتا ہے اس لئے اگر ایسے لوگوں کو جملہ اسباب معیشت مہیا بھی ہوں تو وہ اُن سے حقیقی راحت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فلسفہ کی قوت سے پہلے اخلاقِ فاضلہ اور ملکاتِ رذیلہ کو ایک دوسرے سے متمیز کیا جائے اور اس کے بعد ملکاتِ رذیلہ کو ترک کر کے اُن کی بجائے اخلاقِ فاضلہ کو اختیار کیا جائے اس طرح کمالِ نفسانی حاصل ہوتا ہے اس کے حصول کے لئے انسان نے فنِ تہذیب الاخلاق کی اختراع کی اور جب عقل، بدن اور معیشت کی اصلاح اور اخلاقِ نفس کی تعدیل سے فراغت پا چکا تو اپنی عنانِ فکر کو اپنی جانب منعطف کر کے ایسے متوقع کمال کا جویا ہوا جس میں حیاتِ حقیقی اور سعادتِ ابدی حاصل ہو اور فلسفہ و حکمت کی مدد سے اپنی پیدائش اور اس کی حقیقت کے متعلق بحث کر کے شعور کے اسباب اور مدرکات کی علتوں اور بدنی حواس کے ساتھ اُن کے ارتباط کو معلوم کرنے کا طلبگار ہوا اور معلولات میں سے ہر ایک معلول کے نتائج کا متلاشی ہوا نیز اس کا بھی پتہ لگایا کہ معلولات میں سے ہر ایک کے صلاح و فساد کے مقتضیات کیا ہیں، عقول اور ارواح کا ابدان سے کیا تعلق ہے، اخلاقِ اُمم کے اختلافات کی وجہ کیا ہے اُن میں سے ہر خلق کے جداگانہ حصول کے اسباب کیا ہیں ملتوں کے تمدن، علوم و معارف اور صنائع کے عروج و زوال کے وجوہ کیا ہیں، شرائع اور تشریع کی علت کیا ہے اس سے فارغ ہو کر جب انسان نے دنیا پر نظر ڈالی اور اپنی قوتِ فکر کو کام میں لایا تو اس کے مبداء، اصل، مادہ، عوارض، حوادث، علل اور معلولات میں عام و خاص طریق سے غور و خوض کیا، اجزائے عالم کے تجاذب و تدافع، تقارب و تباعد اور فعل و انفعال کی تحقیق کی، حرکت اور اس کے اسباب کا انکشاف کیا، نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے وجوہ اور ان کی ہیئتِ منتظمہ اور اشکال متعینہ محکمہ میں تبدیل ہونے کے اسباب اور اُن کے وجود کی غرض و غائت کو جہاں تک فلسفہ و حکمت رہنمائی کر سکے سمجھا اور اپنی سعادت اور بقاء میں گہری سوچ بچار سے کام لے کر اس کے بعد قوانینِ کلیہ کو جمع کیا اور لاتعداد جزئیات کو منضبط کر کے چند فنون

وضع کئے جیسے کہ فن فلسفہ عقلیہ، فن فلسفہ اخلاق، فن فلسفہ تاریخ، فن فلسفہ شرائع و قوانین، فن فلسفہ اولیٰ و حکمت علیا وغیرہ وغیرہ۔

جب فلسفہ و حکمت کی غرض و غایت معلوم ہوگئی تو اب یہ بات مخفی نہیں رہی کہ عالم انسانی میں اس کے وجود کا حقیقی سبب کیا ہے؛ پہلا سبب انسان کی معیشت کی دشواریاں اور حاجتیں ہیں اور دوسرا انسان کی عقل فطری اور جبلّی ہے جس کی زندگی کا انحصار انسان کی اُن لذّات اور مسرتوں کے علل اور اسباب کے ادراک پر ہے جو عالم ہستی کی مخفی حقیقتوں کو جاننے اور مجہولات کے انکشاف میں حاصل ہوتی ہیں۔

اب یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں اس کی نشر و اشاعت کا کیا ذریعہ رہا ہے۔ ہر قوم بلکہ ہر شخص کے افکارِ عالیہ اس قوم یا اس شخص کے ابتدائی کلیّہ کے ادراک کے مطابق ہوتے ہیں اور ابتدائی کلیّہ کا تعلق معلوماتِ جزئیہ کی مقدار سے ہوتا ہے اور معلومات جزئیہ کا انحصار اُن کی زندگی کے وضع اور معیشت کی ضروریات کے اندازہ پر ہوگا۔ اس بات کا صحیح اندازہ دیہاتی بچے اور شہری بچے کا باہمی موازنہ کرنے سے ہوسکتا ہے اس بنا پر جو قوم بداوت اور وحشیانہ پن میں زندگی بسر کرتی ہوگی وہ اپنے لباس، اشیائے خورد و نوش اور رہنے سہنے کے ساز و سامان میں صلابت، درشتی، خشونت اور کثافت کی عادی ہوگی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو زندگی اور معیشت کے لوازمات اور ضروریات نہایت قلیل ہوں گی اور اس قوم کی زندگی اور معیشت حیوانات کی زندگی اور معیشت سے ملتی جلتی ہوگی چونکہ وہ پست درجہ میں ہوں گے اور تنگ دائرہ میں زندگی بسر کرتے ہوں گے اُن کے معلوماتِ جزئیہ بھی اُسی نسبت سے کم ہوں گے اور جب ان کے معلوماتِ جزئیہ کی مقدار اتنی کم ہوگی تو اُن کے ابتدائی کلیّہ کا ادراک بھی پرازمعلومات نہیں ہوسکتا اور وہ قوم کسی وقت بھی افکارِ عالیہ کی مالک نہیں ہوسکتی بلکہ اپنے ادراکات میں وہ درجۂ حیوانات کے نزدیک ہوگی۔

جو شخص تاریخِ عالم کی معمولی سی بھی واقفیت رکھتا ہے اس کی نگاہوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ قرونِ ماضی میں کوئی قوم ایسی نہیں ملتی جو اُمتِ عربی کے مقابلہ میں تمدن سے زیادہ دور، بداوت میں زیادہ غرق

اور تو بحث کی زیادہ مالک ہو نما۔ قدیم میں اس اُمت کو دوسری قومیں محض اس کے اشعار کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے جانتی تھیں جن کی بنا زیادہ تر اُن کے تخیلات پر تھی ورنہ یہ قوم فکر عالی، اور اکات کلیہ عقلیہ اور فنون حکمت جلیلہ سے قطعاً نابلد تھی یہاں تک کہ خالق مطلق نے اپنے برگزیدہ پیغمبر کے ذریعہ اپنی کتاب بھیجی اور اسی کتاب کے ذریعہ وحدانیت کا سبق دینے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کا اعتراف کرانے کے بعد جہالت، کور باطنی اور اوہام پرستی کی مذمت کی اور علم حکمت و معرفت اور تدبر و تفکر کو سراہا۔ اخلاق رذیلہ کے مفاسد کو آیات بینات سے واضح کیا اور ملکات فاضلہ کی خوبیوں کو غیر متبدل کلمات سے عالم آشکار کیا، اُمم سابقہ کے حالات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا اور اُن میں سے ہر ایک کا ذکر اُن کے دنیوی اعمال کی استقامت اور اعتدال پسندی کی جزا اور گمراہی اور انحراف ورزی کی سزا کی صورت میں کیا تاکہ بعد میں آنے والی قومیں اُن سے عبرت حاصل کریں، معاملات مدنی اور منزلی کے قوانین کلیہ کی اساس کو جو سعادت مطلقہ کا موجب ہوں متعین کیا اور ظلم و تعدی کے نقصانات جو وحشت اور بربریت کا نتیجہ ہوتے ہیں ظاہر کیا اور انسان کو مخاطب کر کے کہا کہ جو کچھ دنیا میں موجود ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا گیا ہے اس لئے ترک خواہشات نہ کرو بلکہ عدل و انصاف کے طریق پر اُن سے متمتع ہونے کی کوشش کرو اور اپنے آپ کو اس سامان آرائش سے محروم نہ کرو جو خدا کا عطیہ عظمیٰ ہے اور عقل و نفس کے کاملین کو جن سے مراد صالحین ہیں تمام روئے زمین کی بادشاہت کی خوشخبری دی الغرض اس کتاب مبین کی آیات محکمات سے فنون کلیہ کو پاک باطن لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کیا اور انسان کو انسان بننے کا راستہ دکھایا۔

چونکہ اُمت عربی اس کتاب پر ایمان لے آئی اس لئے اس کو جہالت کی دنیا سے نکال کر علم کی دنیا سے آشنا کیا، کور باطنی کو نور قلبی سے منور کیا اور وحشت کو مدنیت اور بداوت کو حضارت میں بدل دیا یہاں تک کہ اُمت عربی نے اپنی جملہ احتیاجات زندگی کو کمال عقلی اور نفسی کی رُو سے اچھی طرح سمجھ لیا۔

جب اُن کے دل و دماغ کی آنکھیں اس طرح روشن ہوگئیں تو وہ اپنے افکار و خیالات کی تربیت ہوتی

رُو کو قابو میں نہ رکھ سکے اُن کی عقل اکتساب کمالات کے لئے اقصائے عالم میں گھومنے لگی یہاں تک کہ خلیفہ منصور کے عہد میں حکماء اور علماء کی ایک جماعت نے اس کو ضروری سمجھا کہ اکتساب کمالات کی اس بے پایاں منزل کو جو صعوبتوں اور دشواریوں سے خالی نہیں ہے طے کرنے کے لئے مشرکین کے افکار وخیالات سے استعانت کرے چنانچہ انہوں نے یہ خیال کیا کہ اپنے علم پر تکبّر کرنا جہالت ہے دوسروں کی معلومات سے بھی مستفید ہونا چاہئے اس لئے اسلام اور مسلمانوں کی عین شوکت وعظمت اور سطوت و عزّت کے زمانے میں یہ ہوس اُن کے دل میں پیدا ہوئی کہ علم کے مقام کو اس سے بھی زیادہ رفیع اور باشرف بنایا جائے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں اپنی ذلیل ترین رعایا نصاریٰ، یہودیوں اور مجوسیوں کے سامنے اپنے سر کو جھکا کر اظہارِ فروتنی کرنا پڑا یہاں تک کہ اُن کی مدد سے فارسی، سریانی، اور یونانی زبانوں کے فنونِ حکمت کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا اور اس طرح قرآنی حکمت کو غیر قرآنی حکمت کے ساتھ ملا یا گیا۔

یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ وہ کتاب جس کا نام قرآن مجید ہے مسلمانوں کے لئے سب سے پہلا علم حکمت تھا اور اس عالم اکبر میں وہ ایک نسخہ جامع ہے کہ ہر وجود کے لئے اس میں ایک حرف۔ ہر نوع کے لئے ایک کلمہ۔ ہر جنس کے لئے ایک سطر۔ ہر انسان کے لئے ایک صفحہ اور ہر حرکت اور تغیر کی اس میں شرح ہے یہ وہ کتاب مجید ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اس کے حروف، کلمات، سطور اور صفحات کا شمار انسان کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس کے ہر کلمے بلکہ ہر ایک حرف میں اتنے رموز واسرار پوشیدہ ہیں کہ اگر تمام گذشتہ اور موجودہ علماء کو عمر نوح مل جاتی اور اُن میں سے ہر ایک روزانہ ایک ہزار رموز واسرار کو حل کرتا تو بھی اس کی کُنہ تک پہنچنے سے عاجز آجاتا اور اپنی کم عقلی کا اعتراف کرتا۔ اس لئے اگر کوئی یہ چند بوسیدہ اوراق کو لے کر یہ دعویٰ کردے کہ اس نے تمام دنیا کا علم حاصل کرلیا ہے اور اس کے تمام اسرار کو سمجھ لیا ہے تو وہ جہل مرکب اور مالیخولیا میں مبتلا ہوگا بلکہ جو کچھ بھی کسی نے لکھا ہے کتاب عالم کے اُس مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے جو اس کی قوت وضعف ادراک اور تیزی وانکساری بصیرت نے حاصل کیا ہو۔ چونکہ عقل ومشیت

میں انسان کا کمال کتاب عالم کے علم کے اندازہ پر منحصر ہے اس لئے کمال انسانی کی کوئی حد و انتہا نہیں ہوگی لہٰذا ہر شخص پر انفرادی اور ہر اُمت پر مجموعی حیثیت سے واجب ہے کہ عقل و معیشت کے مدارج کمال پر ترقی کرنے کے اس نسخۂ جامعہ کو اپنے پیشِ نہاد رکھے اور اس میں بنظرِ بصیرت غور و فکر کرکے روزانہ نئی نعمتوں اور نئے لطف سے بہرہ اندوز ہونے کی کوشش کرے۔

جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ قرآن مجید ہی وہ کتاب فلسفہ ہے جس میں انسان کے کمال عقلی اور کمال معیشت کا تمام تر سرمایہ موجود ہے تو یہ بات کسی سے بھی پوشیدہ نہ رہی کہ اس کے فلسفہ کی کوئی انتہا نہیں ہے اور کسی کا فہم اور ذہن اس کا احصا نہیں کر سکتا اتنا ضرور ہے کہ اس کے مدارج علیّہ میں سے اگر اس کے ہر درجہ پر اس کی حدذات کو محفوظ رکھا جائے تو اس سے حصولِ کمال میں مدد ملتی ہے اور اگر اس سے بلند تر درجہ پر نظر ڈالی جائے تو اس کا شمار نقص کمال میں ہوگا اور اگر اس کے مدارج میں سے کسی درجہ پر رک جائے تو یہ انسان کی غفلت اور تساہل یا کوری اور جہل مرکب یا دوں ہمتی اور خستِ فطرت کی دلیل ہوگی۔

حکمائے اسلام نے جتنی کتابیں لکھی ہیں اگرچہ وہ باعتبار تعداد کے بھی ناکافی ہیں لیکن اگر اس سے بھی دُگنی ہوتیں تو بھی کمالِ انسانی تک رہنمائی کرنے کے لئے ناقص اور ناتمام رہتیں اس کے کئی وجوہ ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ جو مطالب ان کتابوں میں درج ہیں نہ تو اپنے نفس الامری حیثیت سے اور نہ حکمائے یونان کے نظریہ کے مطابق ہم پر واضح ہوئے ہیں کیونکہ حکمائے اسلام نے یہ غلطی کھائی کہ انہیں زیورِ کمال سے آراستہ کرکے اور لباسِ عصمت سے پیراستہ کرکے ہمارے سامنے پیش کر دیا اور اپنے روشن دماغوں کو کسی قسم کی تکلیف دینے کی ضرورت نہ سمجھی اور بلا چون وچرا الیقین کر لیا کہ یونانی اور رومانی فلسفی سب کے سب عقل مطلق ملکاتِ مقدسہ اور قوائے قدسیہ اور مکاشفاتِ حقہ کے مالک ہیں اور اُن کی قوتِ شعور و ادراک کی حدیں باقی تمام انسانوں کے شعور و ادراک کی حدود سے بالاتر ہیں اس لئے حکمائے اسلام نے اُن کے اقوال کو وحی آسمانی سمجھ کر قبول کر لیا اور دلائل و براہین کے انتخاب میں بھی اُنہی کی تقلید کی جس طرح کہ عوام اپنے مطالب و مقاصد میں

اپنے رہنماؤں کی تقلید کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابن سینا ایسی جلیل القدر ہستی نے بھی جب چاہا کہ اپنے مرشد ارسطوئے یونانی کی اس کے مسئلہ نفوس فلکیہ کے سلسلہ میں مخالفت کرے تو یہ بات اُسے اتنی بُری معلوم ہوئی کہ دہشت سے مغلوب ہو گیا اس لئے اس نے پہلے پہل تو ارسطو کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اپنے جدید کلیّہ کی بابت خفیف سا اشارہ کیا اور اس کے بعد کسی دوسرے مقام پر نہایت عاجزی اور گھبراہٹ سے اس کا مفصل اظہار کیا ملّا صدر کو اس جماعت پر اتنا اعتقاد تھا کہ وہ ان کے حق میں کفر و زندقہ اور الحاد کو محال سمجھتا تھا یہاں تک کہ دیمقراطیس، تالیس، انباذقلیس اور ایپقورس کی حمایت میں وہ سب سے پیش پیش نظر آتا ہے اور ان اقوال کی بھی تاویلیں کر کے عذر رنگ پیش کرتا ہے جن سے خدا کا صریحی انکار پایا جاتا ہے شہاب الدین مقتول نے اس دائرہ تقلید کو یہاں تک وسعت دی کہ زردشت کے اقوال کو بھی یقین کامل کے ساتھ ان کے حق و صداقت کی تحقیق کئے بغیر صحیح ماننے لگا اور نور و ظلمت کے مسئلہ کو اس نے از سرِ نو تازہ کیا۔ آخر مسلمان حکماء نے ایسے حسنِ اعتقاد کو دل میں کیوں جگہ دی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو گئی کہ فلاسفۂ متقدمین میں سے ہر ایک نے فلسفہ کے چند شعبوں کو دوسروں کے افکار کی مدد کے بغیر ایجاد کیا ہے اور ان مسائل کے ابہام اور مطالب کی مشکلات کو اپنے ذاتی تیقن و استحکام کے ساتھ حل کیا ہے اور وہ اس حقیقت سے قطعاً غافل ہو گئے کہ علوم فلسفہ دیگر فنون و صنائع کی طرح اپنے پیشروؤں کے افکار و آراء کے ساتھ مل کر اس درجہ کو پہنچے ہیں۔ اور ان تمام علوم نے جہاں سب سے پہلے جنم لیا وہ ہندوستان کی سرزمین تھی۔ اس کے بعد بابل اور بابل سے مصر پہنچے اور مصر سے یونان اور روما کے شہروں میں۔ اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہونے کے ساتھ ایک ہیئت جدید اور پیرایۂ نو اختیار کر کے ایک حالت سے دوسری حالت میں متبدل ہوتے گئے چنانچہ نباتات اور حیوانات کی کیفیت جب ناقص حالت سے کامل کی جانب منتقل ہوئی تو حکمائے اسلام نے اس کامیابی کا حقدار حکمائے یونان اور روما کو ٹھہرایا حالانکہ یہ امر

واقعہ ہے کہ حکمائے یونان اور روما کو سوائے چند ایک فرسودہ اقوال و آرا کے اِن فنون میں کوئی دسترس نہ تھی۔ حکمائے اسلام کے باور کرنے کی صرف یہ وجہ ہوئی کہ حکمائے یونان اور روما نے دورانِ تحریر میں اپنے اُن اساتذہ کا تصریحاً ذکر نہیں کیا تھا جو اُن سے پہلے ہو گذرے تھے اور اِن فنون کی تکمیل جن کی کاوشِ طبع کی مرہونِ منت تھی۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکمائے اسلام میں سے بعض اسی دائرہ تقلید میں مقیّد ہو کر رہ گئے اور انہوں نے اپنی نفسیات کے صفحات کو اسی قسم کے فرسودہ نقوش سے آراستہ کیا اور اس تقلید نے اُن پر یہاں تک اثر کیا کہ فلسفۂ یونانی کے قافیے کی رعایت سے انہوں نے اپنے فلسفہ کا نام بھی فلسفہ یمانی رکھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اُن کتابوں میں فلسفیانہ مسائل مخلوط تھے۔ صائبین کے کلامی نظریوں کا اثر اُن میں زیادہ نمایاں نظر آتا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یونانی اور رومانی صابی المذہب تھے اور اُن کا ایمان افلاک و کواکب پر تھا او وہ کئی خداؤں کے معتقد تھے اس لئے انہوں نے اپنے اِن معتقدات کو دلکش دلائل، شیریں کلمات اور لطیف پیرایہ بیان میں فلسفے کی کتابوں کا جزو اعظم بنایا اور اپنے اِن خیالات کو وہ فلسفے کے مسائل حقّہ سمجھنے لگے جس طرح کہ افلاطون کے عقول مجرّدہ اور ارباب انواع کے مسائل جن سے عبارت اُن کے معبود تھے نیز سیر افلاک کی بابت خوارق عادت والتیام کے عدم جواز کا حکم اور اس کے بجائے عنصرِ خامس کے وجود اور عقول و نفوسِ کلیّہ کا اثبات وغیرہ وغیرہ اہم مسائل جن کا تعلق افلاک سے تھا مسلمان حکماء کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی اور انہوں نے اِن تمام مسائل کو من وعن تسلیم کر لیا اور اپنی کتابوں میں لکھ دیا اگر وہ ذرا چشم بصیرت سے کام لیتے تو اُن پر واضح ہو جاتا کہ اِن بیان کرنے والوں نے مسائل کے اثبات میں اپنی طرف سے کوئی دلیل پیش نہیں کی بلکہ اپنے عقائد کو جیسے کہ ہر مذہب کے متکلمین کا خاصہ ہے ایک قسم کی ظاہری آرائش سے سامعین کے سامنے پیش کیا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جو مسائل اُن کتابوں میں درج تھے۔ وہ بذاتِ خود تشنۂ تکمیل تھے جیسے کہ مسائل جبر و مقابلہ و ہیئت۔ ان کے مؤلفین نے خود اپنی کتابوں میں اِن کے نامکمل ہونے کا ذکر کیا ہے خلاصۃ الحساب اور تذکرۂ طوسی ملاحظہ فرمائیے یہاں تک کہ طوسی

جس نے اپنی قوتِ فکر سے متقدّمین کے کارناموں کو جلا دی اور مسائلِ ہیئت کی تکمیل کے لئے اپنے خیال کے مہمان خانہ سے اتنے نئے افلاک، عالمِ سمٰوات میں پیدا کئے اُسے بھی بعض مقامات پر اعترافِ عجز کرنا پڑا۔ رہے مسائلِ طبیعات تو جاننا چاہئے کہ جسم کی یہ ترکیب کہ وہ ہیولیٰ، صورت اور دیگر متعلقات سے مل کر ہوئی ہے اس کا انحصار اس پر بھی ہے کہ جسم اعضائے مفردہ کے ساتھ متصل ہو اور اُن اعضائے مفردہ کے لئے بھی کوئی نہ کوئی مقدار مقرر ہوتی ہے۔ مسائل الٰہیات کا بھی یہی حال ہے حکماء نے پہلے علت و معلول کے درمیان وجوبِ جنسی اور مناسبت تام کا فیصلہ کیا اس کے بعد انہوں نے کہا کہ خدا تمام ممکنات کی علت ہے بعض کی بالواسطہ اور بعض کی بالواسطہ لیکن اس حقیقت کی بابت اُنہوں نے سکوت اختیار کیا کہ خدا اور ممکنات کے مابین جنسی اور نسبتی تعلق کیسا ہے نیز انسان کی نیک بختی اور بد بختی کے متعلق انھوں نے شاعرانہ اقوال پر قناعت کی۔ غرضکہ اُن کے زیادہ تر مسائل ناتمام تھے لیکن متاخرین کی تمام کتابیں متقدّمین حکماء کی تعریف و توصیف اور اُن کے علوم کے خلط مباحث اور مناقشات اور منازعات سے پُر ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمان متقدّمین حکماء کی کتابیں اپنے تمام نقائص کے باوجود متاخرین کی تالیفات سے بہمہ وجوہ بہتر ہیں کیونکہ پہلے مسلمان آج کل کے مسلمانوں سے ہر بات میں بہتر تھے۔

جب فلسفہ، اس کی غایت، اور مسلمان فلسفیوں کی کتابوں کا حال معلوم ہو چکا تو اب میں ہندوستان کے علماء کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ تم نکاوتِ طبع کے مالک ہو اور پاکیزہ نفس رکھتے ہو۔ تمہارے ذہن روشن ہیں اور افکار وسیع تو پھر تم اِن ناقص کتابوں سے اپنی نظروں کو ایک دم کیوں ہٹا نہیں لیتے اور اس وسیع دنیا کی طرف کیوں نہیں دیکھتے دنیا کے حوادث اور اس کے وجوہ معلوم کرنے کے لئے بجائے اس کے تم اُن کتابوں کی طرف رجوع کرو تم اپنے تدبّر اور تفکّر کو کام میں کیوں نہیں لاتے کیا علم تمام بدیہیات میں سے مستغنی عن التعریف ہے یا نظری ہے جو محتاجِ تعریف ہے اور کیا علم فعل کا مقولہ ہے یا مقولۂ انفعالی

ہے یا مقولۂ اضافیت ہے یا مقولۂ کیف ہے منطق کا موضوع معقولاتِ ثانوی ہے یا تصورات و تصدیقات بدیہیہ اور کیا یہ ممکن فی الذہن ہے یا خارج اور اس کے کُلیہ کا تصور کیسے ہو سکتا ہے جنس اور مادہ میں کیا فرق ہے، تصدیق بسیط ہے یا مرکب اور متعلقِ تصدیق کیا ہے۔ جہل مرکب ہے یا بسیط غرضکہ ان تمام جزئی مسائل کی تحقیق میں کیوں عقول عالیہ ہی کو ہمیشہ استعمال کرتے ہو اور اس اہم امر کی جانب قطعاً توجہ نہیں دیتے حالانکہ ہر عقلمند آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی وجہ معلوم کرنے کی سعی کرے کہ مسلمان فاقہ مست اور پریشان حال کیوں ہیں اور ان کے اس ابتلائے عظیم کا کوئی علاج بھی ہے یا نہیں اور کیا خدا نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کوئی ذریعہ قرار دیا ہے یا نہیں۔ اور کیا اس اُمّت کے نفس کی اصلاح ممکن ہے یا محال اور اگر ممکن ہے تو کیا معرضِ عمل میں آسکتی ہے یا ممتنع بالغیر ہے اور اگر ممکن الوقوع ہے تو اس کے اسباب اور محرّکات کیا ہوں گے اور اس کی مادّی اور صُوری علّت کیا ہے اس کا موجد کون ہے اور اس کی علّتِ تام کے آخری جُزء کا کیا نام ہے؟

اس میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ اس شخص نے اپنی عمر کو ضائع کر دیا اگر اس نے اس اہم مسئلہ کے حل کرنے میں اپنے قیمتی اوقاتِ زندگی کو صرف نہیں کیا اور اس افسوسناک حالت پر غور وفکر نہیں کیا۔ ایسے شخص کو حکیم یعنی موجودات کے اصول کا عارف نہیں کہہ سکتے ولو کان ھذا العین تبکی صبابۃ علی غیر لیلی فھو دمع مضیع (اگر یہ آنکھ عشق کی وجہ سے لیلی کے سوا کسی اور کے لئے روئے تو وہ آنسو ضائع اور برباد ہو گئے)

میں پھر ہندوستان کے علماء کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ تم باریک بینی کا سرچشمہ ہو محکم آراء کی کان ہو اور گہرے افکار کا منبع۔ تمہاری تالیفات اور تصنیفات کثیر ہیں۔ کیا تمہارا نفس پاکیزہ اور فطرتِ مقدسہ فی الواقعہ اس پر رضامند ہو جاتے ہیں کہ اپنے روشن ذہنوں کو ان مباحث میں صرف کرو کہ آیا تصور کے وقت اتحاد مختلفین کی تصدیق لازم آتی ہے یا نہیں اور اگر زید آج کہے جو کچھ ہم کل کہنے کو ہیں تو کذب ہوگا اور جب کل آئے اور وہ کہے جو کچھ ہم نے کل کہا تھا تو بھی کذب ہے۔ کیا اسکا کذب صدق کو مستلزم ہے اور صدق کذب کو مستلزم ہوگا یا نہیں؟

جب خارجی ممتنع ذہنی ممتنع ہے تو امتناع ممتنعات کس طرح ہوگا کیا کبھی ٹیلیگراف کی تاروں کو نہیں دیکھتے جو ہندوستان کے طول و عرض کو محیط ہیں اور انکے اسباب کی بابت سوال نہیں کرتے اور کہہ یا جس سے عجیب غریب نتائج سرزد ہوتے ہیں اسکی طرف غور نہیں کرتے اور ہر روز یہ کہتے ہو کہ موجودات کے مشاہدے کا انحصار سورج کی کرنوں پر ہے حالانکہ فوٹو گراف ہندوستان کے تمام شہروں میں منتشر ہے لیکن تمہارا ذہن اور فکر اسکی حقیقت کو معلوم کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا تم اسکی توجیہہ معلوم کرنیکی کوشش نہیں کرتے کہ محض بھاپ کے زور سے ریل کس طرح آہنی پٹری پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ جاتی ہے تم ٹیلیفون، سینما اور دوربین کو کبھی اپنا موضوعِ بحث قرار نہیں دیتے۔ کیا تمہارے لئے یہ واجب ہے کہ تم محض اسلئے ان نئے مسئلوں کو در خورِ اعتنا نہ سمجھو کہ انکا ذکر ابن سینا کی شفا اور شہاب الدین کی حکمتِ اشراق میں نہیں ہے۔ کیا تمہارے اوپر واجب نہیں ہے کہ تم بھی اسی طرح آئندہ نسلوں کی خدمت کرو جس طرح تمہارے بزرگوں نے تمہاری خدمت کی۔ کیا ہر حکیم بلکہ ہر عقلمند آدمی کیلئے نا واجب نہیں ہے کہ وہ جہالت پر رضا مند ہو اور غفلت کو پسند کرے۔ کیا انسان اسمیں قصور وار نہیں ہے کہ وہ اسباب کے معلوم کرنے کیلئے جد و جہد نہ کرے۔ کیا عالم دانا اور حکیم بینا کیلئے یہ عیب نہیں ہے کہ اس نے تمام دنیا کے جدید فنون اور اختراعات کو یاد تو کر لیا ہو لیکن ان کے علل و اسباب سے قطعاً بے خبر ہو اور دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو چکا ہو لیکن وہ خوابِ غفلت میں پڑا ہو۔ کیا کسی محقق کیلئے یہ سزاوار ہے کہ مجہولِ مطلق باتیں کرے اور معلومِ مطلق کو نہ جانے۔ موہوم اشیاء کی ماہیت معلوم کرنے کیلئے موشگافیاں کرے اور امورِ ظاہرہ کی معرفت حاصل کرنے سے گریز کرے۔

یہ ہے مختصراً جو میں نے فوائدِ فلسفہ کے موضوع کے ماتحت بیان کرنا چاہا انشاء اللہ پھر کبھی اسی موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالوں گا۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستان کے مقتدر علماء اس مقالہ کو غور و فکر کے ساتھ پڑھیں گے نظرِ صحیح کے ساتھ پڑھنے کے بعد میری خلوصِ نیت ان پر آشکار ہو جائے گی۔ ❖

(مترجمہ) نگار



اقوالِ زریں

اقوال حضرت مجددؒ الف ثانی

(از جناب شیخ عبدالمالک صاحب کرنال بوٹ شاپ لاہور)

۱- گناہ کے بعد ندامت بھی توبہ کی شاخ ہے۔

۲- عورت کا نامحرم مرد سے ملائم گفتگو کرنا بدکاری ہے۔

۳- علمائے بےعمل پارس پتھر کی مثل ہیں جو اوروں کو سونا بنا تا ہے مگر خود پتھر کا پتھر ہی رہتا ہے۔

۴- کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ دل آزاری ہے خواہ مومن کا ہو یا کافر کا۔

۵- ناقص پیر آخرت کی کھیتی کا ناقص تخم ہے۔

۶- گوشہ نشینی اختیار کرنے میں چاہیئے کہ مسلمانوں کے حقوق ضائع نہ ہوں اور خود خدمت خلق سے محروم نہ رہے۔

۷- اہل اللہ کو تجارت اور خرید و فروخت ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔

۸- خدا کو خدا جاننا یہ ہے کہ شرک نہ کرے اور رسولؐ کو رسولؐ سمجھنا یہ ہے کہ اُس کے سوا کسی کی پیروی نہ کرے۔

۹- سرود و نغمہ ایک زہر ہے جو شہد میں ملا ہوا ہے

۱۰- گانا بجانا زنا کا منتر ہے۔

۱۱- خدا کے کرم پر مغرور ہونا اور عفو کی اُمید پر گناہ کرنا شیطان کا فریب ہے۔

۱۲- دولت مندوں کی صحبت زہر قاتل اور اُن کے چرب لقمے دل کو سیاہ کرنے والے ہیں۔

۱۳- متکبروں کے ساتھ تکبر کرنا صدقہ ہے۔

۱۴- جس نے دولت مند کی تواضع اس کی

دولت مندی کے سبب سے کی اُس نے دو حصّہ دین برباد کر ڈالا۔

۱۵۔ ہر عمل جو موافق شریعت ہے ذکر میں داخل ہے اگرچہ خرید و فروخت ہو۔

۱۶۔ ترکِ دُنیا سے مراد اس میں رغبت کا ترک کرنا ہے کہ نہ کسی چیز کے آنے کی خوشی ہو اور نہ جانے کا غم۔

۱۷۔ بلا استطاعت سفرِ حج تضییعِ اوقات ہے۔

۱۸۔ اُس غرض کو مٹا دینا جو کفّار سے وابستہ ہو کمالِ ایمان ہے۔

۱۹۔ ناراض ہونے کے خیال سے حق بات دوست کو نہ بتلانا حق دوستی نہیں۔

۲۰۔ نرم خُو اور متواضع کے لئے جہنم حرام ہے۔

۲۱۔ جس کو نرمی عطا ہوئی دنیا و آخرت عطا ہوئی

۲۲۔ سب سے زیادہ عذاب عالمِ بے عمل پر ہوگا۔

۲۳۔ پیر وہ ہے جو مرید کے مال میں اپنی خواہش نہ پائے

۲۴۔ تف ہے اُس طریقہ پر جس میں گالی دینا عبادت ہے۔

تمدّنِ افرنگ

(از جناب مرزا محبوب عالم صاحب)

تمدّنِ افرنگ سے مُراد وہ تمدّن ہے۔ جو برّاعظم فرنگستان کی موجودہ اقوام کے عادات و اطوار، خصائل و شمائل اور تہذیب و معاشرت پر مشتمل ہے۔ قیافہ، قیاس یا تخمینہ سے قطع نظر کرتے ہوئے مشاہدات و تجربات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے اور یہ ایک حقیقت ثابت ہے کہ تہذیبِ فرنگ کی عمارت کا سنگِ بنیاد الحاد و بے غیرتی ہے۔ مدت مدید و عرصۂ بعید تک مذہب سے بیگانہ رہنے کی وجہ سے ان اقوام میں الحاد نمودار ہوا جو ترکِ مذہب کا لازمی نتیجہ ہے۔ پھر لحم خنزیر کے استعمال سے جذبات غیرت زائل ہو کر بے غیرتی پیدا ہوئی جس کی وجہ سے شجرِ غیرت کے ثمرات، عفّت، عصمت اور حیا سے محرومی ہو گئی اسی لئے عصرِ حاضر کے مفکرِ اعلیٰ حضرت علّامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے ؎

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب   کہ روح اس مدنیّت کی رہ سکی نہ عفیف

تہذیبِ فرنگ کو "الحادِ فرنگ" سے تعبیر کرنا بے جا نہیں ہے۔ اس کی عقلی دلیل جو متعدد تجربات و مشاہدات کو متحمل ہے۔ اور مسلّمات عامہ میں سے ایک مسلّمہ امر ہے یہ ہے کہ اقوامِ مشرق کے کسی فرد کے سامنے خواہ وہ کتنا ہی فاسق و فاجر اور بداخلاق انسان ہو کسی خلافِ تہذیب فعل کا ظہور پایا جائے تو اس کے جذبات مذہبی و جذبۂ غیرت مشتعل ہو کر اُسے اُس ناجائز فعل کو روکنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ کیوں؟ یہ اس لئے کہ اُس کا مذہب کے ساتھ تعلق ہے اور مذہب نے جن امور کو ناجائز و حرام قرار دیا ہے وہ ان کو بُرا جانتا

ہے۔ برعکس اس کے اقوامِ فرنگ کے کسی ذوالاقتدار فرد یا برسرِ حکومت جماعت کے سامنے بھی کوئی شخص خدائی کا دعوے کر دے جس سے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے تو یہ لوگ اس سے پوچھتے تک نہیں۔ کیوں؟ یہ محض اس لئے کہ ان اقوامِ فرنگ کا مذہب سے تعلق نہیں ہے۔ حکیم الامت اقبال علیہ الرحمۃ کا یہ شعر اس کی تصدیق کرتا ہے ؎

ضمیر اس مدنیّت کی دیں سے ہے خالی ۔۔۔ فرنگیوں میں اخوّت کا ہے نسب پہ قیام

تہذیبِ فرنگ کی اجمالی خصوصیات رب العالمین کی قولاً و عملاً بغاوت اور اس کے مطیع و فرمانبرداروں سے تمسخر و استہزا مذہبی خیالات والے افراد کے خلاف جذباتِ منافرت کا اظہار اور مذہبی احکام و شعائر کو دقیانوسی خیالات کہنا اور متبعینِ شریعتِ مقدسہ کو خشک مُلّا کے نام سے موسوم کر کے عامۃ الناس میں مذہب کے حق میں جذباتِ منافرت پھیلانا۔ مذہبی و اخلاقی کتب و رسائل کے بجائے حُسن و عشق اور مخربُ الاخلاق و حیا سوز تصنیفات کا مطالعہ اور اُن کی نشر و اشاعت، مکانات کے اندر نشستگاہوں میں عبرت و نصیحت آموز قطعات کے بجائے نسوانی تصویریات جن میں بعض بالکل عُریاں ہوتی ہیں آویزاں کرنا۔ داڑھی کے ساتھ مونچھوں کو بھی صاف کر کے ہونٹوں اور رخساروں کو فرنگستانی زیبائشی سفوف سے صیقل کر کے ایسا چہرہ بنانا جو خاصۂ نسوانیت ہے۔ بوجہ عدمِ غیرت کے عورتوں کے اخلاقی جرائم بالخصوص زنا کے ارتکاب پر بھی زبان پر مُہرِ سکوت لگا لینا بلکہ رضامندی کا اظہار کرنا جو خاصۂ دیوثی ہے جس کے متعلق خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ عالی ہے کہ "دیوث انسان پر جنت کی خوشبو تک حرام ہے" لباس اس وضع کا پہننا کہ جس سے جسم کے اعضا اور ان کی ماہیت ظاہر ہو۔ یعنی غیر شریفانہ لباس لحمِ خنزیر کا استعمال جس سے بے غیرتی پیدا ہوتی ہے۔ طہارت و استنجا سے گریز طرزِ غسل ایسا کہ طہارت بدنی کے بجائے نجاست بدنی لاحق ہو سینما، تھیٹر، گراموفون، ہارمونیم اور عشقیہ غزلیات وغیرہ کو لوازماتِ زندگی سمجھنا تخلیطِ رجال و نسا علاوہ ازیں اور بہت سے ایسے حیا سوز امور جو اخلاقاً ناقابلِ

بیان ہیں تہذیب فرنگ کے اجزائے لاینفک ہیں۔

الحاصل تمدّنِ افرنگ کے تمام اجزاوہ اجزا ہیں جن کو مذہب نے ناجائز قرار دیا ہے اور عفّت و عصمت اور غیرت کے منافی ہیں۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ دو متضاد چیزوں کا یکجا اکٹھا ہونا محال ہے۔ مثلاً آگ و پانی ظلمت و ضیا، مذہب و الحاد پس جس ہستی میں مذہبی تہذیب پورے طور پر موجود ہو۔ وہاں الحادی تہذیب ——— تہذیب فرنگ ——— کا اثر نہیں ہو سکتا۔

غمخوار ملّت اقبال علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے ؎

ہوا ہے بندۂ مومن فسونئ افرنگ — اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک
تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ امومت — ہے حضرت انسان کے لئے اس کا ثمر موت

تہذیب فرنگ کے اثرات | محض مادی اشیا کا حصول مقصدِ حیات سمجھ لینا۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں مذہبی لائحہ عمل کو ترک کر کے اقوام فرنگ کے تمدّن و معاشرت کی طرف مائل ہو جانا۔ دینی علوم سے معرّا جاہل رہنا لہٰذا الحاد و دہریت اور خیالاتِ باطلہ کا پیدا ہونا۔ جذبات غیرت وحمیّت کا نیم مُردہ یا بالکل مُردہ ہو جانا۔ صحیح فطرت سلیمہ کا اس قدر کمزور ہو جانا کہ اُمور خیر و شر میں تمیز نہ کر سکنا۔ اپنی مذہبی قومی اور ملکی اشیاء سے نفرت و بُعد اور فرنگستانی اشیاء سے التفات۔ دینی مدارس و مکاتب کی غیر آبادی اور مذہبی تعلیم کا تنزّل۔ شکل و صورت، لباس و کلام بلکہ اکثر امور معاشرت میں اقوام فرنگ کی تقلید۔ ظاہری شکل و صورت کے علاوہ دل کا بدل جانا۔ یہ سب سے بڑی ہلاکت ہے جذبات حُرّیت و شجاعت کے بجائے آرام طلبی، تعیّش اور نسوانیت تہذیب افرنگ کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ مفکّر اعلیٰ اقبال علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے — جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ
ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

تہذیبِ فرنگ کے موضوعات | ہر سلیم الفطرت انسان جس کی فطرت صحیحہ روحانی امراض میں مبتلا ہو کر ضائع نہیں ہوئی۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ مروجہ تعلیم کے نتائج میں سے ایک امتیازی نتیجہ یہ بھی صاف طور پر عیاں ہے۔ کہ کالجوں کے فارغ التحصیل طلباء از سرتاپا تشبہ با قوام فرنگ کے پورے مصداق ہوتے ہیں۔ اقبال علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

ترا وجود سراپا تجلیِ افرنگ 	کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

یہ مسلّم امر ہے۔ کہ انہیں مختلف طریقوں سے تہذیبِ فرنگ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور جو متعلم اس سے اجتناب کرے طعن و تشنیع سے اُس کا قافیہ تنگ کیا جاتا ہے۔

اگر آپ بے تعصب ہو کر غور و فکر کریں اور عدل و انصاف کی عینک سے دیکھیں تو آپ پر اس راز کا انکشاف ہو جائے گا کہ سکول و کالج یقیناً تہذیبِ فرنگ کے سانچے ہیں۔ حکیم ملت علامہ اقبالؒ کے حسب ذیل افکار عالیہ اس پر مُصدِّق ہیں ؎

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم 	ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر 	کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو 	ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں 	ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

تہذیبِ فرنگ کے نقصانات | گو اس تہذیبِ حیوانی کے نقصانات متعدد ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ

مضر و مہلک نقصان یہ ہے۔ کہ حضرت انسان کی مذہبیت و روحانیت چھین لیتی ہے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغ سجود   خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

پس اے نوجوانانِ اسلام ایسی تہذیب فرنگ جس کی بنیاد الحاد و دہریت پر ہو اور اسلام نے جن جن امور کو ناجائز و حرام اور منافیٔ غیرت قرار دیا ہو اس میں باعث تفخر ہوں تو ایسی تہذیب کی طرف التفات کرنا فطرتِ سلیمہ و عقل صحیحہ کو ذبح کرنے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟ الغرض اندریں صورت غیرت اسلامی اس امر کی متقاضی ہے ؎

حذر ان شعبدہ بازانِ تہذیب فرنگی سے   کہ ان کی پیروی کا ہے نتیجہ ذلت و خواری

چونکہ اپنے گھر کو چھوڑ کر بیگانے گھر کی طرف رجوع کرنا خلافِ عقل، خلافِ فطرت او خلافِ شریعت ہے اس لئے اپنی تہذیب اور اپنے آئین کو دستور العمل بنانا چاہیے۔ اپنا مکمل اور افضل آئین جس کو ہم بھول چکے ہیں غمخوار ملت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کس درد کے ساتھ یاد دلاتے ہیں۔ سنیئے ؎

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست   زیر گردوں سرِ تمکینِ تو چیست؟
آں کتاب زندہ قرآن حکیم   حکمت اُو لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوین حیات   بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

از یک آئیں مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

اس آئینِ الٰہیؒ قرآن حکیمؒ میں اُن لوگوں کے لئے جو توحید باری تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد اشرف الانبیاء خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پہ ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا یہ حکم ہے

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ط

"یعنی جو شخص اللہ اور یومِ آخرت سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اکثر یاد کرتا ہے اس کے لئے اللہ کا رسولؐ بہت اچھا نمونہ ہے۔"

المختصر جس طرح پروانہ با شمع، ماہی با آب، اسی طرح مسلم با تہذیبِ اسلام۔ فی الحقیقت پروانہ اگر پروانہ ہے تو شمع سے مفارقت کیونکر، اور مچھلی اگر مچھلی ہے تو ترکِ آب سے اس کی زندگی کیسی؟ علیٰ ہذا القیاس مسلمان کو تہذیبِ اسلام سے مفارقت اور تہذیبِ فرنگ سے التفات کیا معنی!

روسیوں جیسی ملحد و زندیق قوم کو جب یہ تہذیبِ فرنگ راس نہ آئی تو مسلمانوں جیسی غیور قوم جس کی مذہبی تعلیمات میں غیرت و ایمان لازم و ملزوم ہیں اور جس کے ضابطۂ قوانین قرآن حکیم میں یہ ارشاد ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ جس کی زندگی ہی اللہ کے لئے ہو۔ اُسے یہ الحادی تہذیب کب موافق آسکتی ہے۔ اور اس الحادی تہذیب کا وہ دامِ تحریص جو طول و عرض میں بچھا ہوا ہے۔ اہلِ بصیرت و صاحبِ غیرت اس کے قریب نہیں جاتے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

طائرِ دانا نمی گردد اسیر گرچہ باشد دامے از تارِ حریر

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانانِ عالم کو بالعموم اور اسلامیانِ ہند کو بالخصوص اس الحادی تہذیب سے مامون و محفوظ رہنے کی توفیق مرحمت فرمائے!

میکدۂ صوفی

(از جناب مرزا عزیز فیضانی رامپوری)

نیاز خیز نہ جو ہو وہ ناز ناز نہیں ادا ادا ہی کہاں وہ جو دلنواز نہیں

شہ و گدا کا اخوت میں امتیاز نہیں یہاں ایاز بھی محمود ہے ایاز نہیں

خدا کی راہ میں حائل اگر مجاز نہیں تو حق عیاں ہے حقیقت بھی کوئی راز نہیں

مقام جلوۂ خلاقِ حسن ہے دلِ مرد یہاں جمال حسیناں کی ترکتاز نہیں

نیاز مند کے آگے نیاز؟ دیکھ، سنبھل! نیاز مند بن اُس کا جسے نیاز نہیں

مفید میکدۂ صوفی کا تھا اب اس میں مگر شراب ہند و عجم ہے مئے حجاز نہیں

ہیں بے اثر تو نمازوں پہ اعتراض فضول کہ اب نماز ہماری رہی وہ نماز نہیں

ہیں کیا لذیذ جہاں میں نشاط و مستی و عیش کمی یہی ہے کہ یہ سلسلہ دراز نہیں

بلند بزم غلاماں میں ہو؟ خدا نہ کرے وہ نغمہ جس میں ترنم ہے سوز و ساز نہیں

بتاؤں درد سے مجبور ہو کے راز دروں خرد جو روک نہ دے کہہ کے "یہ جواز نہیں"

کروں تو کیا کہ یہی لے عزیز ہے مجھ کو

ہے درد خیز میرا نغمہ، چارہ ساز نہیں

اعلان

اسلام کا نظریہ سیاسی

از

سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور

مولانائے موصوف کا یہ ایک مشہور مقالہ ہے جو انہوں نے مسجد شاہ چراغؒ کے ایک اجلاس میں گزشتہ سال پڑھا تھا۔ قدر دانوں کے اصرار پر اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے اور اب عام پبلک کے فائدہ کی خاطر اسے اردو میں بھی شائع کیا جارہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مقالہ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جاوے تاکہ مسلمانوں کو اس نظریہ حکومت وسیاست کا پتہ چل جائے جو اُن کے لئے قرآن نے مقرر کیا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر اس پمفلٹ کی قیمت بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔ انگریزی اور اردو کے پمفلٹ الگ الگ ذیل کی قیمتوں پر مل سکتے ہیں :-

قیمت	ایک عدد	۳ر	مع محصول ڈاک
"	۵ عدد	۱۲ر	"
"	۲۵ عدد	سے ۳ر	"

مینجر پیغام حق۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

اعلان

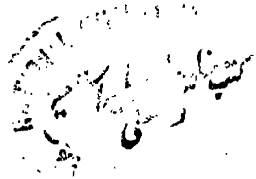
ایشیائی دواخانہ لاہور

جس طرح دہلی کو ہندوستان کا دار الخلافہ اور شاہانِ مغلیہ کا پایۂ تخت رہنے کی وجہ سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے اُسی طرح لاہور کو پنجاب کا دار الخلافہ اور ہندوستان کا علمی مرکز ہونے کا شرف حاصل ہے یہاں بھی دہلی کی طرح اشد ضرورت تھی کہ ایک اعلیٰ درجہ کا دیسی دواخانہ کھولا جاتا جس میں ہر قسم کی مرکب و مفرد ادویہ جو بالکل خالص ہوں کسی ماہر کامل طبیب کی زیر نگرانی مہیا کیجاویں۔ ہندوستان کی آب و ہوا کو دیسی ادویہ ہی راس آسکتی ہیں اور پھر غریب ہندوستانی انگریزی ادویہ کی قیمتیں بھی کہاں سے ادا کرے غریب لوگوں کی صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے اگر کسی کو بدقسمتی سے کوئی مرض لاحق ہو جاتا تو دیسی اطبا کامل اور دیسی دوئیہ خالص اُسکو میسر نہیں آتیں اور انگریزی ادویہ کی قیمت اور ڈاکٹروں کی فیسیں وہ ادا نہیں کر سکتا جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بیچارہ گھُل گھُل کر مر جاتا اور زندگی برباد کر دیتا ہے۔ اسلئے چند حساس حضرات کی عرصہ سے یہ خواہش تھی کہ اگر ایک ماہر کامل طبیب کہیں نظر آجائے اور وہ لاہور میں آکر مستقل طور پر بیٹھنے کو تیار ہوں تو اہل پنجاب کے لئے ایک مستند اور بلند پایہ دواخانہ کھولدیا جائے جس سے امرا کے علاوہ غربا بھی فائدہ اُٹھا سکیں خدا کا شکر ہے کہ ایک عرصہ کی تلاش و جستجو کے بعد ایک نہایت کامیاب مشہور آفاق طبیب کامل اور حکیم حاذق نے اپنی خدمات قوم کیلئے وقف کر دینے کا وعدہ کر لیا ہے میری مراد جناب ابو العرفان حکیم محمد عبد الرشید خاں صاحب سے ہے جو ریاست بہاولپور کے افسر الاطبا ہیں اور جنکی علمی لیاقت کا ایک بہت بڑے طبقہ میں کافی شہرہ ہے! آپکے زیر اہتمام لاہور میں ایک دواخانہ کھولدیا گیا ہے جسکا نام ایشیائی دواخانہ رکھا گیا ہے اس دواخانہ میں جو ادویہ تیار ہونگی اُنکا اشتہار وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہیگا امید ہے کہ ضرورتمند حضرات فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرینگے۔

بیرونجات کے حضرات اپنی اپنی امراض کی مفصل کیفیت لکھ کر تشخیص کرا سکتے اور نسخہ حاصل کر سکتے ہیں جس کیلئے کوئی فیس نہیں لی جاویگی مگر جواب کیلئے ٹکٹ یا ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا چاہیے جس پر مکتوب الیہ کا پورا پتہ لکھا ہوا ہو

مینجر ایشیائی دواخانہ مظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

اقبال اکیڈیمی لاہور کا پہلا شاہکار



یادِ اقبال علیہ الرحمۃ

حصّہ اوّل

ہندوستان بھر کے مقتدر شعراء نے ترجمانِ حقیقت علاّمہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی رحلت پر جس گہرے تاثر و احساس کے ساتھ اظہارِ عقیدتمندی کیا ہے وہ اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان تو درکنار دُنیا بھر کی کسی شخصیت کے متعلق اتنی کثرت سے مرثیے نہیں لکھے گئے عوام تو عوام خاص بھی اس کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر ہیں کہ اگر اُن نظموں کو یکجا کیا جائے تو اس کی کئی مجلّدات ہو سکتی ہیں! اقبال اکیڈیمی لاہور جس کا مقصد اقبالؒ کے حیات افروز پیغام کی نشر و اشاعت ہے۔ اس کے کارپردازوں نے سب سے پہلے "پیغامِ حق" ماہنامہ جاری کیا جو ایک سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ اب مہینوں کی تلاش و جستجو اور عرقریزی کے بعد یہ مجموعہ تیار کیا ہے جس کا حصّہ اوّل اقبالی ذوق رکھنے والے اصحاب کے دلوں کو گرمانے کے لئے شائع ہو چکا ہے۔

قیمت :- غیر مجلّد عہ - مجلّد عہ

ملنے کا پتہ :-

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

Registered No. L. 4584

ستمبر ۱۹۴۰ء جلد ۳—عدد ۳

اشاعت خاص

حالاتِ مفتی محمد عبدُہٗ



ماہنامہ

پیغامِ حق

اصلاحی، اخلاقی، علمی اور دینی مضامین کا ذخیرہ

مرتبہ

سیّد محمّد شاہ ایم۔ اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت سالانہ دو روپے بارہ آنے — قیمت فی پرچہ ۴ آنے

سالانہ قیمت

عوام سے دو روپے بارہ آنے | روساء سے پانچ روپے

فہرست مضامین

جلد ۳ | ستمبر ۱۹۴۰ء | عدد ۳

افتتاحیہ :-

سخنہائے گفتنی ۔ | سید محمد شاہ ایم۔ اے | ۲

مقالات :-

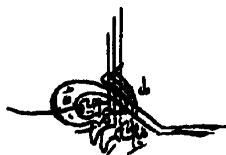
حالات مفتی محمد عبدہ ۔ | جناب محمد مظہر الدین صدیقی بی ۔ اے

۱ - ابتدائی زندگی ۔ | ۵

۲ - پبلک لائف کی ابتدا ۔ | ۲۸

۳ - آخری دور ۔ | ۵۲

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں
طبع ہو کر دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل۔ تاجپورہ لاہور سے شائع ہوا



سخنہائے گفتنی

قوموں کی حیات و ممات اور اُن کا عروج و زوال اکثر بلند ہمت اور روشن دماغ افراد کی حیات و ممات کے ساتھ وابستہ ہے۔ آپ تاریخ عالم پر نگاہ ڈال کر دیکھیں تو ہر ملک میں یہی نظر آئے گا کہ اگر وہ لوگ غفلت و جمود کا شکار تھے۔ کمزور و ناتواں تھے۔ جاہل اور نیم وحشی تھے تو کسی ایک فرد کی مسیحا نفسی سے آہستہ آہستہ اُن کی تمام بیماریاں دُور ہو گئیں اُن کی کمزوریاں قوتوں سے بدل گئیں اور جہالت و غفلت کی جگہ علم اور بیداری نے لے لی۔

دُنیا میں سب سے بڑا انقلاب ہماری نگاہ میں وہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب پہ آیا اور پھر تمام اطراف و اکناف عالم پہ چھا گیا۔ اِس انقلاب کا لیڈر ایک انسانِ کامل تھا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اُس کی طفیل دنیا پہ ایک کامل انقلاب آ گیا (صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ تو کچھ پُرانی بات ہے آپ اپنے زمانہ میں دیکھیے لینن روس میں انقلاب کا باعث بنا مصطفےٰ کمال ترکی میں، رضا شاہ پہلوی ایران میں اور ہٹلر جرمنی میں لینن اور ہٹلر کو تو چھوڑئیے مصطفےٰ کمال اور رضا شاہ پہلوی کا جو ذکر ہم نے کیا ہے اِس سے یہ نہ سمجھ لیجیے کہ انہوں نے اسلام کی کوئی خدمت کی ہے۔

اِن دونوں بہادروں کی جدو جہد اور مساعی کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ ترکی اور ایرانی قوموں کے اندر احساسِ خودداری پیدا ہوا اور انہوں نے بحیثیت ترک اور ایرانی اقوام عالم کی مجلس میں اپنے لیے ایک عزت کا مقام حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر اسلامی نقطۂ نگاہ

سے ان دونوں نے اسلام کے تمام اصولوں اور تمام نظریوں کو انتہائی مجرمانہ غفلت سے پس پشت ڈال دیا اگر ان کے دل و دماغ مسلمان ہوتے تو ہمیں یقین ہے کہ ان کے ذریعے مردہ مسلمان زندہ ہو جاتے صدیوں کے سوتے جاگ اُٹھتے اور اقوام عالم کی رہنمائی کا سہرا ایک دفعہ اور ان کے سر بندھ جاتا۔ مگر چونکہ بدقسمتی سے ان لیڈروں کے دل و دماغ مسلم نہ تھے۔ اُنہوں نے انقلاب تو ضرور پیدا کیا مگر اُس کا فائدہ مسلمانوں کو من الحیث المسلمان کچھ نہیں ہوا۔ دوسری حیثیتوں سے کچھ فائدہ ہوا ہو تو اور بات ہے۔

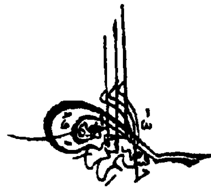
یہ ایک ضمنی بات درمیان میں آگئی تھی۔ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے خوش قسمت بلند ہمت اور روشن دماغ افراد ہی ہوا کرتے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں کے اندر دیر سے کوئی ایسا زعیم پیدا نہیں ہوا جو اُنکو حقیقی اسلام کی طرف دعوت دے کر اُس کا متبع بنا دیتا۔ کوئی قائد ایسا پیدا نہیں ہوا جو اُنکو بتا دیتا کہ دیکھو تم اللہ کے نائب ہو۔ یہ وسیع کرہ ارض اللہ کی ملکیت ہے اور تم اُسکے نائب کی حیثیت سے اسکے حکمران ہو۔ اپنے فرائض کو سوچو سمجھو اور اُنکو بجا لاؤ۔ اُٹھو اور خلافت الٰہیہ کو قائم کرو۔ عدل و انصاف کو قائم کرو اور ظلم و ستم کو جڑھ سے اکھاڑ پھینکو فحش و بدکاری کا نام و نشان مٹا دو اور ہر کسی کو اخلاق حسنہ کا پتلا بنا دو۔ علم سیکھو اور سکھلاؤ۔ اور جہالت کی تاریکی کو دور کر دو۔

ہم نہیں کہتے کہ اس طویل عرصہ میں کوئی صاحب نظر کوئی صاحبدل اور کوئی خود شناس مسلمان ایسا پیدا نہیں ہوا جسکے نہان خانۂ دل میں یہ خیالات موجزن نہ ہوئے ہوں نہیں ایسے سینکڑوں مسلمان پیدا ہوئے ہونگے مگر افسوس تو صرف یہ ہے کہ وہ اتنے بلند ہمت و رکامل انسان ثابت نہ ہو سکے کہ مسلمانوں پر ایک کامل انقلاب لے آتے۔ تاہم غنیمت ہیں وہ بندگان خدا جنہوں نے اسلام کو پھر سربلند دیکھنے کی آرزو میں اپنے امن و آرام اور راحت و چین کو گنوایا۔ ایک دنیا سے دشمنی مول لی۔ اور جاگتے سوتے میں، چلتے پھرتے میں، اور اُٹھتے بیٹھتے میں اسلام ہی کو سربلند دیکھنے کی آرزو کی اور تمام خداداد قابلیتوں کو اسی مقصد کے حصول میں خرچ کیا۔ ہم نہایت فخر اور عزت کے ساتھ اس سلسلے میں

چار بزرگوں کا نام لے سکتے ہیں جن میں سے تین تو اس وقت ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر اُن کا اخلاص اور انکی مساعی شہرتِ دوام حاصل کر چکی ہیں اور اُنکے افکار و عقائد اسوقت مسلمانوں کے اندر تھوڑا بہت ذہنی انقلاب پیدا کر رہے ہیں۔ ہماری مراد علامہ جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ مصری اور ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال" سے ہے۔ آج کی صحبت میں ہم آپکے سامنے مفتی محمد عبدہ مصری کے مختصر مگر سبق آموز سوانح حیات پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے محترم دوست مولوی محمد مظہر الدین صدیقی بی اے نے جو حیدر آباد کے رہنے والے ہیں اس مقالہ کو خوب نبھایا ہے۔ یہ بات آپ پر اس مقالہ سے خوب واضح ہو جائیگی کہ اسلام کی خدمت کرنے کے لیے اسوقت کس اخلاص کس قابلیت کس علم اور کس قربانی کی ضرورت ہے! اور یہ کہ مفتی محمد عبدہ مصری نے کتنی شاندار کامیابی کے ساتھ ملی نہضت کے ڈرامہ میں اپنا پارٹ ادا کیا۔

چوتھا عظیم الشان انسان بطل حریت، زعیم اسلام ایک گمنام مگر حقیقی مسلمان ہے جو کسی لحاظ سے جمال الدین افغانی، محمد عبدہ مصری اور اقبال سے کم نہیں مگر مسلمان ہیں کہ ابتک اسکی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ میری مراد سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ہے۔ جنکی شاندار اسلامی خدمات اسوقت اپنا نظیر نہیں رکھتیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کس پایہ کے عالم، کس پایہ کے سیاستدان، کس پایہ کے فلسفی کس پایہ کے ادیب ہیں اسکا پتہ انکی شہرہ آفاق تصنیف "الجہاد فی الاسلام" سے چلیگا۔ محمد عبدہٗ مصری کو خوش قسمتی سے مصر میں چند مواقع ہاتھ آگئے جس سے وہ اپنی پوشیدہ قابلیتوں کو ظاہر کر سکے اور مسلمانوں کو حقیقی فائدہ بھی پہنچا گئے۔ مجھے توقع ہے کہ اگر سید ابوالاعلیٰ مودودی کو عملی سیاست میں حصہ لینے کا کوئی موقع مل گیا تو شاید وہ مسلمانوں کے اندر ایک ایسا انقلاب پیدا کر سکیں جس سے وہ پھر مسلمان کہلانے کے قابل بن سکیں۔ سید صاحب میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک بڑے مدبر، ایک بڑے سیاستدان، ایک بڑے جرنیل اور ایک بڑے حاکم میں پائے جاتے ہیں۔ انکا دل اور دماغ دونوں مسلمان ہیں۔ وہ قلم اور تلوار دونوں کو چلانا جانتے ہیں وہ قانون الٰہی سے واقف اور اُس پر عامل ہیں وہ دنیاوی علوم و فنون سے گہرے واقف ہیں۔ یہ مسلمانوں کی سخت بد قسمتی ہوگی کہ پروانہ وار انکے گرد جمع نہ ہوں اور انکی بصیرت، انکی روشن دماغی اور انکی قیادت سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ میرے نزدیک اس عین شباب کے زمانہ میں بھی ابوالاعلیٰ ہندوستان کے محمد عبدہ ہیں۔ خدا کرے کہ آپ ترقی کرتے کرتے دنیا کے سب سے بڑے انقلابی، سب سے بڑے زعیم اور سب سے بڑے مدبر ثابت ہوں۔

محمد شاہ



محمد عبدہ

ابتدائی زندگی

(۱۸۴۹ء سے ۱۸۷۶ء تک)

پیدائش اور ابتدائی زمانہ محمد عبدہ کی صحیح جائے پیدائش نامعلوم ہے اور نہ ان کی تاریخ پیدائش کا تعین ہو سکا ہے۔ عام طور سے ۱۸۴۹ء ان کا سال پیدائش مانا جاتا ہے اور خود ان کی تحریروں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اگرچہ بعض لوگ ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۴۲ء بتلاتے ہیں۔ محمد علی پاشا کے عہد حکومت کے اواخر میں محمد عبدہ کے والد نے حکامِ صوبہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ترک وطن کیا اور صوبہ غربیہ میں آکر مختلف قریوں میں سکونت اختیار کی۔ اسی آوارہ وطنی کے زمانہ میں انہوں نے شادی کی اور محمد عبدہ پیدا ہوئے۔ اس کے چند سال بعد ان کے والد اپنے اہل و عیال کے ساتھ محلات نصر واپس آئے

جہاں انہوں نے تھوڑی زمین حاصل کرلی۔

یہاں محمد عبدہ کی تعلیم و تربیت بالکل اسی طرز پر ہوئی جو اس زمانہ کے مصری قریوں میں رائج تھا۔ اُن کی جسمانی نشوونما اچھی ہوئی اور انہوں نے تیراکی، گھوڑے کی سواری اور نشانہ بازی میں بڑی مہارت حاصل کرلی۔ اسی زمانہ سے انہیں بیرون خانہ زندگی گزارنے کا شوق پیدا ہوا جو آخر عمر تک باقی رہا۔ ان کی شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف جو آئندہ زندگی میں ظاہر ہوئے درحقیقت عکس تھے دیہاتی رسم رواج اور قبائلی زندگی کی ان خصوصیات کا جن میں ان کی ابتدائی عمر گزری تھی۔ عوام کی ضروریات کا احساس ان ضروریات کی تکمیل کے لیے مخلصانہ سعی و عمل اور قومی زندگی کی اصلاح کا ولولہ یہ سب صفات اسی دیہاتی ماحول کے پیدا کیے ہوئے تھے جہاں وہ اپنے بزرگوں سے محمد علی پاشا کے عہد حکومت کے افسانے سُنا کرتے تھے جو اُس زمانہ تک لوگوں کی یاد میں تازہ تھے۔

ان کے والدین اگرچہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن سیرت کی پختگی اور کردار کی بلندی ان میں ضرور تھی۔ اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں محمد عبدہ اپنے باپ کا نام بڑی عزت سے لیتے ہیں اور ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہم وطن ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس زمانہ میں محمد عبدہ کے والد نسبتاً فارغ البالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے لیے جس کو وہ عمدہ تعلیم دلانے کے آرزومند تھے ایک استاد مقرر کر دیا تھا جو گھر پر محمد عبدہ کو لکھنا پڑھنا سکھاتا تھا۔ محمد عبدہ کے والد کی حالت دیہات کے اور باشندوں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی بجز اس کے کہ ان کے پاس کچھ زمین تھی۔

دس سال کی عمر میں جب محمد عبدہ لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے انہیں ایک حافظ صاحب کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ انہیں قرآن مجید حفظ کرائیں یہی ایک تعلیم تھی جو اُس زمانہ میں غریب غربا کے لڑکوں کے لیے ممکن تھی جدید تعلیم دینے والے مدارس کی تعداد بہت محدود تھی اور

ان میں بھی صرف سرکاری عہدہ داروں کے لڑکے شریک ہو سکتے تھے۔

ان بنیادوں پر تعلیم پاچکنے کے بعد نوجوان محمد عبدہ کو تیرہ سال کی عمر میں طنطہ کی احمدی مسجد کے مدرسہ میں حفظ قرآن کی تکمیل اور قرأت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے شریک کر دیا گیا محمد عبدہ کے ایک رشتہ دار اس مدرسہ میں معلم تھے اور بحیثیت قاری تھوڑی بہت شہرت بھی رکھتے تھے۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد محمد عبدہ کو عربی صرف ونحو کی ابتداء کرائی گئی۔ لیکن بد قسمتی سے وہ اس صبر آزما مشقت کو برداشت نہ کر سکے۔ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں وہ لکھتے ہیں "میں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی لیکن اس مضمون کا ایک لفظ بھی میں نہ سمجھ سکا کیونکہ طرز تعلیم نہایت مہمل اور مضرت رساں تھا۔ معلمین صرف ونحو کی دقیق اصطلاحات استعمال کرتے وقت اس بات کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ اصطلاحات طلباء کی سمجھ سے باہر ہیں"۔ مایوس ہو کر محمد عبدہ مدرسہ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور تین مہینہ تک اپنے چچا کے مکان میں روپوش رہے۔ بالآخر ان کے بڑے بھائی نے ان کی ٹوہ لگائی اور انہیں مدرسہ واپس لے گئے۔ لیکن محمد عبدہ کو اتنا کامل یقین ہو گیا تھا کہ وہ عربی صرف ونحو سے بالکل بے بہرہ رہیں گے کہ اپنا تھوڑا بہت سامان لے کر وہ وطن واپس چلے آئے اور یہاں اس ارادہ سے کہ اپنے دوسرے اہل خاندان کی طرح وہ بھی زراعت کریں گے انہوں نے سولہ سال کی عمر میں شادی کر لی۔

اپنی خودنوشتہ سوانح عمری میں وہ لکھتے ہیں۔ "یہ پہلا تاثر تھا جو طنطہ کے طرز تعلیم سے میرے دل و دماغ نے قبول کیا اور یہی طرز تعلیم آج تک جامعہ ازھر میں رائج ہے۔ ننانوے فی صدی طلباء اس طرز تعلیم سے یہی تاثر لے کر نکلتے ہیں بجز ان چند خوش قسمت نوجوانوں کے جو کسی ایسے معلم کے زیر تعلیم رہتے ہیں جو پرانے طریقہ تعلیم کو پس پشت ڈال دیتا ہے

جس میں طلباء کی صلاحیتوں کا اندازہ کیے بغیر معلم اپنا ذہنی سرمایہ ضائع کرتا رہتا ہے لیکن زیادہ تر طلباء ایسے ہوتے ہیں جو معلم کے بیان کردہ مطالب و تشریحات کو تو بالکل نہیں سمجھتے ہیں مگر اپنے نفس کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں حتیٰ کہ وہ سن و سال کی پختگی کو پہنچ جاتے ہیں اور پھر بھی بچوں کی طرح خواب و خیال کی دنیا میں زندگی بسر کرتے رہتے ہیں اور بالآخر قوم و ملک کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں"۔ ایک خطبہ میں جو انہوں نے ۱۸۸۴ء میں ٹیونس کے ایک مجمع کے سامنے دیا تھا اور جس میں انہوں نے عربی صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم کے لیے بہتر طریقۂ کار اختیار کرنے پر زور دیا تھا انہوں نے بچپن کے انہیں تلخ تجربات کا تذکرہ کیا اور قدیم طرز تعلیم کے نقصان دہ اثرات کی توضیح بھی کی۔

لیکن اپنی تقدیر سے وہ اس طرح بھاگ کر بچ نہیں سکتے تھے شادی کے چالیس روز بعد ان کے والد نے پھر انہیں اپنے پرانے مدرسہ میں شریک ہونے پر مجبور کیا۔ راستہ میں موقع پا کر وہ دوبارہ بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک رشتہ دار کے گھر چھپ رہے۔ جس خطبہ کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے اسی میں محمد عبدہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ "یہاں مجھے ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑا جس نے مجھے بتلایا کہ حصول علم کا قریب ترین راستہ کون سا ہے۔ یوں مجھے تحصیل علم سے شغف پیدا ہوا اور میں علم کی چاشنی سے پہلی بار لذت گیر ہوا۔ اسی کے بعد سے میں ثابت قدمی کے ساتھ تلاش علم کے راستہ پر جادہ پیما ہوا"۔

یہ صاحب جن کا حوالہ محمد عبدہ نے اپنے خطبہ میں دیا ہے اور جنہوں نے ان کے سینہ میں علم اور مذہبیت کا چراغ روشن کیا ان کے ایک چچا شیخ درویش قادر تھے۔ یہی صاحب ان کے حقیقی معلم تھے اور انہیں نے اس طفل گریز پا کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ یہ بزرگ لیبیا (۱۸۷۰ء) کے ریگستان کا سفر کیے ہوئے تھے بلکہ طرابلس تک ہو آئے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک صوفی بزرگ

سید محمد المدنی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا اور صوفیوں کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ حافظ قرآن بھی تھے اور قرأت میں بھی بہت کچھ مہارت رکھتے تھے۔ جس روز محمد عبدہ اُس گاؤں میں وارد ہوئے اسی روز صبح کو ان کے بیان کے مطابق شیخ درویش ان سے ملنے آئے۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک کتاب لیے ہوئے تھے جس میں وہ تمام روحانی اور اخلاقی ہدایات درج تھیں جن پر اُس حلقہ صوفیا کے شرکا رعامل تھے۔ انہوں نے محمد عبدہ سے اس کتاب کے بعض حصوں کو سنانے کی فرمائش کی۔ مگر یہ تو کتابوں سے پہلے ہی بیزار بیٹھے تھے کتاب لے کر زمین پر پٹک دی۔ شیخ نے دوبارہ سہ بارہ منت و سماجت سے اپنی فرمائش کا اعادہ کیا۔ آخر کہاں تک اثر نہ ہوتا غیرت کے مارے کتاب اٹھا کر محمد عبدہ نے اس کے چند حصے شیخ کو سنائے۔ شیخ نے ساتھ ہی ساتھ ان حصوں کے معانی و مطالب کی کچھ اس طرح توضیح کی کہ محمد عبدہ کے دل میں علم و مطالعہ سے جو نفرت پیدا ہو گئی تھی اور اپنی فہم و صلاحیت کی نسبت جو شکوک اُن کے دل میں جمے ہوئے تھے سب دور ہو گئے مگر ذرا دیر بعد ہی چند لڑکے کھیل کود کے لیے انہیں بلانے آئے اور وہ کتاب پھینک کر چلتے بنے۔ اسی روز دوپہر کو اور دوسرے روز صبح کو شیخ نے پھر وہی عمل کیا۔ تیسرے روز کتاب پڑھنے میں معمول سے زیادہ وقت صرف ہوا یہاں تک کہ محمد عبدہ کو پڑھنے سے ایسی دلچسپی ہو گئی کہ وہ از خود کتاب پڑھتے گئے اور اُس کے بعض اہم مقامات پر نشان بھی لگائے۔ پانچویں روز کے بعد سے انہیں کھیل کود اور ہر اُس چیز سے جو مطالعہ میں حارج ہوتی تھی اتنی ہی نفرت پیدا ہو گئی جتنی نفرت انہیں پہلے کتابوں سے تھی۔ شیخ نے انہیں صوفیانہ اعمال و عقائد کی تعلیم دی اور پہلی بار فہم قرآن سے روشناس کیا۔ مزید برآں شیخ نے انہیں ایک ایسی صداقت کی تلقین کی جو وحی الٰہی کی طرح اُن کے دل میں اتر گئی اور وہ یہ کہ مسلمان جو نیک عملی اور راست کرداری کی زندگی نہ بسر کرے حقیقت میں مسلمان نہیں ہے۔

پندرہ دن اس طرح مصروف مطالعہ رہنے کے بعد محمد عبدہ اپنے قدیم مدرسہ کو واپس ہوئے۔ لیکن اب ان میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اس قلیل مدت میں جو انھوں نے شیخ کی معیت میں بسر کی وہ صوفیانہ زندگی کے شیدائی بن چکے تھے۔ شیخ کی ملاقات کے آٹھ ہی روز بعد انھوں نے صوفیانہ مجاہدات کی مشق شروع کر دی۔ وہ خود لکھتے ہیں "اِن مجاہدات کو شروع کیے ہوئے آٹھ ہی روز ہوئے تھے کہ میرے قلب وضمیر میں ایک حیرتناک انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ راستہ جو مجھے اتنا تنگ اور دشوار گزار نظر آتا تھا اب میرے لیے کشادہ ہو گیا۔ دنیا کی زندگی جو مجھے اس قدر بھاتی تھی میری نظروں میں حقیر ہو گئی۔ حصول علم کی آرزو اور وصالِ الٰہی کی تڑپ میرے دل میں ہنگامہ زا تھی۔ میرے تمام افکار میری سب پریشانیاں مٹ گئی تھیں۔ صرف ایک فکر صرف ایک اضطراب افزا خیال میرے ذہن ودماغ پر قبضہ کیے ہوئے تھا اور وہ یہ تھا کہ مَیں علم کے کمال اور روحانی تربیت کی پختگی کا درجہ حاصل کر لوں۔ مجھے اس وقت تک کوئی ایسا رہنما میسر نہیں آیا تھا جو مجھے میرے قلبی میلانات کے راستہ پر چلا سکتا بجز اس شیخ کے جو مجھے چند روز کے اندر جہل و بے خبری کے تنگ وتاریک زندان سے علم وآگہی کی وسیع اور کشادہ سرزمین پر لے آیا اور جس نے مجھے تقلید کی بندشوں سے آزاد کر کے صوفیانہ اسرار ورموز سکھا دیئے۔ شیخ مذکور نے میری پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھارا اور میری فطری ودیعتوں کو جگایا جن کے وجود ہی سے مَیں سراسر بے خبر تھا۔

ان تجربات کے ساتھ محمد عبدہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ تصوف سے ان کی دلچسپی رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ اُن کی زندگی کا مرکز ومحور بن گئی۔ اور شیخ نے ان کی ہدایت ورہبری کا پورا پورا حق ادا کیا۔

اگر یہ اثرات جاری رہتے تو محمد عبدہ کی مستقل زندگی دنیا سے دور گوشہ نشینی اور عزلت میں گزر جاتی اور ان کے عملی اور علمی کارنامے جن پر ان کی شہرت وعظمت کا دارومدار ہے پردہ عدم سے عالم وجود

میں نہ آتے لیکن بہت جلد انہیں علامہ جمال الدین افغانی سے سابقہ پڑا جنہوں نے اس جذب و انہماک اور خود فراموشی کے عالم سے نکال کر انہیں عملی زندگی کے راستہ پہ قدم زن کیا۔

طالب علمی کی زندگی ۱۸۶۵ء تا ۱۸۷۷ء | اکتوبر ۱۸۶۵ء میں شیخ درویش سے اس یادگار ملاقات کے بعد محمد عبدہ طنطہ واپس ہوئے۔ جہاں انہوں نے دو معلموں کے تحت تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ان کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی جب انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کی گذشتہ بد ذوقی اور دماغی کاہلی پوری طرح دور ہو گئی ہے اور استاد جو کچھ پڑھاتے ہیں وہ اس کو بخوبی سمجھ رہے ہیں۔ جب دوسرے لڑکوں کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ پروانوں کی طرح محمد عبدہ کے گرد جمع ہونے لگے تاکہ ان کی قابلیت اور صلاحیت فہم سے فائدہ اُٹھائیں۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اُن کے دل میں جامعہ ازھر کی شرکت کا شوق پیدا ہوا اور فروری ۱۸۶۶ء میں انہوں نے اپنے قدیم مدرسہ کو الوداع کہا اور کچھ عرصہ بعد جامعہ ازھر میں شریک ہو گئے۔

سلطان ابو تمیم معز کے جنرل جوہر نے مصر کی فتح اور نئے دارالخلافہ قاھرہ کی تعمیر کے بعد ۹۷۰ء میں مسجد الازھر تعمیر کروائی تھی وقتاً فوقتاً فاطمیہ سلاطین نے اس مسجد کی توسیع کی اور اس میں ایک مدرسہ بھی تعمیر کیا۔ جب مغل حملہ آوروں کے سیلاب نے مشرق میں علوم و فنون کے بڑے بڑے مرکزوں کو تاراج کر دیا اور مغرب میں اسلامی سلطنت زوال پذیر ہو گئی تو دنیائے اسلام میں ازھر کے مدرسہ کا نام اور بھی چمکا اور صدیوں تک یہ مدرسہ اسلامی علوم و فنون کا مرکز بنا رہا اور اسلامی ممالک کے ہر گوشہ سے اس نے تشنگان علم کو کشاں کشاں کھینچ بلایا۔

ازھر کا مدرسہ جامعہ ازھر کے نام سے موسوم ہے کیونکہ قریب قریب جملہ اسلامی علوم کی تعلیم یہاں دی جاتی ہے لیکن مغرب میں لفظ جامعہ جن معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے ان معنوں میں مدرسہ ازھر پر لفظ جامعہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے۔ اس میں جو کچھ تعلیم دی جاتی ہے وہ سراسر مذہبی ہے فہم قرآن کی صلاحیت اور اسلامی عقائد و اعمال سے واقفیت علوم کی قدر و قیمت کا پیمانہ ہے۔ روایت

پرستی کی روح صدیوں سے جامعہ ازھر کی تعلیمی کوششوں میں جاری وساری ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ علمی تحقیقات اور چھان بین کے ذریعہ علوم کو ترقی دی جائے تعلیم کا کام بس اتنا ہے کہ اس کے ذریعہ قدماء کا ذہنی سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہے اور وہ بھی بجنسہ اسی حالت میں جس میں کہ وہ ہر نسل کو ملتا رہا ہے۔ آزادانہ تحقیق اور غیر پابند قوت فیصلہ کی نشوونما کا دروازہ تیسری صدی ہجری سے بند ہے۔ اس لیے مذہب کے مستند شارحین صرف ماضی کے دور دراز گوشوں میں ملتے ہیں اور متاخرین کے لیے صرف یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ قدماء کے علمی سرمایہ کی شرح کیا کریں۔

جامعہ ازھر میں مختلف علوم وفنون کو جو اضافی اہمیت حاصل ہے اس سے بھی روایت پرستی صاف عیاں ہے۔ سب سے زیادہ اہمیت علوم نقلیہ کو حاصل تھی۔ یہ علوم حسب ذیل ہیں:-

علم الکلام۔ علم التوحید۔ تفسیر۔ حدیث۔ علم فقہ اور اصول فقہ اس کے بعد علوم عقلی کا درجہ تھا اور وہ علوم یہ ہیں:- علم صرف ونحو۔ علم عروض۔ علم البلاغت۔ علم المعانی والبیان۔ علم منطق اور علم ہیئت۔ اساتذہ اپنے طالب علموں کو جو ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے کسی ایسے مصنف کی کتاب پر لکچر دیتے تھے جو مضمون زیر بحث کا مسلّم الثبوت استاد تسلیم کیا جاتا ہو۔ لیکن طلباء کے پاس کوئی درسی کتاب نہیں ہوتی تھی۔ طالب علم کا کام یہ تھا کہ وہ مابعد کے شارحین کی کوئی شرح جو اس کتاب پر لکھی گئی ہو زبانی یاد کرے اور جو طالب علم اس طرح کتاب کی شرح حفظ کر لیتا تھا اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ اس مضمون پر حاوی ہو گیا ہے۔

وقتاً فوقتاً جامعہ ازھر کے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی کوششیں کی گئیں لیکن کامیابی بہت کم نصیب ہوئی۔ محمد علی پاشا اگرچہ خود ناخواندہ تھا لیکن مغربی علوم کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس نے مصر میں ان علوم کی اشاعت کی جانب کچھ توجہ بھی کی تھی۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں اس نے ایک تعلیمی مشن پیرس بھیجا تاکہ وہاں سے تربیت حاصل کرنے کے بعد اساتذہ ان علوم کی اشاعت مصر

میں کریں۔ مغربی علوم کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی عربی زبان میں کیا گیا۔ ان کتابوں میں زیادہ تر کتابیں فرانسیسی زبان کی تھیں لیکن ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ ازھر کے اساتذہ اور متعلمین کی مخالفت مول لینا پڑی۔

تاہم اس زمانہ میں (۱۸۲۶ء) شیخ الطنطاوی نے جو بعد میں سینٹ پیٹرس برگ میں عربی زبان کے معلم مقرر ہوئے الحریری کی کتاب 'مقامات' پر لکچر دینا شروع کیے۔ جو نہ صرف نہایت دقیق معانی اور مغلق الفاظ سے پُر ہے بلکہ اپنے حریت نواز خیالات کی وجہ سے بھی ممتاز ہے۔ اس قسم کے لکچر اس سے پہلے کبھی نہیں دیئے گئے تھے۔

جامعہ ازھر میں محمد عبدُہ کی شرکت کے تھوڑے عرصہ بعد ہی خدیو اسمٰعیل نے مصر کو مغربانے (WESTERNIZE) کے شوق میں جامعہ ازھر کی اصلاح کے لیے کوششیں شروع کیں۔ اس کام میں خدیو اسمٰعیل کو شیخ محمد العباسی المھدی کی تائید بھی حاصل تھی جو اس زمانہ میں جامعہ ازھر کے شیخ تھے اور جن کا شمار اکابر علماء میں ہوتا تھا۔ جامعہ کے نظم ونسق اور نصاب میں متعدد اصلاحیں کی گئیں جن میں سب سے اہم اصلاح یہ تھی کہ امتحان کا طریقہ رائج کیا گیا کیونکہ اس سے پہلے طلباء کو کسی قسم کا امتحان نہیں دینا پڑتا تھا۔ لیکن ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پرستوں نے شیخ الیش کی سرکردگی میں اس تحریک کی مخالفت میں آسمان و زمین ایک کر دیئے۔ اس لیے جب ۱۸۶۶ء میں محمد عبدُہ جامعہ ازھر میں شریک ہوئے تو اصلاحی تحریک کمزور پڑ چکی تھی اگرچہ شیخ حسن الطاویل منطق اور فلسفہ پر لکچر دے رہے تھے۔

جس وقت محمد عبدُہ نے جامعہ ازھر کی چار دیواری میں قدم رکھا تو شاید ان کی شکل وصورت اور گفتار میں کوئی نمایاں خصوصیت ایسی نہ تھی جس کی وجہ سے وہ ازھر کے اساتذہ کی نظروں میں اُن سینکڑوں ہزاروں طلباء سے ممتاز ہوتے جو اطراف ملک سے اس مرکز علم میں جمع ہوتے تھے۔

لیکن بہت جلد ان کی فطری استعداد، جودت طبع اور ان کی آزاد اور غیر پابند قوت فیصلہ نے انہیں دوسرے طلبار سے ممتاز کر دیا۔ چار سال تک جامعہ کے مقررہ نصاب کی انہوں نے تکمیل کی اور مختلف درسوں میں پابندی کے ساتھ حاضر رہے۔ ان کی بے قرار طبیعت نے انہیں ایسے درسوں میں شرکت کرنے سے باز رکھا جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے وہ ایسی جماعتوں سے غائب رہتے تھے جن میں شریک ہونے سے انہیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ ان اوقات میں وہ اپنا وقت مطالعہ کتب میں گزارتے تھے۔ اسی زمانہ میں وہ جامعہ ازھر کے کتب خانہ میں ایسے مضامین کی کتابوں کی تلاش میں مصروف تھے جن کی تعلیم ازھر میں نہیں ہوتی تھی۔

ان کے قدیم معلّم اور روحانی پیشوا شیخ درویش انہیں منطق ریاضی اور اقلیدس جیسے مضامین کے مطالعہ کا شوق دلاتے رہتے تھے اور انہیں اس کی پرواہ نہ تھی کہ ان علوم کے حصول کے لیے محمد عبدہ کو ازھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا پڑے گا۔ ایک معلّم جن سے انہوں نے اس زمانہ میں مدد لی تھی شیخ البیسونی تھے۔ اس کے بعد انہوں نے شیخ حسن اناویل سے جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے منطق اور فلسفہ کے درس لیے۔ لیکن شیخ حسن بھی ان کے دل کی پیاس نہ بجھا سکے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ شیخ کا طریقہ تفہیم دل نشین اور واضح نہیں ہے بلکہ ان کی تشریح و توضیح کا دارمدار تمام تر قیاسات اور مفروضات پر ہے۔ محمد عبدہ اس وقت تک کسی مضمون کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ وہ اس پر پوری طرح سے حاوی نہیں ہو جاتے تھے اور آخر آخر میں تو ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ کسی مضمون کو ایک مرتبہ سمجھ لینے کے بعد اس وقت تک اس کے مشتملات پر یقین نہیں کرتے تھے جب تک اس کی موافقت میں کافی ثبوت فراہم نہ ہو جاتا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد جب وہ عملی زندگی بسر کر رہے تھے تو انہوں نے کئی بار اس کا اظہار کیا کہ ازھر کے طریقہ تعلیم کے مطابق عربی کتب کا مطالعہ کرنے سے ان کے ذہن و دماغ کو سخت نقصان پہنچا ہے اور باوجود اس کوشش

کے کہ اپنے ذہن سے اس طریقہ تعلیم کے اثرات کو دفع کر دیں انہیں اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔

جس وقت محمد عبدہ جامعہ ازھر میں داخل ہوئے وہ صوفیانہ افکار و عقائد کے زیر تسلط تھے دن کے وقت باوجود اپنے تعلیمی فرائض کے وہ روزہ رکھتے تھے رات رات بھر نمازیں پڑھتے اور کلام مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ کپڑے بھی وہ نہایت معمولی اور نا ملائم قسم کے پہنتے تھے۔ آنکھیں نیچی کیے ہوئے راستہ چلتے تھے اور کسی سے اس وقت تک بات نہیں کرتے تھے جب تک کہ شدید ضرورت نہ پیش آجاتی۔ آخر کار مراقبہ، مطالعہ، ضبط نفس، غرضکہ رہبانیت اور تقشف کے جملہ لوازم میں انہیں ایسا غیر معمولی انہماک پیدا ہو گیا کہ بعض اوقات عالم محسوسات سے پرے وہ فکر و خیال کی ایسی دنیا میں پہنچ جاتے تھے جہاں بقول ان کے وہ گزشتہ زمانہ کی ارواح سے گفتگو کیا کرتے تھے۔

بالآخر وہ صوفیانہ جذب، انہماک اور انقطاع علائق کے ایسے مرتبہ پر پہنچ گئے کہ ان کے معلم اور روحانی پیشوا شیخ درویش کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ انہیں انسانوں کی طبعی زندگی کی طرف پھر کھینچ بلائیں چنانچہ شیخ نے انہیں بتایا کہ ان کا سارا علم بیکار ہو جائے گا اگر اس کی مدد سے انہوں نے خود اپنی اور اپنے ہم قوموں کی صحیح رہنمائی نہ کی۔ شیخ نے انہیں یہ بھی سمجھایا کہ اگر وہ اپنے علم و فضل سے اپنے ہم مذہبوں کو فائدہ پہنچانا اور انہیں مذہب کی سچی پیروی کرنے کے قابل بنانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ ان میں گھل مل کر زندگی بسر کریں۔ شیخ نے انہیں ایسے جلسوں اور مجمعوں میں پہنچانا شروع کیا جہاں لوگ ان سے گفتگو کرتے تھے اور مختلف مضامین پر بحث و مباحثہ میں انہیں شریک ہونا پڑتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ شیخ نے انہیں پھر ایک بار حقیقی زندگی سے روشناس کیا۔

لیکن حقیقتاً جس شخص نے انہیں بالآخر صوفیانہ استغراق سے نکال کر عملی زندگی کے قابل بنایا وہ سید جمال الدین افغانی تھے۔ اگرچہ تصوف کا ذوق و میلان آخر عمر تک محمد عبدہ کا رفیق رہا چنانچہ ان کی کتاب رسالات الواردات میں جو ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی تھی صوفیانہ تجربات اور تصوف کے مطالع

کے اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جمال الدین افغانی کی صحبت ہی نے انہیں دنیائے عمل کی طرف پھر رغبت دلائی اور انہیں کے اثر سے انہوں نے اپنی کشتی کو زندگی کے بحر مواج اور اس کے تھپیڑوں اور طوفانوں کے سپرد کیا۔ رسالات الواردات کی تمہید میں وہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ان کے دل میں علم کی لگن پیدا ہوئی اور سید جمال الدین کی آمد سے قبل کس طرح وہ اس راہ میں بے نیل و مرام جادہ پیمائی کر رہے تھے۔ انہیں علم کی تلاش تھی لیکن منزل مقصود کا سراغ دینے والا کوئی نہ تھا۔ جب وہ کسی عالم سے مدد طلب کرتے تھے تو انہیں جواب ملتا تھا کہ اس قسم کے مضامین کا مطالعہ بالکل ناجائز ہے۔ وہ لکھتے ہیں "جب میں نے اس کی وجہ سوچی تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب کوئی شخص کسی چیز سے ناواقف ہوتا ہے تو اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے"۔ محمد عبدہ علم کی تلاش میں اسی طرح حیران و سرگشتہ تھے کہ دفعتاً ان کے قول کے مطابق سچائی کا وہ سورج طلوع ہوا جس کی روشنی میں ان کی علمی کاوشوں کو سکون کا آغوش میسّر آیا اور انہیں ایک ایسی دنیا کا نظارہ حاصل ہوا جس میں ان کے ذوقِ تصوف کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ جمال الدین خود صوفی تھے اور راہ طریقت کے سالک رہ چکے تھے۔ محمد عبدہ سے کہیں زیادہ ان تمام تجربات و کیفیات کا علم رکھتے تھے جن سے صوفیوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس لیے محمد عبدہ کو اپنے صوفیانہ کمالات کا قائل بنانے میں ان کو چنداں دقت نہ ہوئی اور انہوں نے بہت جلد محمد عبدہ کو تصوف کی فسوں کاریوں اور سحر طرازیوں سے چھڑا لیا حالانکہ اس عالم میں داخل ہونے کے بعد بہت کم ایسے ہیں جو پھر حقائق کی دنیا میں واپس ہوئے ہوں۔ جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی پہلی ملاقات میں تصوف ہی پر بحث کی ابتدا ہوئی۔ قاہرہ میں سید جمال الدین افغانی کی آمد کے بعد[1] محمد عبدہ شیخ حسن الطاویل کے ساتھ ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ اس وقت وہ کھانا کھا رہے تھے۔ بسلسلہ گفتگو میں جمال الدین افغانی

---

[1] یہ ۱۸۶۹ء کا واقعہ ہے۔

نے یہ بحث چھیڑی کہ کلام مجید کی بعض آیات کا مفہوم علماء کے نزدیک کچھ ہے اور صوفیاء کے نزدیک کچھ۔ غرضکہ موضوع بحث تفسیر اور تصوف کا تقابل تھا اور یہی بحث محمد عبدُہ کی دلچسپی کا مرکز بنی معلوم ہوتا ہے کہ جمال الدین اپنی گہری بصیرت کی بنا پر محمد عبدُہ کے ذوق ومیلان کو تاڑ گئے اسی لیے اس نوجوان طالب علم کو انھوں نے اتنی آسانی سے اپنا متبع بنا لیا۔

جب ڈیڑھ سال بعد جمال الدین افغانی قسطنطنیہ سے واپس ہوئے تو محمد عبدُہ باقاعدہ طور سے ان کی علمی مجلسوں میں شرکت کرنے لگے اور سایہ کی طرح ان کے پیچھے پیچھے رہنے لگے۔ ان کا ذوق وشوق رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھا کہ انھوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں کو ان مجالس میں شرکت کی دعوت دی جو جمال الدین افغانی کی قیام گاہ پر منعقد ہوتی تھیں۔ جہاں نہ صرف وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسے ایسے قدماء کی کتابوں کو پڑھتے اور اُن پر بحث مباحثہ کرتے تھے جن کو زمانہ نے فراموش کر دیا تھا بلکہ اپنی طلاقت لسانی اور شیریں کلامی سے ہر کس وناکس کو مسحور کر دیتے تھے۔ ان کے فیضانِ علم سے کوئی شخص محروم نہ جاتا تھا خواہ وہ علم کا جویا ہو یا جہل کا پُتلا۔ عربی کتب کی تفہیم کا طریقہ جسے علّامہ جمال الدین افغانی نے اختیار کیا تھا ازہر کے طریقۂ تفہیم سے بہت مختلف تھا۔ کبھی تو وہ کسی موضوع بحث کی توضیح ایسے صاف سیدھے طریقہ سے کرتے تھے کہ وہ سُننے والے کے ذہن نشین ہو جاتا یا پھر وہ کتاب لے کر اس میں سے کوئی متعلقہ اقتباس پڑھتے تھے اور بتاتے تھے کہ وہ موضوع زیر بحث پر کہاں تک منطبق ہو سکتا ہے۔ اور کبھی وہ کتاب کا کوئی حصہ پڑھ کر سُناتے تھے اور اس کی مخالفت اور موافقت میں دلائل پیش کرتے تھے اور بالآخر ثابت کرتے تھے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ غلط ہے یا صحیح ہے پھر وہ اپنی ذاتی رائے سے بھی آگاہ کرتے تھے۔ یہ بات ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی کہ کتاب صرف سمجھ لی جائے اور مُصنّف کی رائے یا فیصلہ سے اتفاق کر لیا جائے۔ قدماء کی کتابوں پر لکچر ختم کر چکنے اور ان میں ایک نئی روح پھونک دینے کے بعد وہ اپنے شاگردوں

کو مختلف علوم کی ان کتابوں سے روشناس کراتے تھے جن کا ترجمہ عربی زبان میں ہو چکا تھا۔ اس طرح سے محمد عبدہ پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوا یعنی مغربی علوم و فنون کی دنیا کا۔ یہ چیز اُن کی زندگی کے لیے اُس آزاد خیالی کے اثرات سے کچھ کم فیصلہ کن نہ تھی جس کا مظاہرہ علاّمہ جمال الدین اس وقت کرتے تھے جب وہ قدماء کے دلائل و افکار پر تنقید شروع کرتے تھے۔ علاّمہ موصوف نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو ادبی سیاسی اور عمرانی موضوعوں پر اخباری مضامین لکھنا سکھایا اور ساتھ ساتھ ان کی تقریری صلاحیتوں کو بھی ابھارا۔ کچھ عرصہ بعد محمد عبدہ مقرر کی حیثیت سے اپنے استاد پر بھی گوے سبقت لے گئے کیونکہ عربی ان کی پیدائشی زبان تھی اور علاّمہ کے لیے یہ علم و فضل وہ ایک اکتسابی شے تھی محمد عبدہ نے علاّمہ کی دو تقریروں کا خلاصہ ہم تک پہنچایا ہے۔ پہلی تقریر فلسفۂ تعلیم پر ہے۔ اس تقریر میں وہ اخلاقی صحت کو جسمانی صحت سے مشابہ قرار دیتے ہیں جس طرح جسم کی صحت کا دارو مدار متضاد اور متصادم میلانات و عناصر کے صحیح توازن پر ہے اس طرح کہ کوئی عنصر یا میلان دوسرے سے قوی تر نہ ہو جائے۔ اسی طرح اخلاقی حالت کی درستگی بھی اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جبکہ دو متضاد میلانات میں توازن پیدا ہو جائے مثلاً خوف اور جرأت سخاوت اور بخالت۔ اگر ان دو صفات میں سے کوئی ایک دوسرے پر غالب آجائے تو اخلاقی توازن بگڑ جاتا ہے تعلیم اور ضبط (DISCIPLINE) کا یہی مقصد ہے کہ اخلاقی صفات کو تخریب سے بچایا جائے یا اگر وہ ضائع ہو جائیں تو انہیں پھر بحال کر دیا جائے۔ تزکیہ اخلاق کا کام جن لوگوں کے سپرد ہے وہ روح کے معالج ہیں۔ یہی لوگ معلّم اور اساتذہ کہلاتے ہیں۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اخلاقی صحت کے اصولوں سے واقف ہوں جس طرح حکیم یا ڈاکٹر جسمانی صحت کے اصولوں سے واقفیت رکھتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی قوم اور دیگر اقوام کی تاریخ ان کے عروج و زوال کے ادوار ان کی اخلاقی خرابیوں اور ان خرابیوں کو رفع کرنے کی تدبیروں سے بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ اگر یہ روحانی معالج جہل و لاعلمی

میں مبتلا ہیں تو مریض کا خدا ہی حافظ ہے۔ معالجین کا جہل اور ان کی لاعلمی ہر قسم کے جہل سے بدتر ہے۔ ان معالجوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول خطیب اور مقررین، دوم اہل قلم شعراء اور مصنفین۔

دوسری تقریر میں انسان کے عقلی اور عمرانی ارتقاء کی مختلف منزلوں کے تذکرہ اور منفعت بخش علوم وفنون کی قدر وقیمت اور ان کے نشو وارتقاء کے عمل کو بتلانے کے بعد انہوں نے علوم وفنون اور افراد کے درمیان تعاون کی ضرورت کو ثابت کیا۔ علوم ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں اور خود انسان اپنی معمولی ضروریات تک کے لیے علم وفن کی مدد کا محتاج ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ انسان کو اپنی ضروریات کے لیے علوم وفنون کے نتائج وثمرات کی اعانت درکار ہے وہ کس طرح بالکل خود مختار اور آزاد کہا جا سکتا ہے۔ اسی لیے باہمی تعاون ضروری ہے تاکہ ہر شخص اپنی محنت کا معاوضہ دوسروں کی مشقتوں کے نتائج سے حاصل کر سکے۔ اس طرح انسانی سماج ایک ایسے جسم کی مانند ہے جس کا ہر عضو کل جسم کے فائدہ کی خاطر اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ جو شخص اس باہمی تعاون کی ضرورت پر یقین رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ جسمانی اعضا کی طرح دوسرے کے ساتھ پورے سماج کی خاطر اپنا کام انجام دے۔ جو شخص سماج کا کوئی کام نہیں کرتا ہے وہ ایک عضو مفلوج ہے جو جسمانی حرکت میں حارج ہوتا ہے۔

علامہ افغانی نے اپنے شاگردوں کو صرف تعلیم ہی نہیں دی بلکہ اس سے زائد تر اور کچھ بھی عطا کیا۔ علامہ موصوف کے پیدا کیے ہوئے ادبی احیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جرجی زیدان لکھتا ہے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا علامہ نے ان شاگردوں کے اندر اپنی زندہ پُرجوش اور بے قرار روح پھونک دی تھی انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ تاریکی مٹ چکی ہے اور ہر طرف روشنی پھیلی ہے علم وفضل کے اس فیضان کے علاوہ جس سے ان کے شاگرد متمتع ہوئے تھے انہوں نے علامہ کی مضطرب روح

اپنے اندر جذب کر لی تھی جس نے اُن کی آنکھوں کے سامنے حقیقت و اصلیت بے نقاب کر دی اور اُن کے قلب و ذہن پر باطل تصورات و افکار کے جو پردے پڑے ہوئے تھے سب یک بیک مرتفع ہو گئے انھوں نے قلم ہاتھ میں لیا اور فلسفہ ادب اور سیاسیات کے ہر موضوع پر طبع آزمائی شروع کر دی۔

وہ زمانہ بھی جس میں علامہ جمال الدین نے اپنی شخصیت کے اثر سے ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی ان حالات کے لیے موافق تھا۔ خدیو اسمٰعیل مغربی تصورات و افکار مصر میں اس تیزی سے داخل کر رہا تھا کہ اہل مصر میں ان کے جذب کرنے کی طاقت نہ تھی لیکن ان کوششوں کے نتائج سطحی تھے۔ یعنی تعلیم یافتہ حلقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اُن کا ملک ایک پُرشوکت دورِ ترقی سے گزر رہا ہے اور یہی محسوس کیا جانے لگا کہ یہ تعلیم یافتہ گروہ خود اس حرکت و ترقی کے پیدا کرنے کا محرک ہو رہا ہے۔

حالانکہ خدیو اسمٰعیل کی کوششیں مغربی اقوام کی مداخلت کے لیے راستہ ہموار کر رہی تھیں اور سطحی تبدیلیوں سے ترقی کا دھوکا کھا کر لوگوں کی نظروں سے یہ حقیقت اوجھل ہو گئی تھی۔ یہی چیز علامہ جمال الدین کے مقاصد کے خلاف تھی۔ مغربی مداخلت اور غلبہ کا خوف انہیں ہر وقت لگا رہتا تھا اس آنے والی شب کی تاریکی اسی وقت سے پھیلنا شروع ہو گئی تھی اگرچہ آمدِ شب میں ابھی دیر تھی۔

مستقبل کا ایک ہلکا سا عکس ہمیں محمد عبدہ کے اُن مضامین میں ملتا ہے جو انھوں نے اس زمانہ میں لکھے تھے اور جنہیں محمد عبدالرشید رضا نے ان کی سوانح عمری میں نقل کیا ہے۔ اس میں سے ایک مضمون جس میں مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے قاہرہ کے ایک مشہور اخبار الاہرام میں شائع ہوا تھا۔ اس میں نوجوان محمد عبدہ مصر کی عظمتِ رفتہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مصر کی سلطنت سب سے زیادہ قدیم اور پُرشوکت سلطنت تھی۔ جس وقت دنیا کے دوسرے حصوں میں وحشت و بربریت کا دور دورہ تھا مصر تمدن و تہذیب کے پورے عروج پر تھا۔ بالآخر یہی تمدن مغربی اقوام کی موجودہ عظمت کا بانی مبانی ہوا اور ہماری تہذیب ان قوموں میں منتقل ہو کر اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی ہے لیکن گردش

نیل و نہار سے اب مصر پھر اپنے قدیم رتبہ کے حصول کا آرزومند ہے اور اس کی گذشتہ تمدنی عظمت اب پھر اس کی طرف پلٹ رہی ہے اور یقین ہے کہ دورِ جدید میں اُس کی یہ عظمت اُس حد سے بھی بڑھ جائے گی جہاں آکر وہ تعمیر اہرام کے زمانہ میں رُک گئی تھی اس دور میں انھوں نے جو دوسرے مضامین لکھے تھے ان سے بھی اس حرکت و بیداری کا پتہ چلتا ہے جو مصر میں اُس وقت پیدا ہو رہی تھی۔ ان مضامین میں علامہ جمال الدین کی تعلیم و تربیت کا اثر نمایاں ہے۔

دوسرے مضمون میں فن تحریر پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس فن نے انسان کی تہذیبی اور تمدنی ترقی میں کیا حصہ لیا ہے اور آخر میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس فن کے ذریعہ اخباروں اور رسالوں کو مذہبی اور سیاسی معاملات میں قوم کی صحیح رہنمائی کرنا چاہیے۔ تیسرا مضمون انسانی اور روحانی قائدین پر ہے۔ انسانی قائد سے مراد آدمی کی جسمانی حالت ہے جس کا تعلق اس کی جسمانی فلاح سے ہے۔ روحانی قائد سے مراد اس کے ذہن و عقل کی قوتیں ہیں جو مشکل اور پیچیدہ مسائل کو حل کرتی ہیں اور انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اُبھارتی ہیں۔ اس طرح آدمیوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو صرف حیوانی اور مادی زندگی پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو عقل و دانش کو اپنا رہنما بنا لیتے ہیں جوں جوں انسان مادی اور حیوانی زندگی کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے اور عقل و دانش کی راہ پر آگے بڑھتا جاتا ہے وہ انصاف کا طالب، علم کا جویا اور دلائل کا متلاشی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک تو مضمون میں فلسفیانہ اور اخلاقی رنگ غالب ہے لیکن آخری حصہ میں یہ رنگ بالکل بدل گیا ہے بعض لوگ ایسے ہیں جو صرف نام کو عقل کا اتباع کرتے ہیں۔ یہ لوگ دلیل اور سند کے بغیر اپنے عقائد پر اڑے رہتے ہیں اور فلسفہ کی تعلیم کو کفر سمجھتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو ملک کی موجودہ خراب حالت پر اور غیر ممالک کے بے جا تسلط و اقتدار پر مسرور و مطمئن ہیں۔ یہ انسانیت کا ادنیٰ ترین درجہ بلکہ حیوانیت کی سطح ہے اس کے برخلاف ہمیں دشمن کے سامنے متحد ہو جانا چاہیے اور اپنی فرقہ بندیوں کو فراموش کر دینا چاہیے

مصریوں کی حالت اُن بھائیوں کی سی ہونی چاہیے جو آپس میں تو لڑتے ہیں مگر جب کسی دشمن سے مقابلہ آن پڑتا ہے تو باہمی جھگڑوں کا خیال تک دل میں نہیں لاتے ہیں ۔

چوتھا مضمون دینیات اور علوم جدیدہ پر ہے ۔ اس میں ازہر کے ایک طالب علم کی مثال دی گئی ہے (یہ مثال خود محمد عبدہ کی تعلیمی زندگی سے مشابہ ہے) یہ طالب علم منطق اور دینیات کا مطالعہ کرتا ہے ۔ اگرچہ علوم عقلی مثلاً منطق فلسفہ وغیرہ کے حصول کی غرض یہ ہے کہ وہ مذہب کے سمجھنے میں مدد دیں لیکن اس لڑکے کے دوستوں اور عزیزوں نے ان علوم کے مطالعہ سے اس کو منع کیا اور اُس کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں یہاں تک کہ اُس کے والد کو قاہرہ بلوا بھیجا اور لڑکے کا باپ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوا جب تک کہ اس نے یہ حلف نہیں اُٹھا لیا کہ اس کا ایمان صحیح و سلامت ہے اور اس کا وعدہ نہیں کر لیا کہ آئندہ سے وہ ان علوم کا مطالعہ بالکل ترک کر دے گا ۔ حالانکہ پوری اسلامی دنیا میں ان علوم کی تعلیم ہوتی ہے اور غزالی جیسے پابند شریعت نے ان علوم کے حصول کو فرضِ عین قرار دیا ہے ۔ اور دوسرے علماء بھی ان علوم کی تحصیل کو فرض کفایہ قرار دیتے ہیں ان کا مطالعہ اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ ان کی مدد سے ہم مذہب کی حمایت کر سکتے ہیں اگر ان علوم کی نسبت ہمارا طرز عمل یہ ہے تو اُن جدید علوم کے متعلق ہمارا رویّہ کیا ہوگا جن کی ضرورت کا احساس روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے ۔ پھر موجودہ حالت میں جبکہ ہمیں متمدن اور ترقی یافتہ اقوام سے سابقہ پڑ رہا ہے اور خود خدیو اسمٰعیل علوم جدیدہ کی اشاعت میں ہمہ تن منہمک ہیں ان علوم سے ہماری بیگانگی اور بھی زیادہ مضرت رساں ثابت ہوگی ۔

اس کے بعد علماء کا تذکرہ آتا ہے ۔ علمائے اسلام اُمتِ مُسلمہ کے رہنما ہیں لیکن اب تک علوم جدیدہ سے بے بہرہ ہیں ۔ وہ ایسے علمی اشغال میں مصروف رہتے ہیں جن کا موجودہ حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ وہ اس بات کو نہیں دیکھتے ہیں کہ دنیا بہت بدل گئی ہے ۔ زمانہ کا رجحان دین و

مذہب اور اس کی صدیوں کی قائم شدہ عزت و آبرو کے ساتھ ایک ایسے بے برگ و گیاہ صحرا میں لے آیا ہے جو غراتے ہوئے شیروں اور تلملاتے ہوئے بھیڑیوں سے بھرا پڑا ہے جن میں سے ہر ایک شکار کی جستجو میں اِدھر اُدھر دوڑا پھرتا ہے اگر ہم بھی ان شیروں اور بھیڑیوں جیسے ہوجائیں تب تو ہم اپنے مذہب اور اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکتے ہیں ورنہ ہم جہالت کے شکار ہوجائیں گے۔ ہم کو اپنے پاس پڑوس کی قوموں اور ان کے مذہب و تمدن کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ان کی ترقیوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے ان قوموں کے عروج و ارتقاء کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان میں تعلیم کی روشنی پھیلی ہے اور وہ علوم و فنون کی عطا کی ہوئی قوتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جس طرح بن پڑے ان علوم کو حاصل کریں اور ملک میں ان کی اشاعت کریں۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے اُن اثرات کا صاف پتہ چلتا ہے جو اس زمانہ میں محمد عبدہ کے خیالات و افکار کی تشکیل میں حصے رہے تھے اور جن کی وجہ سے بعد میں انہیں ایک مصلح قوم کا مرتبہ حاصل ہوا۔ ان مضامین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعمری میں وہ علامہ جمال الدین افغانی کے افکار و نظریات سے متاثر ہوچکے تھے اور خارجی دنیا سے ان کی بے تعلقی اور بیگانگی جس میں انہوں نے اپنی طالب علمی کا ابتدائی زمانہ بسر کیا تھا اب بالکل دور ہوگئی تھی۔

ان کے افکار و خیالات کے اس تدریجی ارتقاء کی جھلک ہمیں اُن کی دو تصنیفوں میں بھی نظر آتی ہے جو اس زمانہ میں شائع ہوئی تھیں۔ پہلی تصنیف الواردات ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی۔ بقول پروفیسر ہارٹن (PROF. HORTEN) یہ تصنیف جوش و خلوص اور فلسفہ آرائی سے لبریز ہے۔ ازہر کی تعلیم ابتدائے طالب علمی کے صوفیانہ تجربات اور جمال الدین افغانی کی صحبت و رفاقت سب کے سب اس تصنیف میں منعکس نظر آتے ہیں۔

ان کا فلسفیانہ طرزِ فکر اور تجدد پسندی خصوصیت کے ساتھ اس تبدیلی پر گواہ ہے جو علامہ جمال الدین

افغانی کی رفاقت نے ان میں پیدا کردی تھی۔ تمہید میں وہ لکھتے ہیں کہ میں علم العقائد اور علم الکلام سے بیزار ہو چکا ہوں اور فرقہ بندی کے شکنجہ سے میں نے آزادی حاصل کرلی ہے۔ تاکہ ہر قسم کی قید اور طرح کی پابندی سے مجبور ہوئے بغیر شاہدِ علم کی جستجو کرسکوں۔ اس کتاب میں ان کے خیالات پر تصوف کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ اُن کے ذہن پر وجودیت (PANTHEISM) کا تسلّط بھی صاف نظر آتا ہے۔ صوفیا کی طرح وہ بھی اِس اعتقاد پر زور دیتے ہیں کہ حقیقی وجود صرف خداوند تعالیٰ کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں" خداوند تعالیٰ کے وجود کے سوا اور کوئی وجود حقیقی نہیں ہے اور نہ اس کی صفات کے علاوہ اور کوئی صفت وجود رکھتا ہے۔ اس لیے وجود اگر ہے تو بس اسی کا ہے باقی جو کچھ ہے عدمِ محض ہے" ہارٹن لکھتا ہے" بعض امور میں مثلاً خداوند تعالیٰ کی صفات کی نسبت ان کا یقین پختگی کو نہیں پہنچا ہے اور کہیں کہیں شک اور تذبذب کا چہرہ صاف نظر آجاتا ہے"۔

محمد عبدہ کی دوسری تصنیف جو ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی ایک جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب " العقائد العدودیہ" کی ایک[1] مشہور شرح کے مختلف حواشی کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں اُن اختلافات سے بحث کی گئی ہے جو مختلف فرقوں کے علماء میں مذہب کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں اس میں بتلایا گیا ہے کہ یہ اختلافات کہاں تک جزوی اور فروعی ہیں اور کس حد تک بنیادی اور اصولی۔ اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ان اختلافات کو مٹا کر ایسے عقائد و افکار کی تبلیغ کی جائے جو ہر فرقہ کے نزدیک قابل قبول ہوں۔

یہ موضوع تھا جسے اب محمد عبدہ نے اپنی تصنیف کے لیے منتخب کیا تھا۔ دو سال پہلے جو کتاب انہوں نے لکھی تھی وہ تصوف سے لبریز تھی۔ نئے موضوع سے اُس تبدیلی کا پتہ چلتا ہے جو اُن کی زندگی میں واقع ہوئی تھی۔ وہ خیالات جو اس کتاب میں ظاہر کیے گئے ہیں خصوصیت کے

---

[1] یہ کتاب علامہ جلال الدین الدوانی کی تصنیف ہے۔

ساتھ اس انقلابِ حال کا ثبوت دیتے ہیں۔ کتاب کی ابتدا اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد میری امت بہتّر فرقوں میں منقسم ہو جائے گی اور بجز ایک فرقہ کے باقی سب فرقے دوزخی ہوں گے۔ اس حدیث سے محمد عبدہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مختلف اسلامی فرقوں کو بڑی رواداری سے کام کرنا چاہیے۔ کیونکہ کوئی فرقہ تیقّن کے ساتھ اس کا مدّعی نہیں ہو سکتا ہے کہ وہی نجات یافتہ ہے۔

ایک اور اہم نتیجہ وہ اس حدیث سے یہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ عقل ہی وہ رہنما ہے جو صداقت تک رہبری کر سکتی ہے۔

اس طویل دور میں محمد عبدہ کے علم میں نمایاں ترقی ہوئی اور ان کا نقطہ نظر وسیع تر ہو گیا۔ اب ان کی مصروفیتیں اور دلچسپیاں بھی فکر و خیال کی دنیا سے نکل کر عملی جدوجہد پر مرتکز ہو گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وقت زیادہ تر کتب خانہ ازھر کی کتابوں کی چھان بین میں صرف ہوتا تھا۔ اور اُن کو جامعہ کے لکچروں کی زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ محمد عبدہ اور علّامہ جمال الدین افغانی کے خلاف جامعہ کے اساتذہ اور معلّمین میں کافی برہمی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی علّامہ موصوف کی تجدد پسندی کو اور علمِ فلسفہ کے احیاء کے لیے اُن کی سرگرم مساعی کو جامعہ کے قدامت پسند اساتذہ اور معلّمین اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے لیکن سید جمال الدین افغانی سے ان کی نفرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ محمد عبدہ کی سرکردگی میں جامعہ ازھر کے طلباء ان کی علمی صحبتوں میں شریک ہو کر جامعہ کی تعلیم سے غفلت کرنے لگے تھے۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ علّامہ کے بتائے ہوئے تحصیلِ علم کے نئے طریقوں سے خود مستفید ہوں۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ازھر کے جو طلباء اُن سے امداد طلب کرنے آئیں انہیں بھی اس اصلاحی جدوجہد میں شریک کر لیں اور حصولِ علم کے نئے طریقوں سے انہیں روشناس کریں۔ محمد عبدہ ان طلباء کے

سامنے وہ مذہبی کتابیں بھی پڑھا کرتے تھے جن کی تعلیم اس زمانہ میں جامعہ ازھر میں نہیں ہوتی تھی۔ اسی قسم کی ایک کتاب "العقائد الرضانیہ" کی شرح تھی جو ان کو خاص طور پر پسند تھی۔ بعض طالب علموں نے شیخ الیش کو جو کہ قدامت پسندوں کے سرگروہ تھے یہ خبر پہنچائی کہ وہ معتزلہ کے عقائد کی اشاعت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ الیش نے ان سے اس حرکت کا جواب طلب کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس چیز نے شیخ کو اتنا برافروختہ کر دیا تھا وہ یہ خیال تھا کہ ایک طالب علم کو یہ جرأت ہو جائے کہ وہ ایک ایسی مشکل کتاب کا درس دینے لگے جس کی تفہیم خود ازھر کے اساتذہ کے لیے خالی از دقت نہ تھی۔ چنانچہ شیخ نے محمد عبدہ سے سوال کیا کیا تم نے اشاعرہ کے عقائد پہ یقین کھو دیا ہے اور فرقہ معتزلہ کے عقائد پر ایمان لے آئے ہو؟ اس کا جو جواب محمد عبدہ نے شیخ کو دیا اس نے شیخ کے غصہ کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ انہوں نے کہا اگر میں نے اشاعرہ کے عقائد وافکار پہ بے سوچے سمجھے ایمان لانا چھوڑ دیا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بغیر کسی ردّ وقدح کے معتزلہ کے عقائد قبول کر لوں۔ اصل یہ ہے کہ میں نے ہر قسم کی جامد تقلید ترک کر دی ہے اور ثبوت ودلائل کے بغیر میں کسی چیز پہ ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

اس واقعہ نے جامعہ ازھر کے علمی حلقوں میں بہت برہمی پیدا کر دی اور اسی کے بعد سے اُن الزامات کی ابتدا ہوتی ہے جو سید جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ پہ بعد میں لگائے گئے۔ اس برہمی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ محمد عبدہ کو درس دینے کی ممانعت کر دی گئی جب مئی ۱۸۷۷ء میں ان کا امتحان ہو رہا تھا تو انہیں پہلی بار محسوس ہوا کہ سب ممتحنین ان کے خلاف ہیں۔ اور انہیں ناکام کر دینے کا عزم کر چکے ہیں۔ لیکن محمد عبدہ نے امتحان میں ایسی غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کیا کہ شیخ محمد العباسی کی حمایت سے ممتحنین کو انہیں کامیاب قرار دینا پڑا اگرچہ انہیں درجہ دوم میں کامیاب لیا گیا جو ان کی اعلےٰ قابلیت کے لحاظ سے

اُن کے لیے اہانت کا باعث تھا۔

جب محمد عبدہ کو جامعہ ازھر سے سندِ علم مل گئی تو انہوں نے ازھر کو خیر باد کہا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ پھر ازھر واپس ہوئے اگرچہ اس مرتبہ وہ معلّم اور استاد کی حیثیت سے ازھر کی چار دیواری میں داخل ہوئے اب ان کی طالب علمی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور یوں تو وہ عمر بھر طالب علمی کرتے رہے جب وہ اپنی زندگی کے آخری منازل طے کر رہے تھے تو انہوں نے ایک مرتبہ کہا کہ "مَیں اب بھی طالب علم ہوں اور ہر روز اپنے علمی سرمایہ میں اضافہ کا خواہشمند رہتا ہوں"۔ اسی جذبہ کے ساتھ انہوں نے جامعہ ازھر میں اپنے نئے عہدہ کا کام شروع کیا اور یہ وہ کام تھا جس کے لیے انہوں نے تمام عمر تیاری کی تھی۔

پبلک لائف کی ابتدا

(۱۸۷۷ء تا ۱۸۸۲ء)

معلم اور اخبار نویس | ایک مرتبہ جب محمد عبدہ پر ایک ایسی خدمت قبول کرنے کے لیے زور ڈالا جا رہا تھا جو ان کے مطبوعِ خاطر نہ تھی تو انہوں نے کہا تھا "میں معلمی کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بنا ہوں"۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ کس طرح آئندہ زندگی میں ہر قسم کے اثر و رسوخ کو جو انہیں حاصل تھا انہوں نے اپنے خیالات کی اشاعت اور عوام الناس میں تعلیم کی روشنی پھیلانے کا ایک واسطہ بنا دیا تھا تو ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اپنے متعلق وہ جو کچھ یقین رکھتے تھے وہ بالکل صحیح و درست تھا۔ اس کے علاوہ ایک مزید محرک جس نے انہیں طالب علمی کے بعد نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر آمادہ کیا تھا ان کی وہ تربیت تھی جو انہوں نے علامہ جمال الدین افغانی کی صحبتوں سے حاصل کی تھی اور قوم و مذہب کی خدمت کا وہ جذبہ تھا جو اس تربیت نے ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ اس لیے جب وہ دوبارہ جامعہ ازہر میں بحیثیت معلم داخل ہوئے تو نہایت گرم جوشی اور سرگرمی سے انہوں نے کام کی ابتدا کی۔ ازہر میں مختلف موضوعوں پر لکچر دینا شروع کیے اور مذہبی علوم کی تدریس میں انہوں نے منطقی استدلال و ثبوت کے وہ تمام طریقے استعمال کیے جو علامہ جمال الدین افغانی کے فیضانِ علم سے ان تک پہنچے تھے اس کے علاوہ گھر پر بھی وہ ان طلباء کے سامنے لکچر دیتے تھے جو ان کے پاس حصولِ علم کی

غرض سے آیا کرتے تھے۔ اُن کے لکچروں کا ایک سلسلہ ابن مسکویہ کی تصنیف تہذیب الاخلاق پر تھا۔ سیاسیات کے لکچروں میں انہوں نے گویزٹ (GUIZOT) کی تصنیف یورپ اور فرانس کی تمدنی تاریخ "(HISTORY OF CIVILIZATION IN EUROPE AND IN FRANCE)" سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا۔ اس کتاب کا ترجمہ اسی زمانہ میں عربی میں ہوا تھا۔

۱۸۷۸ء کے ختم پر ریاض پاشا کے اثر سے محمد عبدُہ کو ایک مدرسہ میں جس کا نام دار العلوم تھا تاریخ کا معلم مقرر کیا گیا۔ اِس مدرسہ کے بانی خدیو اسماعیل کے وزیر تعلیم علی پاشا مبارک تھے۔ جامعہ ازھر کی اصلاح سے مایوسی کے بعد یہ مدرسہ اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ جدید طرز تعلیم کے ذریعہ یہاں سے روشن خیال اور وسیع النظر علماء تعلیم پاکر ملک میں پھیل جائیں۔ ان علوم کے علاوہ جن کی تعلیم جامعہ ازھر میں ہوتی تھی یہاں بعض جدید علوم کی تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ یہاں آتے ہی محمد عبدُہ نے مقدمہ ابن خلدون پر لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس تصنیف کی تعلیم و تدریس ہی اہل مصر کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ محمد عبدُہ نے جو طریقہ تعلیم اختیار کیا وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور اس سے پہلے کانوں میں اس کی بھنک تک نہیں پڑی تھی۔ نوجوان معلم نے اقوام و ملل کے عروج و زوال کے اسباب تمدن و معاشرت کے اصول اور عمرانی زندگی کی تنظیم کی بابت ابن خلدون کے خیالات پر بحث کرتے ہوئے سیاسی معاشرتی اور تمدنی امور کی نسبت اپنے خیالات و نظریات پیش کیے اور ان افکار و نظریات کو اپنے ملک کے حالات پر عملاً منطبق کرکے دکھایا۔

اسی زمانہ میں وہ خدیویہ مدرسۃ الالسنہ میں عربی زبان و ادب کے معلم مقرر ہوئے اور اس عہدہ کا کام ازھر اور دار العلوم میں درس و تدریس کے کام کے ساتھ انجام دیا۔ عربی زبان و ادب کی تعلیم میں ان کی کوشش یہ رہی کہ صدیوں کے رائج شدہ ناقص طرز تعلیم کی اصلاح کریں۔ اپنے تمام

تعلیمی کاموں میں انہوں نے اصلاح کی اسپرٹ کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ ان کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ملک میں نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو جائے جو عربی زبان اور اسلامی علوم کا احیاء کرے اور حکومت مصر کی گمراہیوں کی اصلاح کرے"۔ حکومت مصر کی جانب اس اشارہ سے اہل مصر کی اُس بے چینی کا پتہ چلتا ہے جو اُس زمانہ میں حکومت وقت کے خلاف عام طور سے پھیلی ہوئی تھی اور جس کی وجہ یہ تھی کہ مالیاتی نظام کی درستگی کی کوشش میں مصری حکومت بیرونی اثرات کا شکار ہو رہی تھی۔ محمد عبدہ تعلیم کی اشاعت کو ان حالات کی اصلاح کا مؤثر ترین ذریعہ خیال کرتے تھے۔ ان جماعتوں میں جہاں وہ تعلیم دیتے تھے وہ ایک طرف تو کردار کی مضبوطی اور اخلاق کی درستگی پر خاص طور سے زور دیتے تھے۔ اور دوسری جانب وہ اس ضرورت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے کہ اہل ملک حکومت اور سیاست کے اصولوں کو سمجھیں اور ان میں عملی تربیت حاصل کریں۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ اپنے آئندہ کے کاموں کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

لیکن ان کی تعلیمی کوششوں کا سلسلہ یک بیک منقطع ہو گیا۔ ۲۵ جون ۱۸۷۹ء میں خدیو اسمٰعیل اپنے بیٹے توفیق پاشا کے حق میں تخت سلطنت سے دست بردار ہو گئے۔ توفیق پاشا کی ذات سے اصلاح و تجدد کی جو امیدیں ان کے وعدوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں اب غلط ثابت ہوئیں تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی اُس نے علامہ جمال الدین افغانی کے اخراج کا حکم صادر کیا اور محمد عبدہ کو دار العلوم اور خدیویہ مدرسہ سے ہٹا کر اپنے آبائی قریہ محلات نصر میں گوشہ نشینی اختیار کرنے کا حکم دیا یہ واقعات ستمبر ۱۸۷۹ء میں پیش آئے۔ سید جمال الدین افغانی سے محمد عبدہ کا گہرا تعلق اور مذہب و سیاست میں ان کی وسیع النظری اور آزاد خیالی جو تعلیم و تدریس کے کام میں اُن سے ظاہر ہوئی تھی اُن کی مخالفت کا موجب بن گئی۔

جس وقت یہ کارروائی عمل میں آئی سابق وزیر ریاض پاشا ملک سے باہر تھے۔ جب وہ واپس ہوئے تو ستمبر ۱۸۸۰ء میں انہوں نے محمد عبدہ کو الوقائع المصریہ کا ایک اڈیٹر مقرر کیا۔ یہ رسالہ اُس زمانہ میں حکومت مصر کا سرکاری ترجمان تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد انہیں اس رسالہ کا مدیر خاص مقرر کیا گیا اور یہ اجازت بھی دی گئی کہ وہ اُن اہل قلم حضرات میں سے بھی بعض کو اپنے کام میں شریک کرلیں جنہوں نے علامہ جمال الدین کے زیر تربیت اس کام میں مشق بہم پہنچائی تھی۔ یہ مددگار جنہیں محمد عبدہ کو اپنے ساتھ کام میں شریک کر لینے کی اجازت دی گئی تھی شیخ عبدالکریم سلمان ان کے مدامی رفیق اور شیخ سعد زاغلول تھے جو اس زمانہ میں جامعہ ازہر میں طالب علم تھے اور بعد میں چل کر مصر کی تحریک آزادی کے سب سے بڑے قائد ہوتے تیسرے مددگار شیخ سعید وفا تھے۔

جس زمانہ میں محمد عبدہ الوقائع المصریہ کے مدیر خاص مقرر ہوئے اس وقت یہ رسالہ سرکاری اطلاعات محکمہ جات حکومت کے اعلانات اور مقامی حالات و اخبار کی اشاعت کا ذریعہ تھا۔ نئے مدیر نے فوراً ہی اس کی اصلاح کی اور اس کے دائرہ عمل و اثر کی توسیع کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے شعبہ اشاعت کے لیے ایک معیّن نظام نامہ مرتب کیا اور ریاض پاشا نے اُسے منظوری دے کر نافذ کیا۔ اس کے ذریعہ تمام سرکاری محکمہ جات کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے دفاتر کی جملہ اہم کارروائیوں فیصلہ جات تجاویز اور رائحہ عمل کا خلاصہ تیار کر کے اشاعت کے لیے روانہ کریں۔ مدیر خاص کو اختیار تھا کہ محکمہ جات کی ان ماہانہ کیفیات اور رپورٹوں میں جو چیز قابل اعتراض نظر آئے اس پر تنقید کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری عہدہ دار زیادہ احتیاط اور سرگرمی کے ساتھ اپنا کام انجام دینے لگے کیونکہ مدیر خاص کی تنقیدیں خود حکومت وقت کی نکتہ چینی کے مترادف تھیں۔ اس طرح نظم و نسق میں اصلاح کی ایک نئی راہ کھل گئی۔ مدیر خاص اپنے مددگاروں اور ماتحتوں پر اعلیٰ ادبی معیار کے برقرار رکھنے میں اس درجہ مُصر تھے کہ بعض بعض شرکاء کار اور ماتحت اس ضرورت

سے مجبور ہوکر شبیہ مدرسہ میں شریک ہوگئے ۔ جسے محمد عبدُہ نے مخصوص اسی غرض سے قائم کیا تھا اور جس میں وہ خود تعلیم دیتے تھے ۔

شعبہ اشاعت کے اعلےٰ عہدہ دار کی حیثیت سے محمد عبدُہ کو ملک میں شائع ہونے والے تمام اخبارات پر احتساب و نگرانی کا اختیار حاصل تھا خواہ یہ اخبار مصریوں کے ہاتھوں میں ہوں یا بیرونی اشخاص کے ۔ اگر کسی اخبار میں حکومت کے کسی عہدہ دار پر تنقید کی جاتی یا اُسے موردالزام قرار دیا جاتا تو حکومت تحقیقات کے ذریعہ حقیقت حال معلوم کرتی تھی ۔ اگر تنقید تلخ اور بے بنیاد ہوتی یا الزامات غلط نکلتے تو اخبار کو تنبیہ کی جاتی ۔ باوجود پیہم تنبیہوں کے اگر اخبار کی روش میں تبدیلی نہ ہوتی تو اس کو مسدود کر دیا جاتا تھا ۔ عربی اخباروں کو حکم تھا کہ ان کا ادبی معیار ایک خاص سطح سے نیچے نہ اُترنے پائے اور ایک مرتبہ تو ایک عربی اخبار کو تنبیہ کی گئی کہ ایک معینہ مدت میں وہ اپنا ایڈیٹوریل اسٹاف بدل دے ورنہ اس کو مسدود کر دیا جائے گا ۔ اس طرح سے محمد عبدُہ نے مصر میں ادبی اخبار کی داغ بیل ڈالی ۔

ابتدا ہی سے انہیں تعلیم سے خاص دلچسپی تھی اور ملک کی تعلیمی حالت کی بابت انہوں نے کئی ایک مضامین لکھے جن میں مدارس کے طریقۂ تعلیم نظام العمل اور نصاب پر خوب جی کھول کر تنقیدیں کیں ۔ اور محکمہ تعلیم کو خاص طور پر نشانہ ملامت بنایا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳ مارچ ۱۸۸۱ء میں محکمہ تعلیم کی ایک مجلس اعلیٰ بنائی گئی اور اس مجلس کو مختلف عاملانہ اختیارات تفویض کیے گئے ۔ محمد عبدُہ بھی اس مجلس کے ایک رکن مقرر ہوئے ۔ اُن کو اس مجلس کی ذیلی کمیٹی کا بھی رکن بنایا گیا جس کا قیام اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ وہ مدارس کے تعلیمی پروگرام کی جانچ پڑتال کرے اور اُس کی اصلاح کے لیے تجاویز پیش کرے ۔ محکمہ وقف بھی محمد عبدُہ کے مشوروں سے مستفید ہوتا رہا ۔ اور انہیں دو محکموں پر کیا موقوف تھا قومی زندگی کا کون سا شعبہ اور نظم حکومت

کی کون سی شاخ تھی جو ان کی فیضان بخشی سے محروم رہی ہو۔
اگرچہ سرکاری حلقوں میں رسالہ الوقائع المصریہ کا اثر بہت نمایاں تھا لیکن محمد عبدہ اپنے رسالہ کے اس محدود دائرہ اثر پر مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے ایک ادبی شعبہ بھی قائم کیا جس کے ذریعہ وہ اور ان کے شرکاء کار ایسے امور کی نسبت رائے زنی کرتے تھے جن کا تعلق عوام کی رائے اور اُن کی دلچسپیوں سے تھا۔ ملک میں اخباروں کی کمی نے رائے عامہ پر اس شعبہ کے اثر و رسوخ میں اور اضافہ کر دیا۔ محمد رشید رضا نے محمد عبدہ کی سوانح عمری میں ان کے ۳۶ چھتیس مضامین نقل کیے ہیں جو قومی زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق ہیں۔ اور ان سے مصنف کے اُس گہرے تردد کا پتہ چلتا ہے جو انہیں اس اندیشہ کی وجہ سے پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں ایسے وقت جبکہ ہر طرف ترقی ترقی کی پکار ہو رہی تھی اور مغرب کی اندھی تقلید کا دور دورہ تھا قومی نشوو ارتقاء کی عمارت کمزور اور ناپائیدار بنیادوں پر نہ اُٹھائی جائے۔ ان مضامین میں بار بار تعلیم کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ سرکاری مدارس پر تنقیدوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک قوم کی قوم کو تہذیب و شائستگی اور علم و ترقی کی اعلیٰ سطح تک پہنچانا اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مغربی علوم کی تھوڑی بہت واقفیت سے یا اہل مغرب کے ادب معاشرت کی بے جان تقلید سے کوئی حقیقی انقلاب نہیں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ انہیں چیزوں کو ترقی کی علامت سمجھتے ہیں اُن میں مغرب کے رسم و رواج اس کے تعیشات و تکلفات اور اہل مغرب کے طرز معاشرت کی تقلید کا تباہ کن میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ قومی عظمت و وقار کی بازیابی یا شخصی عزت و اعتبار کے حصول کی راہ یہ نہیں ہے۔ قوم اُسی وقت ترقی کی حقیقی سطح تک پہنچ سکے گی جب افراد قوم میں کوئی بنیادی انقلاب رونما ہو، رسوم و رواج کی تبدیلی بتدریج ہونا چاہیے۔ سب سے بڑا قومی فرض یہ ہے کہ افراد کی سیرت و کردار اور ان کے

افکار و اعمال کی اصلاح کی جائے اس کے بغیر ہر قسم کی اصلاحی جد و جہد بیکار ہے لیکن اس عمل کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے اور اس کا پہلا زینہ تعلیم کی اشاعت ہے۔

بچوں کے مذہبی عقائد پر تعلیم و تربیت کے اثرات سے بھی وہ بحث کرتے ہیں اور والدین کو آگاہ کرتے ہیں کہ اپنی اولاد کو اُن مدارس میں نہ بھیجیں جن کا در و بست غیر مذاہب کے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ورنہ وہ یہ دیکھیں گے کہ بڑے ہو کر یہی بچے اپنے مذہب سے برگشتہ ہو جائیں گے اور اپنے معلمین کے عقائد پر ایمان لے آئیں گے۔ یہ چیز بالکل ناگزیر ہے کہ بچپن کے اثر پذیر دورِ زندگی میں بچوں کے خیالات پر مذہبی تعلیم کا گہرا نقش جم جائے۔ اس لیے اگر ایسے لڑکے بڑے ہو کر اپنا مذہب تبدیل کر دیں تو اس کے ذمہ دار اُن کے والدین ہوں گے جو اس غفلت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ایک مضمون میں قوم کے اُن رسوم و رواج سے بحث کی گئی ہے جن میں اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔

رشوت ستانی کو مذموم بتلاتے ہوئے اس پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ لوگ معمولی معمولی کاموں کے لیے رشوت دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ شادی کو ایک فریضہ مذہبی قرار دیتے ہیں اور تعدّدِ ازدواج سے خاندانی زندگی میں جو تلخیاں اور ناگواریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے جو ناانصافیاں کی جاتی ہیں ان سب کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ شریعت اسلام نے ازواج کے مابین انصاف اور مساوات کا مطالبہ کر کے تعدّدِ ازدواج کو بہت محدود کر دیا ہے۔ ایک مضمون میں اُن رسوم کے ترک کرنے پر زور دیا گیا ہے جو حقیقی عبادت کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ ایک اور مضمون میں اسراف اور فضول خرچی کے نقائص پر بحث کی ہے اور اس معاملہ میں اعتدال سے کام لینے کی صلاح دی ہے۔

انہیں مضامین میں سے بعض میں سیاسی زندگی سے بحث کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ قومی فلاح

کے لیے قوانین ملک کا احترام ضروری ہے لیکن یہ قوانین حالات کے لحاظ سے بدلتے رہنے چاہییں اور عوام الناس کے فہم کے مطابق ہونے چاہییں ۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ نیابتی حکومت اور قوم کے حقیقی نمائندوں کے ذریعہ قانون سازی کا کام اسلامی حکومت کی نمایاں خصوصیت رہی ہے اگرچہ نمائندگی کی شکل اور طریق انتخاب کے متعلق اسلامی شریعت نے کوئی خاص ہدایت نہیں دی ہے بلکہ ان کو وقت و حالات کی تبدیلی کا تابع رکھا ہے تاکہ جو شکل یا جو طریقہ عامۃ الناس کے مفاد اور عدل و انصاف کے مقتضیات کے مطابق ہو وہ اختیار کیا جائے ۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک سے محبت کرے اور اس کی خدمت و حفاظت کے لیے کمربستہ رہے ۔

الغرض جب محمد عبدہ کے اس دورِ زندگی پر ایک نگاہ بازگشت ڈالی جاتی ہے تو یہ عجیب و غریب منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کہ ازھر کا ایک شیخ جو مذہبی رہنماؤں علماء وقت اور ارباب سیاست سے کیا باعتبار خیالات و افکار اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار اس قدر مختلف ہے عمامہ باندھے ہوئے مصر کے سرکاری اخبار کے ذریعہ ایک مطلق العنان حکومت کے رکن کی حیثیت سے اپنی جگہ بیٹھا ہوا حکام وقت کے اعمال پر تنقیدی نگاہیں ڈال رہا ہے ان کی کوششوں کو جانب اصلاح مائل کر رہا ہے ۔ ملک کے اخباروں کے ادبی معیار کو بلند کر کے انہیں اہل ملک کے لیے مفید و سودمند بنا رہا ہے اور قوم کے اخلاق و عادات اور رسوم و رواج کی اصلاح میں مگن ہے ۔

لیکن جس طرح اس سے قبل اُن کی تعلیمی سرگرمیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اسی طرح واقعات و حالات کی رفتار نے ان کے اس کام کو بھی ختم کر دیا ۔ مئی ۱۸۸۲ء میں اٹھارہ مہینے کام کرنے کے بعد رسالہ الوقائع المصریہ سے ان کا تعلق ٹوٹ گیا ۔ اُس وقت مصر کی قومی تحریک جو محمد عرابی پاشا کے نام کے ساتھ وابستہ ہے بہت زور شور سے جاری تھی فوج کے ترکی عہدہ داروں کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا جاتا تھا وہ اس تحریک کے پیدا کرنے کا موجب ہوا تھا ۔ مگر بعد میں اس نے

وسعت پاکر ہر قسم کے بیرونی اثرات کے خلاف ایک جدوجہد کی صورت اختیار کرلی۔ عربی پاشا جنہیں ابتداً فوج میں کرنل مقرر کیا گیا تھا اور جو بمدارج ترقی کر کے بالآخر ۴ر فروری ۱۸۸۲ء کو محمود سمیع پاشا کی کابینہ کے وزیر فوج مقرر ہوئے اس تحریک کے مقبول عام لیڈر تھے۔ جب ۲۶ر مئی کو اس وزارت نے استعفا دے دیا تو نئی کابینہ میں عربی پاشا کو دوبارہ وزیر فوج کی حیثیت سے شریک کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ لیکن واقعات وحوادث نے قومی آزادی کی امیدوں پہ پانی پھیر دیا۔ گیارہ جون کو اسکندریہ میں زبردست فسادات رونما ہوئے اور اس کے بعد گیارہ جولائی کو انگریزی بحری بیڑے نے اسکندریہ کی بندرگاہ اور قلعہ پہ بم باری کی اور ۱۳ر ستمبر کو طلل الکبیر پر مصری فوج کی شکست اور ۲ دن بعد عربی پاشا کی گرفتاری نے قومی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد فوجی لیڈروں پہ مقدمہ چلا کر انہیں سزا دلوائی گئی۔ عربی پاشا کو موت کی سزا کا فیصلہ سنایا گیا لیکن بعد میں یہ سزا جلاوطنی میں تبدیل کر دی گئی۔

جس زمانہ میں محمد عبدہ الوقائع المصریہ کے مدیر خاص تھے اسی زمانہ میں عربی پاشا کی قیادت میں مصر کی قومی تحریک عروج پر تھی۔ یہ ناگزیر تھا کہ محمد عبدہ جو ترقی پسند عناصر کے روح رواں تھے اور نیابتی ادارہ جات کے قیام کو اسلامی ممالک کے لیے نہ صرف مناسب بلکہ ضروری خیال کرتے تھے اور بیرونی اثرات کے مٹانے کے درپے تھے اس تحریک میں تھوڑا بہت حصہ لیں جو بقول لارڈ کرومر (LORD CROMER) بعض خصوصیات کے لحاظ سے حقیقتاً قومی تحریک کہلائی جا سکتی تھی۔

مذکورہ بالا تحریک کے ابتدائی زمانہ میں جس وقت تک فوجی لیڈروں نے اپنے مقاصد کے لیے تشدد کا حربہ استعمال نہیں کیا تھا محمد عبدہ کا خیال تھا کہ اُن وسیع اصلاحی تدابیر و تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا ہے۔ جن کا نقشہ ایک زمانہ سے اُن کے ذہن میں بنا بنایا تیار تھا۔ ان کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ اس تحریک کو بیرونی طاقتوں کے شکنجہ سے ملک کو رہائی دلانے کی کوششوں

کا ابتدائی زینہ بنائیں۔ اس وقت تک وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس تحریک کے رہنما شخصی اغراض سے پاک ہیں اور انصاف و مساوات کے حصول کے لیے اصلاحی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس لیے انہوں نے دل وجان سے اس تحریک کی رہنمائی کرنا شروع کی اور اس کے لیڈروں کو صلاح ومشورہ دینے میں کوئی کمی نہ کی یہاں تک کہ انہیں اس کی پرواہ بھی نہ رہی کہ کوئی ان کے مشوروں پر کان دھرتا بھی ہے یا نہیں۔

الوقائع المصریہ کے مدیر خاص اور محکمہ احتساب کے صدر کی حیثیت سے جو مواقع انہیں حاصل تھے اُن کو انہوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ایک مضبوط اور صحیح رائے عامہ پیدا کریں اور قومی تحریک کے علمبرداروں کو اعلیٰ مقاصد سے روشناس کریں۔ دوسری طرف عربی پاشا اور دوسرے لیڈر جو ان کے گروہ میں شامل تھے محمد عبدہ کو اپنا معلم اور فکری رہنما خیال کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں ان سب لیڈروں نے ملک کی سچی بہی خواہی اور وفاداری کا حلف اُٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ ندیم اور دیگر اشخاص کے ساتھ انہیں بھی انقلابی جماعت کا سرغنہ سمجھ لیا گیا۔ اُن کی وفات کے بعد جو بیانات ملک کے اخباروں میں شائع ہوئے اُن سب میں اس انقلابی تحریک کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے اکثر اخباروں نے اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ عربی پاشا اور ان کے متبعین محمد عبدہ کے مشورہ بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔

اگرچہ قومی تحریک پر محمد عبدہ کے اثر ونفوذ اور ان کی عام قائدانہ حیثیت مسلّم ہے لیکن بے انصافی ہوگی اگر یہ بھی ساتھ ساتھ نہ بتا دیا جائے کہ اکثر امور کی نسبت وہ فوجی لیڈروں سے اختلاف رکھتے تھے اور جوں جوں قومی تحریک کی رفتار ترقی بڑھتی گئی ان کے خیالات ومقاصد اور فوجی لیڈروں کے فکر وعمل میں جو اختلاف ابتدائے کار سے موجود تھا روز بروز اور نمایاں ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ مجبوراً انہیں اپنی تحریروں میں قومی تحریک کے رہنماؤں پر تنقید کرنی پڑی۔ انہیں نہ تو ان رہنماؤں

کے طریق عمل اور خصوصاً ان کے تشدد آمیز رویہ سے اتفاق تھا اور نہ اُن بڑی بڑی توقعات میں شریک تھے جو ان لیڈروں نے اپنی تحریک کے نتائج کی نسبت قائم کر رکھی تھیں۔ محمد رشید رضا نے ان کی پوزیشن بالکل واضح کر دی ہے:-

"قومی تحریک کے فکری اور ادبی پہلو کے بانی مبانی اور اس کے روح رواں ہونے کے باوجود وہ فوجی انقلاب کے سخت ترین مخالف تھے۔ انقلاب اور اس کے حامیوں سے انہیں تنفر تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انقلاب کی وجہ سے وہ کام ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا جس کا آغاز انھوں نے کیا تھا حکومت کے پیش نظر جو اصلاحی تجاویز تھیں انقلاب کی وجہ سے اُن کو روبعمل لانا ناممکن ہو جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بیرونی طاقتوں کی مداخلت کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی انقلابی گروہ کے طریقۂ عمل پر ان کی بے خوف تنقیدوں کی وجہ سے انہیں اکثر اوقات دھمکیاں بھی دی گئیں مگر وہ اپنی راہ پر ثابت قدم رہے۔

طٰہٰ پاشا کے مکان پر محمد عبدہ عرابی پاشا اور فوجی لیڈروں کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی اُس سے نظریات کا یہ اختلاف صاف ظاہر ہوتا ہے۔

عرابی پاشا اور اُن کے ساتھی اس خیال پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے کہ دستوری حکومت ملک کے مفاد کے لیے قطعی ضروری ہے۔ اور مصر میں اس قسم کی حکومت کے قیام کا وقت آگیا ہے۔ محمد عبدہ اس کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سب سے پہلے اہل ملک کو اس طرز حکومت کے لیے ضروری تعلیم و تربیت دی جانی چاہیے تاکہ ایسے افراد کافی تعداد میں پیدا ہو جائیں جو اس قسم کی حکومت کو ہوشمندی اور ثابت قدمی کے ساتھ چلا سکیں۔ مرکز اور صوبوں میں نیابتی مجلسوں کے ساتھ کام کرنے کی عادت حکومت اور اہل ملک دونوں کو ہونی چاہیے۔ جس بار کو اُٹھانے کے لیے افراد قوم تیار نہیں ہیں اُسی سے اُن کے کمزور شانوں کو گرانبار کر دینا دانشمندی کے خلاف ہوگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی

ہو گی کہ کسی نابالغ لڑکے کو اس کے ماں باپ کا سارا جمع جتھا دے دیا جائے قبل اس کے کہ اس میں اس مال و دولت کو صحیح طور سے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ ان حالات میں تشدد اور انقلاب کے ذریعہ حکومت میں تبدیلی کرنے کی کوشش کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ بیرونی طاقتیں ملک پر قابض ہو جائیں۔ ایک مرتبہ نہیں کئی بار محمد عبدہ نے عربی پاشا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اعتدال پسندی اور میانہ روی سے تھوڑے ہی عرصہ میں انہیں وہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا جس کے وہ خواہشمند ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر جب قومی تحریک کے لیڈروں کے ایک جلسہ کو مخاطب کرنے کی انہیں دعوت دی گئی تو انہوں نے تاریخی شواہد پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ جب کبھی کوئی انقلابی تحریک مطلق العنان حکومتوں کے بے قید اختیارات کو محدود کرنے اور حکمرانوں سے حقوق مساوات و نمائندگی بجبر چھین لینے میں کامیاب ہوئی تو یہ تحریک ہمیشہ قوم کے متوسط اور ادنیٰ طبقات سے شروع ہوئی اور اسی وقت سرسبز ہو سکی جب سیاسی تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایک مضبوط رائے عامہ تشکیل پذیر ہو چکی تھی۔ یہ کبھی نہیں ہوا ہے کہ دولت مند معزز اور بااثر طبقے کے لوگوں نے غریب عوام الناس کے ساتھ مساوات قائم کی ہو اور انہیں دولت اور حکومت میں حصہ دار بنایا ہو۔ انہوں نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیا تم نے خدا کے بنائے ہوئے قانون کو بدل دیا ہے یا ارتقاء عمرانی کی فطری ترتیب الٹ گئی ہے۔ کیا تمہارے درمیان نیکی اور راست کرداری اس درجہ کمال کو پہنچ گئی جہاں تک وہ اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچی تھی اور تم نے برضا و رغبت اور خوب سوچ سمجھ کر اپنے حاصل کیے ہوئے اقتدار اور اپنی فتح مندیوں کے نتائج میں قوم کے دیگر تمام افراد کو حصہ دار بنا لیا ہے اور انصاف اور خدمت خلق کے جذبات سے سرشار ہو کر تم غربا اور مساکین کو آپ برابر کا سمجھنے لگے ہو یا ایسا نہیں ہے اور تم اندھوں کی طرح ایک آن دیکھے اور بے جانے بوجھے راستہ پر چلے جا رہے ہو اور

جو کچھ کر رہے ہو اُس کے نتائج سے لاعلم ہو۔" وہ خود جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے دستوری حکومت کے بڑے حامیوں میں سے تھے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی حکومت حاکم اور محکوم بادشاہ اور رعایا میں باہمی مفاہمت کے ذریعہ قائم کی جانی چاہیے نہ کہ بغاوت اور انقلاب کے ذریعہ اور اس کی ابتدا ایسی ہونی چاہیے کہ اہل ملک بتدریج اس حکومت کے مقتضیات کو سمجھ سکیں اور نیابتی ادارہ جات کا صحیح استعمال سیکھ جائیں تا آنکہ ایک نئی پود وجود میں آجائے جو حکومت کا بار سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہو

لیکن جب واقعات کی رفتار نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ قومی تحریک کی ہمنوائی یا خدیو مصر کی اعانت (جو درحقیقت بیرونی طاقتوں کی اعانت کے مترادف ہوتی) میں سے کسی ایک کو ترجیح دیں تو انہوں نے قومی تحریک کے علمبرداروں کا ساتھ دینا بہتر خیال کیا اگرچہ وہ اس تحریک کے نتائج سے خائف ضرور تھے۔ جب یہ تحریک ناکام ہوئی تو دوسرے لیڈروں کے ساتھ ساتھ ان پر بھی مقدمہ چلایا گیا اور تین سال تین ماہ کے لیے انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کو یہ حکم بھی تھا۔ کہ حکومت مصر کی اجازت کے بغیر وہ ملک میں قدم نہ رکھیں۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء کے ختم سے قبل ہی انہوں نے سرزمین مصر کو الوداع کہا اور شام کی طرف روانہ ہوئے تاکہ وہاں اپنے لیے کوئی مامن تلاش کریں۔

اس طرح ملک کی ترقی اور بیداری کے لیے ان کی اولین کوشش ناکام رہی اور اس ناکامی کی تلخیوں کو جس واقعہ نے تلخ تر بنا دیا وہ اُن کے دوستوں کی بے وفائی تھی جن پر انہوں نے اعتماد کیا تھا اور جنہوں نے بعد میں ان کی مخالفت میں اُن پر طرح طرح کے الزامات تراشے۔ لیکن جن بلند توقعات اور تمناؤں کے ساتھ انہوں نے کام کی ابتدا کی تھی وہ بالکل بر باد نہیں ہوئی تھیں۔ مقدمہ کے دوران میں وہ قید خانہ سے اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں "یہ تکلیف دہ اور روح فرسا واقعات کبھی نہ کبھی لوگوں کے حافظہ سے محو ہو جائیں گے اور قومی عزت و وقار کی مسمار شدہ عمارت پھر کبھی نہ کبھی ضرور تعمیر ہو جائے گی لیکن اگر اہل ملک کی پست حالت ان کی غفلت اور نادانی کی وجہ

سے اس ملک کو عزت و وقار کی گمشدہ دولت حاصل نہ ہو سکی تو پھر ہمیں رنج نہ ہونا چاہیے اگر دوسرے ممالک اس دولت کے مالک ہو جائیں۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہمیشہ اس بات کی کوشش کروں گا کہ میں اپنے دوستوں یا اور لوگوں کو جو اس طرف آنا چاہیں نیکی سچائی اور شرافت کی طرف دعوت دوں۔ مگر یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جب میری صحت اس کام کی اجازت دے اس کے علاوہ میری اور کوئی خواہش نہیں ہے بجز اس کے کہ خداوند تعالیٰ کی مدد میرے شامل حال ہو۔

جلاوطنی کی زندگی ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۸ء | جب ۱۸۸۲ء کے اواخر میں محمد عبدہ نے وطن کو خدا حافظ کہا تو ان کا ارادہ تھا کہ وہ شام چلے جائیں اور وہاں اُس وقت تک سکونت اختیار کریں جب تک کہ انہیں مصر واپس آنے کی اجازت نہ مل جائے لیکن بیروت میں ایک سال قیام کرنے کے بعد سید جمال الدین افغانی نے جو ۱۸۸۳ء کے آغاز سے پیرس میں سکونت پذیر تھے انہیں دعوت دی کہ وہ وہاں آکر مسئلہ مصر کے متعلق ان کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ اس لیے ۱۸۸۴ء کے اوائل میں وہ بیروت سے رخصت ہو کر اپنے قدیم معلّم اور رہنما سے پیرس میں آملے۔ وہاں وہ تقریباً دس ماہ تک رہے اور اس درمیان میں صرف ایک مرتبہ انگلستان اس غرض سے گئے کہ وہاں جا کر ارباب حکومت اور وزراء سے مصر اور سوڈان کے معاملات پر گفت و شنید کریں جہاں اس وقت مہدی سوڈانی کی فوج کشی کی وجہ سے حالات بہت نازک ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں یہ دو دوست جو شاگرد اور استاد بھی تھے ایک خفیہ انجمن العروۃ الوثقٰی کے معاملات کی درستگی میں مصروف تھے۔ اس انجمن کی بنیاد بھی انہیں دونوں نے ڈالی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی ممالک میں بیداری پیدا کی جائے اور ان ممالک کی رائے عامہ کو منظم کیا جائے۔ انہوں نے ایک رسالہ جس کا نام بھی عُروۃ الوُثقٰی تھا شائع کرنا شروع کیا تھا۔ تاکہ اس کے ذریعہ اپنے خیالات و نظریات کی اشاعت کریں۔ جب اس رسالہ کو مسدود کر دیا گیا تو یہ دونوں دوست جُدا ہو گئے سید جمال الدین افغانی روس چلے گئے اور

محمد عبدہ تیونس روانہ ہوگئے جہاں چند دنوں قیام کے بعد اپنی انجمن کی تنظیم کو مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے بھیس بدل کر کئی ایک ملکوں کا سفر کیا۔

اتنی مختصر سی مدت میں العروۃ الوثقیٰ کو جو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اس کے سمجھنے کے لیے ہمیں ان خیالات و افکار پہ ایک نظر ڈالنی چاہیے جو اس کے صفحات میں بتکرار پیش کیے جاتے تھے مسلمانوں کے زوال و انحطاط پہ ماتم کرتے ہوئے ان سے اپیل کی جاتی تھی کہ وہ اپنے مذہب کی مشترکہ اساس پر متحد ہو جائیں اور اپنے مطلق العنان حکمرانوں اور بیرونی طاقتوں کے مقابلہ پر کمر بستہ ہو جائیں تاکہ اسلام کی گمشدہ عظمت و شوکت پھر بحال ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی دعوت کے اثرات نے بہت جلد ان لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کیا جو مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کا احساس رکھتے تھے۔ پھر یہ مضامین جو العروۃ الوثقیٰ کے صفحات کی زینت تھے عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا کامل ترین نمونہ تھے۔ ذیل میں مجملاً ان خیالات کو پیش کیا جاتا ہے۔

مذہب اسلام ایک ایسا رشتہ ہے جو اقطاع عالم کے مسلمانوں کو ایک وحدت عطا کرتا ہے اور ان میں سے نسلی اور قومی امتیازات مٹا دیتا ہے۔ اسلامی شریعت راعی اور رعایا کے تعلقات بتفصیل متعین کرتی ہے اور جسم اسلام کے مختلف اعضا میں تعاون کے امکانات بڑھاتی اور منافقت کے مواقع دور کرتی ہے۔ دوسرے مذاہب کے برخلاف اسلام صرف آخرت کی زندگی ہی کے لیے رہنمائی نہیں کرتا ہے بلکہ اس موجود اور مادی دنیا کے پیچیدہ مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے اور اس طرح اپنے پیروؤں کو دنیا اور آخرت دونوں کی سعادتوں سے بہرہ اندوز کرتا ہے۔

مسلمانان عالم ایک زمانہ تک ایک واحد سلطنت کے زیر فرمان متحد اور متفق تھے۔ علوم و فنون کی ہر شاخ میں ان کے کمالات آج تک صفحہ ہستی پر نقش ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہر اس ملک میں جہاں اسلام کے حلقہ بگوش موجود ہیں اسلامی اقتدار کی بقاء اور اسلامی حکومت

کے قیام کے لیے ساعی رہیں۔ اور کسی حالت میں بھی ان کے لیے یہ جائز نہیں رکھا گیا ہے کہ وہ اُن لوگوں سے مصالحت کریں جنہوں نے ان کے ملکوں پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے اقتدار کو غصب کر لیا ہے۔ اُن پر تو مذہباً فرض ہے کہ وہ کسی قسم کی مداہنت بغیر ایسی تمام طاقتوں کے خلاف تلوار اُٹھائیں اور اُس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ انہیں ہٹا کر اپنا قبضہ و اقتدار دوبارہ قائم نہ کر لیں۔ لیکن مسلمان بادشاہوں اور فرمانرواؤں کی حرص و آز کی وجہ سے مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق رخصت ہو گیا ہے۔ ان بادشاہوں اور حکمرانوں کی تعیّش پسندی اسباب زینت کی چاٹ اور ظاہری شان و شوکت کے شوق نے ملّتِ اسلامیہ کو زوال و انحطاط کے آخری درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ مسلمانوں کو جن رشتوں نے ایک مضبوط اتحاد میں کس دیا تھا وہ اس وقت سے کمزور ہونے لگے جب عباسی خلفاء میں سے علم و فضل قوتِ اجتہاد اور سچی مذہبیت کا جوش جاتا رہا اور وہ صرف خلیفہ کے لقب سے ملقّب ہونے کو اپنی معراج سمجھنے لگے۔

اس طرح سے تیسری صدی ہجری کے بعد سے فرقہ پرستی اور گروہ بندی کا دور دورہ ہو گیا اور خود خلافت میں تفرقہ پڑ گیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان فرمانروا اور بادشاہ اسلامی حکومتوں میں بیرونی اثرات کی مداخلت کو نہ صرف گوارا کرتے ہیں بلکہ خود اپنی گردنوں میں غیر ملکی حکومتوں کی رسّیاں ڈالنے میں مصروف ہیں یوروپین قومیں جو اسلامی ممالک کے لیے ایک عرصے سے حریص ہیں اور مسلمانوں کی وحدت کو توڑنے کے مواقع ڈھونڈھتی ہیں اسلامی حکومتوں کے باہمی نزاعات اور جھگڑوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ بیرونی اشخاص کو اسلامی حکومتوں نے بڑے بڑے عہدے دے رکھے ہیں یہ لوگ جو اسلام سے بیگانہ بلکہ اس کے دشمن ہیں نہ تو حکومت کی عزت و وقار کے لیے تڑپ رکھتے ہیں اور نہ عوام الناس کی بہبودی اور خوشحالی کے لیے حسّاس دل رکھتے ہیں انہیں تو صرف اپنی تنخواہ سے واسطہ ہے اور وہ صرف اپنے فائدہ کے جویاں ہیں۔ اسلامی حکومتیں آج ایک دوسرے

کی امداد سے ہاتھ اُٹھا چکی ہیں کیونکہ انہیں ایک دوسرے کے حالات ہی کا علم نہیں ہے۔ علماء جن کا کام تھا کہ وہ مسجدوں اور مدرسوں کو اس گم شدہ وحدت و اتفاق کے قیام کا مرکز بنائیں اپنے پرانے طریق عمل کو فراموش کر چکے ہیں۔ جو کبھی اتفاق و اتحاد پیدا کرنے میں سب سے زیادہ موثر اور کارگر تھا۔ نہ وہ دوسرے ممالک کے علماء سے سلسلہ رسل و مراسلت رکھتے ہیں نہ باہمد گر ملاقات کے لیے سفر کی زحمت اٹھاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حال سے بے خبر ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ امراء اور بادشاہوں نے انہیں اپنی ہوا و ہوس کا غلام بنا رکھا ہے۔ اس لیے ان میں سے رائے کی آزادی اور اجتہاد کی جرأت مفقود ہو گئی ہے۔

اسلامی ممالک کے زوال و انحطاط کا علاج یہ نہیں ہے کہ اخبارات کی تعداد بڑھا دی جائے یا یورپین مدارس کے نمونہ پر ملک میں بکثرت مدارس کھول دیئے جائیں کیونکہ ان مدارس اور ان میں سکھائے جانے والے علوم کے ذریعہ بیرونی اثرات کی مداخلت کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا ہے نہ ہی اس کی تدبیر یہ ہے کہ مغربی طرز کی تعلیم دی جائے اور مغربی معاشرت کی تقلید کی جائے کیونکہ تقلید کی وجہ سے قوم کی روح مردہ ہو جاتی ہے اور جن کی تقلید کی جاتی ہے ان کا اثر و اقتدار ملک پر بڑھتا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ادبار کا حقیقی علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر سچائی کے ساتھ کاربند ہو جائیں اور خلفاء راشدین کے زمانہ کی اسپرٹ پھر زندہ کر لیں۔ اگر وہ اپنی موجودہ گری ہوئی حالت سے نکل آئیں اور اپنے سچے مذہب کے اصولوں پر خلوص دل اور سرگرمی کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیں تو وہ انسانیت کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ سکتے ہیں اسلامی ممالک کو باہمی امداد کا سبق سیکھنا چاہیے اور دشمن کے سامنے متحد ہو جانا چاہیے۔ اس سے یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ ان سب ممالک پر ایک شخص واحد حکمران ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کلام الٰہی کو تمام اسلامی دنیا پر اثر و اقتدار حاصل ہو اور وہی مسلمانوں کی تمام نزاعوں اور جھگڑوں میں

محکم تسلیم کیا جائے مسلمانوں کو ایک رشتہ میں باندھنے والی اور ایک وحدت میں پرو دینے والی قوت ان کا مذہب ہو اور ایک اسلامی حکومت دوسری اسلامی حکومت کی حفاظت و اعانت کے لیے اپنے تئیں ذمہ وار گردانے۔ کیونکہ ہر اسلامی ملک کی زندگی اور بقا، دوسرے اسلامی ممالک کی زندگی اور بقا پر منحصر ہے جب کبھی مسلمانوں کے کسی ملک پر کوئی ظالم اور ناحق شناس حکمران مسلط ہو جائے اور اپنے اعمال و کردار سے ملک کو مصیبت اور بربادی کی طرف لے جا رہا ہو تو خواہ وہ حکمران مسلمان ہی کیوں نہ ہو اس ملک کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اسے نکال باہر کریں کہ مبادا اس کے عمل اور مثال سے یہی روگ جسم اسلام کے دوسرے اعضا میں سرایت کر جائے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسالہ العروۃ الوثقیٰ کا لہجہ اور اس کی اسپرٹ ان خیالات سے کہیں زیادہ انتہا پسند اور انقلاب انگیز ہے جن کا اظہار محمد عبدہٗ مصر میں الوقائع المصریہ کے صفحات پر کیا کرتے تھے۔ اس لیے جائے حیرت نہیں ہے کہ اسلامی ممالک کے حکمران اور اعلیٰ سرکاری عہدہ دار اس رسالہ کی اشاعت سے خوف زدہ ہو کر اسے بند کر دینے پر آمادہ ہو گئے اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ اس رسالہ کے غیر معتدل میلانات اور اس کے تلخ لہجہ کی ایک وجہ وہ ناکامی اور شکست تھی جو حال ہی میں ترقی پسند عناصر کو مصر میں اٹھانا پڑی تھی اور جس کی وجہ سے بیرونی طاقتوں کے اشارہ پر اور مسلم ارباب اقتدار کی انفعالیت سے جمال الدین افغانی اور محمد عبدہٗ کو جلا وطن ہونا پڑا۔ لیکن اس کا حقیقی سبب یہ تھا کہ اس پوری مدت میں علامہ جمال الدین کی شخصیت محمد عبدہٗ پر پوری طرح سے چھائی ہوئی تھی۔ علامہ موصوف فطرتاً انقلابی تھے اور محمد عبدہٗ خلقی طور سے اعتدال پسند اور تدریجی اصلاح کے قائل تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مرتبہ خود محمد عبدہٗ نے اس پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ مصر کی آزادی کی خاطر اس کا حکمران تہ تیغ کر دیا جائے لیکن اس وقت بھی علامہ جمال الدین کا اثر ان پر

غالب تھا کیونکہ اس وقت تک علامہ مصر ہی میں اقامت پذیر تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ العروۃ الوثقیٰ کی مسدودی اور علامہ جمال الدین سے جدائی کے دو سال بعد ان کی دو تحریروں سے جن میں ایک کے مخاطب قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام اور دوسری کے مخاطب والیئے بیروت تھے اتحاد اسلامی کی اسپرٹ عیاں ہے کیونکہ ان دو تحریروں میں انہوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ دولت عثمانیہ کے تحفظ و بقاء کی ضرورت پر ایمان خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کے بعد اسلامی عقائد میں سب سے زیادہ اہم ہے لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اسلامی خلافت کی صیانت کا خیال ان کے جذبہ مذہبی کے سوا اور کسی جذبہ سے ماخوذ تھا۔ سیاسی مصالح یا خود اپنے ملک کا فائدہ اس تعاون کا سرچشمہ نہ تھا۔ بیرونی اثرات کی مخالفت اور بیرونی طاقتوں سے تنفر اُن الفاظ سے بھی ظاہر ہے جو انہوں نے امریکہ انگلستان اور فرانس کے متعلق استعمال کیے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی ممالک میں یوروپین اور امریکی مدارس اور تعلیم گاہیں قائم کرکے یہ تینوں مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن درحقیقت اسلام کے مٹانے کے درپے ہیں۔

لیکن ان کی پوری زندگی پر ایک مجموعی نظر ڈالنے اور ان کی تصانیف و تقاریر کے عام رجحانات کو دیکھنے سے اس بات کا ناقابل تردید ثبوت حاصل ہوجاتا ہے کہ ان کی حیثیت مقدماً ایک مصلح کی تھی اور وہ تعلیم کی اشاعت اور اخلاق کی تربیت کو انقلاب اور شورش سے زیادہ کارگر متصور کرتے تھے۔ اگر عرابی پاشا کی قومی تحریک کے آخری دَور میں وہ انقلابیوں میں جا ملے تو اس کی وجہ جیسا کہ انہوں نے خود بیان کیا ہے یہ تھی کہ حالات نے اس تحریک کی حمایت پر انہیں مجبور کر دیا اور نتیجۃً انہیں اس طریق کار کو بھی قبول کرنا پڑا جس کی سودمندی پر انہیں بالکل یقین نہ تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ وہی مقاصد زیادہ تیقن کے ساتھ اگرچہ نسبتاً دیر میں کسی قسم کا شور و شر کیے بغیر تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ محمد رشید رضا لکھتے ہیں "محمد عبدہ اور ان کے معلم اور پیشوا علامہ جمال الدین افغانی کو مصر میں توفیق پاشا کے دَور میں جو تجربات حاصل ہوئے انہوں نے دستوری اور سیاسی اصلاح کے متعلق ان کی امیدوں پر کاری ضرب لگائی۔

اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ اصلاح حال کی جانب انہیں متوجہ کیا"۔ اسی لیے پیرس میں انھوں نے علامہ جمال الدین افغانی کے سامنے اپنے اِس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اصلاح کا سیاسی طریق عمل کامیاب نہیں ہوگا۔ کیونکہ صرف بیرونی طاقتوں کے اثرات اور ان کی مداخلت سے آزادی حاصل کر لینا ہی ایک انصاف پسند اور معدلت شعار اسلامی حکومت کے قیام پہ منتج نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا بہتر ہوگا کہ ہم دونوں کسی دور دراز گوشہ میں سیاسی زندگی کے زیر و بم سے دور تعلیم و تربیت کے ذریعہ نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کریں جو کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہر طرف پھیل جائے اور اپنی جد وجہد اور اصلاحی کوششوں سے اپنی ہی جیسی جماعتیں تیار کرے۔ اس طرح بہت تھوڑے عرصہ میں ہمارے تربیت یافتہ نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد دنیا کے ہر حصہ میں اُن مقاصد کے لیے جد وجہد کر رہی ہوگی جو آج ہمارے پیش نظر ہیں۔ لیکن علامہ جمال الدین افغانی نے یہ تجویز مسترد کر دی اور کہا ہم کو اسی راہ میں ثابت قدم رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ یا تو ہم کامیابی سے ہمکنار ہوں یا ناکامی سے داغدار۔

اپنی سوانح عمری میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ میں میں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دے لیا تھا کہ مصر کے حکمرانوں کے خلاف اہل مصر کے حقوق کی حمایت کروں۔ یہاں بھی وہ دراصل اپنی زندگی کے اُس دور کی جانب اشارہ کر رہے ہیں جب وہ عربی پاشا کی قومی تحریک میں شریک تھے۔ اُس وقت اہل مصر کو وہ یہ تعلیم دے رہے تھے کہ اگرچہ فرمانروائے وقت اور حکام مقتدر کی اطاعت اِن پہ لازم ہے لیکن اسی کے مقابل انہیں خاص خاص حقوق بھی حاصل ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اہل ملک کی ضروریات وخواہشات حکمران طبقہ کے علم میں لائی جائیں تاکہ وہ کوئی غلط راستہ اختیار نہ کریں جو ان خواہشات و ضروریات کی تکمیل کے منافی ہو۔ ان کا بیان ہے کہ اپنے بعض مقاصد میں میں تقریباً کامیاب ہوگیا تھا لیکن راعی اور رعیت کا معاملہ میں نے قسمت پہ چھوڑ دیا تھا کہ خداوند تعالیٰ جس طرح چاہے اِس معاملہ کی یکسوئی کرے کیونکہ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ حکام اور رعیت کے تعلقات کی نوعیت

اُس بیج کا پھل ہے جو کوئی قوم خود ہی بوتی ہے اور خود ہی عرصہ تک اس کاشت کی دیکھ بھال کرتی ہے اس وقت اسی تخم پاشی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال جب وہ مصر واپس ہوئے تو انہوں نے حکومت کی طرف پہلے سے کہیں زیادہ مصالحانہ روش اختیار کی یہاں تک کہ وہ علی الاعلان حکومتِ وقت کی حمایت کرنے لگے کیونکہ جیسا وہ کہا کرتے تھے کہ اب وہ اُس آزادی کے سچے قدردان ہو گئے تھے جو اس حکومت کی وجہ سے اہلِ ملک کو حاصل تھی اس نوبت پہ وہ مصطفےٰ فہمی پاشا وزیرِ اعظم کے خاص دوست اور مشیر تھے اور لارڈ کرومر سے بھی ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

۱۸۸۵ء کے آغاز میں پیرس میں خفیہ انجمن کے قیام کے بعد محمد عبدہ بیروت واپس ہوئے اور علامہ جمال الدین افغانی نے تنہا اس کام کو جاری رکھا۔ محمد عبدہ کے دوستوں نے بیروت میں انہیں خوش آمدید کہا اور بیروت میں ان کی قیام گاہ علماء، اہلِ قلم اور مختلف المذاق اشخاص کے اجتماع کی مرکز بن گئی۔ اپنی قیام گاہ پر انہوں نے حضور رسالت مآبؐ کی حیاتِ طیبہ پہ لکچر دینے شروع کیے اور شہر کی دو مسجدوں میں انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر پہ فی البدیہہ تقریریں کیں۔ ان اجتماعات سے فائدہ اُٹھا کر جن میں ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ شریک رہتے تھے محمد عبدہ اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سب کے ساتھ وہ مساوی حُسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن ہمیشہ بلا استثناء وہ اپنے ہی عقائد اور نظریات کی تشریح و توضیح کرتے تھے خواہ ان کا تعلق مذہب سے ہو یا علم و فن کی کسی شاخ سے۔

۱۸۸۵ء کے آخر میں انہیں مدرسہ سلطانیہ میں معلمی کی خدمت پیش کی گئی جسے انہوں نے قبول کیا۔ جیسا کہ ان کا قاعدہ تھا یہاں بھی انہوں نے مدرسہ کے نظم و نسق میں اصلاح کی، نصابِ تعلیم پہ نظرِ ثانی کی اور اس میں دینیات فقہ اور تاریخ کے مضامین بھی شامل کیے۔ سارا دن وہ تعلیم دینے میں مصروف رہتے تھے اور ان کی بڑی کوشش یہ تھی کہ مدرسہ کی اخلاقی حالت اعلیٰ معیار کی ہو جائے۔

ادبی کام کے لیے بھی انہیں تھوڑا بہت وقت مل ہی جاتا تھا۔ انہوں نے علامہ جمال الدین کی

کتاب "ابطال مادیت" کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اپنی دو تقریروں کو بھی انہوں نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ تقریریں عربی ادب کے دو دقیق لیکن فصیح و بلیغ نمونوں کی بابت طلبا کے لیے تیار کی تھیں۔ ان میں سے ایک نہج البلاغت اور دوسری مقامات بدیع الزمان الہمدانی کے متعلق تھی دینیات پر انہوں نے جو لکچر دیئے تھے وہ اگرچہ شائع نہیں ہوئے لیکن ان کی بعد کی تصنیف رسالۃ التوحید کے لیے بطور مواد کام آئے۔ اس کے علاوہ اخباروں میں بھی کبھی کبھی ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔

لیکن ان کی بے چین طبیعت اور بے تاب فطرت جو ہمہ وقت اصلاحی کوششوں کی طرف مائل رہتی تھی اس طرح تسکین نہیں پا سکتی تھی۔ ان کا جذبۂ عمل اپنے لیے اس سے زیادہ وسیع میدان تلاش کر رہا تھا شام اور سلطنت عثمانی کے مختلف حصوں میں سفر کرنے اور مختلف الخیال افراد سے ملاقات کرنے کی وجہ سے انہیں ترکی سلطنت کے حالات کا قریبی علم حاصل ہو گیا تھا۔ اس لیے نہایت احتیاط اور قاعدہ کے ساتھ جیسا کہ ان کی طبیعت کا مقتضا تھا انہوں نے سلطنت عثمانی کے حالات پر دو رسالے لکھے اور جو کچھ خرابیاں اس سلطنت کے دروبست میں نظر آئیں ان کے دور کرنے کی تدابیر پیش کیں۔ اس میں سے ایک رسالہ جس کا نام "مذہبی تعلیم کی اصلاح" تھا انہوں نے قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام کو بھی بھیجا۔ اس رسالہ میں خلیفۃ المسلمین سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ میں ہر طرف مذہب اور اس کی ضروریات و تعلیمات سے لاعلمی اور ناواقفیت پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اخلاقی انحطاط پیدا ہو گیا ہے اور بیرونی قوموں کو موقع مل گیا ہے کہ وہ اپنے مدارس کے ذریعہ مسلمان بچوں کے ذہن و دماغ کو متاثر کریں۔ اس اخلاقی انحطاط کا بڑا سبب مذہبی تعلیم کا فقدان ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے یعنی مذہبی تعلیم جس نہج پر دی جا رہی ہے اس میں تبدیلی کی جائے۔ وہ انسانوں کو ان کے مشاغل کی نوعیت اور تعلیمی حالت کے لحاظ سے تین[۳] گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہر گروہ کی ضروریات و حالات کے مطابق اس کے لیے ایک نصاب تعلیم

تجویز کرتے ہیں ۔ یہ تجاویز انہوں نے اس کمیشن کے غور و ملاحظہ کے لیے پیش کی تھیں جس کو سلطان نے اپنی سلطنت کی تعلیمی حالت کی جانچ کرنے اور اس کے لیے اصلاحی تدابیر پیش کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ دوسرے مقالہ میں جس کا نام تھا "بیروت میں اصلاحات کے لیے چند تجاویز" اور جسے انہوں نے والیٔ بیروت کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ بیروت کے تین بڑے صوبوں کے باشندوں کی تعلیمی حالت کا مرقع کھینچتے ہیں ان کی تعلیمی حالت ان کے مذہبی خیالات اور سیاسی رجحانات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان خطرات کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو بیرونی اقوام کے مدارس اور ان کی پھیلائی ہوئی تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں اور پھر تجویز کرتے ہیں کہ ملک میں عمدہ مذہبی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے ۔

آخر کار بیروت میں ساڑھے تین سال قیام کے بعد چند با اثر اصحاب کی سفارش سے (جن میں ایک لارڈ کرومر بھی تھے) خدیو توفیق پاشا نے انہیں مصر میں داخل ہونے کی اجازت عطا کی اور ۱۸۸۸ء کے اواخر میں انہوں نے سرزمین مصر کو اپنی مراجعت کا شرف بخشا ۔ بیروت میں اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی ۔ مصر سے روانگی کے بعد چھ سال کی درمیانی مدت میں انہوں نے یورپ کے اکثر ممالک کا سفر کر لیا تھا اور مغربی تمدن کا مشاہدہ دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ کیا تھا۔ اس تمدن کی ابتدائی جھلک انہوں نے ان جدید کتابوں میں دیکھی تھی جن کا اس زمانہ میں عربی میں ترجمہ ہوا تھا ۔ انہوں نے اسلامی ممالک کا بھی سفر کیا اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط پر کافی غور و خوض کیا۔ اس طرح اس چھ سال کی جلاوطنی نے ان کی شخصیت کی تکمیل میں بڑا حصہ لیا خصوصاً سعی و عمل کے اس میدان میں قیادت کے لیے جس میں انہوں نے قدم رکھا تھا جن صفات کی ضرورت تھی وہ بھی بڑی حد تک اسی آوارہ وطنی کے زمانہ میں انہوں نے پیدا کیں ۔ محمد رشید رضا لکھتے ہیں" یہ جلاوطنی اور غربت کی زندگی اور سب لوگوں کے لیے جنہیں مصر سے اخراج کا حکم دیا گیا تھا ایک مصیبت تھی لیکن محمد عبدہ کے لیے یہ جلاوطنی خداوند تعالیٰ کی سب سے بڑی برکت و نعمت تھی جس نے ان کی شخصیت کو مکمل کیا ان کے تجربہ

کو وسیع کیا اور دوسرے اسلامی ممالک میں ان کے افکار و نظریات کی تخم ریزی کی۔

سفر یورپ کے تجربات انہیں اتنے گراں بہا اور زندگی بخش معلوم ہوتے تھے (حالانکہ انہوں نے یورپ کا سفر خود اپنی رائے اور مرضی سے نہیں کیا تھا) کہ جب کبھی ان کے قول کے مطابق انہیں اپنے ذہن و دماغ کے لیے تازگی اور فرحت کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بلا تامل یورپ کے ممالک کا سفر کیا کرتے تھے وہ لکھتے ہیں: "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے یورپ کا سفر کیا ہو اور میرے دل میں یہ یقین جاگ نہ اٹھا ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ حالت بہت جلد عروج و ترقی سے بدل جائے گی"۔ جب وہ اپنے گرد مشکلات کا ایک حصار کھنچا ہوا دیکھتے تھے اور اہل ملک کی سستی ہٹ دھرمی اور غفلت کے منظر پر نگاہ کرتے تھے تو یہ یقین بہت کچھ سرد پڑ جاتا تھا لیکن ان کا بیان ہے کہ جب کبھی میں یورپ واپس گیا تو پھر یہ دبی ہوئی امیدیں اور آرزوئیں اپنا نظر افروز چہرہ دکھانے لگتیں اور جن چیزوں کو میں ناممکنات خیال کرتا تھا وہ سہل الحصول نظر آنے لگتی تھیں"۔ یورپ کے سفر و قیام کے یہ مبہم اثرات تھے جو بالآخر ان آخری مجاہدانہ کوششوں میں ظاہر ہوئے جو قومی فلاح و صلاح کے لیے ان کی طرف سے عمل میں آئیں۔

آخری دَور

۱۸۸۸ء تا ۱۹۰۵ء

مصلح اور خادم قوم | جب محمد عبدہ مصر واپس ہوئے تو اہل مصر نے ان کی جاں فروشیوں، ان کے ایثار اور ان کی اسلامی اور قومی خدمات کی کماحقہٗ قدر کی اور انہیں عزت و وقار کی وہ رفعت نصیب ہوئی جو کم لوگوں کو میسر آئی تھی۔ اپنی بقیہ زندگی کے کارہائے نمایاں سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اس عزت و سربلندی کے واقعتاً مستحق تھے۔ یکے بعد دیگرے انہیں ملک کی اعلیٰ ترین خدمات پیش کی گئیں اور ان کی ساری زندگی انہیں اہم خدمات کی انجام دہی میں صرف ہو گئی۔ ان کی کوششوں پر کبھی کبھی مخالفانہ تنقیدیں بھی ہوئیں۔ خصوصاً اپنی اصلاحی جدوجہد میں انہیں قائم شدہ حقوق رکھنے والی جماعتوں کے حملے بھی برداشت کرنا پڑے لیکن اس کے باوجود ان کے بڑے سے بڑے مخالف اور دشمن کو بھی ان کے خلوص ان کی نیک نیتی اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کی بے لوثی پر ایک منٹ کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا۔ مصر واپس آنے کے بعد سے آخری لمحات زندگی تک جو زمانہ گزرا اس میں انھوں نے اپنے ملک اور مذہب کی اہم ترین خدمات انجام دیں۔ اگرچہ ان کی زندگی کا یہ دَور پُرازواقعات نہ تھا۔ ان کی موت کے بعد ان کے متعلق جو بیان شائع ہوا وہ ان کی پوری زندگی اور اُس زندگی کے کارہائے نمایاں کا خلاصہ ہے۔ وہ یہ ہے "مصر میں کوئی اہم اور مہتم بالشان کام نہیں انجام دیا گیا جس میں انھوں نے اوروں سے پہلے اپنی مدد کا ہاتھ نہ بڑھایا ہو اور اوروں سے زیادہ اپنی توجہ

اور کوشش صرف نہ کی ہو"۔

خدیو توفیق پاشا نے معافی عطا کرنے کے بعد انہیں عدالت ابتدائی کا قاضی مقرر کیا۔ ان کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ پھر دار العلوم میں درس و تدریس کا مشغلہ شروع کریں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ معلمی ہی ان کا اصلی پیشہ ہے جسے وہ کامیابی کے ساتھ چلا سکتے ہیں لیکن خدیو توفیق پاشا ان کی اس خواہش کو پورا کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کو ڈر تھا کہ محمد عبدہ کے سیاسی خیالات کا اثر دار العلوم کے طلبہ پر ضرور پڑے گا۔ دو سال بعد قاہرہ میں انہیں عدالت مرافعہ کی مجلس شوریٰ کا رکن مقرر کیا گیا۔

اپنے عدالتی کام میں محمد عبدہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ حق و انصاف کے مقتضیات پورے ہوں اور جہاں تک ممکن ہو فریقین میں باہمی مصالحت ہو جائے اس مقصد کی خاطر محمد عبدہ نے ہمیشہ اپنی آزاد رائے اور فیصلہ پر اعتماد کیا اور قانونی موشگافیوں سے ہمیشہ اغماض برتا جس کے لیے قانون دان حضرات نے ان پر اعتراضات بھی کیے۔ بعض اوقات تو وہ صریحاً قانون کے خلاف عمل کرتے تھے۔ مثلاً وہ ایسے گواہوں کو سزا دلواتے جن کی شہادت انہیں جھوٹی معلوم ہوتی۔ جب تک وہ اس خدمت پر مامور رہے ان کی کوشش یہ رہی کہ دو چیزوں کے متعلق وہ عوام الناس کے اخلاقی ضمیر کو بیدار کریں۔ اوّل جھوٹی گواہی دوسرے فحش کاری۔ اُن کے فیصلے اتنے صحیح اور جچے تلے ہوتے تھے اور حقیقی مجرم کو وہ ایسے عجیب و غریب طریقہ سے بیک نظر شناخت کر لیتے تھے کہ اُن کے یہ دو صفات زبان زدِ خاص و عام ہو گئے۔

جامعہ ازھر کی اصلاح جامعہ ازھر کی اصلاح کا خیال جو ان کے دل میں طالب علمی کے ایام سے پرورش پا رہا تھا اور جسے علامہ جمال الدین افغانی کی رفاقت نے اور زیادہ تقویت پہنچائی تھی اب بالکل پختہ ہو گیا چونکہ جامعہ ازھر پورے عالم اسلامی میں علم و فضل کا مرکز تھی اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ ازھر کی اصلاح درحقیقت مسلمانانِ عالم کی اصلاح ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ازھر کے طریق تعلیم اور

وہاں کے رائج الوقت انتظامی قواعد وضوابط کی اصلاح ہو جائے نصاب تعلیم کو اتنی وسعت دے دی جائے کہ اس میں جدید مغربی علوم بھی داخل ہو جائیں اور اس طرح جامعہ ازہر یورپ کی بڑی بڑی جامعات کے ہم پلہ ہو جائے اور ساتھ ساتھ قدامت پرستی کے اس مرکز میں شریعت اسلام کو حالات زمانہ سے مطابقت دینے کا کام بھی انجام پذیر ہو جائے تو بجا طور سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جامعہ ازہر کی مسلمہ عظمت اور عالم اسلامی میں اس کا قائم شدہ اثر و نفوذ ان تغیرات اور اصلاحات کو صرف مصر ہی میں نہیں بلکہ عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دے گا۔ اس طرح سے جامعہ ازہر پوری دنیائے اسلام کے لیے روشنی کا ایک مینار ہو جائے گی اور اس مصدر نور و حرارت سے ساری دنیا کے مسلمان ضیا یاب ہوں گے۔ محمد عبدہ کی رائے تھی کہ یا تو جامعہ ازہر کو حقیقی معنوں میں از سر نو زندہ کرنا چاہیے یا اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہیے۔

اپنی طالب علمی کے زمانہ میں محمد عبدہ نے بطریق تجربہ ازہر کی اصلاح کے لیے کوششیں کی تھیں مصر واپس آنے کے بعد انہوں نے ازہر کے ناظم سے ملاقات کی اور انہیں ازہر کے نصاب تعلیم میں بعض تبدیلیوں کا مشورہ دیا۔ ان کوششوں کی وجہ سے مخالفت کا جو طوفان برپا ہوا اس سے محمد عبدہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خدیو کی مدد کے بغیر کسی قسم کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ مگر توفیق پاشا اس معاملہ میں اصلاح کے حامیوں کی مدد کرنا نہیں چاہتا تھا سنہ ۱۸۹۲ء میں جب توفیق پاشا کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا عباس حلمی تخت نشین ہوا تو محمد عبدہ نے ازہر کی اصلاح کے لیے چند تجاویز اس کے سامنے پیش کیں اور اپنے تئیں یقین دلایا کہ نیا بادشاہ ان کی اصلاحی کوششوں سے موافقت کرے گا بالآخر ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور خدیو نے ایک قانون کے ذریعہ مورخہ ۱۰ رجب المرجب سنہ ۱۳۱۲ھ کو منظور ہوا ایک انتظامی کمیٹی مقرر کی جو ازہر کے ممتاز شیوخ پر مشتمل تھی محمد عبدہ اور ان کے دوست شیخ عبدالکریم سلمان اس کمیٹی میں حکومت کے نمائندے مقرر ہوئے۔ ابتدا ہی سے محمد عبدہ اس کمیٹی کے

روحِ رواں تھے ۔

اگرچہ محمد عبدہ کو اب خدیو اور اس کی پوری حکومت کی تائید حاصل تھی پھر بھی ان کی خواہش تھی کہ جو اصلاحات بھی روبعمل لائی جائیں وہ ازہر کے شیوخ اور اساتذہ کی مرضی اور رضامندی سے نافذ ہوں اس غرض سے انہوں نے اصلاح کی ابتدا اس طرح کی کہ جامعہ ازہر کے اساتذہ اور معلّمین کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا۔ پہلے حالت یہ تھی کہ ایک طرف تو بعض اساتذہ اور معلّمین چھ سو قرش[1] ماہوار تک پاتے تھے اور دوسری طرف بعض اساتذہ کو صرف سولہ قرش ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور بعض ایسے بھی تھے جو اس قلیل مشاہرہ سے بھی محروم رہتے تھے اور جو کچھ انہیں طلبا سے یا فرصت کے اوقات میں اور کوئی کام کرنے سے مل جاتا تھا اسی پر قناعت کر لیتے تھے ۔ محمد عبدہ نے اس غرض سے سرکاری خزانہ سے ایک ہزار پاؤنڈ کی رقم کی منظوری حاصل کر لی اور حکومت سے مزید رقم کی منظوری کا وعدہ بھی لے لیا لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کر دی کہ منظور شدہ رقم ایک خاص قاعدہ کے ساتھ شیخ الازہر کی صوابدید کے مطابق صرف کی جائے (جیسا کہ اس سے قبل ہوتا آیا تھا) اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمی اور انتظامی حالت میں ایسی نمایاں اصلاح ظاہر ہو کہ جس کی بنا پر منظور شدہ رقم میں اور اضافہ کیا جا سکے ۔

اس شرط سے فائدہ اٹھا کہ انہوں نے ازہر کے اساتذہ کو معیار قابلیت کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا اور ہر گروہ کے لیے ایک متعیّن مشاہرہ مقرر کر دیا جس کی وجہ سے اساتذہ کو معلوم رہتا تھا کہ انہیں کیا مشاہرہ ملے گا۔ صرف شیخ الازہر کے رحم و کرم پر اب ان کی تنخواہ کا دارومدار نہیں تھا ۔

محمد عبدہ نے طالب علموں کے رہنے سہنے کے طریقوں کی بھی تحقیق کی اور اس تحقیق نے ان پر ظاہر کیا کہ ان کی رہائش کا طریقہ اور وہ ماحول جس میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے نہایت مضر صحت تھا کیونکہ کثرت تعداد کی وجہ سے کمروں میں بھیڑ لگی رہتی تھی۔ پھر روٹیاں جو انہیں ملتی تھیں ناکافی ہوتی تھیں اور پرانے فرسودہ طریقوں سے پکائی جاتی تھیں ۔ انہوں نے روٹیوں کی تعداد پانچ ہزار سے پندرہ ہزار

[1] مصری قرش ۲؍ کے برابر ہوتا ہے ۔

کردی اس کے لیے انہیں محکمہ وقف سے مزید رقم حاصل کرنا پڑی۔ محمد عبدہ نے جامعہ ازھر کے اوقاف کی حالت بھی بہت کچھ درست کی کیونکہ روز بروز ان کی حالت خراب ہوتی جاتی تھی۔ اس انتظامی اصلاح کی وجہ سے آمدنی چار ہزار پونڈ سے بڑھ کر چودہ ہزار ساڑھے سات سو پونڈ ہوگئی۔ روٹیوں کی روزانہ تقسیم ازھر کے بعض اساتذہ کے لیے ایک وافر آمدنی کا ذریعہ بن گئی تھی۔ علاوہ بریں اس کی وجہ سے آپس میں جھگڑوں اور مخالفتوں کا طوفان برپا رہتا تھا اس لیے محمد عبدہ نے اس انتظام کی کی اصلاح کے لیے کمیٹی کے سامنے بعض تدابیر پیش کیں لیکن کمیٹی نے ان کو پس پشت ڈال دیا۔ طلباء کی خوابگاہوں کے لیے انہوں نے کمروں کی تعمیر کا انتظام کیا فرنیچر کی مرمت کرائی جہاں نئے فرنیچر کی ضرورت محسوس ہوئی اس کی فراہمی کا انتظام کیا اور مفید صحت تدابیر روبعمل لائے۔ طلباء کے معائنہ طبی کی غرض سے ایک طبیب کا تقرر کیا۔ انہیں کے ایماء پر جامعہ ازھر میں ایک چھوٹا سا دواخانہ کھولا گیا جس میں سب ضروری دوائیں موجود رہتی تھیں بعد میں اس دواخانہ نے وسعت پاکر ایک باقاعدہ اسپتال کی شکل اختیار کرلی۔

جامعہ ازھر کے انتظامی در وبست پر بھی انہوں نے بہت کچھ توجہ کی۔ جامعہ کی عمارات میں سے چند کمرے دفتری کاروبار کے لیے مخصوص کر دیئے گئے اور اہلکاروں اور منشیوں کی ایک کافی تعداد اس غرض سے مقرر کی گئی کہ وہ انتظامی امور میں شیخ الازھر کا ہاتھ بٹائیں اور نئی تنظیم کو کامیاب بنانے میں مدد دیں۔ اس سے پہلے قاعدہ یہ تھا کہ شیخ الازھر انتظامی کام اپنے گھر میں انجام دیتے تھے جہاں طلباء اور اساتذہ کو معاملات کے تصفیہ کے لیے جانا پڑتا تھا۔ جزوی امور کے انصرام کا سررشتہ شیخ الازھر کے معتمد کے ہاتھ میں تھا جس کی وجہ سے معتمد مذکور کافی اختیارات کا مالک بن بیٹھا تھا۔ نصاب تعلیم پر بھی کافی توجہ کی گئی۔ اس خیال سے کہ جو کچھ تبدیلیاں عمل میں آئیں انہیں ازھر کے اساتذہ کی رضامندی حاصل ہو جامعہ کے تیس ممتاز اساتذہ کی ایک کمیٹی اس غرض سے

مقرر کی گئی کہ وہ جاری شدہ نصاب تعلیم اور اس میں مناسب تبدیلیوں کی ضرورت پر غور وفکر کرنے کے بعد انتظامی کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اُن مضامین کی صراحت کر دی گئی جن کی تعلیم بہرحال ضروری تھی۔ اسی طرح وہ مضامین بھی بتا دیے گئے جن کی تعلیم اگرچہ بجائے خود ضروری نہ تھی لیکن مذکورہ بالا بنیادی علوم کی تحصیل میں آسانی پیدا کرنے کے لحاظ سے اہم تھی۔ ان موخر الذکر علوم میں ریاضی، الجبرا، تاریخ اسلام، اقلیدس اور جغرافیہ بھی شامل تھے۔ عالم کی سند حاصل کرنے کے لیے ہر طالب علم پر لازم تھا کہ وہ اوّل الذکر مضامین میں سے سب میں کامیابی حاصل کرے اور موخر الذکر مضامین سے چند مضامین میں کامیاب ہو۔ اس امر کی صراحت بھی کر دی گئی کہ تعلیم کے ابتدائی چار[۴] سالوں میں طالب علم کو کسی کتاب کے حاشیہ یا شرح کے مطالعہ سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس کو سادہ اور عام فہم طریقہ سے مذہب کی مختلف شاخوں میں ضروری اور اہم معلومات بہم پہنچائے جانے چاہییں اور زیادہ تر اُس کی اخلاقی نشوونما پر توجہ کی جانی چاہیے۔

اساتذہ سے مشورہ کے بعد انتظامی کمیٹی نے متعدد ضمنی قوانین بھی نافذ کیے۔ جن میں سے بعض طریقۂ تعلیم کو منضبط کرنے کی غرض سے بنائے گئے تھے اور بعض اساتذہ اور طلباء کے تعلقات سے متعلق تھے۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ نئے انتظامات کے بعد سے طلباء اور اساتذہ دونوں اپنے اپنے کام میں سرگرمی اور انہماک دکھانے لگے۔ پہلے اُن طلباء کی تعداد جو امتحان میں شریک ہوتے تھے چھ[۶] سے زائد نہیں ہوتی تھی اور اوسطاً امتحان دینے والے طلباء کی تعداد تین[۳] فی سال تھی۔ لیکن نئے قوانین کے نفاذ کے بعد سے یہ تعداد پچانوے[۹۵] تک پہنچ گئی۔ ازھر کے اساتذہ کا خیال تھا کہ نصاب تعلیم میں جدید علوم کے شامل کر دینے سے لڑکے قدیم علوم سے غفلت برتنے لگیں گے اور تحصیل میں دل نہیں لگائیں گے۔ محمد عبدہ نے ایک آزمائشی امتحان لے کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ طلباء زیادہ تعداد میں کامیاب ہوتے ہیں جو علوم جدیدہ اور قدیم علوم دونوں کی تعلیم حاصل

کرتے ہیں بمقابلہ ان طلباء کے جو صرف قدیم علوم کی تحصیل میں مصروف رہتے ہیں۔ تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جامعہ ازھر کے کتب خانہ کی حالت بہت خستہ تھی بلکہ اس کا وجود و عدم برابر تھا۔ اکثر کتابیں جو کیڑوں کی نظر نہیں ہوئی تھیں مختلف رواقوں میں بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی حالت بہت ردی تھی۔ بہت سے نایاب نسخے مغربی علماء کے ہاتھوں بک چکے تھے اور جو باقی تھے وہ سستے داموں کتب فروشوں کو بیچے جا رہے تھے۔ ان مختلف مقامات سے جہاں کتابیں بکھری پڑی تھیں انہیں ایک مقام پر جو کتب خانہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا تھیلوں میں رکھ کر پہنچا دیا گیا۔ وہاں ان کی ترتیب و تہذیب کی گئی اور مضامین کے لحاظ سے انہیں تقسیم کر دیا گیا۔ اضلاع کے مدارس میں بھی کتب خانے قائم کیے گئے اور انتظامی امور میں یہ مدارس جامعہ ازھر سے ملحق کر دیے گئے۔ اس طرح سے یہ تمام مدارس انہیں قواعد و ضوابط کے تحت آ گئے جو ازھر میں نافذ تھے۔ ازھر میں جب کوئی نئی اصلاح ہوتی تھی تو اس کے اثرات دُور دُور تک پھیل جاتے تھے۔ ایسا کرنے میں محمد عبدُہ کا یہ مقصد تھا کہ ازھر ملک کی تعلیمی اصلاح اور ذہنی انقلاب کا مرکز بن جائے جس کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں زندگی اور حرکت کی ایک نئی لہر دوڑ جائے۔ یہاں اس چیز کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محمد عبدُہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ عربی ادب کا احیاء کیا جائے اور قدیم عربی معیار تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی تقریروں خطبوں اور تحریروں میں فصاحت و بلاغت کے نمونے پیش کر کے اس مقصد کی تکمیل کی بلکہ محکمہ وقف سے ایک خاص رقم اس غرض سے منظور کرائی کہ ازھر میں عربی ادب کا ایک مسلّم الثبوت استاد مقرر کیا جائے جو عربی زبان کی اصلی بلاغت کو زندہ اور مجسّم کر دے۔

جامعہ ازھر کی اصلاح کی غرض سے محمد عبدُہ نے جو کوششیں کی تھیں ان کا تذکرہ اس شرح و بسط سے اوپر اس لیے کیا گیا ہے کہ محمد عبدہ کے نزدیک یہ اصلاح ان کی زندگی کے اہم ترین

مقاصد میں سے تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو کل عالم اسلام کی اصلاح کا راستہ صاف ہو جائے گا اس لیے اس کام میں انھوں نے اپنے وقت و فرصت کا ایک ایک لمحہ اور اپنے ذہن و دماغ کی ساری قابلیتیں صرف کر دیں لیکن بدقسمتی سے جو کچھ مستقل کامیابی انہیں اس باب میں حاصل ہوئی وہ ان کے جوش و خلوص اور ان کی ان تھک کوششوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اصلاحات مکمل طور سے عمل میں آئیں خصوصاً نظم و نسق کی حد تک کوئی کمی باقی نہیں رہ گئی لیکن جہاں تک محمد عبدہ کے اُن مقاصد کا تعلق تھا جو ازہر کی روحانی و اخلاقی اور عقلی اصلاح کے لیے ان کے پیش نظر تھے ان کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ محمد عبدہ نے ان کی تکمیل کی داغ بیل ڈال دی۔ یہ نہ تھا کہ ازہر کے تمام اساتذہ اور طلباء اصلاح کے مخالف تھے۔ اس کے برخلاف بعض سربرآوردہ اساتذہ اور ممتاز طلباء اصلاح کی ضرورت کے سچے دل سے قائل تھے اور انھوں نے محمد عبدُہ کی ہر طرح مدد کی اور ان کی ہمت بڑھائی لیکن یہ اسی وقت تک تھا جب تک کہ محمد عبدُہ کو خدیو کی تائید اور حمائت حاصل تھی۔ شومئ قسمت سے خدیو کے الطاف و عنایات تھوڑے ہی عرصہ میں مخالفت سے بدل گئے۔ اس طرح رجعت پسند عناصر کا پھر غلبہ ہو گیا اور آخر کار ۱۹۰۵ء میں محمد عبدُہ نے مایوس ہو کر انتظامی کمیٹی سے استعفاء دے دیا۔ جامعہ ازہر سے ان کا تعلق اب ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا اور کچھ عرصہ کے بعد جامعہ مذکور پھر اپنی اصلی حالت پر عود کر آئی۔

مفتی مصر | جون ۱۸۹۹ء میں خدیو کی سفارش سے محمد عبدُہ مصر کے مفتی مقرر ہوئے اس عہدہ کے حامل کی حیثیت سے وہ شریعت اسلام کے شارح اور مفسّر تھے اور جن معاملات میں ان سے استفتا کیا جاتا تھا اُن سے متعلق ان کے فتوے مستند اور فیصلہ کن ہوتے تھے۔ اس سے پہلے جو لوگ اِس خدمت پر مامور تھے وہ اپنے تئیں حکومت کا مشیر قانونی خیال کرتے تھے اور بجز اُن

امور کے جن کی بابت سرکاری محکمہ جات استفتا کرتے یا قانونی مشورہ طلب کرتے اور کسی معاملہ میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ اگر رعایا کا کوئی فرد ان سے فتویٰ طلب کرتا تو وہ اُس پر کوئی توجہ نہیں کرتے تھے۔ اِن حالات کی وجہ سے جب محمد عبدُہ اُس خدمت پر مامور کیے گئے تو انہیں اندیشہ پیدا ہوا کہ اگرچہ یہ خدمت سب سے زیادہ اہم خدمت ہے جس کے لیے کوئی مسلمان فقیہہ تمنا کرسکتا ہے لیکن اس کا دائرہ کار اس قدر تنگ ہے اور اس میں خصوصی مہارت کی اتنی ضرورت ہے کہ اس کی ذمہ واریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ان کے جذبۂ عمل کے لیے کوئی راہ اور ان کی اصلاحی سرگرمیوں کے لیے کوئی وقت اور موقع نہ ہوگا۔ لیکن جس طرح دوسری سرکاری خدمات جن پر اُن کا تقرر کیا گیا تھا ان کی شخصی عظمت و وقار کی وجہ سے ایک نئی اہمیت اور وزن کی مالک ہوگئی تھیں اسی طرح اس نئے عہدہ میں بھی ان کی شخصیت نے چار چاند لگا دیئے۔ انہوں نے کام شروع کرتے ہی اہل ملک کو شرعی امور میں مشورہ دینا شروع کیا اور استفتا کرنے پر عوام الناس کو بھی فتوے دینے لگے۔ اس طرح وہ خدمت جس کی پہلے کوئی اہمیت نہ تھی بڑے اقتدار و اثر کا وسیلہ ہوگئی محمد عبدُہ اس خدمت پر انتقال کے وقت تک مامور رہے۔

مصر میں اُس وقت کئی ایک غیر مسلم اقوام بھی متوطن تھیں۔ اور مصر کے مسلمانوں کو ان قوموں سے روزمرہ کی زندگی میں سابقہ پڑتا تھا۔ اس وجہ سے بہت سے ایسے مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے تھے جن میں اسلامی شریعت کی تعبیر کی ضرورت داعی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ زمانہ جدید کے بدلے ہوئے حالات نے بھی نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے تھے خصوصاً اس وجہ سے کہ مصر کے مسلمانوں پر اسلامی قوانین کے ماسوا دوسرے قوانین کی بھی عملداری قائم ہوگئی تھی۔ ایسے حالات میں محمد عبدُہ کے سامنے مختلف النوع امور و مسائل پیش کیے جاتے تھے اور ان سے فتویٰ طلب کیا جاتا تھا۔ اُن فتووں سے جو محمد عبدُہ نے اس زمانہ میں جاری کیے تھے ہمیں ان کی بلند نظری

اور روایت پرستی اور تقلید کی بندشوں سے ان کی بالکلیّہ آزادی کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کو جدید حالات زندگی سے مطابقت دینے کے لیے انھوں نے بڑی پُرجوش اور مخلصانہ کوششیں کی تھیں لیکن ان کی وسعتِ نظر اور آزاد خیالی کی وجہ سے ان کے خلاف ایک عام برہمی پھیل گئی اور قدامت پرست طبقہ ان کی مخالفت پہ آمادہ ہو گیا۔ ان کے دو فتوے سب سے زیادہ ہدفِ تنقید بنے۔ پہلا فتویٰ یہ تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت کھانا مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔ دوسرا یہ تھا کہ ڈاکخانوں کے سیونگ بنک میں روپیہ رکھانا اور اُس سے سود حاصل کرنا بھی جائز ہے ان فتووں کی وجہ سے ان کی شہرت دُور دُور پھیل گئی اور وہ اپنے زمانہ کے ائمۂ مجتہدین میں شمار کیے جانے لگے یہاں تک کہ دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمان بھی اُن سے استفتا کرنے لگے۔

لیکن محمد عبدُہ نے اپنی سرگرمیوں کو صرف فتوے دینے تک محدود نہیں رکھا۔ ان کی نمایاں خدمات میں سے ایک یہ خدمت بھی تھی کہ انھوں نے مصر کے محاکم الشرعیۃ (وہ عدالتیں جو مسلمانوں کے معاشرتی امور مثلاً نکاح طلاق اور خلع وغیرہ کی نسبت شریعت کی رو سے فیصلے صادر کیا کرتی تھیں) کی بابت مکمل تحقیقات کی۔ مفتی کی حیثیت سے اس نوع کی تحقیقات ان کے اختیارات میں داخل تھی۔ وہ خود بھی دل سے چاہتے تھے کہ ان عدالتوں کی کارکردگی اعلیٰ درجہ کی ہو اور ملک میں ان کی وقعت اور ان کا احترام قائم ہو۔ حکومت نے اس تحقیقات کی غرض سے انہیں کامل اختیارات دے دیے تھے۔ انھوں نے ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دَورہ کرکے ہر صوبہ واری اور ضلع داری عدالت کا معائنہ کیا اور شخصی ملاقاتوں کے ذریعہ ان عدالتوں اور ان کے حکام کی حالت معلوم کی۔ اس تحقیقات سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان عدالتوں کے ناکارہ ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ حکام عدالت نا اہل تھے صحیح عدالتی طریق کار

پر عمل نہیں کیا جا رہا تھا ججوں اور دوسرے عدالتی عہدہ داروں کی تنخواہیں بہت کم تھیں علاوہ ازیں جن میں عام طور سے عدالتیں قائم تھیں اس کام کے لیے بالکل ناموزوں تھیں۔ اپنی رپورٹ میں انہوں نے اُس وقت کی عدالتوں کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اصلاح کی سفارشیں کیں اور ججوں کی تعلیم و تربیت کا طریقہ بتایا۔ اس رپورٹ کے پیش ہونے پر حکومت نے اس کی پیش کردہ سفارشات پر غور کیا اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے موزوں کارروائی کی مجلس قانون ساز نے بھی اس زمانہ میں عدالتوں کی اصلاح کی طرف توجہ منعطف کی اور مجلس مذکور کی سفارش پر حکومت نے دو کمیٹیوں کا تقرر کیا۔ ایک کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ جملہ عدالتی فیصلہ جات یکجا کر کے تاکہ نظائر کا ایک مجموعہ تیار کیا جا سکے جو ججوں کو فیصلہ دینے میں معاون ثابت ہو۔ دوسری کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ وہ ججوں کی تربیت و تعلیم کے لیے ایک مدرسہ کی تجویز پیش کرے محمد عبدہ ان دونوں کمیٹیوں کے صدر مقرر کیے گئے۔ انہوں نے اپنی آخری علالت سے چند روز قبل ہی مجوزہ مدرسہ کے متعلق اپنی سفارشات پیش کر دی تھیں۔

مفتی کی حیثیت سے وہ محکمہ وقف کی مجلس اعلیٰ کے رکن بھی تھے۔ انہیں کی کوششوں سے ایک کمیٹی ان کی صدارت میں اس غرض سے مقرر کی گئی کہ وہ اصلاح مساجد کی بابت اپنی رپورٹ پیش کرے۔ محمد عبدہ نے خود ہی یہ رپورٹ مرتب کی جس میں اصلاح مساجد کے لیے مختلف تجاویز پیش کیں مثلاً انہوں نے یہ رائے دی کہ مساجد کے خطیب، امام، مؤذن غرضکہ جتنے ملازمین مساجد سے متعلق ہیں سب کو مختلف درجات کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے دوئم مساجد کے خطیب اور امام وغیرہ اچھی قابلیت کے لوگ ہوں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ازہر کے تعلیم یافتہ اشخاص سے ان جگہوں کو پُر کیا جائے۔ ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر کے ان سے زائد کام بھی لیا جائے مثلاً وہ نمازیوں کو تھوڑی بہت مذہبی تعلیم بھی دیں۔ اس رپورٹ کو مجلس قانون ساز نے بھی منظور

کر دیا تھا لیکن خدیو کی مدافعت کی وجہ سے اس کی سفارشات کو پورے طور سے عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔

رکن مجلس قانون ساز | ۲۵ جون ۱۸۹۹ء کو محمد عبدُہ مجلس قانون ساز کے مستقل رکن مقرر ہوئے۔ ۲۹ جون کو انھوں نے مجلس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ مصر میں اس وقت نیابتی حکومت کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ چیز اس بات سے بھی ظاہر تھی کہ مجلس قانون ساز کے اختیارات بالکل محدود تھے۔ اور اس کی حیثیت صرف مشاورتی تھی۔ طریقہ کار بے قاعدہ اور غیر منضبط تھا۔ اہم معاملات میں مجلس مداخلت کرتے ہوئے پس و پیش کرتی تھی۔ ارکان مجلس حکومت کی طرف سے مشتبہ رہتے تھے اور خود حکومت کو مجلس پر پورا اعتماد نہ تھا۔ محمد عبدُہ نے مجلس قانون ساز کی بے بہا خدمت کی۔ انہوں نے اپنے تئیں پارلیمانی کام کا اہل ثابت کر دکھایا۔ وہ ایک پُر جوش مقرر اور پختہ کار قانون دان تھے۔ اور ہر قسم کے معاملات پر مستحکم اور صائب رائے دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس لیے بہت جلد وہ مجلس پر چھا گئے۔ ان کی رائے ہمیشہ مجلس کے لیے بڑی وزن کی مالک تھی۔ وہ ان تمام کمیٹیوں کے صدر ہوتے تھے جنہیں حکومت معاملات سلطنت اور امور مملکت پر غور و فکر کرنے کی غرض سے مقرر کرتی تھی۔ ان کی قیادت میں مجلس کا اثر و رسوخ عوام الناس اور حکومت دونوں پر بہت بڑھ گیا انہیں فرائض کی ادائیگی میں وہ اپنے وقت و فرصت کا بہترین حصہ گزارتے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ اس طرح نیابتی حکومت کے نشوو ارتقاء کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔ ان کی کوششوں سے مجلس کی کارکردگی بڑھ رہی تھی اُس میں عوام کی ضروریات و جذبات کا احساس ترقی کر رہا تھا۔ اِس لیے ضرور تھا کہ یہ روایات جن کی داغ بیل وہ ڈال رہے تھے آنے والے اراکین مجلس کو اپنے قالب میں ڈھال لیں۔ پھر ان کی مساعی جمیلہ سے اہل ملک اور عامۃ الناس کو حکومت کے معاملات اور

ملک کے نظم ونسق سے تعاون اور اشتراک عمل کا درس مل رہا تھا اور اس طرح وہ نیابتی حکومت کے لیے ضروری تربیت حاصل کر رہے تھے۔

مسلم امدادی انجمن | یورپ کے سفر میں محمد عبدہ مغربی زندگی کی ایک خصوصیت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ مغرب میں انہوں نے دیکھا کہ لوگ خیراتی کاموں میں بڑا حصہ لیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہاں بے شمار انجمنیں قائم ہیں۔ پبلک میں بھی ان انجمنوں اور اداروں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ دیکھ کر انہیں خیال پیدا ہوا کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی تقلید مسلمانوں کو بھی کرنی چاہیے۔ اگرچہ اسلام نے خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ پر بڑا زور دیا ہے اور اسلامی ممالک میں غریبوں کی خبرگیری اور شخصی امداد کا طریقہ عام ہے لیکن مسلمانوں نے خیرات اور امداد کے لیے اجتماعی اداروں کے قیام کی طرف مطلق توجہ نہیں کی ہے۔ چنانچہ غریبوں کی خبرگیری اور ضعیفوں اور مسکینوں کی اعانت میں مسلمانوں کو باہمی تعاون اور اجتماعی جدوجہد کا سبق دینے کے لیے اور امرا میں غربا کی طرف رحم وکرم کے جذبات پیدا کرنے کے لیے انہوں نے ایک امدادی انجمن کے قیام میں بڑا حصہ لیا اور خود اس انجمن کا رکن بننا منظور کیا۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ جو مسلمان معاش سے محروم ہوں یا روزی کمانے کے قابل نہ ہوں ان کی امداد کی جائے اور ایسے غریب بچوں کے لیے مدارس کھولے جائیں جو اتنے غیر مستطیع ہوں کہ سرکاری مدارس کے اخراجات بھی نہ ادا کر سکیں۔ انہوں نے انجمن کے بانیوں کے ساتھ اس مقصد سے تعاون کیا کہ انجمن کو بڑے بڑے اہل ثروت اور ذی مقدور لوگوں کی سرپرستی حاصل ہو جائے تاکہ انجمن کو جو لوگ اپنے ذاتی اغراض کے ماتحت بدنام کرنا چاہتے تھے اور حکومت کو اس کے خلاف اُبھارنا چاہتے تھے ان کی مخالفتوں کا مقابلہ بھی کیا جا سکے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں محمد عبدہ اس کی صدارت کے لیے منتخب کیے گئے اور آخر عمر تک اس انجمن کے صدر رہے

ادبی احیاء کی کوششیں | اس سے پہلے محمد عبدہ کی اُن کوششوں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے جنہیں وہ الوقائع المصریہ کی ادارت کے زمانہ میں عربی ادب کے احیاء کی غرض سے عمل میں لائے تھے ان کوششوں کا محرک صرف علمی اور ادبی ذوق نہ تھا۔ بلکہ محمد عبدہ کا خیال تھا کہ عربی زبان اسلام کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہے وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں میں اُس وقت تک سچی مذہبیت نہیں پیدا ہو سکتی ہے جب تک کہ عربی زبان سے واقفیت ان میں عام نہ ہو جائے۔ اس لیے مسلمانوں کی اصلاح کا ایک ذریعہ عربی زبان کی اصلاح بھی ہے۔ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے اس خیال کی توضیح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں "عربی زبان سے ناواقفیت کے سبب سے مسلمانوں کی بڑی اکثریت اپنے مذہبی علوم سے بے بہرہ ہے اور اصل مذہب اسی لیے عامۃ المسلمین کی رسائی سے باہر ہے۔ کیونکہ قدیم عربی ادب میں علم و فضل کے ایسے جواہر پارے اور مذہبی علوم کے ایسے ایسے دُرِ بے بہا پردہ خفا میں پڑے ہوئے ہیں کہ کوئی شخص جو عربی زبان پر حاوی نہیں ہے اُن تک نہیں پہنچ سکتا ہے"۔ لیکن وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ عربی زبان کا صحیح علم ان کتابوں کے واسطہ سے نہیں حاصل ہو سکتا ہے جو ازہر کے نصاب میں اس زمانہ میں داخل تھیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ مسلم ائمہ اور علماء کی بڑی بڑی تصانیف جو ماضی کے دور دراز گوشوں میں پڑی ہوئی تھیں پھر روشنی میں لائی جائیں اور انہیں از سرِ نو زندگی بخشی جائے۔ اس غرض سے سن ۱۹۰۰ء میں انہوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام انجمن احیاء علوم عربیہ تھا۔ محمد عبدہ اس انجمن کے صدر تھے۔ ان کی کوششوں سے فن خطابت پر دو مشہور تصنیفات کے قلمی نسخے دوسرے ممالک سے حاصل کیے گئے اور انہیں مرتب و مہذب کرنے بعد شائع کر دیا گیا۔ ایک بڑے عالم دین کی مدد سے انہوں نے عربی علم اللسان پر ایک مشہور تصنیف کو سترہ جلدوں میں شائع کیا۔ اس کے بعد امام مالک رح کی مشہور تصنیف موطا کے قلمی نسخے طونس سے منگوائے

گئے اور انہیں مرتب کرنے کے اخراجات برداشت کیے گئے۔ اس کے علاوہ اس انجمن نے وظائف اور رقمی امداد کے ذریعہ اُن تمام اہل قلم کی امداد بھی کی جو غیر زبانوں سے عربی میں کتابیں ترجمہ کرکے اس ادبی احیاء کی رفتار بڑھا رہے تھے۔

حمایت اسلام | اپنے استاد سید جمال الدین افغانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے محمد عبدہ نے حسب موقع ان الزامات اور حملوں کے خلاف اپنے مذہب کی حمایت کی جو عیسائی اور مغربی معترضین اسلام پر کیا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ مشہور ان کے وہ جوابات ہیں جو انہوں نے فرانس کے وزیر خارجہ جبرئیل ہونیٹو اور الجامعہ کے مدیر فرح انطون کی تحریروں پر شائع کیے تھے ان پرجوش اور چبھتے ہوئے جوابوں نے محمد عبدہ کی شہرت پوری دنیائے اسلام میں پھیلا دی اور ان کا شمار اسلام کے قابل ترین مفسروں میں ہونے لگا۔

ہونیٹو (HANOTAUX) کا مضمون سنہ ۱۹۰۰ء میں جرنل ڈی پیرس میں شائع ہوا تھا اور اس کا عنوان تھا "اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ"۔ المؤید میں اس مضمون کا عربی ترجمہ شائع ہوا۔ مصنف کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ حکومت فرانس کو اُن اختلافات کی طرف متوجہ کرے جو اس کی مسلمان رعایا اور عیسائی حکمران قوم کے خیالات و عقائد میں نمایاں تھے۔ اور حکومت کو یہ مشورہ دے کہ وہ ایک مختصر یادداشت مرتب کرے جس میں اُن اصولوں کی صراحت کی جائے جو حکومت فرانس اور اس کی مسلمان رعایا کے تعلقات کو متعین کریں گے۔ عیسائی مذہب اور اسلام کے تضاد کو ظاہر کرنے کی غرض سے اس نے مذہب کے دو بنیادی مسائل کو اپنی بحث کا موضوع قرار دیا یعنی فطرتِ الٰہی اور جبر و اختیار کا مسئلہ۔ اس نے اِس بات پر زور دیا کہ تصورِ الوہیت کی نسبت عیسائیوں کا یہ اعتقاد کہ خداوند تعالیٰ انسانی شکل و صورت میں مجسم ہو سکتا ہے اور انسان کے دکھ درد میں عملاً شریک بھی ہوتا ہے یعنی عقیدۂ تثلیث

ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے انسان کی عظمت اور خداوند تعالیٰ سے اس کی قربت ظاہر ہوتی ہے اس کے برخلاف وحدانیت کا عقیدہ اور تقدیر پر اعتقاد جس پر سب مسلمان متفق ہیں کہ انسان کی تحقیر و تذلیل کا موجب ہے۔ اور اس کے احساسِ عجز و بے چارگی کو تقویت دینے والا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کا یہ اعتقاد کہ انسان اپنے ارادہ اور عمل میں آزاد ہے انسان کی عملی قوتوں کے لیے ایک تازیانہ اور اس کی خود اعتمادی کے لیے ایک مضبوط اور مستحکم بنیاد ہے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کو تقدیر پہ بھروسہ ہے اور اس وجہ سے وہ اپنے تئیں نامعلوم قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔

محمد عبدہ نے اپنے جواب میں ہونیٹو پر اعتراض کیا کہ اس نے تاریخ کا مطالعہ گہری نظر سے نہیں کیا ہے۔ یورپ کی موجودہ تہذیب کو ابتدائی آریائی نسل کے تہذیبی سرچشمہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یونانیوں نے جنہیں ہونیٹو یورپ کا معلّم کہتا ہے اپنی تہذیب سامی اقوام سے حاصل کی ہے۔ جس زمانہ میں یورپ میں قتل و ہلاکت اور خونریزی کی تہذیب کے سوا اور کسی تہذیب کا پتہ تک نہ تھا مسلمان یورپ میں داخل ہوئے اور یونانیوں، مصریوں اور رومیوں کے علوم و فنون اور اُن کی ترقیات اپنے ساتھ لائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر قوم دوسری قوموں سے ضرورت کے موافق کچھ نہ کچھ اخذ کرتی ہے اور مغربی آریائی قوموں نے اپنے زوال و انحطاط کے دَور میں مشرقی سامی قوموں سے اس سے کہیں زیادہ اخذ کیا جتنا کہ آج روبزوال مشرق مغرب سے اخذ کر رہا ہے۔

محمد عبدہ نے بتایا کہ خدا کی وحدانیت کا اعتقاد سامی الاصل نہیں ہے بلکہ اس کی ابتدا عبرانیوں سے ہوئی۔ پھر تقدیر کا مسئلہ کسی ایک مذہب تک محدود نہیں ہے خود عیسائیوں میں اس مسئلہ کی بابت مختلف فرقوں میں بے حد اختلاف ہے۔ قرآن جبر سے انکار کرتا ہے اور

اس میں چھیالیس آیات ایسی ہیں جس میں سعی وعمل کی ترغیب دی گئی ہے اور انسانی ارادہ کی آزادی کا اثبات کیا گیا ہے۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ پیغمبر اسلام اور اُن کے رفقاء اور اصحاب نے ایک مختصر سی مدت میں دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اسلام کا سکہ جما دیا۔ یہ صحیح ہے کہ بعد میں بے عملی اور جمود کے افسون نے عالم اسلام کو متاثر کر دیا لیکن یہ صوفیاء کی تعلیم کا نتیجہ تھا اور تصوّف کی اشاعت کا پھل تھا جسے اسلام سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا کیونکہ تصوف کا مولد ومنشاء ایران تھا اور صوفیانہ عقائد وافکار بھی ایرانی الاصل تھے۔

خدا کی وحدانیت اور اس کی ماورائیت کے اعتقاد پر بحث کرتے ہوئے محمد عبدہ نے مختلف قوموں کے عقائد اور اُن کی زندگی پر ان عقائد کے نتائج واثرات کی مثالیں دے کر اس کا ناقابل انکار ثبوت پیش کیا کہ یہ عقیدہ انسانی فکر وتعقل کی اعلیٰ ترین فتوحات میں سے ہے اور اس کی بنیاد سراسر عقلی ہے برخلاف اس کے تثلیث کے عقیدہ میں خود عیسائیوں کے اقوال کے مطابق عقل وفکر کو کوئی دخل نہیں ہے قسطنطین کے عہد حکومت تک عیسائی مذہب کی ساری طاقت اور یورپ کی غیر عیسائی قوموں کے لیے اس کی زبردست اپیل اس بات میں تھی کہ عیسائیت ذات ایزدی کی ماورائیت (TRANSCENDENCE) پر زور دیتی تھی۔ تثلیث کا اعتقاد تو قسطنطین کے عہد کے بعد کی پیداوار ہے اور اسی عقیدہ کی بدولت مغربی زندگی میں لاتعداد بُرائیاں جڑ پکڑ گئیں جو دَورِ اصلاحات تک زائل نہ ہوسکیں۔

جب محمد عبدُہ کا یہ جواب شائع ہوا تو مصر کے اخبار الاہرام نے ہونیٹو (HANOTEAUX) کی حمایت میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا اور یہ ثابت کیا کہ ہونیٹو کے مضمون کا ترجمہ اغلاط سے پرتھا پھر جب ہونیٹو نے محمد عبدُہ کا مضمون الاہرام کے فرانسیسی اڈیشن میں پڑھا تو اس نے جرنل ڈی پیرس (JOURNAL DE PARIS) میں ایک اور مضمون شائع کیا جس کا ترجمہ الاہرام

نے مصر میں ۱۲ مئی سنہ ۱۹۰۰ء میں چھاپا۔ اس میں ہونیٹو نے بیان کیا کہ اس کے سابقہ مضمون کی اشاعت سے یہ مقصود نہ تھا کہ مذہب اسلام کو نیچا دکھایا جائے اور عیسائیت کی برتری ثابت کی جائے بلکہ اس کی اشاعت کی غرض یہ تھی کہ فرانسیسی حکمرانوں اور ان کی مسلمان رعایا میں باہمی مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ ان کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہو جائیں اور وہ ایک دوسرے کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اس کے بعد جب الاھرام کا مدیر پیرس گیا تو وہاں اس نے ہونیٹو سے ملاقات کی اور اس ملاقات کی ایک مختصر یادداشت ۱۶ جولائی سنہ ۱۹۰۰ء میں شائع کی۔ اس میں پھر ہونیٹو نے اسلام پر حملہ کرنے کے الزام سے اپنی بریت کا ثبوت دیا تھا لیکن اس نے یہ ضرور کہا کہ مشرق ابھی تک عدل و انصاف اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے جتنا ترقی یافتہ مغرب ہے۔ اس نے اپنے اس یقین کا بھی اظہار کیا جب تک مسلمانوں میں ریاست و مذہب کا موجودہ اتحاد باقی ہے اس وقت تک ترقی کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی ہے۔ یورپ نے بڑے تلخ تجربات کے بعد ان دونوں کی علیحدگی کا سبق سیکھا ہے۔

اس کے جواب میں محمد عبدہ نے المؤید میں تین مضامین شائع کیے۔ انہوں نے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ ہونیٹو کی تنقیدوں سے سبق حاصل کریں اور ہونیٹو نے ان کی جن کمزوریوں اور خرابیوں کو طشت از بام کیا ہے ان کو دفع کریں اور ان پر غالب آنے کی کوشش کریں تاکہ وہ ترقی کی دوڑ میں مغرب سے کامیاب مقابلہ کر سکیں۔ انہوں نے بتایا کہ پان اسلامزم یا اتحاد اسلامی کی تحریک جس کی طرف ہونیٹو نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا ہے کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے بلکہ یہ تحریک خالص مذہبی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان اپنی اصلاح کے لیے اس ایک راستہ پر قدم زن ہو جائیں جو ان کی اصلاح کی واحد راہ ہے اور یہ راہ سچی مذہبیت کی راہ ہے۔ انہوں نے ان تمام کمزوریوں اور خرابیوں کا کھلے دل

سے اعتراف کیا جن کو دور کرنا اتحاد اسلامی کی تحریک کا اولین مقصد تھا انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ اگر موجودہ اسلامی حکمران مذہب اور سیاست دونوں کی نمائندگی کرتے تو اُن کے لیے ناممکن ہوتا کہ وہ ظلم وستم اور اسراف کر کے مذہبی اصولوں کی اس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے جیسے کہ وہ آج کر رہے ہیں اور جس کی وجہ سے اسلامی ممالک پر فلاکت وادبار چھا گیا ہے اور وہ اپنی عزیز ترین متاع یعنی آزادی اور خود مختاری سے محروم ہو گئے ہیں۔

محمد عبدہ کا دوسرا مضمون جو انہوں نے اسلام کی مدافعت میں لکھا تھا اُس مقالہ کا جواب تھا جو الجامعہ کے عیسائی اڈیٹر نے ابن رشد پر لکھا تھا۔ دورانِ بحث میں مدیر الجامعہ نے علم وفضل اور حکمت وفلسفہ کی نسبت اسلام اور عیسائیت کے طرزِ عمل کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا کہ عیسائیت نے بمقابلہ اسلام کے مفکرین اور فلاسفہ کے ساتھ زیادہ رواداری کا برتاؤ کیا ہے اور نسبتہً اُن پر کم ظلم وستم ڈھائے ہیں۔ اس کی وجہ اُس نے یہ ظاہر کی تھی کہ اسلام میں دینی اور دنیوی اقتدار ایک ہی جگہ مرتکز ہے جس کی وجہ سے رواداری کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ عیسائی یورپ میں علم وفضل اور فلسفہ وسائنس ان تمام مخالفتوں اور دشواریوں پر غالب آ گئے جن کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔ اس کے برخلاف اسلامی دنیا میں آج تک علم وفلسفہ مغلوب ومقہور ہیں۔ اس مضمون میں مسلمان فلاسفہ کی جانب عِلَلِ ثانوی (SECONDARY CAUSES) کی اثر فرمائی کا انکار منسوب کیا گیا تھا اور ابنِ رشد کو ملحد بھی قرار دیا گیا تھا محمد عبدہ نے اپنے جواب میں چار چیزوں پر بحث کی

اول اس الزام کے جواب میں کہ مسلمانوں نے غیر مسلم علماء اور فلاسفہ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا ہے انہوں نے خود غیر مسلم مؤرخین کی شہادتوں سے اس الزام کو رفع کیا۔ دوئم انہوں نے اس دعویٰ کو غلط ثابت کیا کہ اسلامی فرقے ہمیشہ مذہبی مسائل کے متعلق آپس میں دست وگریبان رہے ہیں۔ سوم الجامعہ کے اڈیٹر نے اپنے مقالہ میں لکھا تھا کہ مذہب اسلام کی فطرت ہی میں ناروا داری اور

علم و ہنر سے بیزاری کے عناصر موجود ہیں ۔ اس کے برخلاف عیسائیت فکری آزادی کی حامی ہے اور اس نے ہمیشہ علم و فضل کی سرپرستی کی ہے ۔ اس پر محمد عبدہ نے تفصیلی بحث کی ہے ۔ وہ مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان دونوں مذاہب کی فطرت ان کے رجحانات اور ان رجحانات کے نتائج کا فرق واضح کرتے ہیں ۔ چہارم اس دعوے کے جواب میں عیسائیت کی رواداری کی برکات کی وجہ سے اہل مغرب ترقی اور تمدن کے اس اعلیٰ مرتبہ تک پہنچے ہیں محمد عبدہ تاریخ سے اس امر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب نے نہ صرف دوسرے مذاہب کے علماء اور فلاسفہ کی فکری آزادی کو پامال ستم کیا بلکہ خود عیسائی مفکرین اس کی سخت گیریوں اور ستمرانیوں سے نالاں اور شاکی رہے ہیں ۔ اس کے بعد وہ تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ اسلام نے علم و فضل اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ علماء اور فلاسفہ کی سرپرستی کی ہے پھر محمد عبدہ ان اسباب پر نظر ڈالتے ہیں جنہوں نے موجودہ زمانے میں اسلامی نظام کو اس قدر بے لوچ بنا دیا ہے اور اس ناخوش گوار تبدیلی کے مضر نتائج کی صراحت کرتے ہیں اور مادہ اور حیات کے متعلق ابن رشد اور دیگر اسلامی مفکرین کے نظریات کی وضاحت کرتے ہیں ۔

ناتمام ارادے | جامعہ ازھر کی انتظامی کمیٹی سے محمد عبدہ کے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے ان کے اکثر ارادے ناتمام رہ گئے ۔ انہوں نے شیخ الازھر کی یہ تجویز قبول کرلی تھی کہ وہ ازھر میں تاریخ اسلام پر لکچر دیں اور اس مضمون پر ایک کتاب جدید طرز کی کتاب تصنیف کریں ۔ لیکن جب ازھر سے ان کا تعلق منقطع ہو گیا تو یہ تجویز بھی تشنہ تکمیل رہ گئی ۔ اس کے علاوہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ان مخالفتوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے جو اس وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں کہ وہ جامعہ ازھر کو عالم اسلامی کی اصلاح کا مرکز بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے

سب سے پہلے خود جامعہ ازہر کی اصلاح کرنا چاہتے تھے تو انہوں نے اپنی اس ناکامی پر صبر کر لیا۔ اس کے بعد اسی مقصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایک نئے ادارہ کی بنا ڈالنی چاہی اس کے لیے ملک کے ایک بڑے امیر و کبیر شخص نے جو اس تجویز کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا اپنی زمین کا ایک قطعہ بھی وقف کر دیا تھا اور مجوزہ ادارہ کا خاکہ بھی تیار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن ان کی موت کی وجہ سے یہ تجویز عملی شکل نہ اختیار کر سکی۔ قرآن مجید کی وہ تفسیر بھی نامکمل رہ گئی جو انہوں نے کچھ عرصہ قبل لکھنا شروع کی تھی۔

ایک اور تجویز بھی ان کے ذہن میں تھی اور وہ یہ تھی کہ ایک کمپنی اس غرض سے بنائی جائے کہ وہ ایک عربی روزنامہ کی اشاعت کا انتظام کرے جو ادبی لحاظ سے اپنا آپ نمونہ ہو اور جس کی مجلس ادارت قابل ترین افراد پر مشتمل ہو۔ اس روزنامہ کے ذریعہ محمد عبدہ ملک اور اہل ملک کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور اس غرض سے اُسے سیاسی خبروں سے پاک رکھنا چاہتے تھے لیکن موت نے اس ارادہ کو بھی پورا نہ ہونے دیا وہ مشرقی ممالک کے سفر کا بھی ارادہ کر رہے تھے تاکہ ایران، افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کی صحیح حالت کا اندازہ کر سکیں جس طرح کہ مغربی ممالک کے مسلمانوں کی صحیح حالت کا انہیں اندازہ تھا۔

علالت اور موت ان کی آخری علالت کا سلسلہ جو ان کی موت پر منتہی ہوا ان کے ایک دوست محمد بے کے مکان سے شروع ہوا جہاں وہ اُس زمانہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ صاحب اسکندریہ سے قریب ایک قریہ میں سکونت پذیر تھے۔ ان کا مرض بہت پرانا تھا اگرچہ اُس کے مہلک ہونے کا اندیشہ کسی کو نہ تھا لیکن ان کی حالت بڑھتی گئی یہاں تک کہ جمعرات کے روز گیارہ جولائی ۱۹۰۵ء کو انہوں نے اس عالم فانی کو الوداع کہا۔

دوسرے روز اُن کا جنازہ جس کے پیچھے ہزاروں لوگ زار و قطار رو رہے تھے اسٹیشن لایا گیا

وہاں سے ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ ان کی نعش قاھرہ آئی۔ راستہ میں اہم مقامات پر ریل روک لی جاتی تھی تاکہ ان کے ہم وطنوں کا اجتماع ان کا آخری دیدار کر سکے۔

قاہرہ میں اسکندریہ کے مجمع سے کئی گنا زیادہ مجمع ان کے جنازہ کو نماز کے لیے مسجد ازھر پہنچانے کے لیے موجود تھا۔ اس مجمع میں حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار غیر ممالک کے سفرا اور پولیس کے دستے علماء اور اہل قلم حضرات کی ایک کثیر تعداد ازھر کے طلبا کی کئی ٹولیاں غرضکہ ہر فرقہ جماعت اور مشرب کے لوگ شریک تھے۔ مسجد میں نماز کے بعد محمد عبدہ کے مناقب و فضائل پر ایک کلمہ بھی نہیں کہا گیا کیونکہ خود محمد عبدہ نے اپنی زندگی میں اس رسم کو مٹا دیا تھا۔ نماز کے بعد یہ پورا مجمع جنازہ کے ساتھ قبرستان گیا۔ جہاں محمد عبدہ کے جسم فانی کو ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کر دیا گیا۔ حسن پاشا نے مجمع کو منتشر ہو جانے کا حکم دیا اور اس یگانہ فضیلت کی تعریف میں کسی کو ایک لفظ تک کہنے کی اجازت نہیں ملی۔ موت کے چالیس دن بعد رواج کے مطابق دعاء و مغفرت کے لیے لوگ پھر قبرستان میں جمع ہوئے اس مرتبہ مجمع اور زیادہ تھا۔ چھ[6] مقررین منتخب کیے گئے جنہیں محمد عبدہ سے خاص تعلق تھا اور جو ان کے مقاصد اور خیالات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان مقرروں نے ان کے حالات زندگی بیان کیے اور ان کے کارناموں کی تعریف و توصیف کی۔ اس کے بعد مجمع منتشر ہو گیا۔

سیرت و کردار | محمد عبدہ کی وفات کے بعد وہ تمام نکتہ چینیاں، اعتراضات، پرجوش مخالفتیں اور خفیہ سازشیں جو زندگی بھر ان کی شخصیت کو گھیرے ہوئے تھیں اور جو ان کی عمر کے آخری دو[2] سالوں میں اور بڑھ گئی تھیں دفعتہً سرد پڑ گئیں ملک و قوم اور اصلاح مذہب کی تحریک کو ان کی موت سے جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اس کی یاد بہت دنوں تک فراموش نہ کی جا سکی۔ ہر مذہب فرقہ اور جماعت کے لوگوں نے باہمی اختلافات کے باوجود متفقہ طور سے اس محب وطن اس یگانہ

روزگار شخصیت اور اس باہمت مصلح و رہنما کے کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

بلاشبہ محمد عبدہ کی ذات میں قیادت و رہنمائی کے لیے جتنی خصوصیات ضروری ہیں سب کی سب موجود تھیں جسمانی لحاظ سے وہ توانا اور تندرست تھے اگرچہ قدآور نہ تھے۔ داڑھی گھنی اور آواز پاٹ دار تھی۔ مزاج کے البتہ وہ تیز تھے۔ ان کی تقریر میں روانی اور برجستگی ہوتی تھی اور ان کی زبان تحریر و تقریر دونوں میں فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا حافظہ قوی اور قوتِ استدلال نہایت زبردست تھی۔ وہ غیر معمولی محنت و مشقت کے عادی تھے اور جیسا کہ ان کی زندگی کے مختلف ادوار سے ظاہر ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی عملی اور انتظامی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے۔ علم و فضل میں جو درجہ کمال انہیں حاصل تھا اس کی وجہ سے ان کا شمار اپنے زمانہ کے بڑے بڑے علماء میں ہوتا تھا اور اسلامی دنیا میں اسی وجہ سے انہیں ایک مخصوص حیثیت حاصل تھی اسلامی علوم کی کوئی شاخ ایسی نہیں تھی جس میں انہیں معمولی سے زیادہ درک نہیں حاصل تھا۔ فلسفہ دینیات، فقہ، حدیث اور دیگر علوم میں ان کا فضل و کمال مسلّم تھا۔ عربی ادب سے ان کی واقفیت بہت وسیع تھی اور اس ادب کے وسیع مطالعہ سے ان کا انداز تحریر و تقریر ایک خاص سانچہ میں ڈھل گیا تھا۔ جس سے انہوں نے اپنے علمی اور تعلیمی کاموں میں بہت فائدہ اٹھایا۔ تاریخ اسلام سے انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ابنِ خلدون کی تاریخ کا نہ صرف مطالعہ کیا اور اس پر تبصرہ لکھا بلکہ اپنی تصنیف رسالۃ التوحید کے تمہیدی حصہ میں انہوں نے اسلام کے نشوو ارتقاء پر ایک مستقل مقالہ بھی سپرد قلم کیا جس میں انہوں نے ایسی اصابت رائے اور صحت فکر کا ثبوت دیا جو عام طور سے مشرقی مورخین میں کم پائی جاتی ہے۔ اپنی فلسفیانہ تصانیف میں بقول پروفیسر ہارٹن (PROF HORTEN) نہ وہ ابن رشد کی سی گہرائی پیدا کر سکے اور نہ کسی بڑے فلسفی کی سی بلند پروازی دکھا سکے۔ اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے جیسا کہ پروفیسر مذکور کو خود اقرار

ہے کہ جہاں تک اُن کی اُس کوشش کا تعلق ہے جو انہوں نے اسلام کے روایتی اور قدیم فلسفہ کی جگہ ایک نئے اسلامی فلسفہ کی تعمیر اور اسلامی فقہ اور شریعت کے قوانین کو زمانہ حال کے مرقع علم سے مطابقت دینے کے لیے کی تھی کہ انہوں نے وہ سب کچھ کر لیا جو اُن ناموافق حالات میں کسی انسانی ذہن کے لیے ممکن تھا۔

مغربی علوم کی مختلف شاخوں سے بھی وہ کچھ کم واقفیت نہ رکھتے تھے اگرچہ اس باب باب میں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ تراجم کے ذریعہ حاصل کیا تھا چالیس سال کی عمر میں انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی تاکہ فرانسیسی زبان کا علم انہیں براہِ راست حاصل ہو جائے۔ اس کے بعد پھر وہ فرانسیسی زبان کی کتابوں کا مطالعہ لگاتار کرتے رہے تاریخ اخلاقیات فلسفہ اور فن تعلیم سے انہیں زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ مشہور فلسفی ہربرٹ سپنسر (HARBERT SPENCER) کے بڑے مداح تھے۔ اور اُن سے انگلستان میں ملاقات بھی کی تھی۔ ان کی کتاب (ON EDUCATION) کا ترجمہ بھی انہوں نے فرانسیسی زبان سے عربی میں کیا تھا اور اس کتاب کے ترجمہ سے ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ انہیں مصر کے مدارس اور خصوصاً جامعہ ازھر کی اصلاح میں مدد ملے۔ اسی طرح وہ روسی ادیب ٹالسٹائی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے اور جب روسی کلیسا نے ٹالسٹائی پر کفر کا فتویٰ دیا تو انہوں نے ٹالسٹائی کو ایک خط بھی لکھا۔

جو شخص محمد عبدہ سے ایک بار بھی ملا وہ اُن کی سیرت کی پختگی اور کردار کی بلندی کا گہرا نقش لے کر واپس ہوا اُن کی رفتار و گفتار اور وضع قطع سے ایک فطری تمکنت ظاہر ہوتی تھی۔ اور چونکہ وہ بڑے سے بڑے مقتدر اور با اثر شخص کے ساتھ بھی عاجزی یا خوشامد سے پیش نہیں آتے تھے اس لیے بعض دفعہ اُن پر مغرور اور بد دماغ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا لیکن حقیقتاً وہ بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے جیسا کہ دوستوں اور طلباء کے ساتھ ان کے برتاؤ اور طرز تخاطب سے صاف معلوم

ہوتا تھا۔ اپنے مخالفین اور بدخواہوں کے ساتھ بھی وہ بڑی کشادہ دلی کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ اپنے دوستوں پر انہیں بڑا اعتبار تھا اور اس میں بعض دفعہ وہ اتنا غلو کرتے تھے کہ اس کی وجہ سے انہیں طرح طرح کے خطرات کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ غریبوں اور حاجتمندوں کے لیے وہ بڑے فیاض تھے یہاں تک کہ ان کی فیاضی ضرب المثل ہو گئی اور انہیں بدنصیبوں کا سرپرست کہا جانے لگا۔ ان کا مکان واقعی بدنصیب لوگوں اور ستم زدہ افراد کے لیے ایک جائے پناہ بن گیا تھا۔ اُن کے دروازہ پر اکثر اوقات حاجتمندوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی خصوصاً ازھر کے نادار طلباء کے لیے اُن کی آمدنی کا ایک حصہ وقف تھا اور ان کے حسابات میں وہ ماہانہ امداد بھی شامل رہا کرتی تھی جو وہ ازھر کے بعض غیر مستطیع طلباء کو دیتے تھے۔ اپنے قول کے بڑے سچے تھے اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی کسی بات میں مبالغہ کا شائبہ نہ ہو۔ ہر معاملہ میں بڑے غور و خوض کے بعد وہ فیصلہ کرتے تھے لیکن جب فیصلہ کر لیتے تو اس پر مضبوطی سے قائم رہتے فکر و عمل کی آزادی ان کا ایک امتیازی وصف تھا مگر یہ نہ تھا کہ وہ کسی سے مشورہ نہ لیتے ہوں جب کبھی ضرورت محسوس کرتے دوسروں سے مشورہ اور امداد طلب کرتے لیکن ان کی وہ صفت جس نے جریدہ عالم پر ان کا دوام ثبت کر دیا اور جو ان کی شخصیت کا اعلیٰ ترین جوہر تھی ان کی بے مثال اخلاقی جرأت تھی۔ ایک عربی اخبار نے ان کی موت کے بعد لکھا " مشرق کے سب سے بڑے مرکز میں اُس ملک میں جو تخویف ظلم اور جابرانہ ملوکیت کا محفوظ ترین نشیمن تھا یہ باہمت اور جری مردِ شخص ہر بات میں اپنی غیر پابند اور آزاد رائے کا علی الاعلان اظہار کرتا تھا اور اُس پر ثابت قدمی کے ساتھ جما رہتا تھا بغیر اس خوف کے ارباب اقتدار اور اعیان سلطنت پر اس کا کیا اثر پڑے گا" حالانکہ اس حق پرستی اور آزادیٔ رائے کی وجہ سے انہیں متعدد آزمائشوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اسلام اور اس کے نصب العین زندگی کے ساتھ عقیدت ان کے تمام اعمالِ حیات کا سرچشمہ

تھی۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ اسلامی نظام کی کامل اصلاح ہی (جو درحقیقت صدر اوّل کے اسلامی نظام کی طرف رجعت کے مترادف تھی) سے مسلمان وقت اور ماحول کے مطالبات کو پورا کر سکیں گے اِس مقصد کے حصول میں ان کا رہوارِ عمل ہر ٹھوکر پر ایک نیا تازیانہ کھاتا تھا۔ وہ کہتے تھے" میں موت کے سوا اور کسی شئے سے نہیں ڈرتا ہوں اور اُس سے بھی صرف اس لیے خائف رہتا ہوں کہ میرا مقصد ناتمام رہ جائے گا"۔ جب ان کے دوست انہیں مشورہ دیتے تھے کہ تم اُن ذمہ دار خدمتوں سے سبکدوش ہو جاؤ جہاں شبانہ روز کی محنت کے بعد تمہیں صرف یہ صلہ ملتا ہے کہ مخالفین تلخ تنقیدیں کرتے ہیں اور تمہیں اپنے ناروا حملوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس کے بجائے تم عدالت مرافعہ میں اپنی پرانی خدمت پر واپس چلے جاؤ جہاں کام کم اور تنخواہ زیادہ ہے تو وہ ہنس کر ان کی باتوں کو ٹال دیتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس طوفان بدتمیزی کے باوجود جو اُن کے خلاف برپا تھا اُن کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اُن کا وہاں رہنا ضروری تھا۔ اُن کے ایک دوست لکھتے ہیں" میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے لیے ناممکن تھا کہ وہ جس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے اُسے خیرباد کہہ دیتے"۔ کبھی کبھی وہ راتوں کو نیند سے بیدار ہو جاتے تھے اور گھنٹوں اس پر غور کیا کرتے کہ مسلمانوں کی پستی رفع کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اسلام اور مسلمانوں سے گہری وابستگی کے ساتھ انہیں قوم و ملک سے بھی سچی محبت تھی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ قوم و ملک سے محبت اُن کے لیے درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کی محبت کے ہم معنی تھی۔ ان کی تمام سرگرمیوں میں جو چیز ان کا سب سے بڑا سہارا تھی وہ یہ غیر منقطع امید تھی کہ اُن کی کوششیں ضرور سرسبز و بارآور ہوں گی۔ اس یقین و امید کی روشنی میں تمام پریشانیاں فکریں اور مایوسیاں اُن کی نظروں سے غائب ہو جاتی تھیں۔ اصلاح قوم کی امید نے ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا کیونکہ ان کو پختہ یقین تھا کہ اصلاح کا بیج ایک ایسی سرزمین میں بویا جا رہا ہے جو اُسے اپنی

آغوش میں لینے کے لیے بالکل تیار ہے۔ اور یہ بیج اسی طرح بار آور ہوگا جس طرح کہ خرابی کے بیج پہلے بوئے گئے تھے اور ان سے بڑے بڑے تناور درخت پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے زندگی بھر کی کمائی خیالات و عزائم کے ان نئے بیجوں کے بونے میں صرف کر دی۔

جب انہوں نے تحریک اصلاح شروع کی تو انہیں معلوم ہوا کہ اُن کے ہم وطن دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک طرف وہ قدامت پرست گروہ تھا جو ہر قسم کی تبدیلی اور جدت کا مخالف تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں گزشتہ زمانہ سے جو کچھ ملا ہے اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ ایک مقدس امانت ہے جسے اپنی جگہ پر محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس گروہ کے نمائندے زیادہ تر ازہر کے شیوخ اور علماء اور ان کے متبعین تھے۔ دوسری طرف ایک تجدد پسند جماعت تھی جو زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل تھی جنہوں نے جدید طرز پر تعلیم پائی تھی اور جن کا خیال تھا کہ ماضی سے یہ گہری وابستگی فکر و خیال کی آزادی کے لیے سم قاتل ہے اور اس کی وجہ سے ترقی کا ہر اقدام اور اصلاح کی ہر تحریک ناکام و نامراد رہتی ہے۔ محمد عبدہٗ ایک معنی کر کے ان دونوں جماعتوں میں شامل تھے اور دونوں کے سرگروہ تھے۔ قدامت پرست ان کے علم و فضل اور ان کی اسلامی حمیت کا احترام کرتے تھے اگرچہ ان کی تجدد پسندی سے ناراض تھے۔ ترقی پسند طبقہ انہیں اپنا سب سے بڑا رہنما اور قائد خیال کرتا تھا اور ان کے اصولوں میں ایک درخشاں مستقبل کی روشنی دیکھتا تھا لیکن ان کے مخالفین سب قدامت پرست نہ تھے بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی اپنی جگہ بڑے اثر و اقتدار کے مالک تھے اور محمد عبدہٗ کی سرگرمیوں اور کوششوں میں انہیں اپنے اثر و اقتدار کے زوال کا چہرہ نظر آتا تھا بعض لوگ اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر ان کے دشمن تھے۔ وہ لوگ جو اسلامی ممالک کو ایک واحد حکمراں کے تحت ایک ہی سیاسی وحدت میں منسلک دیکھنے کے آرزومند تھے اس بات سے خوف زدہ تھے کہ کہیں غیر مسلم

اقوام اور مغربی ممالک سے میل جول کا نتیجہ اس تخیل کی بارآوری میں رکاوٹ نہ بن جائے لیکن ان کے مخالفین میں سب سے زیادہ تعداد انہیں لوگوں کی تھی جو یا تو جہالت یا فطری میلان طبع کے سبب سے قدامت پرست تھے اور قدما کے افکار و تخیلات سے سرمو انحراف کو خدا اور رسول کے احکام سے انحراف کے ہم معنی سمجھتے تھے وہ کہتے تھے یہ شیخ کیسا ہے جو فرانسیسی زبان بولتا ہے یورپ کا سفر کرتا ہے مغربی تصانیف کا حوالہ دیتا ہے اور ان کا ترجمہ اپنی مقدس زبان میں کرتا ہے جو بڑے بڑے علما سے اختلاف کرتا ہے اور ایسے ایسے فتوے دیتا ہے جو آج تک کسی نے نہیں دیے۔ یہی لوگ عوام کے ذہن میں ان کی مخالفت کا زہر اتارتے تھے اور بے سمجھ عوام جو ان کے مقاصد زندگی کو سمجھنے کی اہلیت سے محروم تھے ان افترا پردازوں کے دھوکہ میں آکر انہیں ملحد اور بے دین کہتے تھے۔

اگرچہ عام طور سے تجدد پسند طبقہ ان کی ہدایت و رہنمائی پر عامل تھا لیکن اس میں بعض افراد ایسے بھی تھے جو انقلاب کو اور زیادہ تیز رفتار کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ وہ تھے جو یہ چاہتے تھے کہ مغربی تمدن بتمام و کمال اپنی ساری رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ سرزمین مصر پر اتر آئے اور مغربی زندگی کے تمام تکلفات مصر میں گھر کر جائیں۔ ان لوگوں پر محمد عبدہ نے ابتدا میں بہت سخت تنقید کی تھی اور ان کے متعلق انہوں نے کہا تھا کہ یہ لوگ قومی ترقی کے متعلق بہت سطح بینی سے کام لے رہے ہیں۔ اس طرح محمد عبدہ اور ان کے ساتھی دو مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ لارڈ کرومر لکھتے ہیں کہ دوسری جماعت اتنی آزاد خیال تھی کہ قدامت پرست مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہیں لے سکتی تھی۔ نہ تو ان میں اتنی مغربیت تھی کہ وہ ہو بہو مغربی زندگی کی نقل اتار سکتے اور نہ وہ مشرقی تمدن کی خصوصیات کے حامل تھے۔ اگرچہ محمد عبدہ کے حامیوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن ترقی اور اصلاح کا جو ولولہ ان

کے دلوں میں موج زن تھا وہ کہیں زیادہ تیز اور احاطہ کن تھا۔ خود جامعہ ازہر میں ایسے لوگ تھے جو اصلاح کی ضرورت کے قائل تھے اور اُن کی مساعی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے ازہر سے باہر اس سے بھی زیادہ تعداد میں لوگ دل ہی دل میں اُن سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن وہی کمزور خیالی اور آزادانہ اظہار رائے کا خوف وہی بے عملی اور اخلاقی جرأت کی کمی جو ازہر میں محمد عبدہ کے حامیوں کو اُن سے تعاون نہیں کرنے دیتی تھی ازہر سے باہر بھی ان کے ہم خیالوں کو گونگا اور اپاہج بنائے ہوئے تھی۔ اس کے برخلاف ان کے مخالفین کا شور و غوغا بڑھتا ہی گیا اور ان کے دشمنوں کے فتنہ خیز عزائم شر انگیزی سے باز نہ آسکے۔ دوستوں کی کمزوری اور مرعوبیت مخالفین کی جرأت اور بے خوفی۔ اُن کی راہ میں یہی دو بڑی روکاوٹیں تھیں۔

ان کی شہرت و نام آوری کا دائرہ صرف سرزمین مصر تک ہی محدود نہ تھا۔ دیگر اسلامی ممالک کے بسنے والے مسلمان بھی ان کی اسلامی خدمات کی شہرت سے متاثر ہو کر خطوط کے ذریعہ مذہبی، قانونی اور معاشرتی امور میں اُن سے استفسا کرتے تھے یا اور طریقوں سے ان کے علم و فضل سے منفعت پذیر ہوتے تھے۔ ان امور سے متعلق ہندوستان سے لے کر مراقش تک جملہ اسلامی ممالک کے علماء، بادشاہوں اور عہدہ داروں سے ان کی خط و کتابت تھی۔ اسلامی ممالک میں ان کے نام کا کتنا اثر تھا یہ صرف اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی موت کے بعد شام اور ترکی میں اخباروں کو ممانعت کر دی گئی کہ نہ تو وہ ان کی موت کی اطلاع شائع کریں اور نہ اپنے کسی اداریہ یا مضمون میں اُن کی ثنا و صفت بیان کریں۔ اُن کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تو ان کا نام زبان پہ لانا بھی مستوجب سزا خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اُن کے نام کے ساتھ تحریک اصلاح کا تذکرہ آنا بھی ضروری تھا۔ شام

ہندوستان، بحرین، سنگاپور، جاوا، روس، ایران، تیونس، الجیریا اور دیگر اسلامی ممالک سے جو تعزیتی پیامات ان کے اعزا اور دوستوں کو وصول ہوئے وہ اُن کی شہرت کی وسعت و گیرائی پر گواہ ہیں۔ اس دعویٰ کا مزید ثبوت اس امر سے فراہم ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد اُن کے مختصر حالات زندگی اور ان کی بابت تعریفی مضامین نہ صرف اُن ممالک کے اخبارات میں شائع ہوئے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے بلکہ سان پاولو (SAN PAOLO) برازیل اور نیو یارک کے عربی اخبارات میں بھی اسی قسم کے کئی مضامین شائع ہوئے جن میں اُن کا اور علامہ جمال الدین کا تذکرہ مدحت پاشا اور فواد پاشا کے نام کے ساتھ آیا ہے۔ مغربی علماء بھی ان کی تعریف و توصیف میں شریک تھے جیسا کہ علامہ جمال الدین افغانی کے سوانح نگار ای۔ جی۔ براؤن کے پیغام سے ظاہر ہے جس میں اس نے محمد عبدہ کی موت پر ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے "علم و فضل میں، تقویٰ اور ریاضت میں، دانشمندی، فصاحت اور خلائق کی نفع رسانی میں موجودہ زمانہ میں ان کا سا شخص نہ مغرب میں پیدا ہوا اور نہ مشرق میں"۔

ان کی تصانیف کے ترجمے اکثر زبانوں میں ہو چکے ہیں اور بعض میں ابھی ہو رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک میں ان کا اثر اب بھی قائم ہے۔ محمد رشید رضا کا بیان ہے کہ ان کی تصنیف رسالۃ التوحید (جس میں انہوں نے اپنے مذہبی اصول و عقائد کی توضیح کی ہے) کا ترجمہ اُردو زبان میں ہو چکا ہے اور یہ کتاب علی گڑھ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔ ڈاکٹر احمد محی الدین نے اپنی ایک کتاب میں (جو انہوں نے ترکی زبان میں تحریک تجدد پر تصنیف کی ہے) لکھا ہے کہ اُن کی تصانیف کے بعض حصوں کا ترجمہ عاکف نے ترکی زبان میں کیا ہے اور ڈاکٹر موصوف نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ترکی قوم پرستوں اور اصلاح پسندوں کے خیالات و افکار پر محمد عبدہ کی تصانیف کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا ہے۔

ایک ولندیزی فاضل ڈاکٹر کریمر جس نے ملایا کے مسلمانوں کی حالت کا خاص طور سے مطالعہ کیا ہے ایک جگہ لکھتا ہے :-

"محمد عبدہ کے افکار و نظریات جزائر شرق الہند میں اب نفوذ کر رہے ہیں۔ اُن کی تفسیر قرآن کا ترجمہ ملایا کی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ جاگجیا میں محمدیہ فرقہ محمد عبدہ کے اسلام کی تبلیغ کر رہا ہے اگرچہ اس تبلیغ میں ان کا نام زبانوں پر نہیں آتا ہے۔ مغربیت کی ترقی یہاں علم و تعلیم کی اشاعت طبی امداد کی فراہمی اور نوجوانوں کے ذریعہ پروپیگنڈے کی شکل میں نمودار ہو رہی ہے۔ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں اِن چیزوں کی محرک ہوئی ہیں۔ اور ترقی کی تمام کوششیں انہیں خطوط پر ہو رہی ہیں جن پر مشنریوں نے کام کیا ہے۔ محمدیہ تحریک کے ماسوا ایک اور تحریک "ارشاد" کے نام سے جاری ہے جو بٹیویا (BATAWIA) کے عربوں میں بہت مقبول ہے۔ یہ بھی ایک ترقی پسند تحریک ہے۔ اس کے برخلاف مذہبی رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی کوئی منظم تحریک یہاں بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ اس قسم کی بعض چھوٹی چھوٹی تحریکیں ہیں مگر غیر معروف۔ اس کے بعد حاجی سلیم کی تحریک ہے جس کا مقصد مسلمانوں کے افکار کو اتحاد اسلامی اور بین الملیت کی طرف راغب کرنا ہے۔ اس طرح مذہبی قدامت پسندی اور روایت پرستی کے قلعہ پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ یہ سب اُس سمندر کی لہریں ہیں جو محمد عبدہ کے دل میں موجزن تھا۔"

الغرض محمد عبدہ گزشتہ صدی کے ایک عظیم المرتبت انسان تھے علم و فضل، تقریر و خطابت، حب الوطنی اور مذہبی خدمات جس جس پہلو سے دیکھیے معلوم ہوگا کہ اُن کی زبردست شخصیت اپنے زمانہ پر گہرے نقوش ترسیم کر گئی ہے۔ اور ان خصوصیات کے لحاظ سے ان کا مقابلہ اُن کے زمانہ کی بڑی بڑی ہستیوں سے کیا جا سکتا ہے لیکن جس چیز نے اُن کی عظمت کو چار چاند لگا دیے وہ ان

کا جذبہ اصلاح تھا اور اس کا عملی مظاہرہ۔ کیونکہ بقول جرجی زیدان قوموں کی تاریخ میں خواہ وہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو ایسے افراد کم نظر آتے ہیں جن کی سرگرمیوں کا پیمانہ اتنا وسیع ہو جتنا کہ محمد عبدہ کے اصلاحی کارناموں کا پیمانہ وسیع تھا۔ جو باغ انہوں نے لگایا تھا اس کو ہرا بھرا اگرچہ وہ خود نہ دیکھ سکے جن سوکھے درختوں کو انہوں نے عمر بھر پانی دیا تھا اُن کی شادابی کے نظارہ سے بھی وہ محروم رہ گئے۔ مگر اُن کے بوئے ہوئے بیج اب ہر طرف پھیلے نظر آتے ہیں اور ان کے لگائے ہوئے درختوں کے پھل اپنی پاکیزگی سے آنکھوں کو طراوت بخش رہے ہیں وہ چل بسے لیکن بیداری اور حرکت کی جو لہریں وہ پیدا کر گئے تھے وہ بڑھ بڑھ کر اب جمود و غفلت کی چٹانوں سے ٹکرا رہی ہیں اور اسلامی دنیا کو چیخ چیخ کر نیند سے بیدار کر رہی ہیں۔ ان کا ایک ہم عصر لکھتا ہے "اُس دن کے طلوع ہونے سے پہلے ہی وہ دُنیا سے کوچ کر گئے جس کے طلوع کے لیے اُن کی بے تاب فطرت سراپا انتظار تھی"۔

اُس دن کی روشنی ابھی تک نمودار نہیں ہوئی ہے لیکن اُن کی صاف نظارگی اور دور بینی اُس کا جلوہ بہت پہلے دیکھ چکی تھی۔

اعلان

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی مشہور مثنوی 'اسرار خودی' کی مکمل و مدلل شرح جناب محمد یوسف خاں سلیم چشتی (بی۔اے) نے بڑی محنت اور عرقریزی سے تحریر فرمائی ہے۔ مثنوی 'اسرار خودی' کے مطالب جس قدر مشکل اور پیچیدہ ہیں اسی قدر اس شرح نے اُن کو آسان اور قابل فہم بنا دیا ہے۔ اہلِ ذوق سے درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد اس کتاب کو طلب کر کے مطالعہ فرماویں۔ اور اقبال اکیڈیمی کی مساعی جمیلہ کی داد دیں۔

قیمت بے جلد صرف ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:-

دفتر اقبال اکیڈیمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

Registered No. L. 4584

جلد ۳ — عدد ۴

اکتوبر ۱۹۴۰ء

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت (گرامی)



ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

سیّد محمد شاہ ایم۔اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت سالانہ دو روپے بارہ آنے
قیمت فی پرچہ ۴ آنے

سالانہ قیمت

عوام سے دو روپے بارہ آنے　　　　رؤسا سے پانچ روپے

فہرست مضامین

جلد ۳	اکتوبر ۱۹۴۰ء	عدد ۴

افتتاحیہ:-

سخنہائے گفتنی　　سید محمد شاہ ایم۔ اے　　۲

مقالات:-

مصلحانہ جنگ اور اُس کی حقیقت　　جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور　　۵

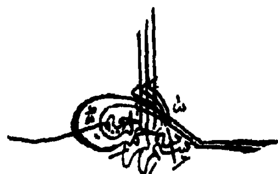
ارمغانِ حجاز پر ایک نظر　　جناب سید بشیر الدین احمد (بی۔ای) مدراس　　۱۵

علماءِ ربّانی　　جناب مرزا محبوب عالم صاحب　　۲۳

اقوال حضرت غوث الاعظمؒ　　جناب شیخ عبدالمالک صاحب ملک کرنال شاپ لاہور　　۴۰

سلامتی کا راستہ　　جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔　　۴۱

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر دفتر رسالہ پیغامِ حق۔ ظفر منزل۔ تاجپورہ۔ لاہور سے شائع ہوا



سخنہائے گفتنی

علامہ اقبالؒ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جو دینی و ملی خدمات شعر و فلسفہ کے ذریعے انجام دی ہیں اُن کا اعتراف نہ صرف مسلمانانِ ہند نے کیا ہے بلکہ ہند سے باہر بھی مسلم و غیر مسلم سب نے ان کا لوہا مانا ہے اور اس امر واقعی کو تسلیم کیا گیا ہے کہ مذہب سے ہٹے ہوئے، تہذیبِ مغرب کے دلدادہ اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے مسلمان کو دوبارہ مذہب کے حاطہ اقتدار میں لانے، تہذیبِ مغرب سے متنفر کرنے اور اُسے خوددار بنانے میں اقبالؒ نے جو کام کیا ہے وہ مسلمانانِ عالم میں سے اور کسی کے حصہ میں نہیں آیا۔ اقبالؒ ہندوستان میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہمیں یہ پیغام دیا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ۔۔۔ نیست ممکن جز بقرآں زیستن

ہندوستان میں مسلمانوں کی حیات ملی و سیاسی اور دینی و مذہبی کا سب سے بڑا دشمن آج تک عیسائیت ہی ہے مگر اب عیسائیت سے بڑھ کر ہمارا دشمن ہندو ہے۔ ہندو اپنے اقتدار، اپنے علم اور اپنی پوری طاقت سے ہندوستان میں اسلام کو ختم کر دینا چاہتا ہے اقبالؒ نے ہمیں بتایا ہے کہ تمہاری مخالف طاقتیں تم سے بہت زیادہ زبردست ہیں، اور اگر تم نے اپنے بچاؤ کی کوئی کارگر تدبیر نہ کی تو پھر سمجھ لو کہ تمہاری حیات ملی و سیاسی معرض خطر میں ہے بچاؤ کی تدبیر جو علامہ اقبال ہمیں بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ تم قرآن پاک کے متبع ہو جاؤ۔ قرآن پاک کی تعلیمات کو سمجھو اور اُن پر عمل کرو۔ قرآن کی تعلیمات کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کر سکتی ہیں پس اگر تم نے متبع قرآن بن کر زندگی گزارنی شروع کر دی تو پھر تمہیں کسی طرف سے کھٹکا باقی نہ رہے گا بلکہ خود تم سے دنیا ہراساں و ترساں رہے گی۔

اقبالؒ نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ مسلمانوں کو یہی بات سمجھانے میں صرف کیا ہے جب تک وہ بقید حیات تھے اپنی شخصیت

اور خدمات کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے اور ان کے سُست گام قافلہ کو "بانگِ درا" کے ذریعے تیز گام کرتے رہے مگر آہ! اُن کے انتقال کے بعد ہم ناکارہ اور احسان فراموش مسلمانوں نے اتنا بھی تو نہیں کیا کہ اُن کی کوئی ایسی یادگار قائم کر دیں جس سے اُن کا پیغام موجودہ اور آئندہ نسلوں تک برابر پہنچتا رہے اور اُن کی شخصیت اور تعلیمات مسلمانوں کے روح اور قلب کو گرماتی رہیں۔

میں نے انہی خیالات کے ماتحت چند دوستوں کے مشورہ سے گزشتہ سال "اقبال اکیڈیمی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا اور ارادہ کیا تھا کہ ہندوستان بھر کے مصنفین اور اہلِ علم و صلائے عام دونگا کہ وہ اقبال کی تعلیمات کے جس پہلو کو بھی نمایاں حیثیت سے مسلمانوں میں پیش کر سکتے ہیں اُس کے لئے کوشش کریں اکیڈیمی کی طرف سے اُن کی بھی مالی معاونت کی جائیگی اور اُن کی تحقیقات کے نتائج کو بھی عوام الناس تک پہنچایا جائیگا مجھے امید تھی کہ اس کام میں مجھے بکثرت معاونین مل جاوینگے جن کی امداد سے یہ کام بہت جلد شروع ہو سکے گا مگر افسوس کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ احباب بالکل بے پرواہ اور بے حس نظر آتے ہیں زبانی باتیں کرنے والے بہت ہیں مگر جونہی صرفِ زر کا سوال آتا ہے اقبالؒ کا بڑے سے بڑا مداح بغلیں جھانکنے لگتا ہے اور طرح طرح کے عذر تراشنے شروع کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے پاس دولت نہیں۔ دولت بیشمار ہے مگر وہ اپنی دولت کا صحیح اور مفید مصرف لٹریچر کی اشاعت اور امداد نہیں سمجھتے اُن کے نزدیک روپے کا صحیح مصرف وہ ہے جس سے اُن کی حیوانی خواہشات کی تکمیل ہو یا بدرجۂ اقل اُن کے نام کی شہرت ہو۔

ان حالات کے ماتحت کام بسرعت نہیں ہو سکتا تھا جو کچھ اب تک کیا ہے اپنے بل بوتے پر کیا ہے پیغامِ حق جیسا کچھ ہے آپ کے سامنے ہے میں جانتا ہوں کہ اس کو اس سے بہتر بنانے کی ضرورت بھی ہے اور گنجائش بھی مگر جب تک آمدنی نہ بڑھ جائے مصارف کس طرح بڑھاؤں۔ پیغامِ حق کے علاوہ یادِ اقبال طبع ہو چکی ہے یہ کتاب شاعرِ مشرق کی یادگار میں ایک ادبی تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے حصہ دوم زیرِ ترتیب ہے اور انشاء اللہ العزیز دسمبر میں طبع ہو جائیگا

گزشتہ پرچہ میں اپنے محترم دوست یوسف سلیم چشتی کی معرکۃ الآرا کتاب شرح اسرارِ خودی کا اعلان شائع کر چکا ہوں الحمد للہ کہ چند فرمائشیں بھی وصول ہوئیں مگر کتاب مقررہ وقت پر طبع سے نہیں آسکی۔ خدا نے چاہا تو عید سے ایک دو دن

پہلے اُن حضرات کی خدمت میں پہنچ جائے گی جنہوں نے فرمائشیں بھیج دی ہیں۔ شرح اسرارِ خودی سے بھی دو چار روز پہلے سلیم صاحب کی ایک دوسری کتاب تعلیماتِ اقبال جس کا عرصہ سے ادبی حلقوں میں انتظار ہے طبع ہو کر آ رہی ہے۔ اس کی قیمت عہ ہے۔ جو حضرات شرح اسرارِ خودی کی فرمائشیں بھیج چکے ہیں اگر اُن کو یہ کتاب بھی درکار ہو تو مطلع کر دیں۔ دونوں کے اکٹھا منگوانے میں محصول ڈاک کی بہت کفایت ہو جائے گی۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی "حیات محمد عبدہ" ہے یہ کتاب چارلس ایڈمس کی کتاب "اسلام اینڈ ماڈرنزم ان ایجپٹ" کے بعض ابواب کا ترجمہ ہے جو مفتی محمد عبدہ کی سرگزشت حیات سے متعلق ہیں اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ علامہ جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ مصری نے مسلمانوں کی بیداری کے لئے کیا کچھ کیا ہے اس کی قیمت بھی ایک روپیہ ہے اور کتاب طبع ہو کر دفتر میں آ گئی ہے۔

یہ ہے میری اپنی ناچیز خدمات کی اب تک کی سرگزشت۔ اگر مجھے کچھ معاونین مل جاتے تو آپ دیکھتے کہ اس ایک سال کے عرصہ میں کتنا مفید لٹریچر شائع کرتا۔ میں قارئین پیغام حق سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مفید کام میں میرا ہاتھ بٹائیں جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اُن کو خود بھی خریدیں اور اپنے دوستوں کو بھی خریدنے کی ترغیب دیں۔ علاوہ ازیں وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اقبال اکیڈمی کے معاون بننے کی کوشش کریں۔ معاونین کو -/۱۵ روپے سالانہ ادا کرنا ہوتا ہے اور اُن کے لئے رعائت یہ ہے کہ اکیڈمی کی طرف سے جس قدر کتابیں شائع ہوں گی اُن سے اُن کی قیمت ۲۵ فی صدی کم لی جاوے گی۔ تعاونوا علی البر والتقوی۔

محمد شاہ

الجہاد فی الاسلام

مصلحانہ جنگ اور اس کی حقیقت

(از جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور)

(۹)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرق | یہ عالمگیر انسانی خدمت جو مسلمانوں کے سپرد کی گئی ہے دو اجزاء پر مشتمل ہے ایک امر بالمعروف اور دوسرے نہی عن المنکر۔ ان دونوں کا مقصود و مدعا اگرچہ ایک ہے یعنی آدمی کو انسان بنانا لیکن دونوں کے مدارج مختلف ہیں۔ اور اس لئے دونوں کے طریقوں میں بھی اختلاف ہے۔ آئندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے اس اختلاف کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

علم الاخلاص میں انسان کے فرائض کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے ایک وہ فرائض جن کے کرنے کا اس سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ فرائض جن کا کرنا نہ کرنا خود اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ سوسائٹی کا ایک اچھا رکن بننے کے لئے انسان کا کم سے کم فرض یہ ہے کہ وہ بُرے کاموں سے بچے۔ دوسروں کے حقوق نہ چھینے۔ دوسروں پر ظلم نہ کرے۔ دوسروں کے امن و اطمینان میں خلل نہ ڈالے۔ اور ایسے اعمال سے پرہیز کرے جو اس کے وجود کو سوسائٹی کے لئے نقصان دہ یا غیر مفید بناتے ہوں۔ ان فرائض کے ادا کرنے کا ہر سوسائٹی اپنے ہر رکن سے مطالبہ کرتی ہے۔ اور اگر وہ انہیں ادا نہ کرے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے ادا کرنے پر اسے مجبور

کرے۔ فرائض کی دوسری قسم وہ ہے جو فضائل اخلاق سے تعلق رکھتی ہے اور جنہیں ادا کرنے سے انسان سوسائٹی کا ایک معزز اور اعلیٰ درجہ کا رکن بن سکتا ہے۔ مثلاً خدا اور بندوں کے حقوق پہچاننا، اور انہیں کرنا خود نیک بننا اور دوسروں کو نیک بنانا اپنے خاندان اور اپنی قوم اور اپنے ابنائے نوع کی خدمت کرنا اور حق کی حمایت و حفاظت کرنا، وغیرہ ذالک۔ اس دوسری قسم کے فرائض کو انجام دینے کے لئے انسانی شعور کی تکمیل ضروری ہے۔ اور کوئی شخص انہیں اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ نہ لے اور اس کے نفس میں اتنی پاکیزگی پیدا نہ ہو جائے کہ وہ انہیں ادا کرنے پر آمادہ ہو۔ اس لئے یہ فرائض اجباری نہیں بلکہ اختیاری ہیں، اور انسان کی مرضی پر منحصر ہے کہ خواہ معزز اور اعلیٰ درجہ کا انسان بنے یا نہ بنے۔ اگرچہ ایک سوسائٹی کا اخلاقی نظام ایسا ہی ہونا چاہئے کہ اس کے افراد میں اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کی خواہش طبعاً پیدا ہو۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرق بھی تقریباً اسی تقسیم پر مبنی ہے، آدمی کو حیوانیت کے درجہ سے نکال کر انسانیت کی سطح پر لانا، اور اسے انسانی سوسائٹی کا ایک غیر مفید، اور نقصان دہ رکن بننے سے روکنا نہی عن المنکر سے تعلق رکھتا ہے! اور پھر اس کو انسانیت کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کاملہ کے درجہ میں لے جانا۔ اور انسانی سوسائٹی کا ایک مفید اور معزز رکن بنانا امر بالمعروف سے متعلق ہے! امر بالمعروف، نہی عن المنکر سے افضل ہے لیکن ترتیب کے اعتبار سے نہی عن المنکر پہلے ہے اور امر بالمعروف بعد میں، جس طرح ایک کسان کا اصل مقصد اناج پیدا کرنا ہے لیکن اس کے لئے بیج ڈالنے سے پہلے ہل چلا کر زمین کو نرم کر دینا ضروری ہے اسی طرح اسلام کا اصل مقصد تو انسان کو انسان اعلیٰ بنانا ہے مگر معروف کا بیج ڈالنے سے پہلے اس کی فطرت کو منکر سے پاک کر کے ہموار کر دینا ضروری ہے۔ اسلام ہر شخص کو معروف کی طرف دعوت دیتا ہے، اور انسان کو اس کی خوبیاں دکھا کر اسے اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن منکر ایک پردہ ہے جو اس کی آنکھ کو معروف کا جمال دیکھنے سے باز رکھتا ہے اور ایک زنگ ہے جو اس کے آئینہ قلب کو معروف کا پرتو قبول کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ اس لئے منکر کے پردہ کو ہر ممکن طریقہ سے چاک کرنا اور اس کے زنگ کو ہر ممکن طریقہ سے کھرچ

دینا سب سے پہلی اور ضروری تدبیر ہے۔ اس کے بعد کوئی شخص معروف کی دعوت کو قبول کرے تو اس کے لئے فضائل اخلاق کا ایک بڑا حصہ اختیاری نہیں رہتا بلکہ اجباری ہو جاتا ہے کیونکہ انسانیت کاملہ کے درجہ میں پہنچ کر اس کے لئے وہ آسانیاں باقی نہیں رہ سکتیں جو انسانیت محضہ کے درجہ میں اسے حاصل تھیں لیکن اگر یہ زنگ چھوٹ جانے کے بعد اور یہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد بھی کوئی آنکھ معروف کا جمال نہ دیکھے اور کوئی قلب اس کا پر تو قبول نہ کرے تو اسلام اسے صرف منکر سے روکنے پر اکتفا کرتا ہے اور آگے اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیتا ہے کہ چاہے اسے بصیرت عطا کرے چاہے نہ کرے مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

ایک دوسری حیثیت سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرق اُس فرق پر مبنی ہے جو خود اسلام کی دو مختلف حیثیتوں کے درمیان ہے۔ اسلام ایک حیثیت میں تو محض دعوت ہے نیکی اور تقویٰ کی جانب اور دوسری حیثیت میں وہ اللہ کا قانون ہے تمام دنیا کے لئے جب کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کے لئے یہ دونوں حیثیتیں جمع ہو جاتی ہیں اور دعوت کی دفعات بھی اس کے حق میں قانون کی دفعات بن جاتی ہیں۔ مگر اسلام نہ قبول کرنے کی صورت میں دعوت الگ رہتی ہے۔ اور قانون الگ۔ دعوت کا منشاء یہ ہے کہ انسان اس منصب خلافت کا اہل بن جائے جو اللہ نے اسے زمین پر بھیجتے وقت سپرد کیا تھا اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کی حیثیت سے اس پر عاید ہوتی ہیں۔ قانون کا منشاء یہ ہے کہ انسان اگر منصب خلافت کی خدمات کو انجام نہ دے تو کم از کم فساد و خونریزی تو نہ کرے جس کا طعنہ فرشتوں نے اس کو دیا تھا۔ اگر وہ اشرف المخلوقات نہ بنے تو کم از کم ارذل المخلوقات تو نہ بن جائے۔ اگر وہ دنیا کو نیکی و تقویٰ سے روشن نہ کرے تو کم از کم بدی و شرارت سے اس کے امن و سکون کو تو غارت نہ کرے پہلی چیز باطن کی روشنی اور طبیعت کی صلاحیت پر منحصر ہے، جو ظاہر ہے، کہ مارے کوٹے سے پیدا نہیں ہوتی، لیکن دوسری چیز حدود کی تعین اور نگہداشت سے تعلق رکھتی ہے جس کا پاس و لحاظ کرنے پر اس کی سرکش طبیعت کو صرف

وعظ و تلقین ہی سے آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ بعض حالات میں اسے مجبور کرنے کے لئے قوت کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔

نہی عن المنکر کا طریقہ اس مضمون کے بعض پہلو مزید روشنی کے محتاج ہیں جنہیں آگے چل کر ہم ایک دوسرے موقع پر بوضاحت بیان کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر بتلانا مقصود ہے کہ اسلام نے غیر مسلم دنیا کو معروف کا حکم کرنے کے لئے تو صرف دعوت و تبلیغ کا طریقہ بتلایا ہے لیکن منکر سے روکنے کے لئے اس کی قید نہیں رکھی بلکہ اس کی مختلف انواع کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے ہیں قلب و ذہن کی گندگی اور خیال و رائے کی ناپاکی کو وعظ و تلقین کے ذریعہ سے دور کرنے کی ہدایت کی چنانچہ فرمایا:-

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (۱۶:۱۶)	اللہ کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلا۔ اور ان سے ایسے طریقہ پر بحث و مناظرہ کر جو بہترین ہو (یعنی سختی و بدکلامی اس میں نہ ہو)

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ (۵:۲۹)	اور اہل کتاب سے بحث و مناظرہ نہ کر۔ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں ظالم و بدکار ہیں۔

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ (۲:۲۰)	پس اس سرکش سے نرم گفتگو کرو۔ شاید کہ وہ نصیحت پکڑے اور اللہ سے ڈرے۔

فعل و عمل کی برائی کو طاقت و قوت کے زور سے روکنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اوپر وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ولتاخذن علی ید المسیئ ولتاطرنه علی الحق اطراً "تم پر لازم ہے کہ بدکار کا ہاتھ پکڑ لو۔ اور اس کو حق کی طرف موڑ دو" اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں۔ جن میں منکر

کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کا حکم ہے۔ ایک موقع پر حضورؐ نے فرمایا ہے :۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان (رواہ مسلم)

تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے درست کر دے اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ تو زبان سے! اور اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

ان احادیث میں ید کا لفظ جسمانی ہاتھ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ مجازاً قوت کے معنی میں بولا گیا ہے۔ بدکار کا ہاتھ پکڑنے سے مراد در اصل یہ ہے کہ اس کو اس طرح مجبور کر دیا جائے کہ وہ بدی و شرارت کا ارتکاب کر ہی نہ سکے۔ اسی طرح تغیر بالید سے مراد یہ ہے کہ تم اپنی قوت و طاقت کو منکر کے مٹانے اور روکنے میں استعمال کرو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ :۔

ان اللہ لا یعذب العامہ بعمل الخاصہ حتی یروا المنکر بین ظہر اینھم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ (رواہ احمد)

اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے عمل کی سزا اس وقت تک نہیں دے گا جب تک ان میں یہ رواداری پیدا نہ ہو جائے کہ بدی کو اپنے سامنے ہوتے ہوئے دیکھیں۔ اور اس کو روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔

رسول اللہ کا ارشاد اللہ کے ارشاد کی تفسیر کرتا ہے پس ان احادیث سے قرآن پاک کے حکم نہی عن المنکر کے معنی صاف معلوم ہوتے ہیں کہ اس سے مراد صرف زبان ہی سے منکر کو روکنا اور اس کی برائی بیان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ حسب ضرورت بزور قوت اس کو روک دینا اور دنیا کو اس کے وجود سے پاک کر دینا بھی ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی قدرت و استطاعت پر موقوف ہے۔ اگر مسلمانوں میں اتنی قوت ہو کہ تمام دنیا کو منکر سے روک کر اسے قانون عدل کا مطیع بنالیں تو ان کا فرض ہے کہ اس قوت کو استعمال کریں، اور جب تک اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا نہ دیں چین نہ لیں لیکن اگر اتنی قوت نہ رکھتے ہوں تو جس حد تک ممکن ہو انہیں اس خدمت کو انجام دینا چاہئے۔ اور تکمیل مدعا کے لئے مزید قوت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے

فتنہ و فساد کے خلاف جنگ | منکر کی اس دوسری قسم کو جس کے خلاف اسلام میں قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے پہلی قسم سے ممتاز کرنے اور اس کی نوعیت کو زیادہ واضح کر دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور فساد سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ ان تمام آیات میں جن میں منکر کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی ہے یا اس کی ضرورت ظاہر فرمائی گئی ہے یا اُسے بزور شمشیر مٹانے کا حکم دیا گیا ہے تم کو منکر کے بجائے یہی فتنہ اور فساد کے الفاظ ملیں گے۔

قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ۔ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ ۔ اللہ اگر لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی ۔

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا ۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ بُری چیز ہے ۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا جو کوئی کسی شخص کو بغیر اس تصور کے قتل کرے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ ۔ اُنہوں نے فتنہ پھیلانا چاہا تھا ۔

كُلَّمَا رُدُّوْا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا جب فتنہ کی طرف واپس جاتے ہیں تو اس میں خود بھی شامل ہو جاتے ہیں

ان تمام آیات میں اسی منکر کو فتنہ اور فساد کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تمام منکرات میں یہ فتنہ، فساد ہی ایک چیز ہے جس کا استیصال بغیر تلوار کے نہیں ہو سکتا۔

فتنہ کی تحقیق عام طور پر فتنہ و فساد کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ کسی پر دو جماعتوں میں جھگڑا ہو جائے، پہلے گالم گلوج ہو۔ پھر فریقین کے مستعد آدمی اینٹ پتھر یا لاٹھی سونٹے، یا تلوار بندوق سے مسلح ہو کر میدان میں کود پڑیں ایک دوسرے کے سر پھوڑ دیں اور خوب قتل و غارت کر کے آتش غضب کو ٹھنڈا کر لیں۔ اگرچہ فتنہ و فساد کا اطلاق اس شغلہ پر بھی ہوتا ہے لیکن قرآنی اصطلاح میں ان الفاظ کا مفہوم اس قدر تنگ نہیں ہے، بلکہ اور بہت سے اخلاقی جرائم بھی ان کے تحت آتے ہیں۔ جن کی تفصیل دوسری کتابوں میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود قرآن ہم کو بتائے گا کہ اس کی مراد فتنہ و فساد سے کیا ہے۔

لغت میں فتن کہتے ہیں سونے کو تپا کر اس کا میل چھانٹ دینے کو، اسی لغوی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ انسان کے آگ میں ڈالے جانے پر بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ (جس روز وہ آگ پر بھونے جائیں گے) اور پھر مجازاً اس سے ہر وہ چیز مراد لی گئی ہے جو انسان کو دکھ اور مصیبت اور آزمائش میں ڈالنے والی ہو چنانچہ مال و دولت اور اہل و عیال کو بھی فتنہ کہا کہ وہ انسان کو حق سے غافل کر کے غلط کاریوں میں مبتلا کر دیتی ہے وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ اور راحت و مصیبت کو بھی جو اللہ کی طرف سے ہے فتنہ کہا کہ وہ آزمائش ہے انسان کے لئے وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً۔ قدرتی حالات کے تغیر اور انسان پر ان کے اثرات کو بھی فتنہ کہا کہ ان کے مصائب سے آدمی کو عبرت حاصل ہوتی ہے، أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ۔ (کیا نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں کسی کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالنے کو بھی فتنہ کہتے ہیں کہ وہ اس کے لئے تکلیف کا موجب ہوتا ہے وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ ائْذَن لِّي وَلَا تَفْتِنِّي (اور کوئی ان

میں کہتا ہے کہ مجھے قیام کی اجازت دے دے اور تکلیف و پریشانی میں مبتلا نہ کر) خاص کفر کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ کیونکہ وہ انجام کار انسان کو دکھ اور مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ. ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ۔ (جس دن وہ آگ پر پھونے جائیں گے اور اُن سے کہا جائیگا کہ اپنے کفر کا مزہ چکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے لئے تم جلدی کر رہے تھے) لیکن قوت کے زور سے جس فتنہ کو مٹانے کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ وسیع المعنی فتنہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ وہ فتنہ ہے جو اپنی حدود سے تجاوز کرنے والوں کی سرکشی سے بندگان خدا کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی پر تباہی لاتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) کمزوروں پر ظلم وستم کرنا، ان کے جائز حقوق سلب کرنا، ان کے گھر بار چھین لینا، اور انہیں تکلیفیں پہنچانا، چنانچہ فرمایا:۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا (۱۶: ۱۱۰)

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لئے جو بہت دکھ دیئے جانے کے بعد گھر بار چھوڑ کر نکل گئے۔ اور جنہوں نے حق کی خاطر سخت جدوجہد کی۔ اور راہ حق میں ثابت قدم رہے (مغفرت کرنے والا ہے)

وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۔ (۲: ۲۱۷)

(حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنا یقیناً مسجد حرام کی حق تلفی ہے لیکن اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ برا ہے۔ اور یہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ (۸۵: ۱۰)

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم وستم کئے اور اس گناہ سے توبہ نہ کی ان کے لئے دوزخ اور آتش دوزخ میں جلائے جانے کی سزا ہے۔

وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ

انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔ کیونکہ فتنہ قتل

اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۲: ۲۴) سے زیادہ بُری چیز ہے۔

(۲) جبر و استبداد کی بنا پر حق کو دبانا اور قبول حق سے لوگوں کو روکنا۔ چنانچہ سورہ یونس میں فرمایا ہے کہ

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ	پس موسیٰ پر ان کی قوم میں سے کوئی ایمان نہ لایا سوائے ایک
قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ	قلیل جماعت کے کیونکہ انہیں فرعون اور اپنے سرداروں سے
وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۔	(جو فرعون کے خوشامدی تھے) خوف تھا کہ انہیں عذاب میں مبتلا
(۱۰: ۹)	کر دیں گے۔

(۳) صد عن سبیل اللہ جس کی تشریح گذشتہ باب میں کی جا چکی ہے۔ چنانچہ سورہ انفعال میں پہلے تو کافروں کا یہ جرم بتایا ہے کہ وہ صد عن سبیل اللہ کی کوشش کرتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ پھر ان کے مغلوب ہونے کی پیش گوئی کی ہے۔ ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ اور اس کے بعد ان کے اسی فعل کو فتنہ قرار دے کر جنگ کا حکم دیا ہے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

(۴) لوگوں کو گمراہ کرنا اور حق کے خلاف خدع و فریب اور طمع و اکراہ کی کوششیں کرنا چنانچہ فرمایا:-

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ	اور انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ تجھے طمع و اکراہ کے ذریعہ اس وحی سے
اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ	پھیر دیں جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے تاکہ تو اسے چھوڑ کر ہم پر افترا باندھنے
خَلِيْلًا (۱۷: ۸)	لگے (اگر تو ایسا کرتا) تو اس وقت وہ تجھے دوست بنا لیتے۔
فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ	یقین رکھو کہ تم اور تمہارے معبودان باطل جنہیں تم پوجتے ہو کسی کو
بِفٰتِنِيْنَ ۔ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ	گمراہ نہیں کر سکتے بسوائے اس شخص کے جو خود ہی دوزخ کی طرف
(۲۷: ۵)	جانے والا ہے۔
وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ	اور ان سے بچ کہ کہیں تجھے ان احکام میں سے کسی سے نہ پھیر دیں

اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ (۵ : ۷) — جو اللہ نے تیرے اوپر اتارے ہیں کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔

(۵) غیر حق کے لئے جنگ کرنا۔ اور ناجائز اغراض کے لئے قتل و خون اور جتھہ بندی کرنا۔ چنانچہ فرمایا،

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَا اِلَّا يَسِيْرًا (۳۳ : ۲) — اور جنگ احزاب میں اگر دشمن مدینہ کے اندر گھس آتے اور ان (منافقین) سے قتل و غارت کے فتنہ میں شریک ہونے کی درخواست کی جاتی تو یہ ضرور اس میں جا ملتے اور ذرا تامل نہ کرتے

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوْا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا (۴ : ۱۲) — تم دو اقوام میں سے کچھ دوسرے لوگ پاؤ گے جو تم سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم سے بھی مگر جب فتنہ کی طرف واپس جاتے ہیں۔ تو اس میں اوندھے گر جاتے ہیں (یعنی خود بھی فتنہ برپا کرنے والوں کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں)

(۶) پیروان حق پر باطل پرستوں کا غلبہ۔

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ۔ (۸ : ۱۰) — اگر تم (پیروان حق کی مدد) نہ کرو گے۔ تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔ (یعنی غلبہ باطل سے حق پرستوں پر زمین تنگ ہو جائے گی)

(باقی)

———(۰)———

ارمغان حجاز پر ایک نظر

از جناب سید بشیر الدین احمد (بی۔ ای) مدراس

حضرت علامہ اقبال کی یہ تصنیف ان کے انتقال کے چند ماہ بعد طبع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچی ہے یہ ان کے لازوال کلام کا آخری مجموعہ ہے، جس میں فارسی اور اردو پر مشتمل دو حصوں کو یکجا کر دیا گیا ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم اس اقبال سے کس حد تک متاثر نظر آتے ہیں جو اس افتراق انگیز دور میں اسلامی اخوت واتحاد کا پیام لے کر ہم میں آیا تھا اور قلب ملت کی مایوسیوں کو امید وار آرزو کی خوشی میں بدل ڈالا تھا لیکن ہم میں ابھی بہت سے لوگ اس اقبال سے مانوس نہیں جو ایک طرف حکمت وفلسفہ کا مخزن اور راز سرتاپا دماغ ہی دماغ ہی تھا تو دوسری طرف ایک دھڑکتا ہوا دل اپنے سینہ میں رکھتا تھا جو اپنی ہر دھڑکن کے لئے یثرب کے خورشید سے توانائی حاصل کرتا تھا " ارمغان حجاز " کا فارسی حصہ بعنوان " حضور رسالت " اس امر کا شاہد ہے کہ اسی توانائی کی لہریں اس کی تمام دماغی صلاحیتوں کی اصل حقیقت ہیں ۔

چو خود را در کنار خود کشیدم به نور تو مقام خویش دیدم

یہاں اکثر مقامات پر ہمیں اصلی اقبال کی ایک جھلک نظر آتی ہے جس کا عشق رسول عربی صلعم سے اتنا گہرا معلوم ہوتا ہے کہ اس ظاہر پرست دور میں کہ ایک خاص قسم کا لباس اسلامی کلچر (ثقافت) کی اصل اور زہد و تقدس اور حب رسولؐ کی انتہا سمجھا جاتا ہے اس کا تصور شاید ممکن نہ ہو۔

به کوئے تو گداز یک نوا بس مرا این ابتدا این انتہا بس

خواب جرأت آں رندِ پاکم خدا را گفت ما را مصطفیٰ بس!

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے :۔

تو ہم آں مے بگیر از ساغرِ دوست کہ باشی تا ابد اندر برِ دوست

سجودے نیست اے عبد العزیز ایں بروبم از مژہ خاکِ درِ دوست

اس سلسلے میں بے محل نہ ہوگا اگر محترم دوست نذیر نیازی کا تجربہ پیش کیا جائے جو انہی کے الفاظ میں یوں ہے: "ایک دن مجھ سے حدیث رسول صلعم پر گفتگو فرما رہے تھے جب حضرت ابو سعیدؓ خدری کی اس روایت کا ذکر آیا کہ حضور رسالتمآب صلعم اپنے بعض احباب کے ساتھ احد پر تشریف لے گئے اور احد کانپ اٹھا تو حضرت علامہ کہنے لگے "یہ محض استعارہ نہیں" اور پھر درد کی تکلیف کے باوجود سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے رہے (MIND YOU ! IT IS NO METAPHOR) یاد رکھو یہ محض استعارہ نہیں انہیں رسول صلعم سے کچھ ایسا عشق تھا کہ آپؐ کا ذکر مبارک آتے ہی ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتیں اور بیماری کے آخری ایام میں تو فرطِ ادب سے یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ حضور صلعم کا اسم گرامی زبان پر لانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ ان کے حواس اور بدنی حالت میں کوئی خرابی تو نہیں

اس طرح چودھری غلام احمد پرویز کا بیان ہے مولانا[1] صاحب نے دریافت کیا کہ آج کل کوئی تازہ کلام کہا گیا ہے؟ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ زخمہ کس تار پر جا لگے گا فرمایا کہ گزشتہ چھ ماہ سے جب سے حج کا ارادہ ہوا ہے صبح سے شام تک مدینہ ہی کے راستے میں رہتا ہوں جو کچھ کہتا ہوں وہ بھی وہیں کی باتیں ہوتی ہیں یہ کہا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے کچھ طبیعت سنبھلی تو فرمایا بہت کچھ دل میں ہے کہ حضورؐ کے آستانہ اقدس پر پہنچوں گا تو یہی عرض کروں گا وہ بھی راستہ طے کر لیتا ہوں لیکن جب وہاں پہنچتا ہوں تو طبیعت قابو میں نہیں رہتی ...... ہاں ایک شعر یاد آگیا کعبۃ اللہ میں پہنچ کر حضور حق عرض کروں گا۔

تو باش اینجا و با خاصاں بیامیز کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

[1] مولانا محمد اسلم جیراجپوری ۔

پہلا مصرعہ تو آسانی سے پڑھ دیا لیکن دوسرے مصرعہ میں منزل دوست تک پہنچے تو ایک عجیب کیفیت سامنے آئی دیکھا کہ تمام جسم پر ایک ارتعاشی حالت پیدا ہو گئی ہے لیتے ہوئے اٹھ بیٹھے یوں محسوس ہوا کہ کلیجہ امنڈ کر منہ میں بھر آیا ہے گلا پھول گیا چہرہ سرخ ہو گیا اسے بڑی مشکل سے یوں دبایا جیسے کسی چیز کو حلق سے نیچے لے جا رہے ہیں بڑے کرب و اذیت کے بعد انتہائی اضطراب کے عالم میں بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگے غش کی سی حالت ہو گئی اور نڈھال ہو کر لیٹ گئے ۔

ارمغان حجاز کے فارسی حصہ میں حضور رسالتؐ کے علاوہ بعض عنوانات ہیں۔ حضور حق، حضور ملت۔ حضور عالم انسانی جن میں سے ہر ایک مختلف چھوٹے چھوٹے عنوانات پر مشتمل ہے جن کے ماتحت متعدد قطعات جمع کر دیئے گئے ہیں چونکہ ان میں سے کسی ایک عنوان پر مفصل طور پر لکھنے کے لئے بہت کافی وقت کی ضرورت ہو گی اس۔ لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اختصار کے ساتھ بعض امور کی طرف اشارہ کر دیا جائے حضور رسالتؐ میں جہاں یہ عالم ہوتا ہے

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

یہ دیکھا جا چکا ہے کہ اقبال کس طرح سراپا نیاز نظر آتا ہے لیکن حضور حق میں اس کا رنگ دگرگوں ہے۔ یہاں نیاز سے زیادہ ناز کی جھلک نظر آتی ہے اور کبھی کبھی تو وہ مجسم شکوہ نظر آتا ہے یک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

جہاں از خود بروں آوردۂ کیست؟ جمالش جلوۂ بے پردۂ کیست؟
مرا گوئی کہ از شیطان حذر کن بگو با من اُو پروردۂ کیست؟

اس قسم کے شکوے اقبال کے کلام میں جگہ جگہ مل سکتے ہیں اور یہ موضوع اقبال کا خاص موضوع ہے جو کسی اور کو راس نہیں آیا اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان شکووں کا راز حکمت اور فلسفہ کی گہرائیوں میں مضمر ہوتا ہے مثال کے طور پر اوپر کے قطعے سے کچھ وہی لوگ لطف اندوز ہو سکیں گے جنہوں نے تخلیق عالم

اور جبر و شر کی بظاہر دوئی کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہو اگر سرسری طور پر اشارہ کر دیا جائے کہ اس قطعہ میں پہلے دو سوالوں کا سلسلہ کچھ برگساں کے تصور زماں اور کچھ ملا باقر اور میر داماد کے پیش کردہ اس نکتہ سے جا ملتا ہے کہ زماں عمل تخلیق کے ساتھ پیدا ہوتا ہے جس کی بدولت ایغو (Ego) اپنے تخلیقی امکانات کا شمار کرتی ہے اور تیسرے سوال کا جواب گوئٹے کے نظریہ خوب و زشت کی روشنی میں اور کچھ خود علامہ اقبال کے مطابق یوں ہے کہ

چہ گویم نکتہ زشت و نکو چیست　　زباں لرزد کہ معنی پیچدار است
بروں از شاخ بینی شاخ و گل را　　درون او نہ گل پیدا نہ خار است
(پیام مشرق)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ایک شکوے کے جذبات کو سمجھنے کے لئے کن کن کوچوں کی خاک چھاننی پڑے گی اس نوع کے پیچیدہ مباحث سے قطع نظر کرتے ہوئے پوری کتاب میں مختلف مقامات پہ ملت اسلامیہ کے متعلق ہمیں متعدد نکات ملتے ہیں اور اس ضمن میں یہ پیام اساسی قرار دیا جا سکتا ہے۔

کشودم پردہ را از روئے تقدیر　　مشو نومید و راہ مصطفےٰ گیر
اگر باور نہ داری آنچہ گفتم　　ز دیں بگریز و مرگ کافرے میر

اس قطعہ میں اقبال کا یہ دعوے کہ کشودم پردہ را از روئے تقدیر کچھ کم حقیقت پر مبنی نہیں جہاں تک ہندی مسلمانوں کا تعلق ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر اقبال نہ ہوتا تو قومی احساس کی وہ چنگاری جو آج ان کے سینوں میں ہوا کھا کر شعلہ بنتی جا رہی ہے پیدا ہی نہیں ہوتی مسلمانوں کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ خود ایک قوم کہنے سے جھجکتے تھے اور اپنے ایک مرکز پر جمع ہونے سے شرماتے تھے اس زمانے میں اقبال کے پیامات اغیار کے مہلک پروپیگنڈوں کے خلاف جو "وطنیت" آج یورپ میں لپ گور نظر آتی ہے! "متحدہ قومیت" کے خلاف جو در اصل ہندو قومیت سے کچھ کم نہیں، اور جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے جنت الحمقا کی ایک اچھی خاصی مثال ہے) نام پہ کئے جاتے تھے پیام جہاد

ثابت ہوئے اس سلسلے میں قابل ذکر امر یہ ہے کہ اغیار نے خود ہی اس قسم کے پروپیگنڈے نہیں کئے بلکہ مسلمانوں ہی سے ان لوگوں کو بھی اس غرض کے لئے استعمال کیا جنہیں "علماء" کہا جاتا ہے چنانچہ کل تک یہ پروپیگنڈے یورپ کی تہذیب اور سیاست کے نام پر کئے جاتے تھے تو آج کبھی قرآن وسنن اور کبھی قرآن وسنت کو چھوڑ کر صرف لغات کی موٹی موٹی کتابوں کے نام پہ کئے جاتے تھے یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ تاویل بازی ایک ایسا فن ہے جس کی بدولت قرآن کو بنا سکتے ہیں پاژند

چنانچہ حضرت اقبال فرماتے ہیں۔

زمن بر صوفی و ملا سلامے کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را!

اس سلسلے میں نذیر نیازی صاحب کا بیان بھی سنئے:۔

"انہیں جدید زمانے کے الحاد پرور نظریوں سے بے حد تکلیف ہوتی تھی جو اندر ہی اندر جسد ملی کو کھائے جا رہے ہیں مگر اس پر انہوں نے درویشانہ خاموشی اختیار نہیں کی بلکہ آخر دم تک مقابلہ کیا یہ اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ قوم اور ملت کی غیر اسلامی تفریق پر انہوں نے اپنا بیان اس وقت لکھوایا جب رہ رہ کر ضعف اور اختلاج کے دورے ہو رہے تھے اور قریشی صاحب کو خطرہ تھا کہ اس کا کوئی ناگوار اثر ان کی طبیعت پہ نہ پڑے ان ایام میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ ملا کم شناسد رمز دیں را

ایک رات انہوں نے یہ شعر پڑھا:۔

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگ محتسب بروں دل ما آمد و ایں آفت از مینا گذشت

اور اتنی رقت طاری ہوئی کہ ان کے نیاز مندوں کو اضطراب ہونے لگا۔

آج کل قوم میں ایسے کرم فرماؤں کی کمی نہیں جو ہر موقعہ اور غیر موقعہ پہ مسلمانوں اور خصوصاً نوجوانوں

کو الحاد و دہریت سے ڈراتے ہیں اور چیخ چیخ کر انہیں مذہب کی طرف بلاتے ہیں لیکن وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ اپنے سوا کوئی اور شخص مذہب کے متعلق کوئی بات زبان پر لائے ـــــ خواہ اس سے مذہب کی حمایت ہی کیوں نہ مقصود ہو حقیقت یہ ہے کہ آج معاملہ یہ نہیں ہے کہ "مذہب کو مانو" بلکہ صاف اور صریح طور پر یہ ہے کہ ہم کو مانو اور ہمارے وقار کو مانو اس ضمن میں ما و شما کی حقیقت ہی کیا ہے جب کہ حضرت علامہ اقبال پر بھی وار کیا گیا تھا کہ انہیں مذہب کے نام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

گرفتم حضرت مُلّا ترش رُوست نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ من دارم مرا از کعبہ می راند حقّ اوست

ایک اور مقام پر ان حضرات کے متعلق کہا گیا ہے جو ہر اس مسلمان کو دوزخی قرار دے ڈالتے ہیں جو ان کے خیالات و اقوال سے خواہ وہ کتنے بھونڈے ہی کیوں نہ ہوں اختلاف رکھنے کا مجرم ہو:۔

ز دوزخ واعظِ کافر گرے گفت حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت
نداند آں غلام احوال خود را کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت

ابھی تک میں نے ارمغان حجاز کے اردو حصے کا تذکرہ نہیں کیا جو کتاب کے جملہ ۲۰۰ میں سے ۱۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس حصے میں ایک طویل نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے عنوان سے درج ہے جو ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی ابلیس تفاخرانہ انداز میں اپنے کارنامے بیان کرتا ہے اور اپنے نظام کے متعلق کہتا ہے

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند کون کر سکتا ہے اس نخل کہن کو سرنگوں؟

ابلیس کا پہلا مشیر اس کی تائید کرتے ہوئے اس امر پر اظہار مسرت کرتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس نماز روزہ اور حج تو موجود ہے لیکن ان کی روح سے وہ بے خبر ہو چکے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ اس سبق سے بھی متاثر ہو چکے ہیں کہ

"ہے جہاد اس دَور میں مردِ مسلماں پر حرام"

اس کے بعد تیسرا مشیر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور یہ شک ظاہر کرتا ہے کہ کہیں جمہوریت کی بدولت نظام ابلیسی کو کوئی گزند نہ پہنچے اور دوسرا مشیر اس کا جواب دیتا ہے کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جدید جمہوریت کے نقاب کے اندر ہی پرانی شاہی رکھ دی گئی ہے اور اس کے علاوہ

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

تیسرا مشیر اشتراکیت کے طوفان کا ذکر چھیڑتا ہے اور چوتھا مشیر کہتا ہے کہ فاشیست کی صورت میں اس کا بھی توڑ کر دیا گیا ہے لیکن تیسرے مشیر کو اس جواب سے تسلی نہیں ہوتی وہ کہتا ہے

میں تو اس کی عافیت بینی کا کچھ قائل نہیں جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب

پانچواں مشیر اشتراکیت کو فتنۂ فردا قرار دیتا ہے جس کی ہیبت سے آج ہی کوہسار و مرغزار کانپنے لگے ہیں اور ابلیس سے اپیل کرتا ہے کہ اس کا مناسب تدارک سوچے اب ابلیس اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سنجیدگی سے گویا ہوتا ہے۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ ہو

حقیقی خطرہ جمہوریت ہے اور نہ اشتراکیت ——— ان جھوٹی باتوں سے نبٹنا کونسا بڑا کام ہے! اگر اقوام یورپ کے لہو کو ذرا سا گرما دیا جائے تو مشرق و مغرب نظارہ کریں گے کہ ان باتوں کا انجام کیا ہوتا ہے حقیقی خطرہ اگر ہے تو اس امت سے ہے جس کے خاکستر میں اب تک ایک آرزو باقی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ عصر حاضر کے تقاضاؤں سے شرع پیغمبر کا اظہار ہو جائے۔

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر

لیکن مسرت کا مقام ہے کہ یہ امت اصل کو چھوڑ کر فروعات میں پھنس چکی ہے اب کامیابی کا راز اسی امر میں مضمر ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس امت کو عالم کردار سے دور رکھا جائے اور خانقاہوں کے اندر اسے شعر و تصوف میں مست رکھا جائے۔

جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اور سب سے اہم یہ کہ الہیات کے تراشے ہوئے لات و منات مثلاً ذیل کے مباحث میں اُنکو الجھا دیا جائے کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟

ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم

امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

اب حصہ اُردو کی ان تمام نظموں سے قطع نظر کرتے ہوئے جس کے مطالب و معانی پر روشنی ڈالنے کے لیے بہت کافی وقت درکار ہے مَیں صرف ایک نظم کے تذکرے پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں یہ نظم سر اکبر حیدری کے نام ہے اور اس کی شان نزول یہ ہے کہ یوم اقبال کی تقریب کے موقعہ پر موصوف نے ایک ہزار روپیہ کا چیک حضرت علامہ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ مذکورہ رقم حضور نظام کے توشہ خانے کے فنڈ سے پیش کی جا رہی ہے جو ان کے قبضہ میں تھا حضرت علامہ کی غیور طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ توشہ خانے کی جانب سے کوئی ہدیہ قبول کیا جائے چنانچہ فوراً انھوں نے چیک واپس کر دیا اس سلوک پر بے چینی کے عالم میں ایک نظم کہہ ڈالی جس کا اخیر شعر ہے :-

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول

جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

علماءِ ربانی

(جناب مرزا محبوب عالم صاحب)

علماءِ ربانی سے مراد وہ اشرف جماعت علماءِ دین کی ہے جن کی تحصیلِ علم سے غرض محض حصولِ رضاالٰہی و عمل ہو نیز جو عوام الناس کے لئے بالعموم اور اہل اسلام کے لئے بالخصوص احکامِ شریعت کا عملی نمونہ ہوں۔ جو لوگوں کے دلوں میں اتباع دین کے لئے اشتیاق و رغبت کا موجب بنے۔

ثانیاً دین اسلام کی اشاعت و حفاظت میں اخلاص و محبت کے ساتھ کارفرما ہو۔ اور اس کے اس مہتم بالشان کام کے اسباب و ذرائع بالخصوص چار ہوتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت | جذبۂ محبت ہی صحیح معنوں میں اطاعت کا باعث ہوتا ہے۔ اور یہ وہ عظیم الشان سرمایہ ہے جو کماحقہ اطاعت کی راہ میں استقامت و استقلال کا موجب بھی ہوتا ہے اور اس منزل میں آنے والے مصائب و تکالیف پر جو بطور امتحان ہوتے ہیں مستعد و ثابت قدم رہنے میں امداد دیتا ہے فی الحقیقت یہ وہ جوہر ہے کہ اس کی موجودگی میں محبوب کی مخالفت فی الناس کسی نوعیت یا کسی صورت میں بھی محبِ صادق سے دیکھی بھی نہیں جا سکتی۔ چہ جائیکہ برداشت ہوسکے مخالفین کے حق میں جذبۂ انتقام اس قدر مشتعل ہوتا ہے کہ آرام و راحت وغیرہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالےٰ ہے:۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ۔ وہ لوگ جو اللہ تعالےٰ پہ ایمان لائے ہیں انکو اللہ عزوجل کے ساتھ انتہائی محبت ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا۔
"اس پاک ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اس کی اولاد سے زیادہ محبوب ہو جاؤں"

تعلق باللہ والرسولؐ | تعلق ہی وہ رشتہ ہے جو متعلق کی شادمانی پر شاد اور اس کی توہین پر دل میں صدمہ پیدا کر کے اس کے اعداء کے حق میں جذبات منافرت کو مشتعل کرتا ہے اور متبعین شریعت کے ساتھ الفت و اعداء دین کے ساتھ بغض رکھنے کی ترغیب دیتا ہے اور دین اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ (یعنی دوستی و دشمنی اللہ تعالےٰ کی رضا کے لئے ہو)

خشیت اللہ | یہ وہ نعمت عظمےٰ ہے۔ جس کی وجہ سے اوامر کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب ہوتا ہے اور اصل میں علماء حق کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس دولت علیا کے طفیل حق کا اظہار کرتے ہیں۔ اور کتمان حق سے گریز کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔
اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط مگر یہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے مراد محض اللہ عز و جل سے ڈرنا اور کسی سے نہ ڈرنا کیونکہ اگر کوئی عالم ہے ہی ڈرپوک۔ تو وہ رب العزت سے بھی ڈرے گا اور غیر اللہ سے بھی۔ مگر یہ تو خوئے بزدل ہے۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست گدا گر تواضع کند خوئے اوست (سعدیؒ)

پس خشیت اللہ یہ ہے کہ آیہ مبارکہ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ کا مصداق ہو کر کسی سے بھی عالم حقانی نہ ڈرے اور صرف رب العالمین سے ڈرے۔

از ہر کہ ترسد بگر دو دلاور بترسد از و ہر کہ باشد دلاور (عزیز لبنانی)

اجتناب از احتیاج غیر | حقیقۃً احتیاج میں مبتلا ہونا ایک ایسی صعوبت ہے جس کی وجہ سے انسان کی فطرت سلیمہ، غیرت و حمیت اور جرأت جیسے عظیم الشان اخلاقی جوہر کمزور ہو جاتے ہیں

اوراسی سبب سے اکثر علماء وفضلاء کلمہ حق کے اظہار اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسے اہم فرائض دینیہ کے تارک ہو جاتے ہیں۔ مگر علماء حقانی جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت موجود ہوتا ہے۔ وہ اس احتیاج سے جو احکام اسلام کی تعمیل میں مخل ہوتی ہے کوسوں دُور رہتے ہیں۔ اور دُور رہنے کا یہی احسن طریقہ ہے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کو مہیا کرنے کے لئے حلال وطیب ذرائع معاش اختیار کرتے ہیں۔ اور اپنے رازق کو پہچانتے ہیں ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک　　اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا وجم (اقبالؒ)

چنانچہ ایسے علماء ربانی جنہوں نے دین کی اشاعت وتبلیغ اور قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس میں قرآن کریم کی اس آیہ شریفہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔ اور گذر اوقات کے لئے مختلف حلال طیب ذرائع ووسائل معاش کو اختیار کئے رکھا ہے۔ اُن میں سے چند ایک کا حال ملاحظہ کیجئے۔

تعداد	اسماء علماء عظام	ذرائع معاش	کیفیت
۱	امام یونس بن عبیدہؒ	ریشمی پارچہ	تذ جلد ۱ صفحہ ۱۳۰
۲	امام القراء حمزہ زیاتؒ	زیتون پنیر اور اخروٹ	ابن - جلد ۱ صفحہ ۱۶۷
۳	امام ابوحنیفہؒ	ریشمی پارچہ	امام موصوف کی صدر دکان کوفے میں تھی (تذ جلد ۱ صفحہ ۱۵۱)
۴	حافظ الحدیث غندر بصریؒ	چادر اور سوتی پارچہ	تذ جلد ۱ صفحہ ۲۷۵
۵	ابوصالح سمانؒ	روغن زیتون روغن زرد	تذ جلد ۱ صفحہ ۷۸
۶	حسن بن ربیع کوفی (استاد امام بخاریؒ)	بوریئے	اسی تجارت کی وجہ سے اُن کا لقب بوریٰ ہے (تذ جلد ۲ صفحہ ۴۴)
۷	ہشام دستوائیؒ	پارچہ	تذ جلد ۱ صفحہ ۱۴۷
۸	احمد ابن خالد قرطبیؒ	جبہ فروش	تذ جلد ۳ صفحہ ۳۶

تعداد	اسماء علماء عظام	ذرائع معاش	کیفیت
۹	امام ابن جوزیؒ	تانبا	تانبے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ تذ جلد ۴ صفحہ ۱۳۷
۱۰	حافظ الحدیث ابن رومیہ	ادویہ	علم نباتات میں اپنے عہد میں بے نظیر تھے (تذ جلد ۴ صفحہ ۲۱۰)
۱۱	ابو یعقوب لغویؒ	چربی لیٹھا	ابن ج ۱ صفحہ ۳۱۵
۱۲	محمد ابن سلیمانؒ	گھوڑوں کی تجارت	تذ ج ۳ ۔ صفحہ ۱۰۸
۱۳	داؤد ابن ابی ہندؒ	ریشمی پارچہ	تذ جلد ۱ ۔ صفحہ ۱۳۱
۱۴	سالم ابن عبد اللہؒ	۔	بازار میں بیع و شرا کیا کرتے تھے (تذ جلد ۱ صفحہ ۷۷)
۱۵	امام عبد اللہ بن مبارکؒ	۔	امام ذہبی انکا ذکر یوں شروع کرتے ہیں۔ الامام التاجر السفار (تذ جلد ۱ صفحہ ۲۵۰)

احتیاج سے بچنے کے متعلق علامہ اقبالؒ کے چند پُر درد اشعار مرقوم الذیل ہیں ؎

خود فرود آ از شترِ مثلِ عمرؓ — الحذر از منتِ غیر الحذر
فطرتے کو بر فلک بندد نظر — پست می گردد ز احسانِ دگر
رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو — موجِ آب از چشمۂ خاور مجو
تا نہ باشی پیشِ پیغمبرؐ خجل — روزِ فردائے کہ باشد جانگسل
ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز — آبروئے ملتِ بیضا مریز

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

الغرض علماء حق چونکہ ان اوصاف مذکورۂ بالا سے موصوف ہوتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ و رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت ہونے کی وجہ سے فرائض مذہبی کی ادائیگی میں تساہل و تغافل نہیں کرتے۔ اور رب العزت اور اُس کے نبیؐ کی مخالفت ہوتی دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے۔ حتی الامکان اس کے تدارک کی

سعی فرماتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے جو کچھ دل میں لاتے یا کرتے ہیں وہ خلوص پر مبنی ہوتا ہے۔ اور عمل وہی مقبول ہے۔ جو اخلاص پر مبنی ہو۔

(۲) تعلق باللہ والرسولؐ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ و رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات و صفات اور دین اسلام کی توہین دیکھ کر سکون و جمود کی زندگی بسر نہیں کرتے۔ نہ یہ عذر کر سکتے ہیں کہ ہم گوشہ نشین ہیں۔ نہ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ زمانہ نازک ہے۔ کون کسی کی مانتا ہے۔ اور نہ یہ کہ طاقت والوں کے سامنے اظہار حق کر کے جان کو کیوں تکلیف میں ڈالیں۔

کیونکہ جب محبت و تعلق ہوا تو جان محبوب و متعلق کی رضا کے مقابلے میں کیا چیز ہے ایسے لوگ رب العزت کی ذات و صفات کے ساتھ شرک کرنے والوں اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ شرک یعنی ختم نبوت کے قصر عظیم پر ضرب لگانے والوں کے ساتھ رفاقت و اتحاد رکھنے کی بجائے ان کو صراط مستقیم پر لانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اسی خدمت دینی کی دھن میں اُن کا پیمانہ حیات لبریز ہو جاتا ہے۔

امام بغوی علیہ الرحمۃ نے کتاب معالم التنزیل میں اس حدیث شریف کو لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "ظالم سلطان کے سامنے حق کہنا جہاد اکبر ہے"۔ پس یہ علماء ربانی غازی اکبر بنتے ہیں یا شہید اکبر۔

(۳) خشیت اللہ۔ ہونے کی وجہ سے دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت ان کو اعلاء کلمۃ الحق سے نہیں روک سکتی۔ کیونکہ وہ ڈرتے صرف اللہ عزوجل سے ہیں اور خشیت اللہ کا مطلب یہ ہے کہ غیر اللہ کا خوف دل سے نکل جائے۔

نیز اُس ذات قدوس کا یہ حکم ان علماء ربانی کو ہر وقت یاد رہتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (سورۃ بقرہ)

اب اس خیال سے کہ سرمایۂ موعظت ہو۔ اور علماءِ عصر کو اس نہج پر عمل کا شوق پیدا ہو اس مقدس گروہ کے چند کارنامے ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

خلیفہ معتصم باللہ جو دولتِ عباسیہ میں سے ہشتم خلیفہ تھا اپنے بھائی خلیفہ مامون الرشید کے تاطع ایمان عقیدۂ خلقِ قرآن پر قائم رہا اور قرآن مجید کو مخلوق کہتا اور کہلواتا رہا۔ اس نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کو جو اس وقت بمقام رقہ محبوس تھے کو اپنے دربار میں بلایا اور علماءِ سُو جو خلیفہ کے ہم عقیدہ تھے۔ ان سے مناظرہ کرایا بعد میں امام موصوف کے سامنے دو امور پیش کئے۔ یا حبس یا عقیدۂ سُوء کا اقرار۔ امام علیہ الرحمۃ نے اس مہلک ایمان عقیدۂ بد کو مسترد کرتے ہوئے قیدخانہ کو قبول فرمایا اور تیس ماہ کا عرصہ قید و بند میں گذارا۔ پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ جب پاؤں زنجیروں کے بوجھ سے زیادہ تھک جاتے۔ تو کمربند کے کپڑے سے زنجیروں کو باندھ کر کمر سے آویزاں کر لیتے تھے۔ فریضۂ نماز کی ادائیگی اور نیند کے وقت بیڑیاں پاؤں سے اُتار دی جاتی تھیں۔ بعد ازاں بدستور سابق ڈال دی جاتی تھیں۔

اس شدت اور قید و بند کے ہوتے ہوئے بھی امام علیہ الرحمۃ نے اپنے فرض منصبی کو کسی وقت بھی ترک نہیں کیا۔ قیدخانہ کے اندر بھی نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ چنانچہ قیدی آپ کی اقتدا میں فرائض نماز ادا کرتے اور آپ اُن کی امامت فرماتے۔

طلباءِ علمِ دین بغرض تحصیل علم قیدخانہ میں ہی حاضر ہوتے اور آپ اُن کو علوم دینیہ سے سرفراز فرماتے معتصم نے ان پر دو محافظ مقرر کر رکھے تھے جو ہر روز سوال کرتے تھے کہ آپ کے عقیدہ میں کچھ تغیر ہوا ہے یا نہیں۔ روزمرہ یہی جواب فرماتے تھے کہ "نہیں"

آخر ایک دن نگہبانوں نے رنجیدہ خاطر ہو کر ایک کے بجائے چار بیڑیاں امام صاحب کے پاؤں میں ڈلوا دیں۔ امام ممدوح نے نہایت صبر و تحمل سے مزید تکلیف کو بھی برداشت کیا معتصم نے ان

کے اس استقلال واستقامت کو دیکھ کر دربار میں حاضر ہونے کا امر کیا۔ امام صاحب کو دربار میں اس حالت میں پہنچایا گیا۔ کہ دونوں پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور بیڑیوں کی شدت تکلیف کی وجہ سے قدم قدم پر گرنے کا خطرہ تھا۔ دربار میں پہنچے۔ تو جلاد ننگی تلواریں اور دُرّے لئے کھڑے تھے۔ امام صاحب سے استفسار کیا گیا۔ کہ اب بھی آپ خلیفہ سے متفق الرائے ہونے کو تیار ہیں یا نہیں۔ امام رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت استقلال سے جواب فرمایا۔ کہ کلام اللہ وسنت رسول اللہ کے سوائیں اور کسی چیز کو قبول نہیں کرتا امام موصوف کی اس حق گوئی پر جلادوں کو فرمان ہوا کہ دُرّے مارو چنانچہ امام صاحب کو کوڑے لگنے شروع ہوئے۔ ہر کوڑہ پر امام علیہ الرحمۃ اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتے تھے۔ ۱۹ کوڑے لگنے پر غش کھا کر گر پڑے بدن مبارک سے خون جاری تھا۔ یہ معتصم جس کی شوکت وہیبت اور رعب سے اہلِ رُوم کے دل کانپتے تھے اس امام ربانی کی قوتِ ایمانی کے مقابلہ میں اس کی شاہی قوت اور حاکمانہ اقتدار نے ہزیمت کھائی اور امام حقانی کا یہ استقلال اور یہ استقامت دیکھ کر اس کا دِل کانپ گیا۔ اسی وقت امام صاحب کو قید سے رہا کر دیا۔

جملہ علماء کرام کے لئے بالعموم اور حنفی علماء عظام کے لئے بالخصوص حضرت امام علیہ الرحمۃ کا یہ عظیم الشان کارنامہ قابلِ تقلید ہے (تاریخ حریت اسلام) علامہ اقبالؒ فرما گئے ہیں ۔

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے — وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور — موت کیا شئے ہے؟ فقط عالمِ معنیٰ کا سفر

(۲) خلیفہ معتضد باللہ کے عہد خلافت میں علامہ ابوالحسین نوری بہت بڑے عالم تھے یہ ایک مرتبہ سفر کے سلسلہ میں کشتی پر سوار ہو کر دریا کو عبور کر رہے تھے کشتی میں کچھ مٹکے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھ کر دریافت فرمایا۔ کہ یہ مٹکے کس کے ہیں اور ان میں کیا ہے۔ لوگوں نے جواب

دیا کہ یہ مٹکے بادشاہ کے ہیں اور ان میں شراب ہے۔ آپ نے لاٹھی سے ان تمام مٹکوں کو توڑ دیا۔ لوگ کانپنے لگے کہ دیکھئے ان پر بادشاہ کا کیا غضب نازل ہوتا ہے۔ خلیفہ کو جب اس واقعہ کی خبر پہنچی تو ان کی گرفتاری کا فرمان جاری کیا۔ چنانچہ علامہ ابوالحسین نوری دربار میں حاضر ہوئے۔ خلیفہ نے پوچھا۔ تم کون ہو؟ آپ نے فرمایا۔ محتسب۔ خلیفہ نے کہا تم کو محتسب کس نے بنایا ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ جس نے تجھے خلیفہ بنایا ہے۔

علامہ تقی الدین ابن تیمیہؒ جن کی ولادت ۶۶۱ھ میں ہوئی۔ اپنے عہد میں علم و عمل میں عدیم النظیر تھے بہت بڑے جیّد عالم فاضل تھے۔ آپ کی متعدد تصنیفات ہیں۔ فریضہ تبلیغ و اشاعت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں ہمہ تن کوشاں رہتے تھے اور اعلائے کلمۃ الحق میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ ایک دفعہ حاکم مصر کے متعلق کسی نے آپ سے شکایت کی کہ وہ رعایا پر بے جا تشدد اور تعدی کرتا ہے آپ یہ خبر سُن کر مغموم ہوئے۔ اور فریضہ نہی عن المنکر کی ادائیگی کے لئے جو کہ علماء دین پر فرض ہے حاکم مصر کے پاس تشریف لے گئے۔ حاکم نے مذاق کے طور پر آپ سے کہا۔ کہ آپ نے اتنی تکلیف کیوں اٹھائی مجھے بلا لیتے۔ علامہ ابن تیمیہ نے جواباً فرمایا۔ کہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدّام جیسا بھی درجہ نہیں رکھتا۔ اور تو از روئے جور و ظلم فرعون علیہ اللعنۃ سے بھی بڑھ رہا ہے۔ موسےٰ علیہ السلام دن میں تین بار فرعون کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔ اور اُسے ایمان کی ترغیب دیتے تھے۔ اور میں اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے لئے صرف ایک مرتبہ پہلی ہی بار خود تمہارے پاس حاضر ہوا ہوں۔

(۳) شاہ مظفر الدین قاچار بادشاہ فارس کے عہد میں مملکت فارس (ایران) کی طرف سے گرانقدر رقم کے معاوضہ میں ایک انگریزی کمپنی کو تمباکو کی خرید و فروخت کا ٹھیکہ دے دیا گیا تھا۔ اس اجارہ کی وجہ سے اور کوئی شخص ملک فارس میں تمباکو کی تجارت نہیں کر سکتا تھا۔

سید جمال الدین افغانیؒ کو اقوام فرنگ کا یہ اقتدار اور ایران کی کمزوری دیکھ کر دل میں نہایت صدمہ اور رنج پہنچتا تھا۔ مگر وزراء سلطنت کے سامنے کوئی سعی و کوشش کارگر نہ ہوتی تھی۔ آخر انہوں نے فارس کے (مجتہد اعظم) میرزا حسن شیرازی کو اس ضروری امر کی طرف توجہ دلائی۔

مجتہد اعظم نے سید صاحب سے متفق الرائے ہو کر مملکت فارس میں تمباکو کے حرام ہونے کے متعلق فتویٰ جاری کر دیا۔ فتویٰ کا جاری ہونا ہی تھا۔ کہ تمام ملک میں یکایک انقلاب برپا ہو گیا لوگوں نے اس پر نہایت اشتیاق اور فراخدلی سے عمل کیا۔ عوام و خواص بلکہ اُمراء و رؤساء کے گھر دل اور شاہی محلات سے بھی کلیاں حقّے اور تمباکو کو نیست و نابود کر دیا گیا چنانچہ اسی تحریک کے دوران میں ایک دن بادشاہِ فارس نے جب حُقّہ طلب کیا۔ تو خدّام نے عرض کیا۔ کہ تمباکو کا خاتمہ کر دیا گیا۔ بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا۔ کہ کیا وجہ؟ عرض کیا گیا کہ حجۃ الاسلام حاجی میرزا حسن شیرازی مجتہد کے فتوے کی تعمیل ہیں۔

شاہ نے کہا۔ کہ مجھ سے بھی اذن لے لینا تھا۔ خادموں نے عرض کی کہ یہ مذہبی مسئلہ ہے اس کے متعلق مفتی دین کی اجازت کی ضرورت ہے۔ عالیجاہ کی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ بادشاہ کو جب یقین ہو گیا کہ تمام مملکت میں لوگ اس اجارہ کے خلاف ہیں۔ تو اس اجارہ (ٹھیکہ) کو منسوخ کر دیا (تاریخ حریت اسلام)

(۴) خلیفہ ہاروں الرشید کے عہد میں حضرت امام ابو یوسفؒ بغداد کے قاضی القضاۃ تھے ایک دفعہ ایک یہودی اور خلیفہ ہاروں الرشید کا مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ عدالت میں یہودی خلیفہ سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا۔ امام صاحب نے فرمایا۔ یہ اسلام کے عدل کا گھر ہے۔ اس میں اس وقت خلیفہ و یہودی دونوں برابر ہیں۔ اس حالت میں حاکم و محکوم دونوں مساوی ہیں خلیفہ ہاروں الرشید چونکہ خود بھی عدل و انصاف سے اُنس رکھتے تھے۔ امام صاحب کے

اس اظہار حق پر آفریں کہا۔ اور نہایت خوش ہوئے۔

(۵) خلیفہ منصور کے ایام خلافت میں قاضی محمد بن عمران مدینہ منورہ کے قاضی تھے۔ ایک دفعہ خلیفہ مکہ معظمہ سے حج کر کے مدینہ منورہ گیا۔ تو اونٹ والوں کا کرایہ ادا کرنے میں تاخیر کی اونٹ والوں نے اسی قاضی کی عدالت میں دعوے دائر کر دیا۔ قاضی نے مدعا علیہ کے جواب دعوے سننے کے لئے اپنے ہاتھ سے پروانہ طلبی عدالت خلیفہ کے نام تحریر فرما کر ارسال کیا۔ کہ وقت متعینہ پر عدالت میں حاضر ہو کر دعوے کا جواب دیجئے۔ یہ پروانہ عدالت خلیفہ کو عین اس وقت ملا جب کہ عدالت میں حاضری کا وقت بالکل قریب ہو چکا تھا۔ خلیفہ دار القضا کے پروانہ کو دیکھ کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور حکمنامہ لانے والے کے ساتھ تن تنہا چل دیا۔

جب خلیفۃ المسلمین کا عدالت میں ورود ہوا تو قاضی نے تکریم و تعظیم کچھ نہ کی۔ بلکہ عام مقدمہ والوں کی طرح خلیفہ کو عدالت میں کھڑا کیا۔ اور اثبات دعویٰ کی صورت میں خلیفہ پر ڈگری دے دی۔ لوگ حیران کھڑے دیکھتے تھے۔ کہ قاضی صاحب پر خلیفہ کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے خلیفہ نے روپیہ منگا کر اوّل تو اونٹ والوں کا کرایہ ادا کیا۔ پھر قاضی کے اس عدل و انصاف پر دس ہزار روپیہ اُن کی خدمت میں معدلت گستری کے طور پر پیش کیا۔

(۶) قاضی القضاۃ احمد ابن ابی داؤد نہایت بڑے فقیہہ، اصولی متکلم عالم ربانی تھے۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد کے مشہور شاعر دعبل خزاعی نے کتاب الشعرا میں ان کا ذکر کیا ہے ان سے پہلے دربار کا یہ آئین تھا۔ کہ تاوقتیکہ خلیفہ کوئی کلام نہ کرے۔ دربار میں کوئی متنفس گفتگو کرنے کا مجاز نہیں ہوتا تھا۔ یہ قاضی القضاۃ احمد ابن ابی داؤد کی قوتِ ایمانی و اظہارِ حق کا ہی نتیجہ تھا۔ کہ یہ جابرانہ قانون منسوخ کر دیا گیا۔ اور آہستہ آہستہ ان کی کوشش وسعی سے اس

قسم کے کئی قوانین ٹوٹ گئے خلیفہ معتصم باللہ کی ہیبت وسطوت سے تمام دربار کانپتا تھا کسی کو مجال دم زدن نہ تھی لیکن قاضی صاحب ممدوح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ نہایت ہمت ودلیری کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

ایک دفعہ خلیفہ نے برمکی کے قتل کا حکم دیا۔ دربار میں سناٹا چھا گیا خلیفہ کا رعب وداب اور غیظ وغضب دیکھ کر سب مرعوب ہو گئے۔ برمکی کے سر پہ بادشاہ کی تلوار جھکی۔ قریب ہی تھا کہ جلاد تلوار کو جنبش دیتا۔ قاضی احمد نہایت جرأت وہمت کے ساتھ آگے بڑھ کر خلیفہ سے مخاطب ہوئے "آپ نے اس کے قتل کا فرمان تو نافذ کر دیا لیکن اس کی موت کے بعد اس کی جائداد کے آپ وارث نہیں ہو سکتے" معتصم نے غضبناک ہو کر کہا "مجھ کو اس کے مال واسباب لینے سے کون روکنے والا ہے؟" قاضی احمد نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم" کیونکہ بروئے شرع شریف مال وارث کو مل سکتا ہے۔ اور تا وقتیکہ آپ اس کے قتل کا جواز ثابت نہ کریں صحیح وارث وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ قاضی صاحب نے یہاں تک زور دیا۔ کہ آخر خلیفہ نے اپنا ارادہ ترک دیا

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی — کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی
دم تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک — عدل تھا اس کا قوی، لوث مراعات سے پاک
(اقبال)

(۷) سلطنت اسلامیہ ہند کے آخری بادشاہ ابوالمظفر بہادر شاہ کے عہد ۱۱۲۱ھ میں کسی مذہبی معاملہ پہ علماء لاہور نے حکومت کی مخالفت کی۔ بادشاہ نے انہیں دارالسلطنت میں بلوایا۔ حاجی یار محمد ومحمد مراد مع چار اور فضلاء کے ہمراہ بادشاہ کے دربار میں پہنچے۔

بادشاہ نے شاہی رعب دکھا کر تحکمانہ لہجہ کے ساتھ ایک سوال کیا۔ اہل دربار کو امید تھی۔ کہ علماء لاہور مرعوب ہو کر اپنے دعوئے حق سے دست بردار ہو جائیں گے لیکن حاجی یار محمد نے بادشاہ کے کلام کو ایسے مدلل طریقہ سے مسترد کر دیا۔ کہ لوگ حیران رہ گئے۔ اس سے بادشاہ کے جذبۂ غضب

کو کمال اشتعال ہوا۔ غیظ و غضب میں آکر کہا۔ کیا تو سلاطین کے غضب سے خائف نہیں ہوتا۔ (آہ! یہ کہتے ہوئے بہادر شاہ بیچارہ خود اس تقدیر انقلاب سے بے خبر اور بے خوف تھا جو اس کے سر پہ منڈلا رہی تھی)

حاجی یار محمد نے جواب دیا مجھے دائم اپنے اللہ تعالیٰ سے چار چیزوں کی طلب رہی ہے۔ اول تحصیل علم۔ ثانیاً حفظ کلام اللہ شریف ثالثاً حج رابعاً تمنائے شہادت۔ رب العالمین کے فضل و کرم سے پہلی تین نعمتیں حاصل ہو چکی ہیں۔ اب طلب شہادت باقی ہے۔ امکان ہے کہ بادشاہ کے ذریعہ سے یہ نعمت عظمیٰ بھی نصیب ہو جائے۔

حاجی یار محمد کی یہ قوت ایمانی و جذبہ اسلامی دیکھ کر اہل دربار میں سے ایک لاکھ آدمی اس عالم ربانی سے موافقت اور اس کی متابعت اختیار کر گئے۔ بہادر شاہ کو آخر نادم ہونا پڑا۔

اصل واقعہ یہ تھا کہ بہادر شاہ بادشاہ چند ایک شیعہ علماء کے ایما سے خطبہ میں کچھ کلمات کا اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ اور اہل سنت والجماعت کے علماء دین بادشاہ کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہتے تھے۔ علماء حق اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو گئے۔ اور شہنشاہ ہند نے اپنے اس ارادے کو ترک کر دیا

(۸) حضرت امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ جب خلیفہ ہارون الرشید تخت خلافت پہ جلوہ افروز ہوا۔ تو اس نے اپنی تخت نشینی کی تقریب پہ زر و دولت کا بہت بڑا حصہ علماء و صلحاء اور صوفیا میں تقسیم کیا۔ جب شاہی انعامات و عطیات کو بانٹتے ہوئے پورا ایک سال گزر گیا۔ تو حضرت امام سفیان ثوریؒ کوفی کی خدمت میں بکمال ادب و احترام مراسلہ لکھ کر اپنے وزیر معتمد خاص کے ذریعے کوفہ میں ارسال کیا۔ مکتوب کا خلاصہ مضمون یہ تھا۔

"اے امام میں اور آپ اوائل عمر میں ایک ہی مدرسہ میں ایک ہی استاد کے پاس تحصیل علم کرتے رہے ہیں۔ بہت عرصہ اکٹھے حصول علم کے بعد مفارقت نصیب ہوئی۔ اب میری تاجپوشی کی

تقریب پہ دُور دراز سے علماء فضلاء اور صوفیاء اکٹھے ہوئے ہیں۔ اور مَیں نے ایک لاکھ سے کم عطیہ کسی کی خدمت میں پیش نہیں کیا اس رقم سے بیش از بیش تقسیم کیا ہے۔ پورا ایک سال آپ کا انتظار کیا۔ کہ شرف زیارت و سعادت نصیب ہو گا۔ مگر نہایت ہی تعجب کا مقام ہے کہ آپ باوجود اتنے دیرینہ تعلقات کے اس تقریب پہ تشریف نہ لائے۔"

شاہی معتمد خلیفہ کا یہ خط لے کر عین اس وقت پہنچا جبکہ امام صاحب مسجد میں حدیث شریف کے درس میں مشغول تھے۔ تقریباً ساڑھے چھ سو (۶۵۰) طالبین صاحب کشف و کرامت ان کے درس عظیم سے مستفید ہوتے تھے۔

معتمد نے خلیفہ کا مراسلہ خدمت میں پیش کیا معائنہ فرما کر زمین پہ رکھ دیا۔ اور پھر درس میں مشغول ہو گئے حتیٰ کہ ظہر کا وقت قریب آ گیا۔ وزیر نے التجا کی کہ حضور اس کے جواب سے سرفراز فرمائیے۔ امام علیہ الرحمۃ نے اوّل تو ارشاد فرمایا کہ اس کے جواب کی چنداں ضرورت نہیں پھر وزیر کے دوبارہ اصرار پہ اسی نامہ کی پشت پہ جواب ارقام فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا۔

"اے ہارون الرشید۔ یہ بیت المال جس سے لاکھوں کی تعداد میں تُو نے اپنی منشاء کے مطابق لوگوں پہ صرف کیا ہے۔ تیری ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ امانت ہے اور اہل اسلام کا حق ہے محشر کے روز جب رب العزت کی عدالت میں تیرا یہ جُرم پیش کیا جائے گا۔ تو مَیں شہادت دُوں گا۔ کہ واقعی تُو نے جُرم عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔"

معتمد امام صاحب کا جواب لے کر خلیفہ کے دربار میں پہنچا۔ تو خط نکال کر پیش کیا۔ پڑھ کر خلیفہ پہ رقّت طاری ہو گئی۔ بہت رویا۔ اور اس خط کو قرآن مجید میں بطور عبرت رکھ دیا۔ جس کی وہ ہر روز تلاوت کیا کرتا تھا حسب معمول روزمرّہ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت اس نامہ کو بغرض حصولِ عبرت پڑھ لیا کرتا تھا۔

(۹) مولانا مفتی عبد الغنی صاحب جن کے دار الانشاء سے اکثر اوقات سلاطینِ ہند، نوابانِ اودھ اور امرا روہیلکھنڈ ضروری نسادے طلب کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بمقام آنولہ ضلع رائے بریلی جو اُس زمانہ میں حکومت روہیلہ کا دارالمملکت تھا۔ نواب علی محمد خان حاکم روہیلکھنڈ کے ہاں تشریف فرما تھے۔

ایک دن حاکم روہیل کھنڈ کے نواب زادے نواب سعد اللہ خان نے حجام کو بلوا کر اپنی حجامت بنوانی شروع کی اتفاقاً مفتی صاحب بھی نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب زادہ نے حجامت کے دوران میں حجام کو داڑھی کترنے کا حکم دیا۔ اور مفتی صاحب کی کوئی پرواہ نہ کی مفتی صاحب کو اس توہینِ شریعت پر بہت غصہ آیا۔ ایک طمانچہ حجام کو اس طرح رسید کیا کہ اُس کا اثر نواب زادہ کے چہرہ تک جا پہنچا۔ نواب زادے کو طیش تو بہت آیا مگر کسی وجہ سے خاموش ہو گیا۔

(۱۰) مُلّا ارادت المعروف مُلّا شاہی ملک افغانستان میں بعہدِ سلطنت احمد شاہ دُرّانی ایک نامور عالم حقانی گزرے ہیں۔ احمد شاہ دُرّانی کے نام سے ہر تعلیمیافتہ آدمی واقف ہے۔ جس نے متعدد بار پنجاب پر لشکر کشی کی۔ اور ہندوستان کی طاقتور قوم مرہٹہ کو ایسی شکست فاش دی کہ اس کے بعد پھر وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہی ہیبت وسطوت میں یہ بادشاہ مشہور عالم تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ اس نے اپنے دربار میں محفل رقص وسرود منعقد کی۔ اور مُلّا ارادت المعروف مُلّا شاہی کو بھی بُلوا بھیجا۔ مولنا تشریف لائے۔ اور یہ سماں دیکھ کر نہایت غضبناک ہوئے۔ جرأت وہمت سے کام لے کر بر سرِ دربار بادشاہ کو مخاطب کیا۔ "اے احمد شاہ" تو جس کی اُمت میں اپنے آپ کو شمار کرتا ہے۔ کیا اُس نے کبھی یہ کام کیا ہے؟ اپنے نام کی لاج رکھو"!

بادشاہ نے کہا۔" اس میں ہرج ہی کیا ہے"۔

مُلّا ارادت اس درجہ ہتک شریعت پر نہایت ہی غضب میں آئے۔ اور دوبارہ ہمت و دلیری سے فرمایا:-

"اے احمد شاہ جس چیز کو اسلام نے حرام کیا ہے۔ تو اُسے حلال کر رہا ہے تیری یہ حرکت کُفر کے نزدیک جا رہی ہے"۔ یہ کلمہ حق فرما کر دربار سے واپس آنے لگے۔ تو بادشاہ نے کہا۔ "کہ مجھے ایسے کاموں کے لئے فرصت ہی کہاں ہے۔ اور نہ ایسے غیر مشروع شغلوں سے مجھے دلچسپی ہے۔ یہ صرف علماء وصلحا کے اتقاء عمل کا امتحان تھا۔ الحمد للہ کہ میرے ملک کے عالیجاہ عالم ربانی کو اس امتحان میں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی"۔

مُلّا ارادت نے یہ سُن کر فرمایا: "کہ اس دن سے لے کر آئندہ کے لئے تم مجھے دربار شاہی میں کبھی نہ دیکھو گے"۔

ملک کشمیر میں بعہد سلطان قطب الدین فرمانروائے کشمیر امیر کبیر سیّد علی ہمدانی ایک مشہور ومعروف عالم فاضل ہوئے ہیں۔ یہ جب باہر سے کشمیر میں تشریف لائے۔ تو انہیں معلوم ہوا۔ کہ اس ملک کے بادشاہ کے نکاح میں دو حقیقی بہنیں ہیں۔ نہایت متعجب و متاسف ہوئے اور شاہی دربار و ملک کے بعض علماء سُوء جنہوں نے بادشاہ کا یہ نکاح پڑھایا پڑھوایا تھا ان کی ایمانی کمزوری اور بے حمیّتی پر بہت ہی افسوس ظاہر کیا کہ ان علماء سُو نے طمع ولالچ اور خوفِ مخلوق کی وجہ سے فریضہ نہی عن المنکر کو ادا نہیں کیا۔

آخر خود اپنی غیرت ایمانی سے متاثر ہو کر بادشاہ کو کہا۔ کہ دو سگی بہنوں کا نکاح ایک شخص کے ساتھ شریعت مقدسہ کی رُو سے ناجائز ہے۔ آپ امیر المسلمین ہیں۔ اس ناجائز عمل سے توبہ کریں۔ چنانچہ سلطان نے ایک بیگم کو طلاق دے دی اور سیّد صاحب

موصوف سے فرمایا کہ "آپ سے پہلے آج تک مجھے کسی عالم نے منع نہیں کیا"۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے متعلق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشاد عالی مرقوم الذیل ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے تم میں سے جو کوئی غیر مشروع عمل (ناجائز فعل) دیکھے تو اُسے اپنے ہاتھ سے مٹائے۔ اور ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے۔ اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھے۔ تو دل سے بُرا جانے۔ اور یہ ضعیف ترین ایمان ہے۔ (صحیح مسلم)

مُلک خجند کے ایک عالم حقّانی جو سلطان مُراد کے عہد سلطنت میں قاضی عادل ہو گزرے ہیں اُن کے اظہار حق وعدل وانصاف کا مشہور واقعہ جس کو غمخوار ملّت علّامہ اقبالؒ نے اپنی مثنوی میں منظوم فرمایا ہے ذیل میں ہدیہ ناظرین ہے:-

بُود معمارے ز اقلیم خجند — در فنِ تعمیر نام او بلند
ساخت آں صنعت گر فرہاد زاد — مسجدے از حکم سلطان مُراد
خوش نیامد شاہ را تعمیر اُو — خشمگیں گردید از تقصیر اُو
آتش سوزندہ از چشمش چکید — دستِ آں بیچارہ از خنجر برید
جُوئے خوں از ساعدِ معمار رفت — پیشِ قاضی ناتوان وزار رفت
آں ہنرمندے کہ دستش سنگ سفت — داستانِ جورِ سلطاں باز گفت
گفت اے پیغام حق گفتار تو — حفظ آئینِ محمدؐ کارِ تو
سفتہ گوش سطوتِ شاہاں نیم — قطع کُن از رُوئے قرآں دعویم
قاضی عادل بدنداں خستہ لب — کرد شہ را در حضورِ خود طلب
رنگ شہ از ہیبت قرآں پرید — پیش قاضی چوں خطا کاراں رسید
از خجالت دیدہ بر پا دوختہ — عارض او لالہ ہا اندوختہ

یک طرف فریادیِ دعوے گرے — یک طرف شہنشہ گردوں فرے
گفت شہ از کردہ خجلت بُردہ ام — اعتراف از جرم خود آوردہ ام
گفت قاضی فی القصاص آمد حیواۃ — زندگی گیرد زایں قانوں ثبات
عبد مسلم کمتر از احرار نیست — خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید — دستِ خویش از آستیں بیروں کشید
مُدّعی را تابِ خاموشی نماند — آیۂ "بالعدل والاحسان" خواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش — از برائے مصطفٰے بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر — سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

اس مقدس جماعت کے ان اوصاف مذکورۃ الصدر سے ہر ذی عقل و فہم انسان نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگا سکتا کہ دنیا کی اعلیٰ و ارفع ہستیاں یعنی سلاطین و اُمراء جن کی قوت و طاقت، افواج و عساکر، القاب اور خزائن پر مشتمل ہوتی ہے جب علماء ربانی اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں ان عظیم الشان شخصیتوں سے خائف نہیں ہوتے اور انہیں ناجائز افعال کا مرتکب دیکھکر کمال ہمت و جرأت کے ساتھ منع کرتے ہیں تو عوام الناس کو ناجائز و حرام اُمور کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھکر ممانعت کرنا اُن کیلئے کب مشکل ہو سکتا ہے۔ علانیہ کفر و شرک فسق و فجور اور غیرت و حیا کے منافی افعال کا ظہور دیکھکر بھلا علماء حق فریضہ نہی عن المنکر سے کب غافل رہ سکتے ہیں۔

مگر افسوس کہ عصر حاضر میں اس مقرب جماعت کی اتنی قلت ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ بدرگاہ قاضی الحاجات دعا ہے کہ ذات رب العالمین اپنے فضل و کرم سے اس قلیل جماعت کی تعداد میں ترقی و اضافہ بخشے تاکہ مسلمانوں کی ایمانی و اخلاقی کمزوریوں کا صحیح طور پر علاج ہو سکے اور انہیں اتباع شریعت کا اشتیاق پیدا ہو۔ آمین ۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین ۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم ۔ ۱۲ رجب ۸۹ھ

اقوالِ زریں

اقوال حضرت غوث الاعظمؒ

۱۔ جب کوئی تم سے کوئی تمہاری بے آبروئی کی یا رنج دینے والی کسی شخص کی طرف سے نقل کرے تو اس کو جھڑک دو۔ اور کہہ دو کہ تو اُس سے بھی بدتر ہے کہ اُس نے تو ہماری پسِ پُشت یہ بات کہی ہے اور تو ہمارے منہ پر کہتا ہے اُس نے ہم کو سنائی نہیں تھی لیکن تُو نے سُنا دی۔

۲۔ وہ کیا ہی بدنصیب انسان ہے جس کے دل میں خدا نے جانداروں پر رحم کرنے کی عادت پیدا نہیں کی۔

۳۔ تمام خوبیوں کا مجموعہ علم سیکھنا اور عمل کرنا پھر اوروں کو سکھانا ہے۔

۴۔ دنیا کی محبت سے خاصانِ خدا کو پہچاننے والی آنکھ اندھی رہتی ہے۔

۵۔ شکستہ قبروں میں غور کر کہ کیسے کیسے حسینوں کی مٹی خراب ہو رہی ہے۔

۶۔ جو خدا سے واقف ہو جاتا ہے وہ مخلوق کے سامنے متواضع ہو جاتا ہے۔

۷۔ گمنامی کو پسند کر کہ اِس میں ناموری کی نسبت بڑا امن ہے۔

۸۔ جب تک تیرا اترانا اور غصہ کرنا باقی ہے اپنے آپ کو اہلِ علم میں شمار نہ کر۔

۹۔ اوروں پہ ہر دم نیک گمان رکھ اور اپنے نفس پہ بدظن رہ۔

۱۰۔ کوشش کر کہ گفتگو کی ابتدا تیری طرف سے نہ ہوا کرے اور تیرا کلام جواب بنا کرے۔

۱۱۔ جس نے مخلوق سے کچھ مانگا وہ خالق کے دروازہ سے اندھا ہے۔

۱۲۔ نامحرم عورتوں اور لڑکوں کے پاس بیٹھنا اور پھر یوں کہنا کہ مجھے انکی طرف مطلق توجہ نہیں ہوتی جیسے اس بات میں تو شریعت ہی تیری مخالفت کرتی ہے اور نہ ہی عقل اس سے مطابقت رکھتی ہے یہ شریعت کا انکار علم ہے کیونکہ شریعت نے کسی کو بھی اس سے مستثنےٰ نہیں کیا ہے۔

شیخ عبدالمالک کرنال شاپ لاہور

سلامتی کا راستہ

[یہ خطبہ ریاست کپورتھلہ میں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کے ایک مشترک اجتماع کے سامنے عرض کیا گیا تھا]

ہستی باری

صاحبو! اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ بازار میں ایک دُکان ایسی ہے جس کا کوئی دُکان دار نہیں ہے، نہ کوئی اس میں مال لانے والا ہے نہ بیچنے والا اور نہ کوئی اس کی رکھوالی کرتا ہے، دُکان خود بخود چل رہی ہے، خود بخود اس میں مال آجاتا ہے اور خود بخود خریداروں کے ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے۔ تو کیا آپ اس شخص کی بات مان لیں گے؟ کیا آپ تسلیم کر لیں گے کہ کسی دکان میں مال لانے والے کے بغیر خود بخود بھی مال آسکتا ہے، مال بیچنے والے کے بغیر خود بخود فروخت بھی ہو سکتا ہے، حفاظت کرنے والے کے بغیر خود بخود چوری اور لوٹ سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے؟ اپنے دل سے پوچھیے، ایسی بات آپ کبھی مان سکتے ہیں؟ جس کے ہوش حواس ٹھکانے سے ہوں کیا اس کی عقل میں یہ بات کبھی آسکتی ہے کہ کوئی دُکان دنیا میں ایسی بھی ہوگی؟

فرض کیجیے، ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ اس شہر میں ایک کارخانہ ہے جس کا نہ کوئی مالک ہے، نہ انجینیر، نہ مستری، سارا کارخانہ خود بخود قائم ہو گیا ہے۔ ساری مشینیں خود ہی بن گئیں، خود ہی سارے پرزے اپنی اپنی جگہ لگ بھی گئے، خود ہی سب مشینیں چل بھی رہی ہیں، اور خود ہی ان میں سے عجیب عجیب چیزیں بن بن کر نکل بھی رہی ہیں۔ سچ بتائیے، جو شخص آپ سے یہ بات کہے گا، آپ حیرت سے اس کا منہ نہ تکنے لگیں گے؟ آپ کو یہ شبہ نہ ہوگا کہ اس کا دماغ کہیں خراب تو نہیں ہو گیا ہے؟ کیا ایک پاگل کے سوا ایسی بیہودہ بات کوئی کہہ سکتا ہے؟

دور کی مثالوں کو چھوڑیے۔ یہ بجلی کا لب جو آپ کے سامنے جل رہا ہے، کیا کسی کے کہنے سے آپ یہ مان سکتے ہیں کہ روشنی اس بلب میں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہے؟ یہ کرسی جو آپ کے سامنے رکھی ہے، کیا کسی بڑے سے بڑے فاضل فلسفی کے کہنے سے بھی آپ یہ باور کر سکتے ہیں کہ یہ خود بخود بن گئی ہے؟ یہ کپڑے جو آپ پہنے ہوئے ہیں، کیا کسی علامۂ دہر کے کہنے سے بھی آپ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ ان کو کسی نے بُنا نہیں ہے، یہ خود ہی بُن گئے ہیں؟ یہ گھر جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں، اگر تمام دُنیا کی یونیورسٹیوں کے پروفیسر مل کر بھی آپ کو یقین دلانا چاہیں کہ ان گھروں کو کسی نے نہیں بنایا ہے بلکہ یہ خود بن گئے ہیں، تو کیا اُن کے یقین دلانے سے آپ کو ایسی لغویات پر یقین آجائے گا؟

یہ چند مثالیں آپ کے سامنے کی ہیں۔ رات دن جن چیزوں کو آپ دیکھتے ہیں انہی میں سے چند ایک میں نے بیان کی ہیں۔ اب غور کیجیے، ایک معمولی دکان کے متعلق جب آپ کی عقل یہ نہیں مان سکتی کہ وہ کسی دُکان دار کے بغیر قائم ہو گی اور چلتی رہے گی تو اتنی بڑی دنیا کے متعلق کس طرح آپ کی عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ وہ کسی قائم کرنے والے کے بغیر قائم ہو گئی اور کسی چلانے والے کے بغیر چل رہی ہے؟ جب ایک ذرا سے کارخانے کے متعلق آپ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے کہ وہ کسی بنانے والے کے بغیر بن جائے گا اور کسی چلانے والے کے بغیر چلتا رہے گا تو یہ زمین و آسمان کا زبردست کارخانہ جو آپ کے سامنے چل رہا ہے، جس میں چاند اور سورج اور بڑے بڑے ستارے گھڑی کے پرزوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں، جس میں سمندروں سے بھاپیں اُٹھتی ہیں، بھاپوں سے بادل بنتے ہیں، بادلوں کو ہوائیں اڑا کر زمین کے کونے کونے میں پھیلاتی ہیں، پھر ان کو مناسب وقت پر ٹھنڈک پہنچا کر دوبارہ بھاپ سے پانی بنایا جاتا ہے، پھر وہ پانی بارش کے قطروں کی صورت میں زمین پر گرایا جاتا ہے، پھر اس بارش کی بدولت مردہ زمین کے پیٹ سے طرح طرح کے لہلہاتے ہوئے درخت نکالے جاتے ہیں، قسم قسم کے غلّے، رنگ برنگ کے پھل اور وضع وضع کے پھول پیدا کیے جاتے ہیں، اس کارخانے کے متعلق آپ یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ یہ

سب کچھ کسی بنانے والے کے بغیر خود بن گیا اور کسی چلانے والے کے بغیر خود چل رہا ہے؟ ایک ذرا سی کرسی ایک گز بھر کپڑے، ایک چھوٹی سی دیوار کے متعلق کوئی کہہ دے کہ یہ چیزیں خود بنی ہیں تو آپ فوراً فیصلہ کر دیں گے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے، پھر بھلا اُس شخص کے دماغ کی خرابی میں کیا شک ہو سکتا ہے جو کہتا ہے کہ زمین خود بن گئی، جانور خود پیدا ہو گئے، انسان جیسی حیرت انگیز چیز آپ سے آپ بن کر کھڑی ہو گئی؟

آدمی کا جسم جن اجزا سے مل کر بنا ہے اُن سب کو سائنس دانوں نے الگ الگ کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ لوہا ہے، کچھ کوئلہ، کچھ گندھک، کچھ فاسفورس، کچھ کیلسیم، کچھ نمک، کچھ گیسیں اور بس ایسی ہی چند اور چیزیں جن کی مجموعی قیمت چند روپوں سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ چیزیں جتنے جتنے وزن کے ساتھ آدمی کے جسم میں شامل ہیں، اتنے ہی وزن کے ساتھ لے لیجیے اور جس طرح جی چاہے ملا کر دیکھ لیجیے۔ آدمی کسی ترکیب سے نہ بن سکے گا۔ پھر کس طرح آپ کی عقل یہ مان سکتی ہے کہ ان چند بے جان چیزوں سے دیکھتا، سُنتا، بولتا، چلتا پھرتا انسان، وہ انسان جو ہوائی جہاز اور ریڈیو بناتا ہے، کسی کاریگر کی حکمت کے بغیر خود بخود بن جاتا ہے؟

کبھی آپ نے غور کیا کہ ماں کے پیٹ کی چھوٹی سی فیکٹری میں کس طرح آدمی تیار ہوتا ہے؟ باپ کی کارستانی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ ماں کی حکمت کا اس میں کوئی کام نہیں۔ ایک ذرا سی تھیلی میں دو کیڑے، جو خوردبین کے بغیر دیکھے تک نہیں جا سکتے، نہ معلوم کب آپس میں مل جاتے ہیں، ماں کے خون ہی سے ان کو غذا پہنچنی شروع ہوتی ہے، وہی لوہا، گندھک، فاسفورس وغیرہ تمام چیزیں، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، ایک خاص وزن اور خاص نسبت کے ساتھ وہاں جمع ہو کر لوتھڑا بنتی ہیں، پھر اس لوتھڑے میں جہاں آنکھیں بنی چاہییں وہاں آنکھیں بنتی ہیں، جہاں کان بننے چاہییں وہاں کان بنتے ہیں، جہاں دماغ بننا چاہیے وہاں دماغ بنتا ہے، جہاں دل بننا چاہیے وہاں دل بنتا ہے، ہڈی اپنی جگہ پر، گوشت اپنی جگہ پر، رگیں اپنی جگہ پر، خون اپنی جگہ پر، غرض ایک ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھتا ہے،

پھر اس میں جان پڑتی ہے، دیکھنے کی طاقت، سُننے کی طاقت، چکھنے اور سونگھنے کی طاقت، بولنے کی طاقت، سوچنے اور سمجھنے کی طاقت، اور کتنی ہی بے حد و حساب طاقتیں اس میں بھر جاتی ہیں۔ اس طرح جب انسان مکمل ہو جاتا ہے تو پیٹ کی وہی چھوٹی سی فیکٹری جہاں نو مہینے تک وہ بن رہا تھا خود زور کر کے اسے باہر دھکیل دیتی ہے۔ اور دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ اس فیکٹری میں ایک ہی طریقہ سے لاکھوں انسان روز بن کر نکل رہے ہیں مگر ہر ایک کا نمونہ جدا ہے، شکل جدا، رنگ جدا، آواز جدا، قوتیں اور قابلیتیں جدا، طبیعتیں اور خیالات جدا، اخلاق اور صفات جدا، غرض ایک ہی پیٹ سے نکلے ہوئے دو سگے بھائی تک ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ یہ ایسا کرشمہ ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کرشمے کو دیکھ کر بھی جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ کام کسی زبردست حکمت والے، زبردست قدرت والے، زبردست علم اور بے نظیر کمالات رکھنے والے خدا کے بغیر ہو رہا ہے یا ہو سکتا ہے، یقیناً اس کا دماغ درست نہیں ہے۔ اس کو عقلمند سمجھنا عقل کی توہین کرنا ہے۔ کم از کم میں تو ایسے شخص کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی معقول مسئلہ پر اس سے گفتگو کروں۔

توحید اچھا اب ذرا اور آگے چلیے۔ آپ میں سے ہر شخص کی عقل اس بات کی گواہی دے گی کہ دنیا میں کوئی کام بھی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا کبھی باضابطگی و باقاعدگی سے نہیں چل سکتا جب تک کہ کوئی ایک شخص اس کا ذمہ دار نہ ہو۔ ایک مدرسہ کے دو ہیڈ ماسٹر، ایک محکمہ کے دو ڈائرکٹر، ایک فوج کے دو سپہ سالار، ایک سلطنت کے دو رئیس یا بادشاہ کبھی آپ نے سُنے ہیں؟ اور اگر کہیں ایسا ہو تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک دن کے لیے بھی انتظام ٹھیک ہو سکتا ہے؟ آپ اپنی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں بھی اس کا تجربہ کرتے ہیں کہ جہاں ایک کام کو ایک سے زیادہ آدمیوں کی ذمہ داری پر چھوڑا جاتا ہے وہاں سخت بدانتظامی ہوتی ہے، لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں، اور آخر ساجھے کی ہنڈیا ایک دن چوراہے میں پھوٹ کر رہتی ہے انتظام، باقاعدگی، ہمواری اور خوش اسلوبی دنیا میں جہاں کہیں بھی آپ دیکھتے ہیں وہاں لازمی طور پر کوئی

ایک طاقت کارفرما ہوتی ہے، کوئی ایک ہی وجود با اختیار واقتدار ہوتا ہے، اور کسی ایک ہی کے ہاتھ میں سر رشتۂ کار ہوتا ہے۔ اس کے بغیر انتظام کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔

یہ ایسی سیدھی بات ہے کہ کوئی شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہو اسے ماننے میں تامل نہ کرے گا۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر ذرا اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر ڈالیے۔ یہ زبردست کائنات جو آپ کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، یہ کروڑوں سیارے جو آپ کو اوپر گردش کرتے نظر آتے ہیں، یہ زمین جس پر آپ رہتے ہیں، یہ چاند جو راتوں کو نکلتا ہے، یہ سورج جو ہر روز طلوع ہوتا ہے، یہ زہرہ، یہ مریخ، یہ عطارد، یہ مشتری اور یہ دوسرے بے شمار تارے جو گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں، دیکھیے! ان سب کے گھومنے میں کیسی سخت باقاعدگی ہے۔ کبھی رات اپنے وقت سے پہلے آتی ہوئی آپ نے دیکھی؟ کبھی دن اپنے وقت سے پہلے نکلا؟ کبھی چاند زمین سے ٹکرایا؟ کبھی سورج اپنا راستہ چھوڑ کر ہٹا؟ کبھی کسی اور ستارے کو آپ نے ایک بال برابر بھی اپنی گردش کی راہ سے ہٹتے ہوئے دیکھا یا سنا؟ یہ کروڑ ہا سیارے جن میں سے بعض ہماری زمین سے لاکھوں گنے بڑے ہیں اور بعض سورج سے بھی ہزاروں گنے بڑے، یہ سب گھڑی کے پرزوں کی طرح ایک زبردست ضابطہ میں کسے ہوئے ہیں اور ایک بندھے ہوئے حساب کے مطابق اپنی اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ اپنے اپنے مقرر راستہ پر چل رہے ہیں۔ نہ کسی کی رفتار میں ذرہ برابر فرق آتا ہے، نہ کوئی اپنے راستہ سے بال برابر ٹل سکتا ہے۔ ان کے درمیان جو نسبتیں قائم کر دی گئی ہیں، اگر ان میں ایک پل کے لیے ذرا سا فرق بھی آجائے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے جس طرح ریلیں ٹکراتی ہیں اس طرح سیارے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔

یہ تو آسمان کی باتیں ہیں۔ ذرا اپنی زمین اور خود اپنی ذات پر نظر ڈال کر دیکھیے۔ اس مٹی کی گیند پر یہ سارا زندگی کا کھیل جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب چند بندھے ہوئے ضابطوں کی بدولت قائم ہے۔ زمین کی کشش نے ساری چیزوں کو اپنے حلقے میں باندھ رکھا ہے۔ ایک سکنڈ کے لیے بھی اگر وہ اپنی گرفت

چھوڑ دے تو سارا کارخانہ بکھر جائے۔ اس کارخانہ میں جتنے کل پرزے کام کر رہے ہیں سب کے سب ایک قاعدے کے پابند ہیں اور اس قاعدے میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ہوا اپنے قاعدے کی پابندی کر رہی ہے، پانی اپنے قاعدے میں بندھا ہوا ہے، روشنی کے لیے جو قاعدہ ہے اس کی وہ مطیع ہے، گرمی اور سردی کے لیے جو ضابطہ ہے اس کی وہ غلام ہے، مٹی، پتھر، دھاتیں، بجلی، اسٹیم، درخت، جانور کسی میں یہ مجال نہیں کہ اپنی حد سے بڑھ جائے یا اپنی خاصیتوں کو بدل دے یا اس کام کو چھوڑ دے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔

پھر اپنی اپنی حد کے اندر اپنے اپنے ضابطہ کی پابندی کرنے کے ساتھ اس کارخانے کے سارے پرزے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں، اور دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب اسی وجہ سے ہو رہا ہے کہ یہ ساری چیزیں اور ساری قوتیں مل کر کام کر رہی ہیں۔ ایک ذرا سے بیج کی ہی مثال لے لیجیے جس کو آپ زمین میں بوتے ہیں۔ وہ کبھی پرورش پا کر درخت بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ زمین اور آسمان کی ساری قوتیں مل کر اس کی پرورش میں حصہ نہ لیں۔ زمین اپنے خزانوں سے اس کو غذا دیتی ہے، سورج اس کی ضرورت کے مطابق اسے گرمی پہنچاتا ہے، پانی سے جو کچھ وہ مانگتا ہے وہ پانی دے دیتا ہے، ہوا سے جو کچھ وہ طلب کرتا ہے وہ ہوا دے دیتی ہے، راتیں اسے ٹھنڈک اور اوس بہم پہنچاتی ہیں، دن اسے گرما کر پختگی کی طرف لے جاتے ہیں، اس طرح مہینوں اور برسوں تک مسلسل ایک باقاعدگی کے ساتھ یہ سب مل جل کر اسے پالتے پوستے ہیں، تب جا کر کہیں درخت بنتا ہے اور اس میں پھل آتے ہیں۔ آپ کی یہ ساری فصلیں جن کے بل بوتے پر آپ جی رہے ہیں، انہی بے شمار مختلف قوتوں کے بالاتفاق کام کرنے ہی کی وجہ سے تیار ہوتی ہیں۔ بلکہ آپ خود زندہ اسی وجہ سے ہیں کہ زمین اور آسمان کی تمام طاقتیں متفقہ طور پر آپ کی پرورش میں لگی ہوئی ہیں۔ اگر تنہا ایک ہوا ہی اس متفقہ کاروبار سے الگ ہو جائے تو آپ ختم ہو جائیں۔ اگر پانی ہوا اور گرمی کے ساتھ موافقت کرنے سے انکار کر دے تو

آپ پر بارش کا ایک قطرہ نہ برس سکے۔ اگر مٹی پانی کے ساتھ اتفاق کرنا چھوڑ دے تو آپ کے باغ سوکھ جائیں، آپ کی کھیتیاں کبھی نہ پکیں اور آپ کے مکان کبھی نہ بن سکیں۔ اگر دیا سلائی کی رگڑ سے آگ پیدا ہونے پر راضی نہ ہو تو آپ کے چولھے ٹھنڈے ہو جائیں اور آپ کے سارے کارخانے یک لخت بیٹھ جائیں۔ اگر لوہا آگ کے ساتھ تعلق رکھنے سے انکار کر دے تو آپ ریلیں اور موٹریں تو درکنار ایک چھری اور ایک سوئی تک نہ بنا سکیں۔ غرض یہ ساری دنیا جس میں آپ جی رہے ہیں یہ صرف اس وجہ سے قائم ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کے سارے محکمے پوری باقاعدگی کے ساتھ، پوری پابندی کے ساتھ، پورے انتظام کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر کام کر رہے ہیں اور کسی محکمے کے کسی اہل کار کی یہ مجال نہیں ہے کہ اپنی ڈیوٹی سے ہٹ جائے یا ضابطہ کے مطابق دوسرے محکموں کے اہل کاروں سے اشتراک عمل نہ کرے۔

یہ جو کچھ میں نے آپ سے بیان کیا ہے، کیا اس میں کوئی بات جھوٹ یا خلاف واقعہ ہے؟ شائد آپ میں سے کوئی بھی اسے جھوٹ نہ کہے گا۔ اچھا، اگر یہ سچ ہے تو مجھے بتلائیے کہ یہ زبردست انتظام، یہ حیرت انگیز باقاعدگی، یہ کمال درجہ کی ہمواری، یہ زمین و آسمان کی بے حد وحساب چیزوں اور طاقتوں میں کامل موافقت آخر کس وجہ سے ہے؟ کروروں برس سے یہ کائنات یونہی قائم چلی آرہی ہے، لکھوکھا سال سے اس زمین پر درخت اُگ رہے ہیں، جانور پیدا ہو رہے ہیں، اور نہ معلوم کب سے انسان اس زمین پر جی رہا ہے کبھی ایسا نہ ہوا کہ چاند زمین پر گر جاتا، یا زمین سورج سے جا ٹکراتی۔ کبھی رات اور دن کے حساب میں فرق نہ آیا۔ کبھی ہوا کے محکمہ کی پانی کے محکمہ سے لڑائی نہ ہوئی۔ کبھی پانی مٹی سے نہ روٹھا۔ کبھی گرمی نے آگ سے رشتہ نہ توڑا۔ آخر اس سلطنت کے تمام صوبے، تمام محکمے، تمام ہرکارے اور کارندے کیوں اس طرح قانون اور ضابطے کی پابندی کیے چلے جا رہے ہیں؟ کیوں ان میں لڑائی نہیں ہوتی؟ کیوں فساد برپا نہیں ہوتا؟ کس چیز کی وجہ سے یہ سب ایک انتظام میں بندھے ہوئے ہیں؟ بس

کا جواب اپنے دل سے پوچھیے۔ کیا وہ گواہی نہیں دیتا کہ ایک ہی خدا اس ساری کائنات کا بادشاہ ہے، ایک ہی کا فرمان سب پر چل رہا ہے، ایک ہی ہے جس کی زبردست طاقت نے سب کو اپنے ضابطہ میں باندھ رکھا ہے؟ اگر دو نہیں تین نہیں، دو خدا بھی اس کائنات کے مالک ہوتے تو یہ انتظام اس باقاعدگی کے ساتھ کبھی نہ چل سکتا۔ ایک ذرا سے مدرسے کا انتظام تو دو ہیڈ ماسٹروں کی ہیڈ ماسٹری برداشت نہیں کر سکتا، پھر بھلا اتنی بڑی زمین و آسمان کی سلطنت دو خداؤں کی خدائی میں کیسے چل سکتی تھی؟

پس واقعہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ دنیا کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بنی ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کو ایک ہی نے بنایا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اس دنیا کا انتظام کسی حاکم کے بغیر نہیں چل رہا ہے، بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ حاکم ایک ہی ہے۔ انتظام کی باقاعدگی صاف کہہ رہی ہے کہ یہاں ایک کے سوا کسی کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات نہیں ہیں۔ ضابطہ کی پابندی منہ سے بول رہی ہے کہ اس سلطنت میں ایک حاکم کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا۔ قانون کی سخت گیری شہادت دے رہی ہے کہ ایک بادشاہ کی حکومت زمین سے آسمان تک قائم ہے، چاند سورج اور سیارے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، زمین اپنی تمام چیزوں کے ساتھ اسی کی تابع فرمان ہے، ہوا اسی کی غلام ہے۔ پانی اسی کا بندہ ہے، دریا اور پہاڑ اسی کے محکوم ہیں، درخت اور جانور اسی کے مطیع ہیں، انسان کا جینا اور مرنا اسی کے اختیار میں ہے، اس کی مضبوط گرفت نے سب کو پوری قوت کے ساتھ جکڑ رکھا ہے اور کوئی اتنا زور نہیں رکھتا کہ اس کی حکومت میں اپنا حکم چلا سکے۔ درحقیقت اس مکمل تنظیم میں ایک سے زیادہ حاکموں کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ تنظیم کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ حکم میں ایک شمّہ برابر بھی کوئی اس کا حصہ دار نہ ہو، تنہا وہی حاکم ہو اور اس کے سوا سب محکوم ہوں، کیونکہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں فرمانروائی کے ادنیٰ سے اختیارات ہونے کے معنی بھی بدنظمی و فساد کے ہیں۔ حکم چلانے کے لیے صرف طاقت ہی درکار نہیں ہے، علم بھی درکار ہے، اتنی وسیع نظر درکار ہے کہ تمام کائنات کو بیک وقت دیکھ سکے اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ کر احکام جاری کر سکے۔ اگر خداوندِ عالم

کے سوا کچھ چھوٹے چھوٹے خدا ایسے ہوتے جو نگاہ جہاں ہیں تو نہ رکھتے، لیکن انہیں دنیا کے کسی حصے یا کسی معاملہ میں اپنا حکم چلانے کا اختیار حاصل ہوتا تو یہ زمین و آسمان کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ ایک معمولی مشین کے متعلق بھی آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی ایسے شخص کو اس میں دخل اندازی کا اختیار دے دیا جائے جو اس سے پوری طرح واقف نہ ہو تو وہ اسے بگاڑ کر رکھ دے گا۔ لہٰذا عقل فیصلہ کرتی ہے اور زمین و آسمان کے نظام سلطنت کا انتہائی باضابطگی کے ساتھ چلنا اس کی گواہی دیتا ہے کہ اس سلطنت کے اختیارات شاہی میں ایک خدا کے سوا کسی کا ذرہ برابر بھی حصہ نہیں ہے۔

یہ صرف ایک واقعہ ہی نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ خدا کی خدائی میں خود خدا کے سوا کسی کا حکم چلنے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ جن کو اس نے اپنے دست قدرت سے بنایا ہے، جو اس کے مخلوق ہیں، جن کی ہستی اس کی عنایت سے قائم ہے، جو اس سے بے نیاز ہو کر خود اپنے بل بوتے پر ایک لمحہ کے لیے بھی موجود نہیں رہ سکتے، ان میں سے کسی کی یہ حیثیت کب ہو سکتی ہے کہ خدائی میں اس کا حصہ دار بن جائے؟ کیا کسی نوکر کو آپ نے ملکیت میں آقا کا شریک ہوتے دیکھا ہے؟ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ کوئی مالک اپنے غلام کو اپنا ساجھی بنالے؟ کیا خود آپ میں سے کوئی شخص اپنے ملازموں میں سے کسی کو اپنی جائداد میں یا اپنے اختیارات میں حصہ دار بناتا ہے؟ اس بات پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کا دل گواہی دے گا کہ خدا کی اس سلطنت میں کسی بندے کو خود مختارانہ فرمانروائی کا کوئی حق حاصل ہی نہیں ہے۔ ایسا ہونا نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے، نہ صرف عقل اور فطرت کے خلاف ہے، بلکہ حق کے خلاف بھی ہے۔

انسان کی تباہی کا اصلی سبب

صاحبو! یہ وہ بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر اس دنیا کا پورا نظام چل رہا ہے۔ آپ اس دنیا سے الگ نہیں ہیں، بلکہ اس کے اندر اس کے ایک جز کی حیثیت سے رہتے ہیں، لہٰذا آپ کی زندگی کے لیے بھی یہ حقیقتیں اسی طرح بنیادی ہیں جس طرح کل جہان کے لیے ہیں۔

آج یہ سوال آپ میں سے ہر شخص کے لیے اور دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ایک پریشان کن گتھی بنا ہوا ہے کہ آخر ہم انسانوں کی زندگی سے امن چین کیوں رخصت ہو گیا ہے؟ کیوں آئے دن مصیبتیں ہم پر نازل ہو رہی ہیں؟ کیوں ہماری زندگی کی کل بگڑ گئی ہے؟ قومیں قوموں سے ٹکرا رہی ہیں۔ ملک ملک میں کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ آدمی آدمی کے لیے بھیڑیا بن گیا ہے۔ لاکھوں انسان لڑائیوں میں برباد ہو رہے ہیں۔ کروروں اور اربوں کے کاروبار غارت ہو رہے ہیں۔ بستیوں کی بستیاں اجڑ رہی ہیں۔ طاقتور کمزوروں کو کھائے جاتے ہیں۔ مال دار غریبوں کو لوٹے لیتے ہیں۔ حکومت میں ظلم ہے عدالت میں بے انصافی ہے۔ دولت میں بدمستی ہے۔ اقتدار میں غرور ہے۔ دوستی میں بے وفائی ہے۔ امانت میں خیانت ہے۔ اخلاق میں راستی نہیں رہی۔ انسان پر سے انسان کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ مذہب کے جامہ میں لامذہبی ہو رہی ہے۔ آدم کے بچے لاتعداد گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو دغا، ظلم، بے ایمانی، ہر ممکن طریقے سے نقصان پہنچانا کارِ ثواب سمجھ رہا ہے۔ یہ ساری خرابیاں آخر کس وجہ سے ہیں؟ خدا کی خدائی میں اور جس طرف بھی ہم دیکھتے ہیں امن ہی امن نظر آتا ہے۔ ستاروں میں امن ہے۔ ہوا میں امن ہے۔ پانی میں امن ہے۔ درختوں اور جانوروں میں امن ہے۔ تمام مخلوقات کا انتظام پورے امن کے ساتھ چل رہا ہے کہیں فساد یا بدنظمی کا نشان نہیں پایا جاتا۔ مگر ایک انسان ہی کی زندگی کیوں اس نعمت سے محروم ہو گئی؟

یہ ایک بڑا سوال ہے جسے حل کرنے میں لوگوں کو سخت پریشانی پیش آ رہی ہے۔ مگر میں پورے اطمینان کے ساتھ اس کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ میرے پاس اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی کو حقیقت اور واقعہ کے خلاف بنا دیا ہے اس لیے وہ تکلیف اٹھا رہا ہے اور جب تک وہ پھر اسے حقیقت کے مطابق نہ بنائے گا کبھی چین نہ پا سکے گا۔ آپ چلتی ہوئی ریل کے دروازے کو اپنے گھر کا دروازہ سمجھ بیٹھیں اور اسے کھول کر بے تکلف اس طرح باہر نکل آئیں جیسے اپنے مکان کے صحن میں قدم

رکھ رہے ہیں، تو آپ کی اس غلط فہمی سے نہ ریل کا دروازہ گھر کا دروازہ بن جائے گا اور نہ وہ میدان جہاں آپ گریں گے آپ کے گھر کا صحن ثابت ہوگا۔ آپ کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت ذرا بھی نہ بدلے گی۔ تیز دوڑتی ہوئی ریل کے دروازے سے جب آپ باہر تشریف لائیں گے تو اس کا جو نتیجہ ظاہر ہونا ہے وہ ظاہر ہو کر ہی رہے گا، خواہ ٹانگ ٹوٹنے اور سر پھٹنے کے بعد بھی آپ یہ تسلیم نہ کریں کہ آپ نے جو کچھ سمجھا تھا غلط تھا۔ بالکل اسی طرح اگر آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، یا آپ خود اپنے خدا بن بیٹھیں، یا خدا کے سوا کسی اور کی خدائی مان لیں، تو آپ کے ایسا سمجھنے یا مان لینے سے حقیقت ہرگز نہ بدلے گی۔ خدا خدا ہی رہے گا۔ اس کی زبردست سلطنت، جس میں آپ محض رعیت کی حیثیت سے رہتے ہیں، پورے اختیارات کے ساتھ اسی کے قبضہ میں رہے گی۔ البتہ آپ اپنی غلط فہمی کی وجہ سے جو طرز زندگی اختیار کریں گے اس کا نہایت برا خمیازہ آپ کو بھگتنا پڑے گا، خواہ آپ تکلیفیں اٹھانے کے بعد بھی اپنی اس غلط زندگی کو بجائے خود صحیح ہی سمجھتے رہیں۔

پہلے جو کچھ میں بیان کر چکا ہوں اسے ذرا اپنی یاد میں پھر تازہ کر لیجیے۔ خداوند عالم کسی کے بنائے سے خداوند عالم نہیں بنا ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ آپ اس کی خدائی مانیں تو وہ خدا ہو۔ آپ خواہ مانیں یا نہ مانیں وہ تو خود خدا ہے۔ اس کی خدائی خود اپنے زور پر قائم ہے۔ اس نے آپ کو اور اس دنیا کو خود بنایا ہے۔ یہ زمین، یہ چاند اور سورج اور یہ ساری کائنات اس کے حکم کی تابع ہے۔ اس کائنات میں جتنی قوتیں کام کر رہی ہیں سب اس کے زیر حکم ہیں۔ وہ ساری چیزیں جن کے بل پر آپ زندہ ہیں، اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ خود آپ کا اپنا وجود اس کے اختیار میں ہے۔ اس واقعہ کو آپ کسی طرح بدل نہیں سکتے۔ آپ اس کو نہ مانیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ آپ اس سے آنکھیں بند کر لیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ آپ اس کے سوا کچھ اور سمجھ بیٹھیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ ان سب صورتوں میں واقعہ کا تو کچھ بھی نہیں بگڑتا، البتہ فرق یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ اس واقعہ کو تسلیم کر کے اپنی وہی حیثیت قبول کریں جو اس

واقعہ کے اندر در اصل آپ کی ہے تو آپ کی زندگی درست ہوگی، آپ کو چین ملے گا، امن ملے گا، اطمینان نصیب ہوگا، اور آپ کی زندگی کی ساری کل ٹھیک چلے گی۔ اور اگر آپ نے واقعہ کے خلاف کوئی اور حیثیت اختیار کی تو انجام وہی ہوگا جو چلتی ہوئی ریل کے دروازے کو اپنے گھر کا دروازہ سمجھ کر قدم باہر نکالنے کا ہوتا ہے۔ چوٹ آپ خود کھائیں گے۔ ٹانگ آپ کی ٹوٹے گی۔ سر آپ کا پھٹے گا۔ تکلیف آپ کو پہنچے گی۔ واقعہ جیسا تھا ویسا ہی رہے گا۔

آپ سوال کریں گے کہ اس واقعہ کے مطابق ہماری صحیح حیثیت کیا ہے۔ میں چند لفظوں میں اس کی تشریح کر دیتا ہوں۔ اگر کسی نوکر کو آپ تنخواہ دے کر پال رہے ہوں تو بتائیے اس نوکر کی اصلی حیثیت کیا ہے؟ یہی نا کہ آپ کی نوکری بجا لائے، آپ کے حکم کی اطاعت کرے، آپ کی مرضی کے مطابق کام کرے اور نوکری کی حد سے نہ بڑھے۔ نوکر کا کام آخر نوکری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ آپ اگر افسر ہوں اور کوئی آپ کا ماتحت ہو تو ماتحت کا کام کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ ماتحتی کرے، افسری کی ہوا میں نہ رہے۔ آپ کسی جائداد کے مالک ہوں تو اس جائداد میں آپ کی خواہش کیا ہوگی؟ یہی نا کہ اس میں آپ کی مرضی چلے۔ جو کچھ آپ چاہیں وہی اس میں ہو اور آپ کی مرضی کے خلاف پتہ نہ ہل سکے۔ آپ پر اگر کوئی بادشاہی مسلط ہو اور تمام قوتیں اس کے ہاتھ میں ہوں تو ایسی بادشاہی کی موجودگی میں آپ کی حیثیت کیا ہو سکتی ہے؟ یہی نا کہ آپ سیدھی طرح رعیت بن کر رہنا قبول کریں اور شاہی قانون کی فرماں برداری سے قدم باہر نہ نکالیں۔ بادشاہ کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے اگر آپ خود اپنی بادشاہی کا دعویٰ کریں گے یا کسی دوسرے کی بادشاہی مان کر اس کے حکم پر چلیں گے تو آپ باغی ہوں گے اور باغی کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔

ان مثالوں سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ خدا کی اس سلطنت میں آپ کی اصلی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو اس نے بنایا ہے۔ قدرتی طور پر آپ کا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہے کہ اپنے بنانے والے کی مرضی پر چلیں۔ آپ

کو وہ پال رہا ہے اور اسی کے خزانے سے آپ تنخواہ لے رہے ہیں۔ آپ کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ آپ اس کے نوکر ہیں۔ آپ کا اور ساری دنیا کا افسر وہ ہے۔ اس کی افسری میں آپ کی حیثیت ماتحتی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ زمین اور آسمان سب اس کی جائداد ہیں۔ اس جائداد میں اسی کی مرضی چلے گی اور اسی کی چلنی چاہیے۔ آپ کو یہاں اپنی مرضی چلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اپنی مرضی آپ چلانے کی کوشش کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔ اس سلطنت میں اس کی بادشاہی اُس کے اپنے زور پر قائم ہے۔ زمین اور آسمان کے سارے محکمے اس کے قبضے میں ہیں، اور آپ خواہ راضی ہوں یا نہ ہوں، بہرحال خود بخود آپ اس کی رعیت ہیں۔ آپ کی اور کسی انسان کی بھی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کوئی دوسری حیثیت رعیت ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اسی کا قانون اس سلطنت میں قانون ہے اور اسی کا حکم حکم ہے۔ رعیت میں سے کسی کو یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ میں ہز میجسٹی ہوں، یا ہز ہائی نس ہوں، یا ڈکٹیٹر اور مختارِ کل ہوں۔ نہ کسی شخص یا پارلیمنٹ یا اسمبلی یا کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اس سلطنت میں خدا کے بجائے خود اپنا قانون بنائے، اور خدا کی رعیت سے کہے کہ ہمارے اس قانون کی پیروی کرو۔ نہ کسی انسانی حکومت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ خدا کے حکم سے بے نیاز ہو کر خدا کے بندوں پر خود اپنا حکم چلائے اور ان سے کہے کہ ہمارے اس حکم کی اطاعت کرو۔ نہ کسی انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کے لیے یہ جائز ہے کہ اصلی بادشاہ کی رعیت بننے کے بجائے بادشاہی کے جھوٹے مدعیوں میں سے کسی کی رعیت بننا قبول کرے، اصلی بادشاہ کے قانون کو چھوڑ کر جھوٹے قانون سازوں کا قانون تسلیم کرے، اور اصلی حکمراں سے منہ موڑ کر جھوٹ موٹ کی ان حکومتوں کا حکم ماننے لگے۔ یہ تمام صورتیں بغاوت کی ہیں۔ بادشاہی کے اختیارات کا دعویٰ کرنا اور ایسے دعوے کو قبول کرنا، دونوں حرکتیں رعیت کے لیے بغاوت کا حکم رکھتی ہیں۔ اور اس بغاوت کی سزا ان دونوں کو ملنی یقینی ہے، خواہ جلدی ملے یا دیر میں۔

آپ کی اور ایک ایک انسان کی پیشانی کے بال خدا کی مٹھی میں ہیں جب چاہے پکڑ کر گھسیٹ

لے۔ زمین اور آسمان کی اس سلطنت سے بھاگ جانے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ آپ اس سے بھاگ کر کہیں پناہ نہیں لے سکتے۔ مٹی میں مل کر آپ کا ایک ایک ذرہ بھی اگر منتشر ہو جائے، آگ میں جل کر خواہ آپ کی راکھ ہوا میں پھیل جائے، پانی میں بہ کر خواہ آپ مچھلیوں کی غذا بنیں یا سمندر کے پانی میں گھل جائیں، ہر جگہ سے خدا آپ کو پکڑ بلائے گا۔ ہوا اس کی غلام ہے۔ زمین اس کی بندی ہے۔ پانی اور اس کی مچھلیاں سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ ایک اشارے پر سب طرف سے آپ پکڑے ہوئے آ جائیں گے، اور پھر وہ آپ میں سے ایک ایک کو بلا کر پوچھے گا کہ میری رعیت ہو کر بادشاہی کا دعوی کرنے کا حق تمہیں کہاں سے پہنچ گیا تھا؟ میرے ملک میں اپنا حکم چلانے کے اختیارات تم کہاں سے لائے تھے؟ میری سلطنت میں اپنا قانون جاری کرنے والے تم کون تھے؟ میرے بندے ہو کر دوسروں کی بندگی کرنے پر تم کیسے راضی ہو گئے؟ میرے نوکر ہو کر تم نے دوسروں کا حکم مانا، مجھ سے تنخواہ لے کر دوسروں کو ان داتا اور رازق سمجھا، میرے غلام ہو کر دوسروں کی غلامی کی، میری بادشاہی میں رہتے ہوئے دوسروں کی شاہی مانی، دوسروں کے قانون کو قانون سمجھا اور دوسروں کے فرامین کی اطاعت کی۔ یہ بغاوت کس طرح تمہارے لیے جائز ہو گئی تھی؟ فرمائیے، آپ میں سے کس کے پاس اس الزام کا جواب ہے؟ کون سے وکیل صاحب وہاں اپنے قانونی داؤ پیچ سے بچاؤ کی صورت نکال سکیں گے؟ اور کون سی سفارش پر آپ بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ آپ کو اس بغاوت کے جرم کی سزا بھگتنے سے بچا لے گی؟

ظلم کی وجہ صاحبو! یہاں صرف حق ہی کا سوال نہیں ہے۔ یہ سوال بھی ہے کہ خدا کی اس خدائی میں کیا کوئی انسان بادشاہی یا قانون سازی یا حکمرانی کا اہل ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں ایک معمولی مشین کے متعلق بھی آپ یہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی اناڑی شخص جو اس کی مشینری سے واقف نہ ہو، اسے چلائے گا تو اس کو بگاڑ دے گا۔ ذرا کسی ناواقف آدمی سے ایک موٹر ہی چلوا کر

دیکھ لیجیے۔ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حماقت کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اب خود سوچیے کہ لوہے کی ایک مشین کا حال جب یہ ہے کہ صحیح علم کے بغیر اس کو استعمال نہیں کیا جا سکتا تو انسان جس کے نفسیات انتہا درجہ کے پیچیدہ ہیں، جس کی زندگی کے معاملات بے شمار پہلو رکھتے ہیں اور ہر پہلو میں لاکھوں گتھیاں ہیں، اس کی پیچ در پیچ مشینری کو وہ لوگ کیا چلا سکتے ہیں جو دوسروں کو جاننا اور سمجھنا تو درکنار خود اپنے آپ کو بھی اچھی طرح نہیں جانتے، نہیں سمجھتے۔ ایسے اناڑی جب قانون ساز بن بیٹھیں گے اور ایسے نادان جب انسانی زندگی کی ڈرائیوری کرنے پر آمادہ ہوں گے تو کیا اس کا انجام کسی اناڑی شخص کے موٹر چلانے کے انجام سے کچھ بھی مختلف ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں خدا کے بجائے انسانوں کا بنایا ہوا قانون مانا جا رہا ہے اور جہاں خدا کی اطاعت سے بے نیاز ہو کر انسان حکم چلا رہے ہیں اور انسان اُن کا حکم مان رہے ہیں، وہاں کسی جگہ بھی امن نہیں ہے کسی جگہ بھی آدمی کو چین نصیب نہیں، کسی جگہ بھی انسانی زندگی کی کل سیدھی نہیں چلتی۔ کشت و خون ہو رہے ہیں ظلم اور بے انصافی ہو رہی ہے، لوٹ کھسوٹ برپا ہے، آدمی کا آدمی خون چوس رہا ہے، انسانوں کے اخلاق تباہ ہو رہے ہیں صحتیں برباد ہو رہی ہیں، تمام طاقتیں جو خدا نے انسان کو دی تھیں، انسان کے فائدے کے بجائے اس کی تباہی اور بربادی میں صرف ہو رہی ہیں۔ یہ مستقل دوزخ جو اسی دنیا میں انسان نے اپنے لیے آپ اپنے ہاتھوں بنا لی ہے اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ اس نے بچوں کی طرح شوق میں آ کر اُس مشین کو چلانے کی کوشش کی جس کے کل پرزوں سے وہ واقف ہی نہیں۔

اس مشین کو جس نے بنایا ہے وہی اس کے رازوں کو جانتا ہے، وہی اس کی فطرت سے واقفیت رکھتا ہے، اسی کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہے کہ یہ کس طرح صحیح چل سکتی ہے۔ اگر آدمی اپنی حماقت سے باز آجائے اور اپنی جہالت تسلیم کر کے اُس قانون کی پابندی کرنے لگے جو خود اس مشین کے بنانے والے نے مقرر کیا ہے تب تو جو کچھ بگڑا ہے وہ پھر بن سکتا ہے، ورنہ ان مصیبتوں کا کوئی حل ممکن نہیں ہے۔

بے انصافی کیوں ہے؟ آپ ذرا اور گہری نظر سے دیکھیں تو آپ کو جہالت کے سوا اپنی زندگی کے بگاڑ کی ایک اور وجہ بھی نظر آئے گی۔ ذرا سی عقل یہ بات سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ انسان کسی ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کا نام نہیں ہے۔ تمام دنیا کے انسان بہرحال انسان ہیں۔ تمام انسانوں کو جینے کا حق ہے۔ سب اس کے حقدار ہیں کہ ان کی ضرورتیں پوری ہوں۔ سب امن کے، انصاف کے، عزت اور شرافت کے مستحق ہیں۔ انسانی خوشحالی اگر کسی چیز کا نام ہے تو وہ کسی ایک شخص یا خاندان یا قوم کی خوشحالی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی خوشحالی ہے۔ ورنہ ایک خوشحال ہو اور دس بدحال ہوں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان خوشحال ہے۔ فلاح اگر کسی چیز کو کہتے ہیں تو وہ تمام انسانوں کی فلاح ہے نہ کہ کسی ایک طبقہ کی یا ایک قوم کی۔ ایک کی فلاح اور دس کی بربادی کو آپ انسانی فلاح نہیں کہہ سکتے۔ اس بات کو اگر آپ صحیح سمجھتے ہیں تو غور کیجیے کہ انسانی فلاح اور خوشحالی کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ انسان کی زندگی کے لیے قانون وہ بنائے جس کی نظر میں تمام انسان یکساں ہوں۔ سب کے حقوق انصاف کے ساتھ وہ مقرر کرے جو نہ تو خود اپنی کوئی ذاتی غرض رکھتا ہو اور نہ کسی خاندان یا طبقہ کی یا کسی ملک یا قوم کی اغراض سے وابستہ ہو۔ سب کے سب حکم اُس کا مانیں جو حکم دینے میں نہ اپنی جہالت کی وجہ سے غلطی کرے، نہ اپنی خواہش نفس کی بنا پر حکمرانی کے اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھائے اور نہ ایک کا دشمن اور دوسرے کا دوست، ایک کا طرف دار اور دوسرے کا مخالف، ایک کی طرف مائل اور دوسرے سے منحرف ہو۔ صرف اسی صورت میں عدل قائم ہو سکتا ہے اسی طرح تمام انسانوں، تمام قوموں، تمام طبقوں اور تمام گروہوں کو ان کے جائز حقوق پہنچ سکتے ہیں، اور یہی ایک صورت ہے جس سے ظلم مٹ سکتا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی انسان بھی ایسا بے لاگ، ایسا غیر جانب دار، ایسا بے غرض، اور اس قدر انسانی کمزوریوں سے بالاتر ہو سکتا ہے؟ شائد آپ میں سے کوئی شخص میرے اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کریگا یہ

شان صرف خدا ہی کی ہے۔ کوئی دوسرا اس شان کا نہیں ہے۔ انسان خواہ کتنے ہی بڑے دل گردے کا ہو، بہرحال وہ اپنی کچھ ذاتی اغراض رکھتا ہے، کچھ دلچسپیاں رکھتا ہے، کسی سے اس کا تعلق زیادہ ہے اور کسی سے کم، کسی سے محبت ہے اور کسی سے نہیں ہے، کسی سے اس کو وابستگی ہے اور کسی سے نہیں ہے۔ ان کمزوریوں سے کوئی انسان پاک نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں خدا کے بجائے انسانوں کا قانون مانا جاتا ہے اور خدا کے بجائے انسانوں کے حکم کی اطاعت کی جاتی ہے وہاں کسی نہ کسی صورت میں ظلم اور بے انصافی ضرور موجود ہے۔

ان شاہی خاندانوں کو دیکھیے جو زبردستی اپنی طاقت کے بل بوتے پر امتیازی حیثیت حاصل کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے وہ عزت، وہ ٹھاٹھ، وہ آمدنی، وہ حقوق اور وہ اختیارات مخصوص کر لیے ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں ہیں۔ یہ قانون سے بالاتر ہیں! ان کے خلاف کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چاہے کچھ کریں، ان کے مقابلہ میں کوئی چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی۔ کوئی عدالت ان کے نام سمن نہیں بھیج سکتی۔ دنیا دیکھتی ہے کہ یہ غلطیاں کرتے ہیں، مگر کہا یہ جاتا ہے اور ماننے والے بھی مان لیتے ہیں کہ بادشاہ غلطی سے پاک ہے۔ دنیا دیکھتی ہے کہ یہ معمولی انسان ہیں جیسے اور سب انسان ہوتے ہیں، مگر یہ خدا بن کر سب سے اونچے بیٹھتے ہیں اور لوگ ان کے سامنے یوں ہاتھ باندھے، سر جھکائے، ڈرے سہمے کھڑے ہوتے ہیں گویا ان کا رزق، اُن کی زندگی، اُن کی موت سب ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ رعایا کا پیسہ اچھے اور بُرے ہر طریقے سے گھسیٹتے ہیں اور اسے اپنے محلوں پر، اپنی سواریوں پر، اپنے عیش و آرام اور اپنی تفریحوں پر بے دریغ لٹاتے ہیں۔ ان کے کتوں کو وہ روٹی ملتی ہے جو کما کر دینے والی رعایا کو نصیب نہیں ہوتی۔ کیا یہ انصاف ہے؟ کیا یہ طریقہ کسی ایسے عادل کا مقرر کیا ہوا ہو سکتا ہے جس کی نگاہ میں سب انسانوں کے حقوق اور مفاد یکساں ہوں؟

ان برہمنوں اور پیروں کو دیکھیے، ان نوابوں اور رئیسوں کو دیکھیے، ان جاگیرداروں اور زمینداروں

کو دیکھیے، ان ساہوکاروں اور مہاجنوں کو دیکھیے۔ یہ سب طبقے اپنے آپ کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ ان کے زور و اثر سے جتنے قوانین دنیا میں بنے ہیں وہ انہیں ایسے حقوق دیتے ہیں جو عام انسانوں کو نہیں دیے گئے۔ یہ پاک ہیں اور دوسرے ناپاک۔ یہ شریف ہیں اور دوسرے کمین۔ یہ اونچے ہیں اور دوسرے نیچے۔ یہ لوٹنے کے لیے ہیں اور دوسرے لُٹنے کے لیے۔ ان کے نفس کی خواہشوں پر لوگوں کی جان، مال، عزت، آبرو ہر ایک چیز قربان کر دی جاتی ہے۔ کیا یہ ضابطے کسی منصف کے بنائے ہوئے ہو سکتے ہیں؟ کیا ان میں صریح طور پر خود غرضی اور جانبداری نظر نہیں آتی؟

ان حاکم قوموں کو دیکھیے جو اپنی طاقت کے بل پر دوسری قوموں کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا کون سا قانون اور کون سا ضابطہ ایسا ہے جس میں خود غرضی شامل نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ کو انسان اعلیٰ کہتے ہیں بلکہ درحقیقت صرف اپنے ہی کو انسان سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کمزور قوموں کے لوگ یا تو انسان ہی نہیں ہیں یا اگر ہیں تو ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ یہ ہر حیثیت سے اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا ہی رکھتے ہیں اور اپنی اغراض پر دوسروں کے مفاد کو قربان کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ان کے زور و اثر سے جتنے قوانین اور ضوابط دنیا میں بنے ہیں ان سب میں یہ رنگ موجود ہے۔

یہ چند مثالیں میں نے محض اشارے کے طور پر دی ہیں تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جہاں بھی انسان نے قانون بنایا ہے وہاں بے انصافی ضرور ہوئی ہے، کچھ انسانوں کو ان کے جائز حقوق سے بہت زیادہ دیا گیا ہے اور کچھ انسانوں کے حقوق نہ صرف پامال کیے گئے ہیں بلکہ انہیں انسانیت کے درجہ سے گرا دینے میں بھی تامل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ کرنے بیٹھتا ہے تو اس کے دل و دماغ پر اپنی ذات یا اپنے خاندان، یا اپنی نسل یا اپنے طبقے یا اپنی قوم ہی کے مفاد کا خیال مسلط ہوتا ہے۔ دوسروں کے حقوق اور مفاد کے لیے اس کے پاس وہ ہمدردی کی نظر نہیں ہوتی جو اپنوں کے لیے ہوتی

ہے۔ مجھے بتائیے، کیا اس بے انصافی کا کوئی علاج اس کے سوا ممکن ہے کہ تمام انسانی توانین کو دریا برد کر دیا جائے، اور اُس خدا کے قانون کو ہم سب تسلیم کریں جس کی نگاہ میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں، فرق اگر ہے تو صرف اُس کے اخلاق، اُس کے اعمال اور اُس کے اوصاف (MERITS) کے لحاظ سے ہے نہ کہ نسل یا طبقہ یا قومیت کے لحاظ سے؟

امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے

صاحبو! اس معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے میں نظرانداز نہیں کر سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ آدمی کو قابو میں رکھنے والی چیز صرف ذمہ داری کا احساس ہی ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ جو چاہے کرے کوئی اس سے جواب طلب کرنے والا نہیں ہے اور نہ اس کے اوپر کوئی ایسی طاقت ہے جو اسے سزا دے سکے، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ شتر بے مہار بن جائے گا۔ یہ بات جس طرح ایک شخص کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح ایک خاندان، ایک طبقہ، ایک قوم اور تمام دنیا کے انسانوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ ایک خاندان بھی جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس سے کوئی جواب طلب نہیں کر سکتا تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ بھی جب ذمہ داری اور جواب دہی سے بے خوف ہو جاتا ہے تو دوسروں پر ظلم ڈھانے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ایک قوم یا ایک سلطنت بھی جب اپنے آپ کو اتنا طاقتور پاتی ہے کہ اس کو اپنی زیادتی کے کسی بُرے نتیجے کا خوف نہیں ہوتا تو وہ جنگل کے بھیڑیے کی طرح کمزور بکریوں کو پھاڑنا اور کھانا شروع کر دیتی ہے۔ دنیا میں جتنی بدامنی پائی جاتی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ جب تک انسان اپنے سے بالاتر کسی اقتدار کو تسلیم نہ کرے، اور جب تک اسے یہ یقین نہ ہو کہ مجھ سے اوپر کوئی ایسا ہے جس کو مجھے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے اور جس کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہے کہ مجھے سزا دے سکتا ہے، اس وقت تک یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ظلم کا دروازہ بند ہو اور صحیح امن قائم ہو سکے۔

اب مجھے بتائیے کہ ایسی طاقت سوائے خداوند عالم کے اور کون سی ہو سکتی ہے؟ خود انسانوں میں

سے تو کوئی ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ جس انسان یا جس انسانی گروہ کو بھی آپ یہ حیثیت دیں گے خود اس کے شتر بے مہار ہو جانے کا امکان ہے، خود اس سے اندیشہ ہے کہ تمام فرعونوں کا ایک فرعون وہ ہو جائے گا، اور خود اس سے یہ خطرہ ہے کہ خود غرضی اور جانب داری سے کام لے کر وہ بعض انسانوں کو گرائے گا اور بعض کو اٹھائے گا۔ یورپ نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مجلس اقوام بنائی تھی۔ مگر بہت جلدی وہ سفید رنگ والی قوموں کی مجلس بن کر رہ گئی اور اس نے چند طاقتور سلطنتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر کمزور قوموں کے ساتھ بے انصافی شروع کر دی۔ اس تجربہ کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہ سکتا کہ خود انسانوں کے اندر سے کوئی ایسی طاقت برآمد ہونی ناممکن ہے جس کی باز پرس کا خوف فرداً فرداً ایک ایک شخص سے لے کر دنیا کی قوموں اور سلطنتوں تک کو قابو میں رکھ سکتا ہو۔ ایسی طاقت لامحالہ انسانی دائرے سے باہر اور اس سے اوپر ہی ہونی چاہیے، اور وہ صرف خداوند عالم ہی کی طاقت ہو سکتی ہے۔ ہم اگر اپنی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ خدا پر ایمان لائیں، اس کی حکومت کے آگے اپنے آپ کو فرمانبردار رعیت کی طرح سپرد کر دیں، اور اس یقین کے ساتھ دنیا میں زندگی بسر کریں کہ وہ بادشاہ ہمارے کھلے اور چھپے سب کاموں کو جانتا ہے اور ایک دن ہمیں اس کی عدالت میں اپنی پوری زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہے۔ ہمارے شریف اور پُرامن انسان بننے کی بس یہی ایک صورت ہے۔

ایک شبہ اب میں اپنے خطبہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک شبہ کو صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو غالباً آپ میں سے ہر ایک کے دل میں پیدا ہو رہا ہو گا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جب خدا کی حکومت اتنی زبردست ہے کہ خاک کے ایک ذرہ سے لے کر چاند اور سورج تک ہر چیز اس کے قابو میں ہے، اور جب انسان اس کی حکومت میں محض ایک رعیت کی حیثیت رکھتا ہے تو آخر یہ ممکن کس طرح ہوا کہ انسان اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کرے اور خود اپنی بادشاہی کا اعلان کر کے اس کی رعیت پر

اپنا قانون چلائے؟ کیوں نہیں خدا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا اور کیوں اسے سزا نہیں دیتا؟ اس سوال کا جواب میں چند مختصر الفاظ میں دوں گا۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی حکومت میں انسان کی حیثیت قریب قریب ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی ضلع کا افسر بنا کر بھیجتا ہے۔ ملک بادشاہ ہی کا ہوتا ہے۔ رعیت بھی اسی کی ہوتی ہے۔ ریل، ٹیلیفون، تار، فوج اور دوسری تمام طاقتیں بادشاہ ہی کے ہاتھ میں رہتی ہیں، اور بادشاہ کی سلطنت اس ضلع پر چاروں طرف سے اس طرح چھائی ہوئی ہوتی ہے کہ اس چھوٹے سے ضلع کا افسر اس کے مقابلہ میں بالکل عاجز ہوتا ہے۔ اگر بادشاہ چاہے تو اس کو پوری طرح مجبور کر سکتا ہے کہ اس کے حکم سے بال برابر بھی نہ موڑ سکے لیکن بادشاہ اس افسر کی عقل کا، اس کے ظرف کا اور اس کی لیاقت کا امتحان لینا چاہتا ہے، اس لیے وہ اس پر سے اپنی گرفت اتنی ڈھیلی کر دیتا ہے کہ اسے اپنے اوپر کوئی بالاتر اقتدار محسوس نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ افسر عقلمند، نمک حلال، فرض شناس اور وفادار ہے تو اس ڈھیلی گرفت کے باوجود وہ اپنے آپ کو رعیت اور ملازم ہی سمجھتا رہتا ہے، بادشاہ کے ملک میں اسی کے قانون کے مطابق حکومت کرتا ہے، اور جو اختیارات بادشاہ نے اسے دیے ہیں انہیں خود بادشاہ کی مرضی کے موافق استعمال کرتا ہے۔ اس وفادارانہ طرز عمل سے اس کی اہلیت ثابت ہو جاتی ہے اور بادشاہ اسے زیادہ بلند مرتبوں کے قابل پا کر ترقیوں پر ترقیاں دیتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ افسر بے وقوف، نمک حرام اور شریر ہو اور رعیت کے وہ لوگ جو اس ضلع میں رہتے ہیں، جاہل اور نادان ہوں، تو اپنے اوپر سلطنت کی گرفت ڈھیلی پا کر وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس کے دماغ میں خود مختاری کی ہوا بھر جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو ضلع کا مالک سمجھ کر خود سرانہ حکومت کرنے لگتا ہے اور جاہل رعیت کے لوگ محض یہ دیکھ کر اس کی خود مختارانہ حکومت تسلیم کر لیتے ہیں کہ تنخواہ یہ دیتا ہے، پولیس اس کے پاس ہے، عدالتیں اس کے ہاتھ میں ہیں، جیل کی

ہتھکڑیاں اور پھانسی کے تختے اس کے قبضہ میں ہیں، اور ہماری قسمت کو بنانے یا بگاڑنے کے اختیارات بہ رکھتا ہے۔ بادشاہ اس اندھی رعیت اور اس باغی افسر دونوں کے طرزِ عمل کو دیکھتا رہتا ہے۔ چاہے تو فوراً پکڑ لے اور ایسی سزا دے کہ ہوش ٹھکانے نہ رہیں۔ مگر وہ ان دونوں کی پوری آزمائش کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ نہایت تحمل اور بُردباری کے ساتھ انہیں ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے تاکہ جتنی نالائقیاں ان کے اندر بھری ہوئی ہیں، پوری طرح ظاہر ہو جائیں۔ اس کی طاقت اتنی زبردست ہے کہ اسے اس بات کا کوئی خوف ہی نہیں ہے کہ یہ افسر کبھی زور پکڑ کر اس کا تخت چھین لے گا۔ اسے اس بات کا بھی کوئی اندیشہ نہیں کہ یہ باغی اور نمک حرام لوگ اس کی گرفت سے نکل کر کہیں بھاگ جائیں گے۔ اس لیے اسے جلد بازی کے ساتھ فیصلہ کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ سالہا سال بلکہ صدیوں تک ڈھیل دیتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب یہ لوگ اپنی پوری خباثت کا اظہار کر چکتے ہیں اور کوئی کسر اس کے اظہار میں باقی نہیں رہتی تب وہ ایک روز اپنا عذاب ان پر بھیجتا ہے اور وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ کوئی تدبیر اس وقت انہیں اس کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

صاحبو! ہیں اور آپ اور خدا کے بنائے ہوئے یہ افسر، سب کے سب اسی آزمائش میں مبتلا ہیں۔ ہماری عقل کا، ہمارے ظرف کا، ہماری فرض شناسی کا، ہماری وفاداری کا سخت امتحان ہو رہا ہے۔ اب ہم میں سے ہر شخص کو خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اصلی بادشاہ کا نمک حلال افسر یا رعیت بننا پسند کرتا ہے یا نمک حرام۔ میں نے اپنی جگہ نمک حلالی کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں ہر اُس شخص سے باغی ہوں جو خدا سے باغی ہے۔ آپ اپنے فیصلے میں مختار ہیں، چاہے یہ راستہ اختیار کریں یا وہ۔ ایک طرف وہ نقصانات اور وہ فائدے ہیں جو خدا کے یہ باغی ملازم پہنچا سکتے ہیں اور دوسری طرف وہ نقصانات اور وہ فائدے ہیں جو خود خدا پہنچا سکتا ہے۔ دونوں میں سے جس کو آپ انتخاب کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

اعلان

یہ خطبہ (سلامتی کا راستہ) جو آپ کے ہاتھ میں ہے ہر اُردو داں ہندوستانی کے پاس پہنچنا چاہیے تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو کہ اُس کا خدا کے ساتھ حقیقی تعلق کیا ہے۔ اِس سطحِ ارضی پر اُس کے فرائض کیا ہیں۔ حقیقی انسانیت کیا ہے۔ انسانیت کا حقیقی مرتبہ کیا ہے۔ اور جزا سزا کی فلاسفی کیا ہے۔ آپ اگر اِن مسائل کو مختصراً سمجھنا چاہتے ہیں تو اِس خطبہ کا مطالعہ کیجیے۔

جو حضرات اِسے مفت تقسیم کرنا چاہیں اُن کے لیے ذیل کی قیمتیں مقرر ہیں

قیمت پانچ نسخہ	معہ	محصول	ڈاک	آٹھ آنے
قیمت پچیس نسخہ	"	"	"	۲عہ
قیمت پچاس نسخہ	"	"	"	للعہ روپے
قیمت ایک سو نسخہ	"	"	"	معہ

ملنے کا پتہ:-

دفتر رسالہ پیغامِ حق۔ لاہور

اسلام کا نظریۂ سیاسی

یہ مولنا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک مشہور مقالہ ہے جو ہر اُردو لکھے پڑھے مسلمان وغیر مسلمان کے پاس پہنچنا چاہیے تاکہ اپنوں پرایوں سب کو معلوم ہو کہ اسلام کس قسم کی حکومت چاہتا ہے۔ اور اس حکومت کے قائم کرنے سے اُس کا مقصد کیا ہے۔

جو حضرات از راہِ خیر اس رسالہ کو مفت تقسیم کرنا چاہیں اُن کے لیے ذیل کی قیمتیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ امید ہے کہ اہلِ خیر ان خیالات کو جو اس رسالہ میں درج کیے گئے ہیں عوام تک پھیلانے کی کوشش کریں گے۔

قیمت پانچ نسخہ	معہ محصول ڈاک	دس آنے
قیمت پچیس نسخہ	" "	۳ روپے
قیمت پچاس نسخہ	" "	۵/۸
قیمت ایک سو نسخہ	" "	عہ روپے

نوٹ:۔ اس مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی مندرجہ بالا قیمتوں پر مل سکتا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔

دفتر رسالہ پیغامِ حق ۔ لاہور

Registered No. L. [illegible]

در دیدۂ معنی نگہان حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت



ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم۔ اے

دفتر منزل تاجپورہ لاہور

سالانہ قیمت

عوام سے دو روپے بارہ آنے — روساء سے پانچ روپے

فہرست مضامین

جلد ۳ — نومبر سنہ ۱۹۴۰ء — عدد ۵

افتتاحیہ:-

سخنہائے گفتنی	سید محمد شاہ ایم۔ اے	۲

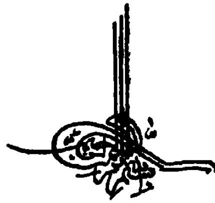
مقالات:-

تفسیر مفسر	علامہ سید جمال الدین افغانی	۱۱
تعلیم حاضرہ کے نتائج	جناب مرزا محبوب عالم لاہور	۲۰
اقبال کا عشق رسول	جناب خانزادہ محمد جمیل خان راز بنگش	۲۸
اقوال حضرت غوث الاعظم	جناب شیخ عبدالمالک کرنال شاپ لاہور	۳۵
غزوۂ بدر	جناب حافظ سراج الدین محمود بہاول پور	۳۲

منظومات:-

سوز اقبال	جناب محمد مضان تبسم قریشی گجرات	۴۹
تاریخ وفات اقبال	" " "	۵۳
اقبال	جناب ماہر القادری حیدر آباد (دکن)	۵۴
وہ اور میں	جناب مرزا عزیز فیضانی	۵۵
دعوت عمل	مولانا سید امین صاحب استاذ جامعہ دارالاسلام عمر آباد (مدراس)	۵۷
اے نیل کی امواج	جناب نعیم صدیقی خان پور (جہلم)	۵۸

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہوکر دفتر رسالہ پیام حق ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع ہوا



سخنہائے گفتنی

سچّا مسلمان

ذیل کا مختصر مقالہ نومبر ۱۹۳۶ء میں راقم الحروف نے بمقام دارالاسلام واقع پٹھان کوٹ وہاں کی مسجد کے افتتاح کے موقع پر پڑھا تھا۔ صدر جلسہ امرت سر کے مولانا محمد حسن صاحب تھے اور حاضرین میں اکثریت اُنہیں کے مریدان باصفا کی تھی بانی جو تھے وہ وقفِ دارالاسلام کے بانی کے اعزا و اقارب تھے۔ جہاں تک اُس وقت میں نے اندازہ کیا حاضرین میں سے کسی نے بھی میرے اِن خیالات کو پسند نہیں کیا تھا مگر مجھے پورا پورا یقین ہے کہ "سچے مسلمان" کے اوصاف یہی ہونے چاہئیں جو میں نے اس مختصر سے مقالے میں بیان کئے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر انتہائی درجہ کا رنج ہوتا ہے کہ ہندوستان کا موجودہ مسلمان اسلام کے مناطبہ اور اُس کی تعلیمات کو تو بالکل فراموش کر چکا ہے مگر جس غیر اسلامی طرزِ زندگی کو وہ اختیار کر رہا ہے اُسی کو اسلام سمجھتا اور سمجھتا کیا معنی اپنے مزعومہ اسلام کے مقابلہ پر حقیقی اسلام پر بے دردی کے ساتھ حملے کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ اِن حضرات نے "اسلام اور مسلمان"

کو وہ اہم معنیٰ الفاظ سمجھ رکھا ہے اور اِن کے نزدیک ہر وہ فعل جو کسی ایسے شخص سے صادر ہو جس نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا ہے اسلامی فعل قرار پاتا ہے خواہ اصل میں وہ اسلام کی ضد ہی کیوں نہ ہو۔ اِن لوگوں کے نزدیک تمام وہ نظریات جو اقوامِ یورپ کی طرف سے آئے ہیں اور جنہیں یہاں کے فریب خوردہ مسلمان سکولوں اور کالجوں کے ذریعے اپنے بچوں کے دماغوں میں ٹھونس رہے ہیں، عینِ اسلام ہیں۔

یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کے اندر یہ غیر اسلامی طرزِ زندگی اور یہ دشمنِ اسلام نظریات رونما ہو رہے ہیں کچھ اَن پڑھ لوگ ہی ہیں۔ نہیں اِن کے رہنما و مقتدا اچھے خاصے سمجھدار، تعلیم یافتہ، ذہین اور اعلےٰ قابلیت کے لوگ ہیں جو بات کو سوچنے اور سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں مگر اِس کا کیا کیا جائے کہ وہ غیر اسلامی اصول و ضوابط کا مطالعہ تو غور، دلچسپی اور محنت سے کرتے ہیں مگر اسلام کے اصول و ضوابط کا مطالعہ مطلقاً نہیں کرتے اور اپنے تمام استدلال کو سُنی سُنائی باتوں پر یا زیادہ سے زیادہ اُس لٹریچر پر کھڑا کرتے ہیں جو غیر مسلمان یورپین مستشرقین کے ذریعے سے اُن تک پہنچا ہے۔ یہ لوگ دراصل اسلام سے باغی ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ اسلام کے خلاف جو کچھ کر رہے ہیں وہ بھی اسلام ہی کے نام پر کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ غیور اور حساس مسلمان اِس ذہنیت کے روکنے کے لئے کوئی متفقہ محاذ پیش کریں۔

اَلْحَمْدُ لِوَلِیِّہٖ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی نَبِیِّہٖ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ — رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَہُوْا قَوْلِیْ۔

جناب صدر و حاضرین جلسہ! آج آپ یہاں جس عظیم الشان مقصد کو لے کر آئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اس مبارک صحبت میں نہایت مختصر طور پہ اُس کے متعلق اپنے خیالات کو بھی ظاہر کر دوں۔ مسجد مسلمانوں کے نزدیک ایک ایسا مقام ہے جو انہیں اپنے گھروں، اور اپنے مال و جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ایک مسلمان بے گھر کے زندہ رہ سکتا ہے۔ بغیر مال و دولت کے گزارہ کر سکتا ہے مگر مسجد کے بغیر نہ وہ بحیثیت مسلمان زندہ رہ سکتا ہے نہ اُس کے بغیر اُس کا گزارہ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ مسجد ہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر وہ اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں سے وہ اپنے روح و قلب کی تازگی کا سامان حاصل کر سکتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں وہ بیٹھ کر خلافت الٰہیہ کے منصوبے سوچ سکتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر وہ اپنی جماعت سے رابطۂ اتحاد و یگانگت قائم کر سکتا ہے جس کا وجود اسلامی جماعت کے لئے از لسبکہ لوازمات میں سے ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اب مسجد کی یہ اہمیت اور یہ احترام باقی نہیں رہا۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس کے کیا وجوہات ہیں۔

میرے خیال میں مسلمان کے موجودہ جمود اور بے حسّی کا باعث صرف ایک امر ہے اور وہ یہ کہ وہ اسلام کی روح سے ناآشنا ہو گیا ہے۔ مسلمان کی مذہبی حالت جس قدر ناگفتہ بہ ہے مجھے ضرورت نہیں کہ اس کے بیان کرنے کے لئے کسی تفصیل میں جاؤں۔ آپ حضرات مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ ہم مسلمانانِ ہند مذہب کو ایک عرصہ سے خیرباد کہہ چکے ہیں۔ مذہب کی روح کیا ہے؟ صرف یہی نا کہ مسلمان جو کام بھی کرے اُس سے مقصود صرف اللہ تعالےٰ کی خوشنودی ہو؟ مذہب نے زندگی کا نصب العین صرف ایک ہی بتایا ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے آپ کو کلیتہً اللہ تعالےٰ کی رضامندی پہ چھوڑ دے۔ کوئی چیز اپنے قبضہ و اختیار میں نہ سمجھے

اپنی حرکات و سکنات اور اپنے اقوال و افعال غرضیکہ ہر چھوٹی سے چھوٹی حرکت پر بھی یہ خیال کرے کہ میرا مالک حقیقی، میرا خالق اکبر اور میرا معبود لازوال اس بات پر کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں ہوگا؛ مذہب کی روح صرف اسی قدر ہے اور مسلمان کی زندگی کا صرف یہی ایک نصب العین ہے۔ اب اس مقصد کے حصول کی مشق کے طور پر مسلمان کو پانچ چیزوں پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔ اوّل یہ کہ وہ اپنے دل اور زبان سے اس بات کی شہادت دے کہ وہ جس کے سامنے میرا سر جھک سکتا ہے وہ صرف اللہ ہے۔ وہ جس کا حکم مجھ پر نافذ ہو سکتا ہے وہ صرف اللہ ہے۔ وہ جس سے میں ڈر سکتا ہوں وہ صرف اللہ ہے۔ اور وہ جس کی غلامی کے لئے میں پیدا ہوا ہوں وہ صرف اللہ ہے۔

اس شہادت کا عملی ثبوت دینے کے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ مسلمان ہر دن میں پانچ مرتبہ اپنے محلہ کے دیگر مسلمانوں کی معیت میں مسجد میں حاضر ہو کر اپنے بندۂ فرمانبردار ہونے کا ثبوت دے اور اگر اس طرح روزانہ پانچ مرتبہ سب کام کاج چھوڑ کر مسجد میں جانے سے اُس کا کوئی نقصان بھی ہو تو وہ اُسے بخوشی قبول کرے۔ مگر اس حاضری میں ناغہ نہ ہونے دے دنیا کا کوئی زیادہ سے زیادہ لالچ اور دنیا کی کوئی قہرمان سے قہرمان طاقت مسلمان کو اس حاضری سے منع نہ کرے۔ فرمانبرداری کے اس عملی ثبوت کو مذہب "نماز" کے نام سے پکارتا ہے وفاداری کے اس ثبوت کے بعد ضروری قرار دیا گیا کہ مسلمان ہر سال اپنی آمدنی میں سے ایک حصہ بطور ٹیکس مسلمانوں کی مرکزی جماعت کو ادا کرے۔ کیونکہ مال و زر کو ہاتھ سے دینا اہل دنیا کے نزدیک سب سے بڑی قربانی ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں۔

گر جاں مے طلبی حاضر است ور زر می طلبی سخن دریں ست

اگر آپ ہم سے جان طلب کریں تو حاضر ہے۔ مگر مال و زر کا معاملہ بڑا کڑا ہے

جس طرح مسلمان کے جسم اور اس کے دل اور دماغ کو ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار کرنا ضروری تھا اسی طرح اس کی روح کو تقویت پہنچانا بھی بہت ضروری تھا۔ اسی لئے ہر سال ایک ماہ کے لئے روزے رکھنے ضروری قرار دیئے گئے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا اور واللہ کیا عمدہ فرمایا۔

اندرون از طعام خالی دار تا دراں نورِ معرفت بینی

پیٹ کو ذرا خالی رکھ۔ تاکہ تُو اپنے اندر نور معرفت دیکھے۔

روزہ کیا ہے۔ اللہ کی خاطر بھوکے پیاسے رہنا اور اُس کی خاطر روح کی زیادہ سے زیادہ تکلیف کو برداشت کرنا۔ چونکہ اللہ تعالےٰ کو منظور تھا کہ وہ مسلمان سے تسخیرِ عالم کا کام لے اور بحر و بر میں اُس کے نام کا ڈنکا بجائے اس واسطے اس کو زیادہ سے زیادہ مصائب کے جھیلنے اور بڑی سے بڑی مشقت کے برداشت کرنے کے لئے تیار کیا حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

تنورِ شکم دم بدم تافتن مصیبت بود روزِ نا یافتن

اللہ تعالےٰ کو یہ منظور نہیں کہ مسلمان اُس کی راہ میں ہمیشہ بھوکے پیاسے رہیں اور عیسائی رہبانوں اور ہندو سادھوؤں کی طرح اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔ اسی لئے سال بھر میں صرف ایک مہینہ روزے رکھنے کا حکم صادر فرمایا۔

پانچویں اور آخری بات جو مسلمان کے لئے ضروری قرار دی گئی وہ بیت اللہ کا حج ہے۔ مقصود اس سے صرف اتنا ہے کہ مسلمان کو اپنے مرکز سے وابستگی رہے اور وہ تمام مسلمانانِ عالم کے حالات و کوائف سے مطلع رہ کر اُن کی صحیح صحیح خدمات سرانجام دے سکے۔

حضرات! اسلام صرف انہی پانچ چیزوں کا نام ہے چنانچہ صحیحین کی ایک حدیث کی رُو

سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بنائے اسلام ہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ یعنی اسلام کی بنا پانچ چیزوں پہ ہے۔ اول شہادت جسے ہم اقرار باللسان وتصدیق بالقلب کہتے ہیں۔ دوسرے نماز تیسرے روزہ چوتھے زکوٰۃ اور پانچویں حج۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنیا میں بھیجا جانا صرف اس لئے تھا کہ آپؐ انسان کو یہ سکھائیں کہ وہ کس طرح اپنی زندگی خدا کے حوالے کر دے اور کس طرح اُس کے تابع فرمان رہ کر اپنے ایامِ زندگی کو پورا کرے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پہلے خدا کی ہستی اور روزِ آخرت کو منوایا اور یہ منوانے کے بعد ان سے شہادت لی۔ جسے آپ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کہتے ہیں۔ جو لوگ یہ اقرار کرتے گئے اُن پہ باقی کی چار چیزیں یعنی نماز، روزہ زکوٰۃ اور حج کو ضروری قرار دیا گیا۔ جو شخص یہ اقرار کر لیتا۔ اُس کو ان چیزوں پہ عمل کرنا قانوناً ضروری ہو جاتا۔ چنانچہ اُس کو بتا دیا جاتا کہ الفرق بین المسلم والکافر الصلوٰۃ مسلمان اور کافر کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے اور کافر نہیں پڑھتا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ۔ مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ ھَدَمَ الدِّیْنَ حضور رسالتمآبؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر جس شخص نے نماز کو بلا عذر شرعی مطلقاً ترک کر دیا اُس نے اپنے اقرار کو توڑ دیا اور وہ منکر ہو گیا

زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کے خلاف حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو جہاد کیا اُس کی تفصیلات آپ کو معلوم ہیں۔

روزے بلا عذر شرعی نہ رکھنے کی سزا جو قرآن مجید نے مقرر کر رکھی ہے اُس سے بھی آپ واقف ہیں۔ بلا عذر شرعی مستطیع کا بیت اللہ کا حج نہ کرنا بھی جس قدر بُرا سمجھا گیا ہے۔ اُس کی

تفصیلات بھی آپ نے کئی بار علمائے کرام سے سُنی ہوں گی۔

ہاں، مَیں آپ سے یہ عرض کر رہا تھا کہ جن لوگوں نے خدا کو مان لیا، اور آخرت کو تسلیم کر لیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا نبی سمجھ لیا وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور ضابطۂ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اُن کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا خود کوئی اختیار نہ رہا۔ وہ ہر وہ کام کرنے کے لئے مجبور ہیں جو اسلام اُن کے لئے تجویز کرے اور ہر اُس کام سے باز رہنے کے لئے مجبور ہیں جس سے اسلام اُن کو باز رکھے۔ مگر جن لوگوں نے یہ شہادت دینے سے انکار کر دیا اگر وہ مرنجاں مرنج زندگی بسر کرتے رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر جو فتنہ بپا کرنے پر اُتر آئیں تو مسلمان ایک منٹ کے لئے اِس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اپنی مدافعت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دے گا اور اپنا مال اپنی جان اور اپنی اولاد تک اسلام کی قربان گاہ پر بخوشی چڑھانے کے لئے تیار ہو جائے گا کیونکہ وہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایک عہد باندھ چکا ہے جسے قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ
أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ
الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ
حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ
وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ
مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ

(یاد رکھو کہ) اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال و دولت اس عوض میں خرید لئے ہیں۔ کہ اُن کے لئے جنت ہو وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل ہوتے ہیں۔ اللہ کا یہ وعدہ توراۃ، انجیل اور قرآن کی رُو سے بالکل سچا ہے اور ایفائے عہد کے معاملہ میں اللہ سے زیادہ

الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (التوبہ)

کون وفادار ہے پس تم کو اس سودے کی خوشخبری ہو جو تم نے اس سے کیا ہے اور (یاد رکھو کہ) یہی (چیز) "فوز عظیم" ہے ۝ (یہ لوگ) توبہ کرنے، عبادت کرنے، حمد و ثنا کہنے، ضبطِ نفس کرنے، رکوع کرنے، سجدہ کرنے، لوگوں کو نیکی کی ترغیب دینے، برائی سے روکنے، اور اللہ کی حدود کو محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اور (اے نبی!) تم (ایسے) مومنوں کو خوشخبری دو۔

یعنی اگر وہ فتنہ برپا کرنے سے باز نہ آئیں یا کہ مسلمانوں کو اسلامی طرزِ زندگی کے گزارنے میں مانع ہوں۔ یا اُن کو اعلانِ حق سے روکیں تو مسلمان پر قرآن کا یہ حکم فوراً نافذ ہو جائے گا فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ ۔" یعنی جہاں کہیں تم مشرکوں کو پاؤ ان سے جنگ کرو اُن کو پکڑ لو۔ اُن کی نگرانی کرو۔ اُن کی گھات میں لگے رہو۔ ہاں اگر وہ توبہ کر لیں اور مسلمان ہو جائیں تو اُن کی راہیں کھول دو۔"

الغرض مجھے اس وقت آپ کو یہ بتانا تھا کہ ایک سچے مسلمان کی زندگی اس طرح ہونی چاہیئے اگر وہ اس طرح زندگی بسر کر رہا ہے تو مسلمان ہے ورنہ آپ اُسے مسلمان نہیں کہہ سکتے خدارا آپ خود اندازہ کریں کہ کیا اِس وقت مسلمانانِ ہندوستان اِسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں یا ان کی زندگیوں کو اس چیز کے ساتھ دُور کا بھی تعلق نہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ہماری زندگی

اس زندگی سے بالکل مختلف ہے جو اسلام کا منشا ہے تو ہمیں شرم کرنی چاہئے اور اس طرح دوغلے بن کر ہمیں اسلام کو بدنام نہ کرنا چاہیئے۔

اگر آپ نے تنہائی اور فرصت کے لمحات میں کبھی میری معروضات پر غور کیا تو مسلمانوں کی غیر اسلامی طرز زندگی کا منظر آپ کو بہت ہی بھیانک اور دردناک نظر آئے گا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ حساس مسلمانوں کی کوئی جماعت آگے بڑھتی اور وہ اپنے غفلت زدہ اور فریب خوردہ مسلمان بھائیوں کو جو بھولے بھٹکے یا باغیانہ طور پر اسلام کی پابندیوں سے نکلے چلے جا رہے ہیں پھر سے حلقہ بگوش اسلام بنانے کی کوشش کرتی۔ چنانچہ یہ دارالاسلام کی بنا اسی مقصد کی ایک اولین کڑی ہے اور اس مبارک مسجد کی تعمیر اسی مقصد کا ایک لازمہ۔ خدا کرے کہ اس جگہ کے ساتھ میں نے جو امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں وہ جلد از جلد پوری ہوں وَيَرْحَمَ اللهُ عَبْدًا قَالَ آمِيْنًا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ۔

محمد شاہ

تفسیرِ مفسّر

سید جمال الدین افغانیؒ

مَنْ لَمْ يَرَ الْاَشْيَاءَ بِعَيْنِ الْبَصِيرَةِ يَضِلُّ وَهُوَ مَلُومٌ (جو شخص اشیاء کو چشمِ بصیرت سے نہیں دیکھتا گمراہ ہو جاتا ہے اور سزاوارِ نکوہش ہے)

انسان تربیت کے اعتبار سے انسان ہے اور اقوامِ بنی آدم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جو تربیت سے خالی ہو خواہ وہ وحشی کیوں نہ ہو اگر کسی انسان کو اس کی پیدائش کے وقت بنظرِ اعتبار دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی زندگی بغیر تربیت کے محالاتِ عادیہ میں سے ہے اور اگر ہم فرض کر لیں کہ اس کی زندگی بغیر تربیت کے ممکن ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس حالت میں اس کی بود و باش حیوانات کی بود و باش سے بھی بدتریں ہو گی تربیت سے مراد طبیعت کے ساتھ مجادلہ اور مقاومت ہے اور اس کا علاج خواہ وہ تربیت نباتات کی ہو یا حیوانات کی یا انسان کی اگر بطریقِ احسن ہو تو طبیعت کو نقص سے کمال اور پستی سے مدارجِ علیہ تک پہنچاتی ہے اور اگر بطریقِ احسن نہ ہو تو طبیعت کی اصلی حالت کو متغیر کر کے اس کے زوال کا باعث ہو گی اور یہ حقیقت حیوانات کے ماہرین، بچوں کے مربیوں، شہروں کے ناظموں اور مذاہب کے عالموں پر بخوبی ظاہر ہے غرضکہ جمادات، نباتات اور حیوانات سب میں حسنِ تربیت تمام محاسن اور کمالات کا باعث ہے اور تربیت ناقصہ

نقائص اور بُرائیوں کا سرچشمہ ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو جاننا چاہئے کہ قوموں میں سے جو قوم اچھی طرح تربیت یافتہ ہو اُس کے تمام طبقات اور اصناف تناسبِ طبیعی کے قانون کے مطابق متفقہ طور پر نشوونما پاکر رُوبہ ترقی ہوتے ہیں اور اس کی ہر صفت اور اس کا ہر طبقہ اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق اُن کمالات کے حصول کے لئے ساعی ہوتا ہے جو اس کو درکار ہوتے ہیں۔ اُس قوم کی تمام اصناف باعتبارِ مراتب ایک دوسرے کے مقابلہ میں مصروفِ جدوجہد ہوں گی یعنی جس طرح حسن تربیت کی وجہ سے اُس قوم میں جلیل القدر سلاطین پائے جائیں گے اُسی طرح فاضل حکماء، متبحر علماء، قابل دستکار، ماہر کاشتکار، متمول تاجر اور دیگر اہل حرفہ بھی وجود میں آئیں گے اور اگر وہ قوم حسن تربیت کی وجہ سے ایسے درجہ پر فائز ہو جائے کہ اُس کے سلاطین تمام قوموں میں ممتاز ہوں تو یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کے جملہ طبقات بھی دوسری قوموں کے تمام اصناف کے مقابلہ میں ممتاز ہوں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر صنف کی ترقی کا تعلق تمام اصناف کی ترقی سے ہوتا ہے ——— یہ ہے قانونِ کُلّی اور ناموسِ طبیعت اور سنت الہیہ ——— اور جب اس قوم کی تربیت میں فساد واقع ہو تو اُسی فساد کے مطابق اس قوم کے تمام طبقات میں حسبِ مراتب ضعف رونما ہوگا یعنی اگر سلطنت میں نقص پیدا ہو تو جاننا چاہیئے کہ یہ نقص حکماء، علماء، تاجر، دستکار اور تمام اہل حرفہ کو حاوی ہوگا کیونکہ اِن سب کے کمال پہ تربیت حسنہ کا دارومدار ہے اور جب تربیتِ حسنہ میں جو کہ علت ہے ضعف و فساد اور خلل پیدا ہو تو لامحالہ اُس کے معلولات میں بھی ضعف و خلل پیدا ہوگا اور جس قوم کے حسنِ تربیت میں خلل پیدا ہوگیا ہو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عادات اور اخلاق کی تباہی اور تربیت میں فساد کی زیادتی کی

وجہ سے اس کے ان طبقات و اصناف میں جو اس قوم کی پائیداری اور استحکام کا باعث ہوتے ہیں خصوصاً طبقاتِ شریفہ میں رفتہ رفتہ اضمحلال آجاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قوم کے افراد اپنے لباس اور نام کی تبدیلی کے بعد کسی دوسری قوم کا جزو بن کر ایک نئے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں جیسے کہ کلدانیوں ، اور قبطیوں وغیرہ وغیرہ نے کیا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس قوم پر عنائتِ ازلی اپنا پرتو ڈالتی ہے اور عین فساد و ضعف کے وقت چند پاکیزہ نفس اور اربابِ بصیرت اصحاب کو عالمِ ظہور میں لاتی ہے اور وہ اس قوم کے جسم میں ایک روح تازہ پھونک کر اس فساد و ضعف کا ازالہ کرتے ہیں جو زوال اور اضمحلال کا باعث ہوں اور ان لوگوں کے دل و دماغ پر سوءِ تربیت کی وجہ سے جو امراض طاری ہو جاتے ہیں ان سے نجات دلاتے ہیں ۔ تربیتِ حسنہ کو اس کی اصلی رونق اور تازگی کی جانب لوٹاتے ہیں ، اپنی قوم کو دوبارہ زندگی بخشتے ہیں اور اس کے طبقات و اصناف کی ترقی اور عزّ و شرف کا اعادہ کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جو قوم رُو بہ انحطاط ہوتی ہے اور اس کے طبقات اور اصناف پر ضعف غالب آجاتا ہے تو اس کے افراد ہمیشہ عنائتِ ازلی سے اس کے منتظر رہتے ہیں کہ شاید ان میں کوئی باخبر مجدّد اور صاحبِ تدبیر حکیم پیدا ہو جو اپنی حکیمانہ تدبیر اور مساعی جمیلہ سے اس قوم کے دل و دماغ کو منوّر اور مطہّر کر دے اور تربیت کے نقص کو دُور کر دے یہاں تک کہ اس حکیم کی تدابیر سے وہ قوم پھر اپنی پہلی حالت کی جانب راجع ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج کل مسلمانوں کے تمام اصناف اور طبقات کو ہر طرف سے پریشاں حالی ، بے چارگی اور ضعف محیط ہے اس لئے خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی ہوں ، جنوبی ہوں یا شمالی غرضکہ تمام اس کے منتظر ہیں کہ دنیا کے کون سے حصّے

اور کس سرزمین سے کوئی مجدّد یا کوئی حکیم ظاہر ہوتا ہے جو مسلمانوں کے دل و دماغ کی اصلاح کرے فساد و ضعف کو رفع کرے اور اس تربیتِ حسنہ الٰہیہ سے دوبارہ ان کی تربیت کرے ممکن ہے اُس تربیتِ حسنہ سے پھر مسرت و شادمانی کی حالت کو پالیں ۔ چونکہ مجھے یقین واثق ہے کہ خدا اس دیانتِ صادقہ اور شریعتِ حقّہ کو زائل نہیں کرے گا اس لئے میں دوسروں کی نسبت اس کا زیادہ منتظر ہوں کہ کسی حکیم کی حکمت اور خبیر کی تدبیر سے مسلمانوں کے دل و دماغ عنقریب منوّر اور قوی ہوں گے ۔ اسی لئے میں ہمیشہ اس کا خواہشمند ہوں کہ جو مقالات اور رسائل ان دنوں مسلمانوں کے قلم سے لکھے جارہے ہیں ان کا مطالعہ کروں اور ان کے خیالات سے بہرہ اندوز ہوں ۔ ممکن ہے کہ اس مطالعہ سے میں کسی ایسے حکیم کے افکار عالیہ کو معلوم کرلوں جو مسلمانوں کے فلاح و بہبود اور حسنِ تربیت کا موجب رہا ہو حتیٰ کہ میں بھی اپنی بساط کے مطابق اس کے افکارِ عالیہ سے بہرہ اندوز ہوکر اپنی قوم کی اصلاح میں اس کا شریک کار بنوں ۔

افکارِ اسلامیہ کے اس بحث و تحمیص کے زمانہ میں میں نے سُنا کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کبر سنی اور کثرتِ تجربات کی حالت میں ممالکِ یورپ کی سیاحت کی اور اس کے بعد بڑی کوشش کے ساتھ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے ۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ جس چیز کی مجھے جستجو تھی وہ یہی ہے اور جس طرح کہ امور جدیدہ کے سننے والوں کی عادت ہے میں نے بھی اپنے خیال کو جولانی میں لاکر گوناگوں تصورات اس مفسّر اور اس کی تفسیر کی بابت قائم کئے اور خیال کیا کہ یہ مفسّر ان تمام تفاسیر کثیرہ کے بعد جو محدثین ، فقہا ، متکلمین ، حکماء ، صوفیہ ، ادباء ، نحویین اور ابن راوندی ایسے زنادقہ وغیرہ وغیرہ نے لکھی ہیں ان کے سخن کی داد دے کر اور

انکشاف حقیقت کرکے نقطۂ مقصود کو پہنچا ہوگا۔ چونکہ مغرب و مشرق کے افکار سے واقف ہے اس لئے اِس مفسر نے یقیناً اپنی قوم کی اصلاح کے لئے دین کی حقیقت اور ماہیت کو جیسے کہ حکمت متقاضی ہے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں بیان کیا ہوگا اور دینی لوازمات کو عالمِ انسانی میں عقلی دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہوگا اور دینِ حق و باطل میں فرق معلوم کرنے کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ رکھا ہوگا نیز اس مفسّر نے بلاشبہ ادیان سابقہ اور لاحقہ میں سے ہر ایک کے اثر کو جہاں تک ان کا تعلق مدنیت، ہیئت اجتماعیہ اور افرادِ انسانی کے دل و دماغ سے ہے وضاحت کی ہوگی۔ اور بعض امور میں ادیان کے اختلاف اور بہت سے احکام میں اتفاق کی علت اور ہر زمانے کے لئے مخصوص مذہب اور مخصوص پیغمبر کا سبب حکمت کس طریقہ پہ بیان کیا ہوگا۔ چونکہ اس تفسیر کو جیسے کہ مفسر نے دعویٰ کیا ہے کہ قوم کی اصلاح کے لئے لکھا ہے مَیں نے یقین کر لیا کہ وہ سیاسیات الٰہیہ اور اخلاقِ قرآنیہ جو اُمتِ عربی کی برتری اور بہرہ مندی کا موجب ہوئے تمام تر اپنی کتاب کے مقدمہ میں بطرزِ جدید بشرح و لبسط کے ساتھ لکھے ہوں گے اور وہ احکام جو عربوں کی زبان کے اتحاد، ان کے افکار کے تبدیل کرنے اور ان کے دل و دماغ کو نورانی اور پاکیزہ بنانے کا باعث ہوئے تھے باوجودیکہ ان میں پہلے درجہ کی نا اتفاقی اور انتہائی وحشت اور کور باطنی تھی اُس نے ایک ایک حکم سے استنباط کرکے اپنے مقدمہ میں درج کیا ہوگا۔

جب مَیں نے تفسیر کو بنظرِ غائر پڑھا تو میں نے دیکھا کہ اس مفسر نے نہ کسی طور ان امور کلیہ کا ذکر کیا ہے نہ سیاستِ الٰہیہ کی بابت کچھ لکھا ہے نہ اخلاقِ قرآنیہ کے بیان کو چھیڑنا مناسب سمجھا ہے اور نہ اس حکم جابلہ کا اظہار کیا ہے جو عربوں کے دل و دماغ کے نورانی اور پاکیزہ کرنے کا باعث ہوا بلکہ وہ آیات جو سیاستِ الٰہیہ سے متعلق ہیں، اخلاقِ فاضلہ۔

عادات حسنہ۔ معاشرت منزلی اور مدنی کی تعدیل کے بیان کی ذمہ دار ہیں اور عقل کو منور کرنے کا باعث ہوتی ہیں، ان سب کو بلا تفسیر چھوڑ دیا ہے۔ اپنی تفسیر کے شروع میں صرف چند باتیں ایسی لکھی ہیں جن سے سورت، آیت اور حروفِ مقطعات جو سورتوں کے ابتدا میں ہیں ان کے معانی پر روشنی پڑتی ہے اس کے بعد اپنی ہمت کو اس پر صرف کیا ہے کہ ہر وہ آیت جس میں جنّ و ملک یا روح الامین و وحی یا جنت اور دوزخ یا انبیاء علیہم السلام کے معجزوں میں سے کسی معجزہ کا ذکر آیا ہے اس کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر مسلمانانِ قرونِ سابقہ کے زندیقوں کی سرد تاویلات کی طرز کی تاویلات اُس نے لکھ ماری ہیں۔

فرق صرف یہ ہے کہ قرونِ سلف کے زندیق علماء تھے اور یہ مفسّر بیچارہ بہت عامی ہے اس لئے اُن کے اقوال کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ فطرت کو محل بحث قرار دے کر بغیر عقلی اور طبیعی دلائل کے اس نے چند مہمل اور مبہم کلمات اس کے معنی کو بیان کرنے کے لئے کہے ہیں گویا کہ اس نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ انسان باعتبار تربیت انسان ہے اور اس کے تمام فضائل اور آداب اکتسابی ہیں اور انسانوں میں سے فطرت کے قریب تر ہیں وہ انسان ہے جو مدنیت سے دور تر اور اکتسابی آداب و فضائل سے بعید تر رہا ہو۔ اگر انسان شرعی اور عقلی آداب کو جو بڑی صعوبت اور مشقت سے حاصل کئے جاتے ہیں ترک کر کے زمام اختیار کو اپنی فطرت اور طبیعت کے ہاتھوں میں دے دیں تو بلاشبہ وہ حیوانات سے پست تر ہوں گے اور زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ مفسّر نبوّت کے مقدس رتبہ الٰہیہ کو گھٹا کر ریفارمر کے درجہ پر لے آیا ہے اور اس نے انبیاء علیہم السلام کو واشنگٹن، نپولین، گاریبالڈی اور گلیڈسٹون کی طرح سمجھ رکھا ہے۔

جب میں نے اس تفسیر کو ایسا پایا تو میں حیران رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اس قسم کی تفسیر

سے اس مفسّر کا کیا مقصد ہوگا اور اگر اس مفسّر کی مراد جیسے کہ وہ خود کہتا ہے اپنی قوم کی اصلاح ہو تو پھر وہ اس کی کوشش کیوں کرتا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے صحیح اعتقادات سے منحرف کرے خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ تمام دوسرے مذہب اسلام کو ہڑپ کر جانے کے لئے اپنا اپنا منہ کھولے ہوئے ہوں ۔ کیا وہ اس کو نہیں سمجھتا کہ مسلمان اس ضعف و پریشانی کے باوجود بہشت و دوزخ اور معجزوں کے کیوں معتقد نہ ہوں اور پیغمبر کو گلبدُ ستو ان کیوں سمجھیں؟ البتہ وہ دن دور نہیں جب کہ وہ خود مغلوب حزب ضعیف کو چھوڑ کر غالب قوموں سے جا ملیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت اُن کے لئے کسی تنبیہ کرنے والے کا ڈر اور خوف باقی نہیں رہے گا اور دوسری طرف سے دین کو تبدیل کرنے کی ترغیب بھی جاری ہوگی اور یہ بات تمام لوگوں کو پسند ہو گئی ہے کہ وہ غالب قوی کے ہم شکل اور ہم مشرب ہوں ۔

اِن افکار و خیالات کے بعد سب سے پہلے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ بلاشبہ اِس مفسّر کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط اور اُن کی پریشاں حالی کا سبب اُن کے یہی اعتقادات ہیں اور اگر اِن اعتقادات کو اُن کے دل سے نکال دیا جائے تو وُہ پھر اپنی عظمتِ رفتہ اور شرفِ گذشتہ کو حاصل کر لیں گے اس لئے اِن اعتقادات کے ازالہ کی کوشش کرتا ہے اور اسی لئے وہ اس معاملہ میں معذور ہے ۔ زیادہ غور و فکر کرنے کے بعد میرے دل میں یہ بات آئی کہ انہی اعتقادات کی برکت سے یہودیوں نے فراعنہ کی عبودیت سے رہائی پاکر فلسطین کے حکمرانوں کے سروں کو زمین پر جھکایا اور اپنے آپ کو سلطنت و مدنیت کے منتہائے کمال تک پہنچایا ۔

کیا یہ مفسّر اس بات کو نہیں جانتا ؛ خود اہل عرب بھی انہی اعتقادات کی برکت

سے جزیرۃ العرب کی سنگلاخ سرزمین سے نکل کر سلطنت، مدنیت، علم، صناعت، فلاحت اور تجارت میں تمام دنیا کے سردار ہوئے اور اہل یورپ انہی عقیدت مند عربوں کو اپنی تقریروں میں بآوازِ بلند اپنا استاد مانتے ہیں۔ کیا یہ بات بھی اس مفسر کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ یقیناً پہنچی ہوگی۔ سچے اعتقادات کی عظیم الشان تاثیرات اور ان کے معتقدین پر غور کرنے کے بعد میں نے باطل عقائد کے معتقدین پر نظر ڈالی تو میں نے دیکھا کہ ہندوؤں نے اس وقت مدنیت اور علوم و معارف اور طرح طرح کی صنعتوں میں ترقی کی تھی جب کہ وہ ہزاروں اوتاروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کے معتقد تھے لیکن اس جاہل مفسر کو اس کی بھی خبر نہیں ہے۔ مصریوں نے اس وقت مدنیت، علوم و معارف اور صنعت و حرفت کا سنگِ اساس رکھا اور یونانیوں کے استاد کہلائے جب کہ اُن کا ایمان بتوں، گائے، کتوں اور بلیوں پر تھا۔ یہ مفسر بلاشبہ اس سے واقف ہے۔ کلدانیوں نے بھی اس زمانہ میں رصد خانے اور آلاتِ رصدیہ اور قصورِ عالی بنائے اور علم فلاحت میں کتابیں تصنیف کیں جب کہ ستارہ پرستی کے قائل تھے۔ یہ بھی مفسر سے پوشیدہ نہیں ہے فنیقیون کی بری اور بحری تجارت اور صنعت و حرفت کا بازار اس وقت گرم تھا اور برطانیہ، ہسپانیہ اور یونان کی سرزمینوں میں اُن کی مستعمراتی حکومتیں تھیں جب کہ وہ اپنے بچوں کو بطور قربانی بتوں کی نذر کیا کرتے تھے۔ یہ بات بھی مفسر پر آشکار ہے۔ یونانی اُس صدی میں سلطانِ عالم تھے اور اس زمانے میں یونان میں حکمائے عظام پیدا ہوتے تھے جب کہ اُن کو ہزاروں خداؤں اور خرافاتوں کے ساتھ دل بستگی تھی۔ مفسر کو اس کا بھی علم ہوگا۔ ایرانی اُس وقت کاشغر کے نواح سے لے کر استنبول تک حکمران تھے اور مدنیت میں ان کو وحید عصر سمجھا جاتا تھا جب کہ صدہا خزعبلات ان کے لوحِ دل پر ثبت تھے۔ مفسر کو یقیناً یہ یاد ہوگا۔ یہی

متاخرین نصاریٰ جس زمانہ میں کہ ان کا ایمان تثلیث، صلیب، قیامت، معمودیہ، مطہرہ، اعتراف اور استحالہ پر تھا اپنی سلطنتوں کو انہوں نے مستحکم کیا اور علوم و معارف اور صنعت و حرفت کے دائرہ میں انہوں نے قدم رکھا اور تمدن کے عروج پر پہنچے اور آج بھی اُن کی کثیر تعداد تمام علوم و معارف میں اسی راستہ پر گامزن ہے مفسّر اس کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔

جب میں نے ان سب امور کی بابت خیال کیا تو میں سمجھا کہ مفسّر کا ہرگز اس قسم کا خیال نہیں ہے کہ مسلمانوں پر انحطاط ان عقائد حقہ کو ماننے کی وجہ سے آیا ہے کیونکہ اعتقادات خواہ وہ حقہ ہوں یا باطلہ مدنیت اور دنیوی ترقیوں سے کسی طرح کی مغائرت نہیں رکھتے خواہ اس اعتقاد کا تعلق طلب علوم سے ہو یا کسب معاش سے یا مدنیت صالحہ کے مسالک کے سلوک سے ہو مجھے یقین نہیں آتا کہ دنیا میں کوئی بھی ایسا مذہب ہے جو ان امور سے منع کرے۔ یہ مطلب جس کا ذکر قبل ازیں کیا گیا ہے اب اچھی طرح واضح ہو گیا ہے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بے اعتقادی سے سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ تمدن میں خلل و فساد اور امید و آرزو کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر بے اعتقادی ترقیٔ اُمم کا موجب ہوتی تو لازم تھا کہ زمانہ جاہلیت کے عرب مدنیت میں گوئے سبقت لے جاتے چونکہ وہ غالباً دہریہ تھے اس لئے ہمیشہ باآواز بلند ارحام تدفع والارض تبلع وما یھلکنا الا الدھر اس کے علاوہ ہمیشہ اُن کے زباں زد یہ کلمات رہتے تھے۔ من یحیی العظام وھی رمیم اور حالت یہ تھی کہ وہ جہل کی انتہا میں وحشی حیوانات سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔

اب مجھے ان تمام خیالات و تصورات سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ نہ یہ مفسّر مصلح ہے اور نہ اس نے یہ تفسیر مسلمانوں کی تربیت اور اصلاحات کے لئے لکھی ہے بلکہ یہ مفسّر اور یہ تفسیر اس حالت حاضرہ میں ملت اسلامیہ کے لئے ان مہلک اور خبیث امراض کی مانند ہے جو انسان کی طبیعت کو اس وقت لاحق ہوتے ہیں جبکہ اس پر انتہائی ضعف کی حالت طاری ہوتی ہے گذشتہ جرح و تعدیل سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ مفسّر نے یہ جو کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے اعتقادات کو خراب کرے اُس سے اس کا مقصد کیا ہے؟

(مترجم، نگار)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعلیم حاضرہ کے نتائج

(جناب مرزا محبوب عالم صاحب لاہور)

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں (اقبالؒ)

موجودہ تعلیم کے نتائج وعواقب پر غور کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ تعلیم کی توضیح کر دی جائے تعلیم کے معنی شناخت کرانا، علم سکھانا اور واقفیت حاصل کرانا ہے یہاں معاملہ زیر بحث میں علم سے مراد علم انسانی ہے۔ اور انسان روح و بدن کے اجتماع کا نام ہے۔ روح ایک نہایت ہی پاکیزہ جنس لطیف ہے اور اس کا تعلق عالم ارواح سے ہے۔ انسان کی دنیاوی حیات کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی شناخت کرے اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری بجالانے کے اصول و قواعد سیکھے اسی واقفیت کا نام علم دین ہے۔

بدن ایک جنس کثیف ہے اس لئے اس کا تعلق عالم مادّیات سے ہے۔ لہٰذا بدن اور اُس کے متعلقات یعنی تمام مادی اشیاء کی کیفیت، خاصیت اور اثر کے معلوم کرنے کا نام علم ابدان ہے۔ فی الحقیقت علم صرف یہی دو ہی ہیں۔ باقی سب ان کی فروعات و متعلقات ہیں

یہ مسلّمات عامہ میں سے ایک مسلّمہ امر ہے کہ ان ہر دو علوم کا حاصل کرنا بنی نوع انسان کے لئے اولیں ولازمی ضرورت ہے ہر سلیم الفطرت انسان جس کی فطرت صحیحہ روحانی امراض میں مبتلا ہو کر ضائع نہیں ہوئی وہ انسان کی اس خِلقت یعنی اجتماع روح و بدن کی قدرتی حکمت پر جو حکیم مطلق نے وضع کی ہے غور کرنے سے اس ظاہری حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان بوجہ روح کے دین اور بسبب بدن کے دُنیا کے حصول و اجتماع پر مامور ہے۔ جس قوم نے اپنے خالق سے تعلق کو منقطع کر کے محض بدنیات ہی کو اپنا مقصدِ حیات سمجھ لیا ہے وہ قوم حیوان بشکلِ انسان ہے جس کا انجام اس کے حق میں مُضر ثابت ہو گا۔ علّامہ اقبال علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لَا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

مروجہ تعلیم بڑے ہولناک و افسوسناک نتائج پیدا کر رہی ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لا کر ان خرابیوں کے اسباب معلوم کریں۔ سرِ دست ہم تین امور کو موضوع بحث قرار دیں گے۔ (۱) نیت حصول تعلیم (۲) نصاب تعلیم (۳) نظام تعلیم۔

نیت حصولِ تعلیم | یہ ایک حقیقت ہے جس کے تسلیم کرنے میں کسی موافق یا مخالف کو انکار کی گنجائش نہیں کہ ۹۹ فیصدی والدین اپنے بچوں کو مروجہ تعلیم محض اس لئے دلاتے ہیں کہ وہ ملازمت حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ تمام اچھے اور آزاد ذرائع معیشت جن کے اختیار کرنے سے انسان کی ضمیر و دماغ آزاد رہ کر حُریت کی قدر و قیمت پہچان سکتے ہیں ان سے اپنی اولاد کو محروم کر دیا جاتا ہے حالانکہ ان آزاد وسائل معاش کے سبب

سے انسان اپنے دین، مذہب اور قوم کی خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ اسی نعمتِ عظمےٰ کے طفیل جذباتِ غیرت، جذباتِ حریت اور جذباتِ شجاعت تر و تازہ رہتے ہیں جو دینی ضروریات کے وقت عملی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اکثر والدین جو اس تعلیم کے عواقب سے بے خبر ہوتے ہیں اپنی اولاد کو دینی تعلیم سے محروم رکھ کر اُسے محض پیٹ پوجا کا عادی بنا دیتے ہیں۔ والدین کی نیت چونکہ سراسر یہی ہوتی ہے کہ اولاد کو سرکاری ملازم ہی بنانا ہے اس لئے بچوں کو دینی تعلیم دلانے یا آزادانہ ذرائع معاش تجارت، طب اور صنعت و حرفت وغیرہ علوم کے سکھانے کا نہ خیال ہی ہوتا ہے اور نہ انتظام ہی کرتے ہیں انہیں ملازم بنانے کی خاطر سینکڑوں روپے مروجہ تعلیم کی تحصیل پر خرچ کر دیئے جاتے ہیں اور اس دوران میں انہیں مذہبی اور اخلاقی تعلیمات و کمالات کے حاصل کرنے سے باز رکھا جاتا ہے۔ ایسے مظلوم طلبا میں سے بعض مروجہ تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود ہی بکمال ندامت علماءِ دین کی خدمت میں حاضر ہو کر نہایت دقّت کے ساتھ اپنے مذہب سے تعارف حاصل کرتے ہیں اور اب تو ملازمت کے دروازے تقریباً بند ہو جانے سے والدین کو اپنی ان اصولی غلطیوں کا احساس ہو رہا ہے۔ انہی حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے حفیظ صاحب نے فرمایا ہے

؎ تم نے جن آقاؤں کا اِن کو بنایا تھا غلام
اب وہ آقا بھی نہیں لیتے غلاموں کا سلام

نصابِ تعلیم ابتدائی عمر میں سادہ لوح بچوں کے دماغوں میں جو خیالات نقش ہو جاتے ہیں وہ اس قدر مستحکم ہوتے ہیں کہ اُن کا دُور کرنا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے بلکہ ان میں تغیّر و تبدیل کرنا بھی محال ہو جاتا ہے۔ مروجہ نصابِ تعلیم کی نسبت غمخوارِ قوم اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں — جس علم کا حاصل ہو جہاں میں دو کفِ جو

نظامِ تعلیم چونکہ سادہ لوح، نو عمر بچوں کی تعلیم کا انتظام کسی ایسی قوم کے ہاتھ میں دے دینا جو مذہب سے بالکل بیگانہ اور الحاد و دہریت کی علمبردار ہو اور اخلاقی کمالات سے محروم ہو کر اخلاقی جرائم کو حلال سمجھتی ہو اور جس کے نزدیک جائز و ناجائز کوئی چیز نہ ہو اپنی اولاد کے حق میں قتلِ حسّی کے مترادف ہے جو جرمِ عظیم و موجبِ عذاب الیم ہے غمخوارِ ملت علامہ اقبالؒ کا ارشاد ہے ؎

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف

اس سلسلہ میں چند ایک "یورپین مدبرین" کی رموزِ ملوکانہ جو نہایت معتبر ذرائع سے حاصل ہوئی ہیں مرقوم الذیل ہیں امید ہے کہ اہلِ بصیرت کے لئے درسِ عبرت ثابت ہوں گی وہ کوئی شخص اہلِ ہندوستان کی ذہانت اور زیرکی پر شُبہ نہیں کر سکتا مگر حیرت یہ ہے کہ مغربی طریقہ تعلیم نے اُسے بُری طرح اپنا شکار کر لیا ہے اور ہندوستان کی روایتی ذہانت کی مشتعل قوت بالکل افسردہ ہو کر رہ گئی ہے"۔

"جب کبھی کوئی ملک یا قوم کسی زبردست طاقت سے مفتوح ہو جاتی ہے تو یقین کر لینا چاہیئے کہ حکمران طاقت سب سے پہلا کام یہی کرے گی کہ مفتوح قوم کی تعلیم تباہ کر ڈالے گی یا سختی کے ساتھ اُسے اپنے ہاتھ میں لے لے گی تاکہ اس سے فائدہ اٹھا سکے کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ علم اور غلامی پہلو بہ پہلو نہیں رہ سکتے"

۱۹۳۳ء میں تعلیمی کمیٹی کے ایک ڈائرکٹر نے کہا تھا "ہم نے امریکہ محض اپنی حماقت سے اس لئے کھو دیا کہ وہاں اسکول اور کالج قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اب ہمیں ہندوستان میں اس حماقت کا اعادہ نہیں کرنا چاہیئے"

مروجہ تعلیم کے نتائج مروجہ تعلیم کے نتائج حسب ذیل ہیں:-

(۱) دینی اور مذہبی تعلیم سے جاہل رہنا۔ لہٰذا الحاد و دہریت اور خیالات باطلہ کا پیدا ہونا

(۲) جذبات غیرت و حمیت کا نیم مُردہ یا مُردہ ہو جانا ؎

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہئے
اقبالؒ

(۳) فطرت سلیمہ کا کمزور یا زائل ہو جانا۔ اس لئے نیکی و بدی میں امتیاز نہ کر سکنا۔

افرنگ زخود بے خبرت کرد و گرنہ
اے بندۂ مومن، تو بشیری تو نذیری
اقبال

(۴) بزرگانِ دین، والدین اور اساتذہ کا ادب و احترام نہ کرنا۔

(۵) اپنی مذہبی، قومی، ملکی اور وطنی اشیاء سے نفرت و بُعد اور اقوام افرنگ کی اشیاء

کی طرف میلانِ طبع ؎

رشتہ اپنے مذہب و تہذیب سے توڑیں اگر
ہوتی ہے دشمن زمیں بھی چرخِ نیلی فام بھی عزیز فیضانی

(۶) حریت و شجاعت کی جگہ آرام طلبی و تعیش اور نسوانیت ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی اقبال

(۷) مروجہ تعلیم تمدنِ افرنگ کا موضوع ہے ؎

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر اقبالؒ

(۸) ذہنیت غلام ہوجانے کی وجہ سے فرمانروا قوم کا تمدن کمال اشتیاق سے اختیار کرلینا ؎

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں اقبالؒ

(۹) موجودہ تعلیم کے اثر سے طلباء کی ذہنیت غلام ہوجاتی ہے اور ذہنی غلامی جملہ اقسام کی غلامیوں سے بدترین غلامی ہے حکیم ملت علامہ اقبالؒ کس سوز و گداز کے ساتھ فرما گئے ہیں ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه"

(۱۰) مدارس میں آرام و راحت کی خسروانہ زندگی بسر کرنے کے سبب سے آرام طلب ہوکر محنت و مشقت سے جی چُرانا اور ذریعہ معاش محض ملازمت ہی سمجھ لینا لہٰذا بیکاری و احتیاج اور بے ہنری و قلاشی کا عام ہونا۔

(۱۱) دینی مدارس و مکاتب کی غیر آبادی اور مذہبی تعلیم کا تنزّل ؎

اے مسلماناں! فغاں از فتنہ ہائے علم و فن

اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب اقبالؒ

---

(۱۲) ذہنی غلامی کی وجہ سے اغیار کی محکومی کا عدم احساس بلکہ اشتیاق ؎

دلوں سے طلب حریت کی مٹا دی

وہ منتر پڑھا جس سے اُمت سلادی عزیز فیضانی

---

(۱۳) دینی علوم سے عدم واقفیت اور ملحد اقوام کی ذہنی غلامی کے سبب سے اخلاقی جرائم کا دلیرانہ ارتکاب اور ارتکاب جرم کے بعد عدم ندامت

(۱۴) شکل و صورت، وضع قطع لباس اور کلام بلکہ تمام اُمورِ تمدن و معاشرت میں اقوام افرنگ کی تقلید کرتے ہوئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشادِ عالی کا مصداق ہو جانا:-

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" "جس نے کسی قوم کا تشبّہ اختیار کیا۔ وہ اُسی میں سے ہو گیا"

(۱۵) ظاہری شکل و صورت کے علاوہ دل کا بدل جانا۔ یہ سب سے بڑی ہلاکت ہے۔ حضرت اکبرؒ الہ آبادی نے کیا ہی خوب فرمایا ہے ؎

یوں قتل پہ بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

اے کاش! کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

(۱۶) فسونِ فرنگ سے مسحور ہونے کی وجہ سے مذہب سے بغاوت اور الحاد کی حمایت ۔

یہ مدرسے یہ جواں یہ سرور و رعنائی
انہیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد اقبالؒ

حضرات! یہ معروضات سراسر حقائق پر مبنی ہیں جو اہلِ بصیرت اور غیور فرزندانِ اسلام کے لئے قابلِ غور و عمل ہیں۔

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را اقبالؒ

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ - وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ -

مورخہ ۱۰ جمادی الثانی
۱۳۵۹ھ

اقبالؒ کا عشقِ رسولؐ

(جناب خان زادہ محمد جمیل خان راز بنگش صدر انجمن ترقی اردو کوہاٹ)

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

اخلاقیات میں اقبالؒ جہاں ایک فلسفی شاعر ہے، وہاں جذبات میں ایک عاشقِ بے اختیارؒ ایک رندِ پاکباز اور ایک آزاد منش قلندر بھی ہے، لیکن عشق میں وہ عام اور سطحی جذبات سے الگ ہو کر عارفِ رومؒ کے مسلک کے پیرو ہیں، وہ رومیؒ کی طرح رعنائیت و معشوقیت کو تصویر و صورت کی بندشوں سے آزاد، ارفع و اعلیٰ طاقت سمجھتے ہیں، عارفِ رومؒ فرماتے ہیں ؎

هر چه معشوق است صورت نیست — خواں عشقِ ایں جہان و آں جہاں
گر ز صورت بگذرید اے دوستاں — جنت است و گلستاں در گلستاں

علامہ کے نزدیک بھی کائناتِ عالم کا رنگ و جمال جو ہزاروں نگاہوں سے آلودہ ہو اپنی لطافت کھو چکا ہے اور شائستہ اعتنا نہیں ؎

جلوۂ پاک طلب از مہ و خورشید گذر — زانکہ ہر جلوہ دریں وہر نگاہ آلود است

باایں ہمہ اُن کی زندگی پر ایک ایسی جمیل ہستی کا جمال بھی اثر انگیز ہے، جس کی پیدائش

سے کائنات نے شگفتگی پائی اور بہاروں نے زندگی اور جو سرورِ کائناتؐ کا خطاب پاکر سرفراز ہوئی۔ آپ علامہ کے کلام پہ غائر نگاہ ڈال کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جہاں بھی اقبالؒ نے رسولِ کریمؐ کا ذکر کیا، تو ایسے بے اختیار ہوئے کہ ان کے ہر لفظ سے شیفتگی و از خود رفتگی کا منظر پیدا ہوتا ہے، اور اس قدر والہانہ انداز سے آپؐ کا ذکر کرتے ہیں کہ بے قابو ہو جاتے ہیں اقبالؒ کو نبیؐ کی حقانیت و محبوبیت پر اس درجہ ایمان ہے جس سے آگے ایمان و ایقان کی کوئی منزل متصور ہی نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں ؎

می توانی منکرِ یزداں شدن   منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

ایک اور مقام پہ رسولِ کریمؐ کو مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ؎

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار   یا رسول اللہؐ اُو پنہاں، تو پیدائے من

عالمِ عشق میں اس قدر فنا فی الرسولؐ ہو چکے ہیں کہ اگر عزت کی طلب ہے تو انہیں سے ؎

خواجۂ من نگاہ دار آبروئے گدائے خویش   او کہ ز جوئے دیگراں پُر نکند پیالہ را

یہی نہیں کہ اقبالؒ ہی صرف عشقِ رسولؐ سے سرشار ہیں۔ بلکہ وہ تو خالقِ کائنات کو بھی فریفتۂ رسولؐ ٹھہرا کر کہتے ہیں کہ ایک طرف تو تیری معشوقانہ صفات اور جبّارانہ طاقتوں کا یہ عالم ہے کہ ذرا سے التجائے دید پہ تُو نے حضرت موسٰیؑ کی شاخِ زندگی پہ آتش باری کی اور دوسری طرف تیرے والہانہ عشق و جانسپاری کی یہ حالت ہے کہ ایک یتیمؐ کی شمع پر پروانہ وار فدا ہوتا ہے

؎ تو بر نخلِ کلیمؑ بے محابا شعلہ می ریزی   تو بر شمعِ یتیمےؐ صورتِ پروانہ می آئی

دوسری جگہ عشقِ رسولؐ سے مدہوش ہو کر ارشاد ہوتا ہے، کہ تُو نے سینکڑوں ابراہیمؑ اپنی آگ میں جلائے تب کہیں جا کر ایک محمدؐ کا چراغ روشن ہوا ؎

شعلہ ہائے اُو صد ابراہیمؑ سوخت   تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

عاشقانِ او زخوباں خوب تر   از حسینانِ جہاں محبوب تر

علامہ نے "دارِ اقبال" بھوپال میں ایک رات سر سید مرحوم کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی علالت کا ذکر دربارِ رسالت ﷺ میں کر چنانچہ اقبال نے اس خواب سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی جس کے ابتدائی اشعار میں مسلمانوں کی زبوں حالی پر اشکباری کے بعد سرورِ کائنات ﷺ کو اپنی حالت پر متوجہ کرنے کے لئے جو رقت آمیز اور پُرسوز لہجہ اختیار کیا اس سے علامہ کی عاشقانہ کشمکشِ اضطراب کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے فرماتے ہیں ؎

شہسوارا یک نفس درکش عناں   حرفِ من آساں نیاید بر زباں
آرزو آید کہ ناید تا بہ لب   می نگرد در شوق محکومِ ادب
آں بگوید لب کشا اے دردمند   ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند
گردِ تو گردد حریمِ کائنات   از تو خواہم یک نگاہِ التفات
آہوئے زار و زبون و ناتواں   کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہِ من حریمِ کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو

پھر سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں اپنی تہی مائیگی کے باعث اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ میری زندگی میں کوئی ایسی بیش بہا شئے نہیں، ہاں البتہ ایک چیز رکھتا ہوں، جسے دل کہا جاتا ہے میں نے اُسے دُنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھا ہے کیونکہ اُس کی شکل تیرے گھوڑے کے سم ایسی ہے ملاحظہ ہو ؎

گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است   چیزکے دارم کہ نامِ او دل است

دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں گرچہ شد بیرنہ تو دارو نشاں
بندۂ را کو نخواہد سازو برگ زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ

جاوید نامہ میں ایک جگہ علامہ نے منزلِ محبوبؐ کی طرف جانے کی کیفیت کو عجیب دلآویز الفاظ میں بیان کیا ہے، علامہ اونٹنی پر سوار ہو کر کوئے دوست کی طرف جارہے ہیں لیکن جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ سرسبز ہے، اونٹنی بار بار سبزہ چرنے میں مشغول ہو جاتی ہے اور اُدھر اقبالؒ کا دردِ جدائی، ایک لمحہ دیر بھی برداشت نہیں کر سکتا اس لئے گھبرا کر ساربان سے کہتے ہیں ؎

ساربان، یاراں بہ طیبہ ما بہ نجد آں حدی کو ناقہ را آرد بوجد
ابر باریداز زمیں ہا سبزہ رُست می شود شاید کہ پائے ناقہ سُست
جانم از دردِ جدائی در نفیر آں رہے کو سبزہ کم دارد بگیر
ناقہ مستِ سبزہ و من مستِ دوست او بدستِ تُست و من در دستِ دوست

ارمغانِ حجاز میں علامہ نے "عالمِ خیال" میں کوئے دوست کی طرف جاتے ہوئے جن رقت خیز اور محبت آموز جذبات کا اظہار فرمایا ہے وہ بھی کچھ کم دلنشیں نہیں ؎

چہ خوش صحرا کہ در وے کارواں ہا درود ے خواند و محمل بہ راند
بہ ریگ گرم او آور سجودے جبیں را سوز تا داغ بماند

پھر عاشقانہ تڑپ اور مجذوبانہ محبت سے بے اختیار ہو کر کہتے جاتے ہیں ؎

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم من و تو کشتۂ شانِ جمالیم

دو حرفے بر مرادِ دل بگویم　　بپائے خواجہؐ چشماں را بمالیم

پھر دفعتاً اپنی بے بضاعتی کا خیال پیدا ہوتا ہے تو کہتے ہیں ؎

جبیں را پیشِ غیر اللہ کردیم　　چو گبراں در حضورِ او سرودیم

ننالم از کسے، من نالم از خویش　　کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

پھر بارگاہِ رسالتؐ میں دُنیا والوں کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے جو بھید ظاہر کئے کسی نے ان سے فائدہ نہ اُٹھایا اور نہ ہی میرے حقائق سے مستفیض ہوئے بلکہ مجھے شاعر سمجھ کر واہ واہ ہی کرتے رہے ؎

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند　　ز شاخِ نخلِ ما خرما نخوردند

من اے میرِ اممؐ داد از تو خواہم　　مرا یاراں غزل خوانے شمردند

دُنیا کی ناقدر شناسی اور بے مہری کا گلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دلِ بر کف نہادم دلبرے نیست　　متاعے داشتم غارت گرے نیست

درونِ سینۂ من منزلے گیر　　مسلمانے ز ما تنہا ترے نیست

رسولِ کریمؐ کی محبت کا ایک لمحہ عمرِ جاوداں سے عزیز سمجھتے ہوئے ایک عجیب رندانہ انداز میں فرماتے ہیں ؎

بکوئے تو گداز یک نفس بس　　مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس

خرابِ جرأت آں رندِ پاکم　　خدا را گفت ما را مصطفےٰؐ بس

رحمۃ اللعالمینؐ کی حقیقت کا بھید واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں ؎

محبت از نگاہش پائدار است　　سکونش عشق و مستی را عیار است

مقامش عبدہٗ آمد و لیکن جہانِ شوق را پروردگار است

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ عاشق خواہ کتنا ہی کم عزت اور ہیچ میرز ہو لیکن وہ اپنے محبوب کے سامنے اپنی بے چارگی اور رسوائی کو برداشت نہیں کر سکتا بلکہ وہ ہر حالت میں آرزو مند ہوتا ہے کہ محبوب کی نگاہوں میں اس کی قدر و قیمت ہو، اس کی اسی حقیقت کے پیش نظر اس ہندی رندِ پاکباز کے "عشقِ رسولؐ" کا عالم ملاحظہ ہو کہ قیامت کے دن اُسے کسی سزا کا اندیشہ یا جزا کی آرزو نہیں، اُسے خوف ہے تو صرف اس قدر کہ اس کے گناہ رسولِ کریمؐ کے سامنے ظاہر ہو کر رسوائی کا موجب نہ ہوں، اس لئے بصد الحاح رب العزت کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں کہ خدایا! میرے گناہ بخش دے اور اگر لازمی طور پر حساب کرنا ہی ہو تو نبی کریمؐ سے چھپا کر میرا حساب لے تاکہ مجھے اپنے محبوب کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روزِ محشر عذرہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر از نگاہِ مصطفےٰؐ پنہاں بگیر

اب آخر میں مَیں اقبالؒ کے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جن میں علامہ نے رحمۃ اللعالمینؐ کی حقیقت پر بحث کی ہے اِن اشعار سے آپ کو اقبالؒ کے عشق کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا ارشادؒ ہوتا ہے ؎

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہم تو بالاتر است زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہر او نے عرب نے عجم است آدم است و ہم ز آدم اقدم است

عبدہٗ صورت گرِ تقدیرہا اندرو ویرانہا تعمیرہا
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ است ماہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست
عبدہٗ با ابتدا بے انتہا عبدہٗ را صبح و شامِ ما کجا
کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دم او عبدہٗ خامش تر خواہی بگو ہُو عبدہٗ

مدعا پیدا نگردد زِدو بیت
تا ندانی از مقامِ ما رمیت

اقوالِ زریں

اقوال حضرت غوث الاعظمؒ

(جناب شیخ عبدالمالک صاحب کرنال بوٹ شاپ لاہور)

۱۔ جب کوئی بندہ گناہ کرنے کے وقت اپنے دروازوں کو بند کر لیتا ہے اور مخلوق سے چھپ جاتا ہے اور خلوت میں خالق کی نافرمانی کرتا ہے تو حق تعالٰے فرماتا ہے "اے ابنِ آدم! تُو نے اپنی طرف دیکھنے والوں میں سب سے زیادہ مجھ کو ہی کمتر سمجھا ہے کہ سب سے پردہ کرنا ضروری سمجھتا ہے اور مجھ سے مخلوق کے برابر بھی شرم نہیں کرتا۔

۲۔ رضائے خالق کے خواہشمند! مخلوق کی اذیتوں پر صبر اختیار کر۔

۳۔ اے عمل کرنے والے! اخلاص پیدا کر ورنہ فضول مشقت اُٹھا رہا ہے۔

۴۔ امیروں کے ساتھ عزت اور دبدبے سے مل اور فقیروں سے عاجزی اور فروتنی کے ساتھ۔

۵۔ خالق کے ساتھ ادب کا دعویٰ غلط ہے جب تک تُو مخلوق کے ادب کا خیال نہ رکھے۔

۶۔ مومن جس قدر بوڑھا ہوتا ہے اُس کا ایمان طاقتور ہوتا ہے۔

۷۔ جو غصّہ کرے متکبّر ہے۔ جو گالی دے وہ کینہ ور ہے۔ جو بدلہ لینے کے درپے ہو وہ درندہ ہے۔ لیکن جو ضبط کر جائے وہ صابر اور کامل انسان اور محبِ خدا ہے۔

۸۔ صبر اختیار کر کیونکہ دُنیا تمامتر آفات و مصائب ہی کا مجموعہ ہے۔

غزوۂ بدر

عالمِ انسانیت کیلئے بشارتِ عظمےٰ

(ازجناب حافظ سراج الدین محمود بہاول پور)

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥

اور یقیناً خدا نے تمہاری مدد کی بدر میں جبکہ تم کمزور تھے پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو ۔ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ ۔

انسانی شرف ووقار ۔ عزت وعظمت ۔ حریت وآزادی اور اخوت ومساوات سے ابتدائی اور بنیادی مگر اہم ترین اور نایاب حقوق کے اعتراف کا اولین لمحہ ۔ حق کی ظفرمندیاں اور باطل کی شکست فاش ۔ انسان کے ظلم وجور اور استبداد وتعدی سے انسان کی پہلی دفعہ رہائی کا شاندار منظر ۔

جب سطح ارضی کے چاروں کونوں سے ظلمتوں سے گھرے اور کثیف بادل اُٹھ کر دنیا کے گوشہ گوشہ پر چھا گئے ۔ جب شر وفساد ظلم وعدوان اور طغیان وسرکشی کی تاریکیاں فضائے بسیط پر مسلط ہوگئیں ۔ جب انسان کی منور پیشانی جو صرف معبودِ حقیقی کے سامنے جھکنے کے لئے بنائی گئی تھی انتہائی ذلت کے ساتھ صرف

اپنے ہم جنس انسانوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ حشرات الارض اور شجر و حجر تک کے سامنے بھی خاکِ مذلت پر رکھی جانے لگی۔ جب طاغوتی طاقتوں کا صورِ انا و لاغیری اس بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا جانے لگا کہ حق و صداقت کی تمام آوازیں اس ایک شور میں دب کر رہ گئیں۔ جب حق مظلوم ہو گیا اور جب شیطان کامیابی اور کامرانی کے نشہ میں مخمور عالم مسرت میں جھوم جھوم کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر چکا تو عین اس وقت عرب کے صحرائے آتش فشاں کی بے آب و گیاہ بنجر اور سنگلاخ سرزمین سے ایک بے یار و مددگار۔ اُمّی یتیم اور ہر قسم کے دنیاوی سازوسامان سے محروم پرستارِ حق کی آواز بلند ہوئی۔ پرستارانِ ظلمت چونک اُٹھے۔ جبر و جور کی قہرمان طاقتیں پورے سازوسامان کے ساتھ مسلح ہو کر اس ایک آواز کو دبانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ مقابلہ غیر مساوی کیا، کچھ تھا ہی نہیں لیکن دنیا آج تک حیران ہے اور ہمیشہ حیران رہے گی کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ صاعقۂ حق کی ایک ہی گرج سے کفر کی ظلمتوں کا ابر چھٹ گیا۔ سیفِ حق کی بجلی چمکی اور تمام بادل پھٹ کر رہ گئے۔

بعثت نبویؐ سے قبل دُنیا کی حالت اسلام کے آنے سے پہلے اس وقت معلوم دُنیا کا بہت بڑا حصہ تو قیصر روم اور کسریٰ ایران کے زیر نگین تھا۔ اس وقت کی دُنیا کی سب سے زیادہ زبردست، طاقتور اور عظیم الشان یہی دو سلطنتیں تھی۔ اول الذکر ایشائے کوچک شام اور فلسطین کے علاوہ بحیرۂ روم کے ارد گرد کے تمام ممالک پر قابض و متصرف تھی یہاں تک کہ شمالی افریقہ پر ایک سرے سے لے کر دوسرے تک اس کا ہی قبضہ تھا۔ فراعنہ کی عظیم الشان سلطنت اس سلطنت کا فقط

ایک صوبہ بن کر رہ گئی سپین ۔ پرتگال ۔ گال (فرانس) اٹلی اور دریائے ڈینوب کی تمام ریاستیں اسی کے قبضہ میں تھیں لیکن اس وسیع مملکت میں جو سینکڑوں اقوام اور ممالک پر مشتمل تھی عوام الناس کا سوائے ایک لعنت وذلت اور غلامی کی زندگی کے اور کوئی حصہ نہیں تھا ۔ عام انسانیت اپنی اس ذلت کی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی ۔ قیاصرہ ۔ ان کا خاندان ۔ فوجی افسران ۔ ملکی عہدے دار اور رؤساء مذہب کے سوا باقی تمام رعایا اس ذہنی اور جسمانی پستی میں مبتلا تھی جس کے تصور سے بھی انسان کانپ اٹھتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اہل روما اور کچھ حصہ اطالیہ کی آبادی کا عام رعایا سے بہتر حقوق کا مالک تھا لیکن یہ وہی لوگ تھے جن میں سے فوجی و ملکی افسران اور مذہبی پیشوا یعنی بطارقہ وقسیس منتخب کئے جاتے تھے اس لئے ان کا اقتدار بھی دیگر رعایا کے لئے ایک لعنت سے کم نہیں ہوتا تھا ۔

شہر روما کے ایمفی تھئیٹر (AMPHE – THEATRE) میں جو ایک مشہور تماشہ گاہ تھی اور جس میں کم از کم پچاس ہزار نشستوں کا انتظام تھا جو تماشے شہنشاہ ۔ اس کے افسران اور عام شہری انتہائی رغبت و دلچسپی سے ملاحظہ کیا کرتے تھے ان سے ان لوگوں کی خونخواری وحشت اور بربریت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور حیرت یہ ہے کہ ان خونریزیوں کا تماشہ دیکھنے کے لئے مستورات تک بھی جو عام طور پر رقیق القلب اور شفیق الطبع مشہور ہیں برابر شریک ہوا کرتی تھیں ۔

عام انسانوں کی جان و مال اور آبرو ان پرستاران اقتدار پر ہر طرح مباح تھی چنانچہ جنگ یرموک کے موقع پر جب رومی سلطنت موت و زلیست کی کشمکش میں مبتلا تھی ایک فوجی سردار اپنا دستہ فوج لئے ہوئے اپنے راستہ پر سرگرم سفر تھا ۔ ایک

دن اختتام منزل پہ شام کے وقت اس کا ورود ایک بستی میں ہوا۔ جہاں ایک دوسرا مالدار رومی سوداگر برائے تبدیلی آب وہوا معہ اہل وعیال ٹھہرا ہوا تھا۔ اس راستہ سے گزرنے والے تمام رومی فوجی افسران کی دعوت وخدمت کرنا وہ اپنا قومی فرض تصور کرتا تھا۔ اس افسر کو بھی اس نے اپنی قیام گاہ پہ ہی ٹھہرایا۔ اس فیاض مہمان نواز رومی کی مہمان نوازی کا صلہ اس فوجی افسر نے یہ دیا کہ بوقت شب بستر پہ دراز ہو کر خود صاحب خانہ کے حرم پہ دست تعدی دراز کیا۔ اس مظلومہ کا ایک لڑکا اپنی والدہ کی مدافعت کے لئے لپکا۔ ظالم مہمان نے اس کا سر تلوار سے اُتار کر ایک طرف پھینک دیا اور بغیر کسی شرم وحجاب کے احساس کے رات بھر داد عیش دے کر صبح کو اپنے سفر پہ روانہ ہو گیا۔ یہ شخص فریاد لے کر باہان سپہ سالار روم کے پاس بھی حاضر ہوا لیکن اس نے بھی اسے بہت بے عزتی سے اپنے سامنے سے نکلوادیا۔

کسریٰ ایران کی شان وشوکت اور مطلق العنانی بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ایران۔ عراق۔ حیرہ اور دیگر حصص عرب کے علاوہ سندھ۔ بلوچستان۔ مکران۔ افغانستان سیستان اور ترکستان پہ بھی کجکلاہانِ ایران کا قبضہ وتصرف تھا۔ تمام دنیا کی دولت کھنچ کر یہاں چلی آرہی تھی۔ جس سے معدودے چند مقتدر انسانوں کے سوا اور کوئی متنفس مستفید نہیں ہو سکتا تھا ملکی وفوجی عہدے داروں کے علاوہ پیرانِ مغانِ آتش کدہ ہی وہ لوگ تھے جو ہر طرح کی عیش وعشرت پہ قابض تھے۔ عوام کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مرزبان ودہقان کی تفریق پہ مذہبی تقدس کی مہر لگی ہوئی تھی اور عام رعایا یعنی دہقان انتہائی ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کرنے پہ قانع تھے۔ طبقۂ اعلیٰ میں شراب وکباب ورباب کا دور دورہ تھا اور ان کی ہوائے نفسانی اور خواہشات شہوانی کے پورا کرنے

میں کوئی قانون سدِراہ نہیں ہوسکتا تھا۔ عوام رعایا کی نوجوان دوشیزہ لڑکیاں اپنی عصمت وعفت کو ان خونخوار درندوں کے ہاتھوں سے کسی طرح محفوظ نہیں رکھ سکتی تھیں کسریٰ ایران کی مطلق العنانی میں خدائی ثبوت کے لئے اتنا بیان کردینا ہی کافی ہے کہ اس نے ہفتہ بھر میں ایک دن خفگی کا مقرر کر رکھا تھا جس دن کوئی بڑے سے بڑا ملکی و فوجی عہدہ دار بھی اس کے حضور میں باریاب ہونے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ دن شہنشاہ کی بلا وجہ خفگی کا دن ہوتا تھا جس کا نام اس نے یوم الغضب رکھ چھوڑا تھا جو بدنصیب اس دن اتفاقیہ یا کسی غلطی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا اس کی سزا قتل ہوتی تھی

خسرو پرویز بڑی ہی شان وشوکت کا شہنشاہ تھا۔ اس کی ملکہ شیریں کی کئی ہزار سہیلیوں میں سے ہر ایک کے پاس سنہری زرق برق لباس کے علاوہ سر پہ رکھنے کے لئے ایک نیم شاہی تاج ہوتا تھا جو کسی دوسرے ملک کی ملکہ کو بھی شاید نصیب نہ ہوتا ہو۔ دولت کے اس اسراف کا نتیجہ تھا کہ عام رعایا ٹکڑوں تک کو محتاج تھی۔

آپس کی جنگوں میں دونوں سلطنتیں جن وحشیانہ مظالم کو روا رکھتی تھیں اور جو قتل وخون ریزی عام طور پہ ہوتی رہتی تھی اسے سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں یہ واقعات آج تک صفحات تاریخ پہ محفوظ ہیں۔ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو ڈھا کر برباد کر دینے کے علاوہ ان معابد میں کشتوں کے پشتے لگا دیا کرتے تھے۔

بدنصیب چین کی حالت بھی بہتر نہیں تھی۔ اپنے عروج سے گر کر انتہائی ذلت ومسکنت میں یہ ملک مبتلا تھا آپس کی خانہ جنگیاں دن رات خوں ریزی و فساد کا بازار گرم رکھتی تھیں۔ تاتاریوں کے آئے دن کے حملات ان کو کچھ کم مبتلائے مصیبت نہیں رکھتے تھے بعض دفعہ اپنی آزادی کھو کر ایران وغیرہ کی سیادت بھی تسلیم کرنی پڑجاتی تھی۔

ہندوستان میں اس وقت طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ملک میں بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں راجپوتوں کی قائم کردہ تھیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں۔ وحدتِ ملکی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور مرکزی قوت کا شیرازہ بکھر جانے کی وجہ سے تمام ملک آلام و مصائب کی آماجگاہ بنا ہوا تھا مذہبی اقتدار ایک خاص گروہ یعنی برہمنوں کے ہاتھ میں آیا ہوا تھا اور وہی مذہب کے سیاہ و سفید پر قابض تھے۔ اپنے آپ کو سب سے الگ رکھ کر ملاءِ اعلیٰ کی صف میں داخل کر چکے تھے۔

ہندوستانی قوم کے ماتھے پر شودر کالنک کا ٹیکہ بنے ہوئے تھے ان کی حالت غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ عام ہندوستانی رعایا کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ پستیٔ اخلاق و پستیٔ افکار کی کوئی حد باقی نہیں رہی تھی۔ ہر جگہ عوام الناس پر ذلت و نکبت سوار تھی۔

عرب دُنیا بھر کے معائب کا آماجگاہ بن رہا تھا۔ افلاس و جہالت۔ نسلی تفاخر۔ زبردست کی زیر دست آزاری۔ فحش و بے حیائی۔ ظلم و عدوان۔ قتل و خوں ریزی۔ لوٹ مار اور غارتگری کا دور دورہ تھا۔ باپ کی موت پر بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو اپنی بیوی بنانے میں کوئی شرم و حجاب محسوس نہیں کرتا تھا۔ دختر کشی۔ قطع رحم۔ خانہ جنگی۔ قبائل کی مسلسل جنگ و پیکار شراب نوشی۔ جُوا اور بُت پرستی جیسے افعالِ شنیع کے ارتکاب میں ان کو مطلقاً کوئی باک نہیں تھا بلکہ ان افعال پر فخر کرتے تھے۔

غرضیکہ اس وقت دُنیا کا کوئی ملک اور کسی ملک کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں امن و آسودگی اور عزت کی زندگی میسر ہو۔ اس لئے اس عالم اضطراب و پریشانی میں روحِ انسانیت تلملا اُٹھی اور سر بسجود ہو کر درگاہِ ایزدی میں فریاد کی اگرچہ اس فریاد کے الفاظ یہ نہیں تھے لیکن حقیقتاً اس کا مفہوم ان سے کچھ دور بھی نہیں تھا۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۔ ط

اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے اس فتنہ سے بچا اور ان کافر سر پھرے تھا اور ظالم انسانوں سے ہمیں نجات دے۔

کفر و شرک اور ظلم و عدوان کی طغیانیاں جب انتہا کو پہنچ گئیں تو رحمتِ باری کو جوش آیا اور آفتابِ عالمتاب مکہ معظمہ میں نمودار ہو کر سر کوہِ فاراں پہ چمکا۔

عوام الناس سے کفر و شرک۔ ضلالت اور گمراہی سے سرکارِ دو عالم سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب مبارک کو قبل از عطائے نبوت بھی بہت صدمہ پہنچتا تھا لیکن جس وقت حق سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بُرائی کی بیخ کنی پہ مامور فرما دیا گیا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار قریش پہ اس کا اعلانیہ اظہار فرمانا شروع کیا۔ صدائے حق کے سننے سے ان کے قلب و گوش اس قدر غیر مانوس تھے کہ پہلے تو وہ ششدر رہ گئے لیکن جس وقت ان کے معبودان باطل کی بطالت اور ان کے آباؤ اجداد سے چلی آنے والی ناحق پرستی کا اظہار کیا جانے لگا تو وہ بگڑ بیٹھے اور ایسے بگڑے کہ چند غریب پرستارانِ حق کی زندگیاں انہوں نے ان کے لئے عذاب کر دیں۔

چند نفوس قدسیہ تو اس صدائے حق کے بلند ہوتے ہی اُس پہ ایمان لے آئے لیکن ان کے اس آواز پہ ایمان لے آنے سے قریش کی آتش قہر و غضب اور بھی مشتعل ہو گئی کوئی ظلم اور کوئی شقاوت ایسی نہ تھی جو انہوں نے خود اس ہادی برحق کے ستانے میں روا نہ رکھی ہو لیکن اسلام کی صداقت کی کشش کچھ ایسی تھی کہ یہ مختصر سی جماعت دن بدن بڑھنے لگی۔ جوں جوں اسلامی جماعت ترقی کرتی جاتی تھی قریش کا ظلم و جور بھی ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا تھا۔ حضرت بلال رضؓ کو جو امیہ بن خلف کے حبشی غلام تھے عرب

کی آتشیں دھوپ میں دوپہر کے وقت جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کی چھاتی پر پتھر رکھ دیئے جاتے تھے تاکہ حرکت نہ کر سکیں۔ اور اس عذابِ شدید سے تنگ آ کر اس صداقت کے اعتراف سے باز آ جائیں۔ شدتِ تشنگی اور عذاب و عقوبت کی وجہ سے ان کی زبان ان کے منہ سے باہر نکل پڑتی تھی لیکن منہ سے سوائے "احد" کی آواز کے اور کچھ نہیں نکلتا تھا ان مظالم کے سہنے میں حضرت بلالؓ تنہا نہیں تھے سینکڑوں ہی اور مظلوم تھے جن پر ان سے بھی زیادہ مظالم روا رکھے جاتے تھے۔ جب قریش کے مظالم حد سے زیادہ بڑھ گئے تو ان مظلوموں کو ہجرت یعنی ترک وطن کی اجازت خداوند قدوس کی طرف سے عطا کر دی گئی لیکن خود ہادی اسلام علیہ الصلواۃ والسلام ابھی تک کفار کے نرغہ میں ہی تھے لیکن جب ابوجہل کی شرارت سے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے بھی کئے جانے لگے تو حکمِ خداوندی اُن کے لئے بھی آ پہنچا۔

سرزمین یثرب حضور انورؐ کی ہجرت کے لئے منتخب فرما دی گئی ایک رات کفار قریش بارادۂ قتل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ کئے ہوئے تھے کہ حضور صلعم بحکمِ خداوندی سورہ یٰسین کی تلاوت فرماتے ہوئے ان کے بیچ میں سے گزر گئے۔ اس وقت اُن پر ایسی غفلت طاری کر دی گئی کہ ان کو معلوم تک بھی نہ ہو سکا۔ کفار قریش کے اس حصار میں سے بخیر و عافیت گزر کر حضور انور یثرب پہنچ گئے اور یہ مقام آئندہ ہمیشہ کیلئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے مدینۃ النبیؐ کے نام سے موسوم ہو گیا۔

حضور انورؐ کے اس طرح صاف بچ کر نکل جانے کی وجہ سے قریش کے جوش انتقام کی کوئی حد نہیں رہی تھی جس وقت صبح ہونے پر ان کو حضور انورؐ کے بستر پر سے حضرت علیؓ اٹھتے ہوئے نظر پڑے تو ان کے غیظ و غضب کی طغیانیاں مکہ معظمہ کی حدود میں نہیں

سما سکتی تھیں۔ لیکن تعجب اس بات پہ ہے کہ ان ظالموں کی امانتیں ابھی تک بھی اسی مظلوم امینؐ کے سپرد تھیں جس کی جان لینے کے لئے رات بھر انہوں نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ حضرت علیؓ حسب فرمان نبویؐ اگلے دن صبح کو ان سب کی امانتیں ان کو پہنچا کر پا پیادہ مدینۃ النبی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب قریش دن رات اسی ادھیڑبن میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح ان بچ کر نکل جانے والوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے مدینہ اب تک ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ و مامون تھا لیکن رسول اللہؐ کی قیام گاہ ہونے نے اس کو قریش کے قہر و غضب کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔ آنحضرت صلعم جب وقت مکہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبداللہ ابن اُبَی کو جو ہجرت نبوی سے قبل رئیس الانصار تھا اور اُس وقت انصار نے اس کی تاج پوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کے لئے تاج تک بھی بنوا کر تیار کر لیا تھا خط لکھا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے لہٰذا یا تو تم لوگ اُس کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ خدا کی قسم ہم سب لوگ تم پہ حملہ کر دیں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پہ قبضہ و تصرف کر لیں گے۔"

عبداللہ ابن اُبَی تو اپنی ذاتی اغراض کے لئے مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا ہی اس لئے وہ تو اس سے بھی زیادہ تک کے لئے تیار تھا لیکن تاہم وہ اس وقت علانیہ تو کچھ نہیں کر سکا مگر کفار قریش کی شہ پا کر مدینہ کے یہود اور منافقین مسلمانوں کے درپے آزار ہو گئے کفار قریش کے اشارہ سے عرب کے دیگر قبائل بھی مسلمانوں کے خلاف ہو گئے اور خود قریش کی طرف سے بھی یہ محض ایک خالی دھمکی ہی نہیں تھی بلکہ وہ اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہر قسم کی تیاریاں کر رہے تھے ان کی ان تیاریوں کی خبر دربار رسالتؐ میں بھی پہنچ

چکی تھی یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگ کر بسر کرتے تھے۔

علامہ سیوطی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "آنحضرتؐ اور صحابہؓ جب مدینہ آئے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام ایک ساتھ اُن سے لڑنے کے لئے آمادہ ہوگئے لہذا صحابہؓ ہتھیار باندھ کر سویا کرتے تھے"۔

جن مظلوموں نے اپنا گھر بار ۔ بیوی بچے ۔ مال و اسباب اور سرزمین وطن کو محض اس لئے خیرباد کہہ دیا تھا کہ انکو باہر نکل کر قریش کے قہر و غضب اور ظلم و جور سے نجات مل جائیگی اور وہ امن و اطمینان کے ساتھ اپنے معبود برحق کی پرستش اس طریق پہ کرنے کے قابل ہوسکیں گے جو ان کے ہادی برحقؐ نے ان کو تلقین کیا تھا لیکن قریش کی اس شدید انتقام پسندی اور کینہ توزی نے ان کو قطعاً مایوس کر دیا۔ اپنے گھروں اور وطن سے نکلنے کے باوجود بھی وہ قریش کے مظالم سے ابھی تک محفوظ نہیں ہوئے تھے ۔ اگرچہ وہ بہت ہی کمزور اور قلیل التعداد تھے لیکن مسلسل ۱۳ سال تک آغوش نبوی میں تربیت پانے کے بعد اب ان میں سے ہر ایک کے ایمان و ایقان اور استقامت کی قیمت تمام دنیا و جہان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ خداوند قدوس نے اپنے ان پاکباز بندوں کی مظلومی اور بے بسی پہ رحم فرمایا اور ان کو ان ظالموں کے مقابلہ پہ آمادہ ہونے کی اجازت اور فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ فرقان حمید نے ان الفاظ میں اس بات کا اعلان فرمادیا:-

"اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ"

جن سے لڑائی کی جاتی ہے (یعنی مسلمان) ان کو بھی مقابلہ کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پہ ظلم کیا جا رہا ہے اور خدا یقیناً ان کی مدد پہ قادر ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِ هِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُ رَبُّنَا اللّٰہُ ۔ یہ وہ مظلوم لوگ ہیں جو بیچارے صرف اتنی سی بات کہنے پر کہ ہمارا خدا اللہ ہے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں

جنگ کی حالت میں سب سے زیادہ ضروری چیز مصارف جنگ کا مہیا کرنا ہوتا ہے اس لئے کفار قریش نے اپنا تمام مال و متاع اور زر و جواہر جمع کر کے سامان تجارت کی خریداری میں لگا دیا تھا جوش و خروش کی یہ حالت تھی کہ قریش کے بچے اور عورتوں تک نے بھی اس میں حصہ لیا اور شہر مکہ نے اپنا تمام سرمایہ اُگل دیا تاکہ اس کے تجارتی منافع سے جنگ کے مصارف ادا کئے جا سکیں چنانچہ اس سر و سامان کے ساتھ قریش کا کاروانِ تجارت شام کی طرف روانہ ہوا کہ اس سے قبل کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں تھی قافلہ ابھی شام سے واپس روانہ بھی نہ ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آ گیا جس نے قریش کی آتش قہر و غضب کو اور بھی بھڑکا دیا۔ شام سے واپسی میں چونکہ مدینہ منورہ راستہ میں پڑتا تھا اس لئے ابوسفیان قافلہ سالار قریش نے خیال کیا کہ کہیں مسلمان قافلہ کی مزاحمت نہ کریں اس لئے اس نے مکہ معظمہ میں پیغام بھیج دیا کہ کاروانِ تجارت خطرے میں ہے۔ جب پیغامبر یہ پیغام لے کر مکہ معظمہ میں پہنچا تو تمام شہر میں گھبراہٹ اور سراسیمگی پھیل گئی۔ کاروانِ تجارت کے ساتھ ہی تو سب خورد و کلاں کے مفاد وابستہ تھے۔ ابوسفیان کا یہ احتیاطی پیغام مکہ کے زن و مرد کے کانوں میں ان الفاظ میں گونج رہا تھا "مسلمان قافلہ کو لوٹنے کے لئے آ رہے ہیں"۔ ان الفاظ کا ان کانوں تک پہنچنا تھا کہ قریش کے قہر و غضب کا دل بادل بڑے زور شور سے اُٹھا اور تمام عرب پہ چھا گیا اور ان کے آتش خشم کی بجلیاں نواحی مدینہ میں چمکنے لگیں۔

دربارِ رسالت میں بھی دم بدم کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ یہاں یہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ عتبہ بن ربیعہ اور ابوجہل ایک ہزار کی جمعیت سے مدینہ منورہ پہ حملہ آور ہونے والے ہیں اس لئے حضور انورؐ نے بھی تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور اس بارے میں ان سے مشورہ چاہا۔ مہاجرین میں سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ نے اٹھ کر جاں نثارانہ تقریریں کیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہ دیا حضورؐ انصار کی طرف دیکھتے تھے اس لئے کہ ایک تو مہاجرین کی تعداد ہی بہت قلیل تھی دوسرے یہ کہ انصار سے صرف یہ عہد ہوا تھا کہ جب کوئی بیرونی دشمن مدینہ پہ چڑھ کر آئے گا تو وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ قبیلہ خزرج کے سردار تھے یہ دیکھ کر کھڑے ہوئے اور عرض کیا:-

"حضورؐ کا اشارہ ہماری طرف ہے یا رسول اللہؐ! خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر حضورؐ ارشاد فرمائیں تو ہم اپنے گھوڑوں کو وادی برک الغماد تک پہنچا کر چھوڑیں۔ ہم ہر طرح حضورؐ کے تابع فرمان ہیں"۔

مقدادؓ ابن اسود نے کھڑے ہو کر عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! جس طرح موسیٰؑ کی قوم نے اپنے پیغمبر سے کہا تھا کہ جاؤ تو اور تیرا خدا دونوں جا کر عمالقہ کی قوم سے لڑو۔ ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے بلکہ ہم لوگ آپؐ کے دائیں اور بائیں سے سامنے اور پیچھے سے لڑیں گے اگر حضورؐ فرمائیں تو ہم سمندر میں پھاند پڑیں گے"۔

ان کی اس تقریر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ چمک اٹھا اور حضورؐ خوش ہو گئے

رسولؐ اللہ نے اک دن مسلمانوں کو بلوایا
بٹھایا مسجد نبوی میں سب کو اور فرمایا

تمہارا عندیہ کیا ہے لڑیں یا بند ہو بیٹھیں
چلیں میدان میں یا شہر کے پابند ہو بیٹھیں

ابوبکرؓ و عمرؓ نے عرض کی اے ہادیٔ دوراں
ہمارے مال و جاں اولاد سب کچھ آپ پر قرباں

غلامانِ محمدؐ جان دینے سے نہیں ڈرتے
یہ سر کٹ جائے یا رہ جائے وہ پرواہ نہیں کرتے

اُٹھے مقداد اُٹھ کر عرض کی اے سرورِ عالمؐ
نہیں ہیں قوم موسیٰؑ کی طرح کہہ دینے والے ہم

"خدا کو ساتھ لے جا اور باطل سے لڑائی کر
ہمارے واسطے خود جا کے قسمت آزمائی کر"

ہمیں کیوں ساتھ لے جاتا ہے دنیا سے اُجڑنے کو
خدا اور اس کا موسیٰؑ ہی بہت کافی ہیں لڑنے کو"

معاذ اللہ مثلِ امتِ موسیٰؑ نہیں ہیں ہم
جہاں ہیں پیروانِ دینِ ختم المرسلیںؐ ہیں ہم

مسلماں کو ڈرا سکتے ہیں کب یہ نیزہ و خنجر
لڑیں گے سامنے ہو کر عقب پر دائیں بائیں پر"

صفِ انصار کی جانب اٹھی آنکھیں نبوت کی
تو سعد ابنِ معاذ اُٹھے دکھائی شان جرأت کی

ادب سے عرض کی انصار ہیں ہم یا رسول اللہؐ
غلام سیدِ ابرار ہیں ہم یا رسول اللہؐ

قسم اللہ کی جس نے نبی مبعوث فرمایا
سبھی کچھ پا لیا جس وقت ہم نے آپؐ کو پایا

ہمیں میدان میں لے جائیے یا شہر میں رہئیے
کسی سے صلح کو فرمائیے یا جنگ کو کہئیے

ہمارا فرض ہے تعمیل کرنا رائے عالی کی
ہماری زندگی تکمیل ہے ایمائے عالی کی

ہمارا مرنا جینا آپؐ کے احکام پہ ہو گا
کسی میدان میں ہو خاتمہ اسلام پہ ہو گا

اگر ارشاد ہو بحرِ فنا میں کود جائیں ہم
ہلاکت خیز گرداب بلا میں کود جائیں ہم

نبی کا حکم ہو تو پھاند جائیں ہم سمندر میں
جہاں کو محو کر دیں نعرۂ اللہ اکبر میں

قریشِ مکہ تو کیا چیز ہیں دیووں سے لڑ جائیں
سنانِ نیزہ بن کر سینۂ باطل میں گڑ جائیں

(باقی)

یادِ اقبال

'یادِ اقبال' کا حصہ اول خدا کے فضل سے بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اب حصّہ دوم بھی زیرِ ترتیب ہے۔ اس میں سے ذیل کی ایک نظم قارئین پیغام حق کی ضیافت طبع کے لئے درج کی جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کے علم میں کوئی ایسا مرثیہ یا نظم ہو جو حصہ اول میں طبع ہونے سے رہ گئی ہے تو براہ کرم وہ بھجوا دیجے اگر معیار پر پوری اتر آئی تو شکریہ کے ساتھ حصہ دوم میں درج کر لی جاوے گی۔

محمد شاہ

سوزِ اقبال

(جناب محمد رمضان تبسم قریشی گجرات)

جانتے ہیں کہ عمر فانی ہے — چار دن کی یہ زندگانی ہے
غم کی کثرت یا شادمانی ہے — بات لیکن یہ آنی جانی ہے
ایک لمحہ کو رُک نہیں سکتی — عمر میں اس قدر روانی ہے
بزمِ ہستی کے میہماں ہیں ہم — چند روزہ یہ میہمانی ہے

موت آئے تو کچھ نہیں بنتا پھر نہ ہم ہیں، نہ زندگانی ہے
دم جو آتا ہے بس غنیمت ہے کر دکھائیں جو دل میں ٹھانی ہے
وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گھات میں مرگِ ناگہانی ہے
جس سے بڑھتا ہے ذوق و شوقِ عمل وہ فقط سوزشِ نہانی ہے
زندگی اس کی ہے جو مر کے جیئے ورنہ کیا لطفِ زندگانی ہے
غم نہیں گر عدوئے سعی و عمل چرخ ہے، گردشِ زمانی ہے
وہ جہاں کا، جہاں ہے اس کا جس کا دل درد کی نشانی ہے
جو نکلتا ہے سوزِ دل سے رواں وہ حقیقت کی ترجمانی ہے
دردِ ملت سے جو رہے بے چین اس کی ہر سانس جاودانی ہے
اس پہ باراں ہے رحمتِ باری اس پہ ایزد کی مہربانی ہے

تا ابد اس کا نام ہے زندہ
موت بھی اس کی زندگانی ہے

قوم کا وہ فدائی و رہبر مردِ مومن، مجاہدِ اکبر
اپنی ملت کی بہتری کے لئے ہو کمربستہ جو کہ شام و سحر
خود بھی روتا اور رُلاتا ہو اپنی ملت کی خستہ حالت پہ
ہے جہاں بھر کی آنکھ کا تارا دیدۂ قوم میں ہے سوزِ نظر
ایسا بخشا تھا ہم کو خالق نے مردِ کامل، حکیم و دانش ور
عالمِ دین و عالمِ دنیا خادمِ ملک اور دیں پرور
گھلتا رہتا تھا قوم کے غم میں تھا وہ سوز و گداز کا پیکر

اُس کا دل بھی تھا ولولہ انگیز   اس کی آنکھیں بھی تھیں لہو سے تر
تھا سراپا وہ سوز و سازِ حیات   اس کے پہلو میں قلب تھا کہ شرر
یوں ہوا گاہے حق سے "شکوہ" سنج   اہلِ اسلام کا ہے گھاٹ نہ گھر
گاہے خود ہی "جوابِ شکوہ" میں   ڈالی ملّت کی خامیوں پہ نظر
"شمع و شاعر" کے روپ میں گاہے   کہ سنایا تھا حالِ دردِ جگر
بن کے "فریادِ اُمتِ مرحوم"   گاہے برسائے اشک کے گوہر
"خضرِ راہ" بن کے وہ کبھی لایا   قومِ گمراہ کو حق نما راہ پہ
عرشِ اعظم پہ ڈالی گاہے کمند   صیدِ یزداں کو رکھ کے پیشِ نظر
جو بھی کہتا تھا خونِ دل پی کر   تھی نوا اس کی رازدانِ اثر
بن کے ساقی پلا گیا سب کو   جو اخوّت سے تھا بھرا ساغر
دردِ دل سے دکھا گیا ہے ہمیں   اُمتی رہ کے شانِ پیغمبر

فی الحقیقت تھا قوم کا اقبال
تھا وہ روح الامیں کا شہپر

جامِ وحدت پلا گیا اقبال   مستِ اُلفت بنا گیا اقبال
پستیِ دہر کے مکینوں کو   بامِ رفعت دکھا گیا اقبال
بزمِ دنیا میں عمرِ فانی کی   کیا ہے غایت؟ بتا گیا اقبال
شعر کی دلربا فضاؤں میں   اِک حقیقت بسا گیا اقبال
بیخودی اور خودی کی پھونکوں سے   شمعِ غفلت بجھا گیا اقبال
کشتِ ایماں کی آبیاری کو   بحرِ حکمت بہا گیا اقبال

قلبِ مسلم سے پردۂ غفلت / کر کے ہمت اُٹھا گیا اقبال

سازِ دل پر سُنا کے نغمۂ درد / دردِ ملت بڑھا گیا اقبال

ایک مدت سے تھی زوال پذیر / قومی سیرت، بنا گیا اقبال

جس سے زندہ ہو عظمتِ ماضی / وہ حکایت سُنا گیا اقبال

قوم کے بننے اور بگڑنے کی / شکل و صورت دکھا گیا اقبال

یورشِ کفر و زورِ باطل / ملّی عزّت بچا گیا اقبال

دل میں دُنیا کے اہلِ ایماں کی / کتنی ہیبت بٹھا گیا اقبال

ہے جو معمارِ قصرِ خود داری / وہ جماعت بنا گیا اقبال

اپنے شعروں سے لعل و گوہر کی / قدر و قیمت گھٹا گیا اقبال

سادہ لفظوں میں تیرہ بختوں کو / رازِ قسمت بتا گیا اقبال

آبِ "لَا تَقْنَطُوْا" سے دھو دھو کر / داغِ حسرت مٹا گیا اقبال

شعر و حکمت کے پردے پردے میں / حُسنِ فطرت دکھا گیا اقبال

گا کے عرفاں کے سرمدی نغمے / ہائے! رخصت ہُوا، گیا اقبال

عشقِ احمدؐ کے فیضِ وافر سے / کیسا امرت پلا گیا اقبال

تھا جو نباضِ گردشِ دوراں / وہ عزیمت نما گیا اقبال

جس طرف دیکھیے ہے جوشِ عمل / باغِ عظمت کھلا گیا اقبال

پھونک ملت میں روحِ بیداری
سُوئے جنت چلا گیا اقبال

تاریخ وفات اقبال

(جناب محمد رمضان تبسم قریشی گجرات)

(۱)

ندیم علم و دانش بودہ اقبال ‏ پئے حکمت زبانش بودہ اقبال
شنو از تاریخ رحلت من بگویم ‏ فروغ علم و دانش بودہ اقبال
۱۹۳۸ عیسوی

(۲)

ہوا اقبال جب دنیا سے رخصت ‏ بشرق و غرب ماتم کا سماں تھا
پئے تاریخ جب ہاتف سے پوچھا ‏ پکارا "ایشیا کا فخر اقبال"
۱۳۵۷ ھجری

اقبال

(جناب ماہر القادری حیدرآباد دکن)

گر توں کو اُٹھاتا ہے، سوتوں کو جگاتا ہے اقبالؒ، ترا نغمہ مُردوں کو جِلاتا ہے
تُو جرأت و بے باکی دُنیا کو سکھاتا ہے کمزور ممولوں کو شاہیں سے لڑاتا ہے
تُو شعر کے پردے میں تکبیر سُناتا ہے تُو پھول کی پتّی کو تلوار بناتا ہے
قرآں ترا ایماں، قرآں تری دُنیا تُو شعر نہیں کہتا، الہام سُناتا ہے

جس نقش کو مغرب کے ہاتھوں نے اُبھارا تھا
اُس نقش کو مشرق کی ٹھوکر سے مٹاتا ہے

اقبال، محمدؐ کا پیغام سُناتا ہے مرنا بھی سکھاتا ہے، جینا بھی سکھاتا ہے
ایماں کی دولت کو غیروں میں لُٹاتا ہے گنگا کی وہ موجوں کو زمزم سے ملاتا ہے
ٹوٹے ہوئے تاروں کو، بکھرے ہوئے پھولوں کو اقبالؒ، محبت کے ہاتھوں سے اُٹھاتا ہے
ہر جبر کی قوت کو، ہر ظلم کی طاقت کو فاروقؓ کی سطوت کا آئینہ دکھاتا ہے
مغرور امیروں کو معلوم نہیں شاید اقبال، امارت کی بنیاد ہلاتا ہے
جس مے نے کیا زندہ عطارؒ و رومیؒ کو اقبالؒ، اُسی مے کے پیمانے پلاتا ہے
تہذیبِ فرنگی پہ آتی ہے ہنسی اُس کو اسپین کے کھنڈروں پہ آنسو بھی بہاتا ہے
پیغامِ حیات تُو دیتا ہے غریبوں کو دولت کی غلامی سے دُنیا کو چھڑاتا ہے

یہ مکر بھری دُنیا رہنے کے نہیں قابل
ماہر تجھے جنت میں اقبالؒ بلاتا ہے

وہ اور میں

(جناب مرزا عزیز نیشانی)

جو دنیا کی مصائب سے چھٹا ہیں — عدم کی اُلجھنوں میں پھنس گیا میں
وہ فوق العرش اور تحت الثریٰ میں — ابھی توبہ! کجا وہ اور کجا میں
کبھی افضل، کبھی ارذل، کبھی گم — سمجھتا ہوں بشر کا مرتبہ میں
کہاں کشتی کو آزادی سے لے جاؤں — اسیرِ حلقۂ موجِ فنا میں
بھلا ڈالوں اُسے دُنیا ہے جس کی — یہ دُنیا ہے تو دُنیا سے رہا میں
شہانِ دہر کو خاطر میں لاؤں؟ — گدائے سیّدِ ارض و سما میں
بُتِ مغرور! کبر و ناز کب تک — خدا تُو ہے نہ بندہ ہی ترا میں
خدا کے سامنے! اللہ اکبر! — ہیں دونوں ہیچ، کیا تُو اور کیا میں
نہیں تھا دیکھنا میرا یونہی کچھ — سمجھ لو، کہہ گیا ہوں مدّعا میں
اُٹھایا تُو نے کب محفل سے اپنی — یونہی مجبور ہو کر خود اُٹھا میں
نیا مجھ پہ کروگے جب کوئی وار — کہوں گا مرحبا صد مرحبا میں
دبانے اور ڈرانے کی ضرورت؟ — یہ دیکھو دب گیا میں، ڈر گیا میں
پڑی ہے کیا تمہیں مشقِ جفا کی — جفا کا لو ابھی قائل ہوا میں

نوا سے باز آؤں بھی تو کیونکر
کہ میں یکسر نوا ہوں اور نوا میں

اُدھر تقدیر ساز آزاد بندے ادھر پابندِ تقدیر و قضا میں
ہم اپنے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں دونوں پئے شمشیر وہ، بہرِ دعا میں
وہ اوروں کا سہارا بن رہے ہیں کسی کا ڈھونڈتا ہوں آسرا میں
ہے اُن کا آستاں مسجودِ عالم درِ اغیار پہ ہوں جبہ سا میں
عزیز اللہ جانے یا مرا دل
کہ آج اس بزم میں کیا کہہ گیا میں

دعوتِ عمل

(از مولانا سید امین صاحب امینؔ (فاضل عمری) استاذ جامعہ دارالاسلام عمرآباد صوبہ مدراس)

خودی کے ساز میں اپنا مقام پیدا کر — نوائے دل میں نیا اک نظام پیدا کر
الٰہی چھا گیا دُنیا پہ طرزِ بولہبی — محمدِ عربی کے غلام پیدا کر
غلامِ خواجہ ابھی فقرِ خواجگی ہے تری — اسی فقیری میں اپنا تُو نام پیدا کر
یہ رنگ و بو کا جہاں تجھ کو سازگار نہیں — مہ و ستارہ سے آگے مقام پیدا کر
بہت زمانہ کی نیرنگیوں کو دیکھ چکا — کچھ اب تو مایۂ عیشِ دوام پیدا کر
جہاں میں ظلم و ستم کی کچھ انتہا نہ رہی — اُٹھ اور امن و اماں کا نظام پیدا کر
الٹ کے رکھ دے جوان خاکیوں کی تقدیریں — نوائے دل میں وہ زورِ پیام پیدا کر
جو اک ہی جست میں طے کر دے آسماں و زمیں — فغانِ نیم شبی میں وہ گام پیدا کر
علومِ مشرق و مغرب تو پڑھ لئے تُو نے — کسی فقیر سے سوزِ تمام پیدا کر
یہ شغل تو سمجھ سب جس پہ ختم ہو جائے — وہ کاروانِ حرم کا امام پیدا کر

امینؔ الجھ کے نہ رہ جا اسی نشیمن میں
تو ماورائے فلک اک مقام پیدا کر

اے نیل کی امواج!

سیاسیاتِ مصر کا ایک جائزہ

جناب نعیم صدیقی خان پور (جہلم)

اے نیل کی امواج نہیں خوفِ کنارہ   تم چاہو تو مشکل نہیں اُبھس جائے گا خارہ

پانی ہے کہ بادہ ہے، یہ پانی ہے کہ پارہ

اے نیل کی امواج!

جب تھک کے گرو تم تو اٹھا دیتی ہے پھر وہ   تقدیر کا میں خوب سمجھتا ہوں اشارہ

بس خامۂ تدبیر کا تقدیر ہے چارہ

اے نیل کی امواج!

وہ نیل کی آغوش میں اسلام کی کشتی   گردوں پہ ہو جس طرح لرزتا کوئی تارہ

یا باغ میں ہلتی ہوئی اک شاخِ ہزارہ

اے نیل کی امواج!

فردوس میں ابلیس کو حاصل ہے گزر کیوں   کیوں کعبہ میں قائم ہے کلیسا کا ادارہ

تہذیب کا مغرب نے لیا کب سے اجارہ

اے نیل کی امواج!

یاں جمع ہیں "توحید" و "یہودیت" و "تثلیث" یکتارہ ہم آہنگ بہ دوتارہ، سہ تارہ
اس حال پہ شاعر کا جگر آہ دو پارہ
اے نیل کی امواج!

پیدا نہ ہوا پھر کوئی یاں مہدیٔ ثانی سوڈان کے ماضی کا کیا تم نے نظارہ
وہ صبح نہ پیدا ہوئی گردوں پہ دوبارہ
اے نیل کی امواج!

فاروق[1] میں پیدا ہو عمرؓ کی جو لیاقت رکھے وہ سرِ کفر پہ اسلام کا آرہ
جینے کو مگر ڈھونڈتا ہے خود وہ سہارا
اے نیل کی امواج!

ہر موج ہو اک شعلۂ آتشکدۂ نیل اخگر ہو حباب، اور گہر گرم شرارہ
اے نیل کی امواج نہیں خوف کنارہ
اے نیل کی امواج!

---

[1] شاہ مصر۔

اعلان

"اردو زبان اور تفسیر قرآن"

راقم الحروف ایک ایسی کتاب اردو زبان میں لکھ رہا ہے جس میں ان مصنفوں کا تذکرہ ہوگا جنہوں نے اردو میں کوئی قرآنی خدمت کی ہے، لہٰذا اس کی درخواست کی جاتی ہے کہ جن حضرات نے اردو میں کوئی مستقل تفسیر لکھی ہے یا کسی دوسری زبان سے کسی تفسیر کی کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے یا کسی خاص تفسیری موضوع پر کوئی محققانہ کتاب تالیف کی ہے، وہ اپنا مختصر سا تذکرہ اپنی کتاب کے ساتھ روانہ فرما کر اردو زبان اور تفسیر قرآن کی اس خدمت میں "دائرہ قرآنیہ" کا ہاتھ بٹائیں امید ہے کہ اہل علم و ادب اس طرف خود توجہ فرمائیں گے، اور اخبارات و رسائل اس اعلان کو نقل فرما کر اجر پائیں گے۔

المعلن :- سید صبغۃ اللہ بختیاری (فاضل دیوبند) استاذ جامعہ دار الاسلام
معتمد "دائرہ قرآنیہ" عمر آباد ضلع شمالی آرکاٹ - (صوبہ مدراس)

حیاتِ محمد عبدہٗ

چارلس ایڈمز نے (ISLAM AND MODERNIZM IN EGYPT)
کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور اُس میں مفتی محمد عبدہٗ مصری کے حالاتِ زندگی بھی درج کئے ہیں اور ان کی سیرت وکردار کے بعض پہلوؤں پر بھی محققانہ روشنی ڈالی ہے جناب مولوی محمد مظہرالدین صدیقی بی۔اے نے مفتی صاحب موصوف سے متعلقہ تمام ابواب کا آسان اُردو میں ترجمہ کر دیا ہے جو حیات محمد عبدہٗ کے نام سے ہم شائع کر رہے ہیں۔ اِس کتاب میں دین اور دنیاوی تعلیم کے حصول کے طریقوں پر بحث کی گئی ہے۔ بالخصوص مذہبی تعلیم، اُس کے حصول اور افادی پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب اِس قدر مفید، دلچسپ اور سبق آموز ہے کہ اگر آپ ایک مرتبہ اِس کو پڑھنا شروع کر دیں تو جب تک ختم نہ ہو جائے آپ اسے ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے۔

قیمت بے جلد، بارہ آنہ (۱۲/) محصول ڈاک ۳/

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاجپورہ لاہور

اعلان

پیغام حق کا اقبال نمبر

اگر اللہ تعالےٰ کو منظور ہوا تو ماہ جنوری ۱۹۴۰ء میں پیغام حق کا جو نمبر نکلے گا وہ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے لئے مخصوص ہوگا۔ اہلِ ادب سے استدعا ہے کہ وہ اس نمبر کو کامیاب بنانے کی سعی کریں۔ کوشش کی جاوے گی کہ یہ نمبر علامہ مرحوم کی شخصیت اور تعلیمات کا پورا پورا مرقع بن جائے۔ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اپنے خیالات کی اشاعت کا یہ بہترین موقع ہے۔ یہ نمبر انشاء اللہ العزیز ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر جاوے گا اور بہت بڑی تعداد میں چھپوایا جائے گا۔ اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہوگی (عہ) جو حضرات پیغام حق کے مستقل خریدار ہیں اُن سے زائد کچھ نہیں جاوے گا۔

چندہ سالانہ عوام کے لئے ۱۲/ ہے اور ذی استطاعت حضرات کے لئے ۵/ ہے

مینیجر پیغام حق ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

Registered No. L. 4584

جلد ۳— عدد ۱

دسمبر ۱۹۴۰ء

ماہ نامہ



پیغام حق

اصلاحی اور اخلاقی، علمی اور دینی مضامین کا ذخیرہ

مرتبہ

سیّد محمد شاہ ایم۔ اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت فی پرچہ

قیمت سالانہ عـہ

تصانیف متعلقہ علامہ اقبال

اقبال

علامہ اقبال کے سوانح حیات اور ان کی شاعری کی تدریجی ترقی، یہ کتاب علامہ مرحوم کی زندگی ھی میں لکھی گئی تھی اور اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ھے جو انکی زندگی میں ان کے ایك دلی دوست نے لکھی -

شاعر مشرق یا Poet of The East

علامہ اقبال کے بالکل مکمل صحیح دلچسپ اور ناقدانہ حالات زندگی جو ملك کے مشہور نامور انگریزی ادیب مسٹر عبداللہ انور بیگ نے تحریر فرمائے ھیں
قیمت -/-/۴ علاوہ محصولڈاك

جوھر اقبال

مولانا سید سلیمان ندوی و سید ابوالاعلی مودودی اور ڈاکٹر عابد حسین وغیرھم جیسے بلند پایہ ادیبوں نے ڈاکٹر اقبال رحمۃاللہ علیہ کو جو خراج تحسین ادا کیا ھے اس کا بہترین ثبوت اس کتاب سے ملیگا، قیمت -/۸/۱ علاوہ محصولڈاك

یاد اقبال

حصہ اول

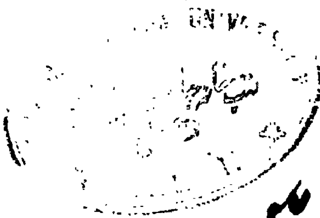
علامہ اقبال کی یاد میں ھندوستانی شعراء نے جو مرثیے تحریر فرمائے ھیں اُن کا بے نظیر مجموعہ ھے، - - - - قیمت -/۴/۱ علاوہ محصولڈاك

ملنے کا پتہ

دفتر اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل تاجپورہ، لاھور

سالانہ قیمت

عوام سے دو روپے بارہ آنے — روساء سے پانچ روپے

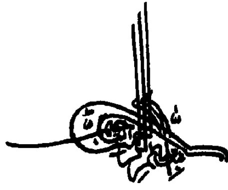


فہرست مضامین

جلد ۳ — دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء — عدد ٦

سخنہائے گفتنی	سید محمد شاہ ایم۔ اے	۲
اسلام اور مسلمان	از جناب مولوی نذیر الحق میرٹھی	۴
اسلام اور ضبط ولادت	از مولنا سید ابو الاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن	۹
ترانہ کہ تازیانہ؟	از جناب مرزا عزیز نیصانی	۶۱
اقوال حضرت عثمانؓ	از جناب شیخ عبدالمالک کرنال شاپ لاہور	۶۲

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر دفتر رسالہ پیغام حق۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ لاہور سے شائع ہوا۔



سخنہائے گفتنی

اِس پرچہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک معرکۃ الآرا مضمون اسلام اور ضبطِ ولادت (BIRTH CONTROL AND ISLAM) شائع ہو رہا ہے۔ موصوف نے یہ مضمون آج سے کوئی چار پانچ سال پہلے لکھا تھا اور رسالہ ترجمان القرآن کی متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ مولانا کے دیگر مضامین کی طرح یہ بھی ایک ایسا مضمون ہے جو کبھی بھی پرانا (OUT OF DATE) نہیں ہو سکتا کیونکہ اس مضمون میں مرد و عورت کے تعلقات کی نوعیت پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اسلام کے نقطۂ نگاہ کے جویاں موجود ہیں تب تک یہ مضمون اُن کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

برتھ کنٹرول تہذیب یورپ کا ثمرِ خبیث ہے جسے مغربی اقوام کا اثر و رسوخ اور تسلط و اقتدار ہندوستان میں لے آیا ہے اور جسے ہماری ہمسایہ اقوام نے جو یورپ کے سانچے میں ڈھل جانے ہی کو معراجِ ترقی سمجھتی ہیں بخوشی قبول کر لیا ہے۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہم بدنام کنندۂ اسلام مسلمانوں نے بھی اس تحریک کے اثرات کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے اور جن گھرانوں سے اسلامی ذہنیت پہلے ہی رخصت ہو چکی تھی اُنھوں نے دوسروں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر اپنے ہم مذہبوں میں بھی ان نظریات کا پرچار کرنا شروع کر دیا اور اس طرح عام مسلمانوں تک اس وبا کے مہلک جراثیم کو پہنچا دینے میں معاون ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

اس نازک موقع پر اس امر کی ضرورت تھی کہ کوئی خدا کا بندہ جو اہلِ قلم ہونے کے ساتھ ساتھ اہلِ دل بھی ہو جو تحریکاتِ حاضرہ سے اعلےٰ درجے کا واقف ہونے کے علاوہ اسلام کے اصولِ تہذیب و تمدن سے بھی واقف ہو اُٹھے

اور الحاد و گمراہی کی اِس بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے کی کوشش کرے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں خدا کا ایک بندہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سچا جانشین اور اسلام کا ایک پُرجوش علمبردار موجود ہے اور گو پورے ہندوستان میں ـــ اِن چالیس کروڑ افراد کے درمیان ـــ وہ ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے مگر کلمۂ حق کہتے وقت کسی سے نہیں ڈرتا۔ جو لوگ اُس کی بات سُنتے ہیں وہ متاثر ہوتے ہیں اور عقلاً اُس کی بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر دلوں میں کچھ ایسی کجی آگئی ہے کہ اُس کے بتائے ہوئے سیدھے راہ پر چلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ آخر برتھ کنٹرول ایسی خطرناک فحش و بے حیائی اور الحاد و گمراہی کی تحریک کا مقابلہ بھی اُسی کے حصہ میں آیا ہے۔

مَیں چاہتا ہوں کہ اگر قارئین پیغام حق میری امداد کریں تو اِس مضمون کو پمفلٹ کی شکل میں شائع کر کے عوام الناس تک پہنچا دوں۔

اقبال نمبر کے لیے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنا مضمون دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ موصوف نے آج تک علامہ اقبال کے متعلقہ کسی موضوع پر قلم نہیں اُٹھایا۔ مجھے اور میرے جیسے اکثر حضرات کو یہ شکایت تھی کہ آپ اس بارے میں خاموش کیوں ہیں بالخصوص اُس وقت جب کہ مرحوم کے کلام کو لوگ غیر اسلامی معنیٰ پہنانے میں مصروف ہیں اور اپنے اپنے مخصوص نظریات کے ماتحت اُن کے کلام کا مفہوم متعین کر رہے ہیں اور ایک جماعت اُن کو ایک اچھا خاصہ بُت بنانے میں مصروف کار ہے۔ الحمد للہ کہ موصوف نے میری استدعا کو شرف قبولیت بخشا ہے اور ایک مبسوط مقالہ اپنے مخصوص انداز میں تحریر فرمانے کا وعدہ کیا ہے جو خدا کے فضل و کرم سے اشاعتِ خاص میں درج کیا جاوے گا۔

محمد شاہ

اسلام اور مسلمان

(از جناب مولوی نذیر الحق میرٹھی)

رہا دین باقی نہ اسلام باقی
فقط اسلام کا رہ گیا نام باقی (اقبال)

کہا جاتا ہے کہ عیسائیوں نے عیسائیت چھوڑ کر سلطنت پائی اور اقوام عالم پر اپنی کشور کشائی و جہانبانی کا سکہ بٹھایا لیکن مسلمانوں نے اسلام اور سلطنت دونوں چیزیں ایک ساتھ پائیں، اس لیے کہ عیسائیت دراصل ایک روحانی اور صوفیانہ تعلیم کا نام ہے، یہ چیز اس کے دائرہ قیادت و رہنمائی سے باہر ہے کہ وہ ملک کے نظم و نسق، قانون سازی اور سیاسی معاملات کو بھی دینی احکام و تعلیمات کا پابند بنائے رکھے بس یہ ایک طبعی چیز تھی کہ عیسائی اپنے مذہب کو چھوڑ کر دنیا میں ترقی کریں اور دنیوی تعلیم پائے ہوئے لوگ دنیوی معاملات کو اپنے اپنے علم و تجربہ کی بنا پر چلائیں اور علمائے دین کا کام صرف دینی رہنمائی رہ جائے۔ اس کے برخلاف اسلام کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے۔ وہ ایک جامع نظریۂ حیات ہے اس کا دین اس کی دنیا سے جدا نہیں۔ بلکہ وہ انسانی زندگی کے متعلق ایک مکمل نظام کا نام ہے، اس کے عقائد، افکار، عبادت، اخلاق، تمدن، معیشت اور سیاست ہر ایک چیز مذہب ہے، اس کی رہنمائی دین و دنیا دونوں پر حاوی ہے اور دین و دنیا کی ہر

شے اس میں موجود ہے۔ پس اسلام میں اس امر کی مطلق گنجائش نہیں کہ یورپ کے ریفارمیشن کی تاریخ پڑھ کر ہر جدت پسند کو اسلام کا لوتھر بننے کا خیال دامنگیر ہو اور اس مقدس مذہب کے پیرو اصولی مسائل میں بھی انتہادرجہ کا اختلاف و تضاد رکھتے ہوئے دو گروہوں میں منقسم ہو جائیں ایک جانب قدیم تعلیمیافتہ حضرات یعنی علمائے کرام مذہبیات میں کسی تغیر و اصلاح کی گنجائش باقی نہ رکھیں اور ہر تغیر و اصلاح کی آواز سن کر "کل بدعۃ ضلالۃ" کا نعرہ لگانے لگیں اور دوسری طرف جدید خیال اور جدید تعلیم سے متاثر ہو کر ایک ایسا فرقہ پیدا ہو جائے جو جدید تمدن اور جدید تخیلات کے ساتھ سرے سے ایک نیا نظریہ مذہب ہی اختیار کر لے اور اس طرح قدامت و تجدّد کی جنگ میں مصروف ہو کر امتِ مسلمہ اپنے مذہب، اس کے اصول و مبادیات اور اپنے فرائض منصبی ہی کو بھول جائے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں نے اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اسلام کہاں گیا جس کے ساتھ ساتھ سلطنت آئی تھی، مسلمانوں کو نحوست نکبت، نفاق و نفرت، تنزل و افلاس اور تعصب و جہالت نے چاروں طرف سے کیوں گھیر لیا؟ وہ افکار و ترددات کا شکار کس لیے بن گئے؟ اور آج ان کے زوال و انحطاط کا مرثیہ کیوں پڑھا جا رہا ہے؟ اس کا جواب بالکل روشن ہے مسلمانوں کی تباہی اس وجہ سے ہوئی کہ انھوں نے اسلام کے صحیح علم و عمل کو غارت کر دیا اور روح اسلام سے ناآشنا ہو گئے۔

ہر قسم کی کامیابی دو چیزوں پہ موقوف ہے۔ ایک تو چند طے شدہ اصولوں کو دل سے تسلیم کرنا اور پھر ان کے مطابق سختی سے عمل کرنا۔ اسی چیز کو مذہب کی زبان میں ایمان و عمل کہا گیا ہے۔ اور مسلمانوں سے ان کے خدا کا اٹل وعدہ ہے کہ اگر تم اپنے اندر ایمان و عمل صالح کی حقیقی روح پیدا کر لو تو ہم تمہیں حکومت و سلطنت سے اسی طرح سرفراز کریں گے جس

طرح تم سے پہلوں کو کرتے رہے ہیں چنانچہ قرآن کریم نے ایمان و اعمال صالحہ کا گراں بہا ماحصل اور درخشندہ نتیجہ یہ قرار دیا ہے کہ انعامات اخروی کے علاوہ مسلمانوں کو اس دنیا میں ایک امتیازی زندگی اور فرقانی شان عطا ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے اسی امتیازی زندگی اور فرقانی شان کو کھو دیا۔ یعنی ایمان کا صحیح تعین اور اعمال صالحہ کی جان سپارانہ پابندی باقی نہیں رہی۔ اور غلط رسوم و رواج اور خارجی بدعات کا نام مذہب رکھ لیا گیا ہے۔ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

مسلمانوں میں مذہب اور اسلامی تعلیمات کے متعلق مہلک غلط فہمیاں عام طور پر پھیلی ہوئی ہیں جو ان کی دنیاوی اور اخروی کامیابیوں میں مُخل ہو رہی ہیں اور اس طرح وہ مقدس مذہب اسلام کی برکات سے بے بہرہ ہو گئے ہیں اس پر مزید اعتقاد و عمل کی گمراہی یہ کہ مذہب کی پابندی کے دھوکہ میں باطل توہمات، لغو اعمال اور خلافِ اسلام حرکات میں مبتلا ہو کر اپنی دنیا اور عاقبت خراب کر رہے ہیں اور سمجھے یہ بیٹھے ہیں کہ مسلمان بیدار ہو کر منظم ہو رہے ہیں۔

پس یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مذہب اسلام کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ایک انسان کو بہتر سے بہتر انسان بنا کر اس کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ کامیاب کر دے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر مذہب میں فضولیات اور لغویات کو دخل نہ ہو بلکہ سچے دل سے صرف اُن احکام کی پابندی کی جائے جو خدا کی طرف سے ہمیں ملے ہیں تو ہماری کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اگر آج ہم کامیاب نہیں ہیں تو اس کا باعث صرف یہی ہے کہ ہمارا عمل مذہب کی ہدایتوں پر نہیں ہے۔ ہم زبان سے اپنے آپ کو مذہبِ اسلام کا پابند کہتے ہیں مگر اس بات کو نہیں جانتے کہ اسلام بنیادی طور پر ہم سے کیا چاہتا ہے؟ یعنی ہمارا نصب العین اس دنیا میں کیا ہے؟ اور اس کے حاصل ہونے کے قرآنی طریقے کون سے ہیں؟ ہماری اس ناسمجھی، بدنصیبی، محرومی اور بداعمالی سے نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ مذہب ہی کو کامیابی کا دشمن سمجھا جا رہا

ہے، ہر ملک کا مسلمان اپنے دین سے بددل ہے اور تعلیمیافتہ لوگ دہریت کی جانب مائل ہوتے جا رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر آج حقیقی اسلام کہیں نظر نہیں آتا اور مسلمان اسی لیے ذلیل و ناکام ہیں تو اسکا ذمہ دار کون ہے؟ سو اسکے ذمہ دار علمار کرام بھی ہیں اور تجدد پرور مصلحین بھی اسکی ذمہ داری کچھ قدامت کی بے جا سخت گیریوں اور تنگ خیالیوں اور کچھ تجدد کی بے اعتدالیوں اور سینہ زوریوں کے سر عاید ہوتی ہے۔

مجھے معاف رکھا جائے اگر میں اس تلخ حقیقت کے بیان پر مجبور ہو جاؤں کہ اس سلسلہ میں علماء اس صورت حال کے زیادہ ذمہ دار ہیں اس لیے کہ وہ مسند رسولؐ کے جانشین ہیں اور مذہب و ملت کی حفاظت و بقا ان کا فرض منصبی۔ اُن کو چاہیئے تھا کہ وہ جہاں کہیں اور جس حال میں بھی ہوتے اسلام کو ایک دعوتِ انقلاب سمجھتے ہوئے اپنے تمام اعمال و افکار کی بنیاد خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سیرت پاک پر رکھتے، قوم کی انفرادی و اجتماعی مشکلات کا حل کتاب و سنت سے پیش کرتے، اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی ایسا صحیح، وسیع اور نتیجہ خیز نظام قائم کرتے جس سے عوام کے دل و دماغ مسلمان بن جاتے اور اسلامی تہذیب کی ترویج اور اس کے حدود کی حفاظت و نگہداشت بھی ہو جاتی۔

اسلام کو علماء کی اس لیے ضرورت تھی کہ وہ اپنی ساری قوتیں اسلام کے لیے وقف کر دیتے، اسلام کو ایک معقول و مدلل صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرتے، ان اسباب کو تلاش کرتے جنہوں نے سلطنت کو اسلام سے جدا کر دیا، غلط رسوم اور خارجی بدعات کو جن کا نام عوام نے اسلام رکھ لیا ہے مٹانے کے لیے عملی قدم اُٹھاتے، اُن اوہام و شکوک کو رفع کرتے جنہوں نے یورپ کے نقال مصلحین کو ملحد اور بے دین بنایا ہے اور سلبی اسلام والوں کے مقابلہ میں ایجابی اسلام پیش کرتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ بشریت، علم غیب، امکان کذب، قیام میلاد، فاتحہ درود اور آمین بالجہر وغیرہ خود ساختہ عقائد کی بحثوں میں اُلجھے رہے اور قوم کے خرمنِ ایمان و عقائد پر چپکے چپکے بجلیاں گرتی رہیں۔

علماء اور صوفیاء کے ایک مختصر گروہ نے ہر زمانہ میں بلاشبہ اس سلسلہ میں نہایت زرین خدمات

سرانجام دیں اور انھی کی برکت ہے کہ آج مسلمانوں میں کچھ علم دین، کچھ اتباع شریعت کا جذبہ اور مذہب سے شیفتگی پائی جاتی ہے لیکن ایک قلیل گروہ کی محدود کوششیں اس حالت میں کیسے کامیاب ہوسکتی تھیں جبکہ علماء اور صوفیاء اور امراء کی اکثریت اپنے فرائض سے غافل رہی اور آج بھی یہی نقشہ ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب مذہب سیاسی قوت سے معرّا ہو جاتا ہے تو اس کی اہمیت فلسفہ کی سی رہ جاتی ہے، وہی آج اسلام کی حالت ہے اور مسلمانوں کی اندرونی خستہ حالی اور قلبی پریشانی کی جو حالت ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اب اصلاح حال کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اسلام کو از سرِ نو ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھایا جائے، علماء کو ان کے فرائض یاد دلائے جائیں مسلمانوں کو ان کی حیثیت سے آگاہ کیا جائے، ان کو بتلایا جائے کہ ان کے لیے ہر شے ان کے مذہب میں ہے، انہیں معاشی استقلال انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق بھی اسلام ہی سے لینا چاہیے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنا نصب العین صرف اسلام کو بنا لیں اور ساری طاقت اس امر پہ صرف کریں کہ ہم صرف احکام اسلام کے مطیع و منقاد بن جائیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمارا مٹ جانا یقینی ہے۔

اسلام اور ضبط ولادت

از جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

چند سال سے ہندوستان میں ضبط ولادت (BIRTH CONTROL) کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ اس کی تائید میں نشر و اشاعت کرنے، اور لوگوں کو اس کی طرف رغبت دلانے، اور اس کے عملی طریقوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لیے انجمنیں قائم ہو چکی ہیں، اور رسالے شائع کیے جا رہے ہیں لکھنو میں عورتوں کی آل انڈیا کانفرنس نے اس کی حمایت میں قرار داد منظور کی۔ کراچی اور بمبئی کی مجالس بلدیہ میں اس کی عملی تعلیم رائج کرنے پر بحث کی گئی میسور، مدراس، اور بعض دوسرے مقامات پر خاص اسی غرض کے لیے (CLINICS) قائم کیے جا چکے ہیں۔ لندن کے برتھ کنٹرول انٹرنیشنل انفارمیشن سنٹر کی ڈائرکٹر مسز ایڈتھ ہو مارٹن (MRS. EDITH HOW MARTYN) ہندوستان میں اس تحریک کی نشر و اشاعت کے لیے دورہ کر چکی ہیں۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے کمشنر ڈاکٹر ہٹن (HUTTON) نے اپنی رپورٹ میں ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرناک ظاہر کر کے ضبط ولادت کی ترویج پر زور دیا ہے۔ ان سب کے بعد حال میں کونسل آف اسٹیٹ کے ایک مسلمان ممبر نے حکومت کو توجہ دلائی ہے کہ وہ ہندوستان میں آبادی کی افزایش کو روکنے کے لیے عملی تدابیر اختیار کرے۔ اگرچہ حکومت ہند نے اس وقت اس تجویز کو رد کر دیا ہے لیکن اندیشہ ہے کہ اگر اسی رفتار کے ساتھ ضبط ولادت کی تائید میں رائے عام کی قوت بڑھتی رہی، تو ایک دن شاردا ایکٹ کی طرح یہ مصیبت بھی ہندوستان پر

مسلط ہو جائے گی اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی جائے خصوصاً اس وجہ سے کہ حکومت کے سامنے اس تجویز کو پیش کرنے والے ایک مسلمان صاحب ہیں جنہیں قوم نے منتخب کرکے اپنی نمایندگی کے لیے کونسل آف اسٹیٹ میں بھیجا ہے اور ان صاحب نے اپنی تقریر میں حکومت کو یقین دلایا ہے کہ "کوئی مذہب ضبط ولادت کی راہ میں مانع نہیں ہے"۔ اس کے بعد اگر اسلامی قوانین کا علم رکھنے والے خاموش رہیں تو عام طور پر یہ گمان کر لیا جائے گا کہ اسلام ضبط ولادت کی تحریک کا حامی ہے، یا کم از کم اس کو جائز رکھتا ہے۔

قبل اس کے کہ اس مسئلہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی جائے، یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ضبط ولادت کی تحریک کیا ہے؟ کس طرح شروع ہوئی؟ کن اسباب سے اس نے ترقی کی؟ اور جن ممالک میں اس نے رواج پایا وہاں اس کے کیا نتائج رونما ہوئے؟ جب تک یہ مقدمات اچھی طرح ذہن نشین نہ ہو جائیں گے، شرعِ اسلام کا فتویٰ ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہ آئے گا، نہ دل اس پر مطمئن ہو سکیں گے۔

تحریک ضبط ولادت کا مقصد | ضبط ولادت کا اصل مقصد نسل کی افزائش کو روکنا ہے۔ قدیم زمانے میں اس کے لیے اسقاط حمل، قتل اولاد، اور بر ہم چریہ (ضبط نفس، خواہ وہ تجرد کی شکل میں ہو یا تاہل کے باوجود مقاربت سے پرہیز کی شکل میں) کے طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ آج کل موخر الذکر دونوں طریقوں کو ترک کر دیا گیا ہے، اور ان کے بجائے یہ طریقہ ایجاد ہوا ہے کہ مقاربت تو کی جائے، مگر دواؤں یا آلات کے ذریعہ سے استقرارِ حمل کو روک دیا جائے۔ اسقاط حمل کا طریقہ بھی کثرت کے ساتھ یورپ اور امریکہ میں رائج ہے لیکن برتھ کنٹرول کی تحریک صرف مانع حمل تدابیر پر زور دیتی ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ان تدابیر کا علم اس قدر عام کر دیا جائے، اور ان کے ذرائع اس کثرت کے ساتھ فراہم کیے جائیں کہ ہر بالغ مرد و عورت ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

تحریک کی ابتدا | یورپ میں اس تحریک کی ابتدا اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوئی۔ اس کا پہلا محرک غالباً انگلستان کا مشہور ماہر معاشیات، مالتھوس (MALTHUS) تھا۔ اس کے عہد میں انگریزی

قوم کی روز افزوں خوشحالی کے سبب سے انگلستان کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھنی شروع ہوئی۔ آبادی کی اس توفیر کو دیکھ کر اس نے حساب لگایا کہ زمین پر قابل سکونت جگہ محدود ہے، اور اسی طرح معیشت کے وسائل بھی محدود ہیں لیکن نسل کی افزائش غیر محدود ہے۔ اگر نسل اپنی فطری رفتار کے ساتھ بڑھتی رہے تو زمین اس کے لیے تنگ ہو جائے گی وسائل معاش کفایت نہ کر سکیں گے، اور افزائش نسل کے ساتھ معیار زندگی پست ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا نسل انسانی کی خوشحالی آسائش اور فلاح وبہبود کے لیے ضروری ہے کہ اس کی افزائش، وسائل معاش کی وسعت کے ساتھ متناسب رہے اور اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ اس غرض کے لیے اس نے برہم چرج کے قدیم طریقے کو رائج کرنے کا مشورہ دیا۔ یعنی بڑی عمر میں شادی کی جائے۔ اور تأھل کی زندگی میں ضبط نفس سے کام لیا جائے۔ یہ خیالات پہلی مرتبہ ۱۷۹۸ء میں اس نے اپنے ایک رسالہ (AN ESSAY ON POPULATION AS IT EFFECTS THE FUTURE IMPROVEMENT OF SOCIETY میں پیش کیے تھے۔

اس کے بعد فرانسس پلاس (FRANCIS PLACE) نے فرانس میں افزائش نسل کو روکنے کی ضرورت پر زور دیا۔ مگر اس نے اخلاقی ذرائع کو چھوڑ کر دواؤں اور آلات کے ذریعہ سے منع حمل کی تجویز پیش کی۔ اس رائے کی تائید میں امریکہ کے ایک مشہور ڈاکٹر چارلس نولٹن (CHARLES KNOWLTON) نے ۱۸۳۳ء میں کی۔ اس کی کتاب ثمرات فلسفہ (THE FRUITS OF PHILOSOPHY) غالباً پہلی کتاب ہے جس میں منع حمل کے طبی طریقوں کی تشریح کی گئی تھی، اور ان کے فوائد پر زور دیا گیا تھا۔

ابتدائی تحریک کی ناکامی اور اس کا سبب | ابتدا میں اہل مغرب نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس لیے کہ نظریہ اصلاً غلط تھا۔ مالتھوس حساب لگا کہ یہ تو دیکھ سکتا تھا کہ آبادی کس رفتار سے بڑھتی ہے۔

لیکن اس کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وسائل معاش کس رفتار سے بڑھتے ہیں، اور زمین میں قدرت کے کتنے خزانے پوشیدہ ہیں جو علم کی ترقی، عقل کی کارفرمائی اور عمل کی قوت سے نکلتے چلے آتے ہیں اور انسان کے وسائل معاش میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کا تصور معاشی ترقی کے ان امکانات تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا جو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے، اور اس کے بعد قوت سے فعل میں آئے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر تک یورپ کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھتی رہی، یہاں تک کہ ۵۰ سال کے اندر قریب قریب دوگنی ہوگئی خصوصاً انگلستان کی آبادی میں تو حیرت انگیز اضافہ ہوا جس کی مثال نسل انسانی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ۱۸۰۱ء میں اس ملک کی آبادی ۱۲ ملین تھی۔ ۱۸۹۱ء میں ۳۲ ملین تک پہنچ گئی لیکن اس اضافہ کے ساتھ ساتھ معاشی وسائل میں بھی زبردست ترقی ہوئی صنعت و تجارت میں یہ ممالک تمام دنیا کے اجارہ دار ہوگئے ان کی زندگی کا انحصار خود اپنی زمین کی پیداوار پہ نہ رہا بلکہ وہ اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں دوسرے ممالک سے سامان غذا حاصل کرنے لگے، اور نسل کی زبردست افزائش کے باوجود ان کو کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ زمین ان کی بڑھتی ہوئی نسلوں کے لیے تنگ ہوگئی ہے، یا قدرت کے خزانے ان کی افزائش نسل کا ساتھ دینے سے انکار کر رہے ہیں۔

جدید تحریک | انیسویں صدی کے ربع آخر میں ایک نئی تحریک اٹھی جو نو مالتھوسی تحریک (NEO-MALTHUSIAN MOVEMENT) کہلاتی ہے۔ ۱۸۷۶ء میں مسز اینی بیسنٹ اور چارلیس بریڈلا نے ڈاکٹر نولٹن کی کتاب "ثمرات فلسفہ" کو انگلستان میں شائع کیا۔ حکومت نے اس پہ مقدمہ چلادیا، اور مقدمہ کی شہرت نے عوام کو اس تحریک کی طرف متوجہ کردیا۔ ۱۸۷۷ء میں ڈاکٹر ڈریسڈیل (DRYSDALE) کے زیر صدارت ایک انجمن قائم ہوگئی جس نے ضبط ولادت کی تائید میں نشر و اشاعت شروع کردی۔ اس کے دو سال بعد مسز بیسنٹ کی کتاب قانون آبادی (LAW OF POPULATION) شائع ہوئی جس کے ایک لاکھ پچھتر ہزار نسخے پہلے ہی

سال فروخت ہو گئے۔ ۱۸۸۰ء میں یہ تحریک ہالینڈ، بلجیم، فرانس اور جرمنی میں پہنچی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ یورپ اور امریکہ کے تمام متمدن ممالک میں پھیل گئی۔ باقاعدہ انجمنیں قائم ہوئیں جنہوں نے تحریر و تقریر کے ذریعہ سے لوگوں کو ضبط ولادت کے فوائد اور اس کے عملی طریقوں سے آگاہ کیا، اس کو اخلاقی نقطۂ نظر سے جائز بلکہ مستحسن، اور معاشی نقطۂ نظر سے مفید بلکہ قطعاً ناگزیر بتایا گیا اس کے لیے دوائیں ایجاد کی گئیں آلات بنائے گئے عام لوگوں کی دست رس تک ان چیزوں کو پہنچانے کا انتظام کیا گیا اور جگہ جگہ (BIRTH CONTROL CLINICS) قائم کیئے گئے جہاں عورتوں اور مردوں کو ضبط ولادت کے لیے ماہرانہ مشورے دیے جانے لگے۔ اس طرح اس نئی تحریک نے بہت جلدی فروغ پالیا، اور اب روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

ترقی کے اسباب دور جدید میں اس تحریک کے پھیلنے کی اصلی وجہ وہ نہیں ہے جس کی بناء پر ابتدا میں مالتھوس نے افزائش نسل کو روکنے کا مشورہ دیا تھا۔ بلکہ دراصل یہ نتیجہ ہے مغرب کے جدید صنعتی انقلاب (INDUSTRIAL REVOLUTION) اور سرمایہ دارانہ نظام، اور مادہ پرست تہذیب اور نفس پرست تمدن کا۔ آئیے اب ہم ان اسباب میں سے ایک ایک پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ اس نے مغربی قوموں کو کس طرح ضبط ولادت پر مجبور کیا۔

۱۔ **انقلاب صنعتی** یورپ میں جب مشین ایجاد ہوئی، اور مشترک سرمائے سے بڑے بڑے کارخانے قائم کرکے کثیر پیدآوری (MASS-PRODUCTION) کا سلسلہ شروع ہوا تو دیہات کی آبادیاں کھیتی باڑی کو چھوڑ کر کارخانوں میں کام کرنے کے لیے شہروں کی طرف آنے لگیں، یہاں تک کہ دیہات اُجڑ گئے اور بڑے بڑے عظیم الشان شہر وجود میں آئے، جہاں لکھوکھا آدمی ایک محدود جگہ میں مجتمع ہو گئے۔ اس چیز نے ابتدا میں یورپ کی خوشحالی کو خوب بڑھایا لیکن بعد میں اس نے بے شمار معاشی مشکلات پیدا کر دیں۔ زندگی کے لیے جدوجہد بڑھ گئی۔ مقابلہ سخت ہو گیا۔ معاشرت

کا معیار بلند ہوا۔ ضروریات زندگی نے وسعت اختیار کی اور ان کی قیمتیں اتنی بڑھ گئیں کہ محدود آمدنی رکھنے والوں کے لیے اپنی خواہشات کے مطابق اپنی معاشرت کے بلند مرتبے کو قائم رکھنا مشکل ہوگیا۔ مکانات میں جگہ کم اور کرائے زیادہ ہوگئے کمانے والوں کے لیے کھانے والوں کا وجود دوبھر ہونے لگا۔ باپوں کے لیے اولاد اور شوہروں کے لیے بیویوں تک کی پرورش ناقابل برداشت بار بن گئی۔ اور ہر شخص مجبور رہا کہ اپنی آمدنی کو صرف اپنی ذات پر خرچ کرے، اور دوسرے حصہ داروں کی تعداد جہاں تک ممکن ہو گھٹادے۔

۲۔ عورتوں کا معاشی استقلال | ان حالات میں عورتوں کو مجبوراً اپنی آپ کفالت کرنا اور خاندان کے کمانے والے افراد میں شامل ہونا پڑا۔ معاشرت کی قدیم اور فطری تقسیم عمل جس کی رُو سے مرد کا کام کمانا اور عورت کا کام گھر کا انتظام کرنا ہے، باطل ہوگئی۔ عورتیں کارخانوں اور دفتروں میں خدمت کرنے کے لیے پہنچ گئیں، اور جب کسب معیشت کا بار ان کو سنبھالنا پڑا، تو اُن کے لیے ناممکن ہوگیا کہ افزائش نسل اور پرورش اطفال کی اُس خدمت کو بھی اس کے ساتھ ساتھ ادا کرسکیں جو فطرت نے ان کے سپرد کی تھی۔ ایک عورت جس کو اپنی ضروریات فراہم کرنے، یا گھر کے مشترک بجٹ میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے روزانہ کام کرنا ضروری ہے، کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس حالت میں بچے بھی پیدا کرے۔ زمانہ حمل کی تکالیف اکثر عورتوں کو اس قابل نہیں رکھتیں کہ وہ گھر کے باہر کچھ زیادہ جسمانی یا دماغی محنت کرسکیں، خصوصاً حمل کے آخری زمانے میں تو ان کے لیے بیکار رہنا ضروری ہے۔ پھر وضع حمل اور اس کے بعد کچھ مدت تک بھی وہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوسکتیں اس کے بعد بچے کو دودھ پلانا اور کم از کم تین چار سال تک اس کی نگرانی، حفاظت اور تربیت کرنا ایسے حالات میں کسی طرح ممکن نہیں۔ نہ تو ماں اپنے شیرخوار بچے کو دفتر یا کارخانے میں لے جاسکتی ہے۔ نہ اپنی قلیل معاش میں اتنی گنجایش نکال سکتی ہے کہ بچہ کی نگہداشت کے لیے نوکر رکھ لے۔ اور اگر وہ اپنے ان

فطری وظائف کو انجام دینے کے لیے ایک کافی عرصہ تک بیکار رہے تو بھوکی مر جائے، یا شوہر کے لیے ناقابل برداشت بار بن جائے اس کے علاوہ جس کی وہ ملازم ہے، وہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ بار بار کئی کئی مہینے کے لیے رخصت لیتی رہے۔ غرض ان اسباب سے عورت اپنی فطری خدمت سے اعراض کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور پیٹ کی ضروریات اس کے ان زبردست جذبات کو سرد کر دیتی ہیں جو فطرت نے بچوں کے لیے اس کے سینے میں ودیعت کیے ہیں۔

۳۔ جدید تہذیب و تمدن | جدید تہذیب و تمدن نے بھی ایسے اسباب فراہم کر دیے ہیں۔ جو افزائش نسل سے عام نفرت پیدا کرنے والے ہیں۔

مادہ پرستی نے لوگوں میں انتہا درجے کی خود غرضی پیدا کر دی ہے ہر شخص اپنی آسائش کے لیے زیادہ سے زیادہ اسباب فراہم کرنا چاہتا ہے اور پسند نہیں کرتا کہ اس کے رزق میں کوئی دوسرا حصہ لے خواہ وہ اس کا باپ بھائی بہن، بیوی، حتیٰ کہ اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

دولت مندوں نے نفس پرستی کے لیے عیش و عشرت کے بے شمار طریقے اور سامان ایجاد کر دیے ہیں جن کو دیکھ دیکھ کر اوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی ان کی ریس کرنا چاہتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے اسباب عیش لوگوں کے لیے لوازم حیات بن گئے ہیں اور لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان چیزوں کے بغیر وہ کسی طرح جی ہی نہیں سکتے اس چیز نے معاشرت کے معیار کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ ایک قلیل المعاش آدمی کے لیے خود اپنے نفس کے بھی تمام مطالبات کو پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے، کجا کہ وہ بیوی اور اولاد کی ضروریات کا بھی کفیل ہو سکے۔

عورتوں میں تعلیم، آزادی، اور مردوں کے ساتھ آزادانہ اختلاط نے ایک نئی ذہنیت پیدا کر دی ہے جو فطری وظائف سے ان کو روز بروز منحرف کرتی چلی جا رہی ہے وہ گھر کی خدمت اور بچوں کی پرورش کو ایک گھناؤنا کام سمجھتی اور اس سے جی چراتی ہیں۔ ان کو دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی ہے مگر نہیں

ہے تو گھر اور اس کے کام کاج - اور بچوں کی نگہداشت سے - بیرون خانہ کے لطف چھوڑ کر اندرون خانہ کی کلفتیں برداشت کرنا وہ حماقت سمجھنے لگی ہیں - مردوں کے لیے جاذب نظر بننے کے لیے وہ لاغر اندام، نرم و نازک، حسین اور جوان بننا چاہتی ہیں - ان اغراض کے لیے وہ زہریلی دوائیں تک کھا کر جان دے سکتی ہیں[1] مگر بچے جن کر صحت خراب کرنا پسند نہیں کرتیں - کروڑہا روپیہ اپنے بناؤ سنگھار اور اپنے لباس پر خرچ کر سکتی ہیں، مگر بچوں کی پرورش کے لیے ان کے بجٹ میں گنجائش نہیں نکلتی -

تہذیب و تمدن نے انتہا درجہ کی نفس پرستی پیدا کر دی ہے - لوگ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کریں مگر اس لذت کے ساتھ جو نتائج اور ذمہ داریاں فطرت نے مقرر کی ہیں ان سے بچے رہیں زمانہ حمل اور اس کے بعد بچوں کی پرورش سے اپنے عیش کو کرکرا کرنا انہیں ناگوار ہوتا ہے -

بچوں کی تعلیم و تربیت اور آیندہ زندگی میں ان کے لیے کامیابی کے مواقع پیدا کرنے کی خاطر بہت سے لوگ (خصوصاً متوسط طبقے والے) ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک دو بچوں سے زیادہ پیدا نہ کریں - ان کے معیار اور تخیلات اتنے بلند ہو گئے ہیں کہ ان کے وسائل معاش ان تخیلات کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور ایسے بلند تخیلات کے مطابق زیادہ بچوں کو پرورش کرنا، تعلیم دلوانا، اور زندگی میں ایک اچھے آغاز (START) کے مواقع بہم پہنچانا ان کے لیے محال ہے - اس کے ساتھ تمدن نے ذرائع تعلیم و تربیت کو نہایت گراں قیمت بھی کر دیا ہے -

دہریت نے لوگوں کے دلوں سے خدا کا خیال ہی مٹا دیا ہے، کجا کہ وہ اس پر بھروسہ کریں، اور اس کی رزاقی پر اعتماد رکھیں - وہ صرف اپنے موجودہ ذرائع ہی پر نظر رکھتے ہیں، اور خود اپنے آپ کو اپنا اور اپنی اولاد کا رازق سمجھتے ہیں -

---

[1] ابھی حال میں نیویارک کے سلیتھ کمشنر نے ایک تنبیہ شائع کی تھی کہ عورتیں لاغر اندام بننے کے لیے ایک دوا کثرت سے استعمال کر رہی ہیں جس کا نام (DINITROPHENOL) ہے - تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ دوا سخت زہریلی ہے اور اب تک بہت سی عورتیں اس کی بدولت سے مر چکی ہیں -

یہ اسباب ہیں جن سے مغربی ممالک میں ضبط ولادت کی تحریک کو اس قدر تیزی اور وسعت کے ساتھ فروغ حاصل ہوا۔ اگر آپ ان اسباب پر غور کی نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ اہل مغرب نے پہلے خود ہی ایک غلطی کی کہ اپنے تمدن، معاشرت اور معیشت کو سرمایہ داری، مادیت، اور نفس پرستی کی غلط بنیادوں پر تعمیر کیا اور جب یہ تعمیر اپنے کمال کو پہنچ کر اپنے بُرے نتائج ظاہر کرنے لگی تو پھر انھوں نے دوسری حماقت یہ کی کہ اس ظاہر فریب نظام معیشت و معاشرت، اور طرز تہذیب و تمدن کو علی حالہ برقرار رکھ کر اس کے بُرے ثمرات سے بچنے کی کوشش کی۔ اگر وہ عقلمند ہوتے تو ان اصلی خرابیوں کو تلاش کرتے جن کی بدولت زندگی میں ان کے لیے یہ دشواریاں پیدا ہوئی ہیں، اور ان کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے۔ لیکن انھوں نے اصلی خرابیوں کو سمجھا ہی نہیں، اور اگر سمجھا بھی تو یہ ظاہر فریب تہذیب و معاشرت ان کے لیے اس قدر خوشنما ہو چکی تھی کہ انھوں نے اس کو کسی صالح تر نظام حیات سے بدلنا پسند نہ کیا۔ برعکس اس کے انھوں نے چاہا کہ اس تہذیب و تمدن اور اس نظام معیشت و معاشرت کو قائم رکھ کر اپنی زندگی کی دشواریوں کو دوسرے طریقوں سے حل کریں۔ اس تلاش و تجسس میں ان کو سب سے زیادہ آسان طریقہ یہی نظر آیا کہ اپنی نسلوں کو بڑھنے سے روک دیں تاکہ ان کو اپنے وسائل معاش اور اسباب عیش سے بلا شرکت غیرے لطف اٹھانے کا موقع مل جائے، اور آیندہ نسلیں ان کے ساتھ حصہ بٹانے، اور ان کی زندگی کو غیر مفید اور بے لطف ذمہ داریوں سے گرانبار کرنے کے لیے پیدا ہی نہ ہوں۔

نتائج | اب ایک نظر اس تحریک کے اُن نتائج پر بھی ڈال لیجیے جو گذشتہ ۶۰ سال کے عملی تجربہ سے ظاہر ہوئے ہیں۔ ۶۰ سال کی مدت ایک ایسی تحریک کے حسن و قبح کا اندازہ کرنے کے لیے بالکل کافی ہے، جس کو مختلف ملکوں اور قوموں میں اس قدر کثرت کے ساتھ اشاعت نصیب ہوئی ہو، اور جس کے نتائج کی بار بار تحقیق کی جا چکی ہو۔

طبقات کا عدم توازن | برتھ کنٹرول کرنے والے ممالک میں سے انگلستان کو ایک نمونے کے ملک کی

حیثیت سے لیجیے کیونکہ ہمارے پاس دوسرے ممالک کی بہ نسبت اس کے متعلق زیادہ ذرائع معلومات ہیں، اور حالات کے اعتبار سے انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے انگلستان کے رجسٹرار جنرل کی رپورٹوں اور نیشنل برتھ ریٹ کمیشن کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ برتھ کنٹرول کا رواج سب سے زیادہ اعلیٰ اور اوسط طبقہ میں ہے۔ زیادہ تر اچھی تنخواہیں پانے والے کارکن، اعلیٰ تعلیم یافتہ کاروباری لوگ، متوسط طبقہ کے ذی حیثیت لوگ، اور دولت مند امرا، تجار اور کارخانہ دار اس تحریک پر عامل ہیں۔ رہے ادنیٰ طبقوں کے مزدور اور کام پیشہ، تو ان میں برتھ کنٹرول کا رواج بمنزلۂ صفر ہے۔ نہ ان کے معیار زندگی زیادہ بلند ہوئے ہیں، نہ ان کے دلوں میں اونچے حوصلے ہیں، نہ ان میں دولت مندوں کی شان دار معاشرت اختیار کرنے کی ہوس ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے ہاں ابھی تک وہی قدیم دستور جاری ہے کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے۔ یہی وجہ ہے کہ معاش کی قلت، وسائل زندگی کی گرانی، اور مکانات کی تنگی کے باوجود وہ ضبط ولادت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان میں شرح پیدائش چالیس فی ہزار کے قریب ہے، اور اس کے برعکس اعلیٰ اور اوسط طبقوں میں شرح پیدائش اتنی کم ہو گئی ہے کہ انگلستان کی مجموعی شرح پیدائش صرف ۱۶ فی ہزار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی سوسائٹی میں ادنیٰ طبقے بڑھ رہے ہیں، اور ان لوگوں کی تعداد روز بروز گھٹتی چلی جا رہی ہے جو عقلی و ذہنی مرتبے کے لحاظ سے بلند درجہ رکھتے ہیں، اور جن میں کارفرمائی و رہنمائی کی صلاحیت ہے۔ یہ چیز آخرکار انگریزی قوم کے زوال کی موجب ہو گی۔ اس لیے کہ اس کا لازمی نتیجہ قحط الرجال ہے، اور قحط الرجال کے بعد کوئی قوم دنیا میں سربلند نہیں رہ سکتی۔

زنا اور امراض خبیثہ کی کثرت | ضبط ولادت سے زنا اور امراض خبیثہ کو بڑا فروغ نصیب ہوا ہے۔ عورتوں کو دو چیزیں اخلاق کے بلند معیار پر قائم رکھتی ہیں۔ ایک ان کی فطری حیا۔ دوسرے یہ خوف کہ حرامی بچہ کی پیدائش ان کو سوسائٹی میں ذلیل کر دے گی۔ ان میں سے پہلی روک کو تو جدید تہذیب نے بڑی حد تک دور کر دیا۔ رقص و سرود، سینما، نائٹ کلبس، اور شراب نوشی کی محفلوں میں مردوں کے ساتھ آزادانہ شرکت کے بعد حیا کہاں

باقی رہ سکتی ہے۔ رہا حرامی اولاد کی پیدائش کا خوف، تو ضبط ولادت کے رواج عام نے اس کو بھی باقی نہ رکھا۔ اب عورتوں اور مردوں کو زنا کا عام لائسنس مل گیا ہے، اور زنا کی کثرت کے ساتھ امراض خبیثہ کا ہونا ضروری ہے،

طلاق کی کثرت ضبط ولادت بھی ان اسباب میں سے ہے جنہوں نے مغربی ممالک میں ازدواجی تعلقات کی بندشوں کو کمزور کر دیا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان زوجی تعلق کو مضبوط کرنے میں اولاد کا بہت بڑا حصہ ہے جب اولاد نہ ہوگی تو زوجین کے لیے ایک دوسرے کو چھوڑ دینا بہت آسان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں طلاق کا رواج نہایت کثرت کے ساتھ پھیل رہا ہے، اور طلاق حاصل کرنے والوں میں بڑی اکثریت ان جوڑوں کی پائی جاتی ہے جو بے اولاد ہیں۔ حال کا واقعہ ہے کہ لندن کی عدالت طلاق میں ڈیڑھ منٹ کے اندر ۱۱۱ نکاح فسخ کرائے گئے اور بلا استثناء وہ سب کے سب ایسے جوڑے تھے جن کے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی۔

شرح پیدائش کی کمی سب سے زیادہ اہم نتیجہ یہ ہے کہ جتنی قومیں اس وقت ضبط ولادت پر عمل کر رہی ہیں ان سب کی شرح پیدائش خوفناک حد تک کم ہوگئی ہے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس تحریک کی اشاعت ۱۸۷۶ء سے شروع ہوئی ہے۔ ذیل کے نقشے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت مختلف ممالک کی فی ہزار شرح پیدائش کیا تھی اور اس کے بعد سے کس طرح گھٹتی چلی گئی۔

	انگلستان و ویلز	بلجیم	ڈنمارک	فرانس	جرمنی	اٹلی	ہالینڈ	ناروے	سویڈن	سوئٹزرلینڈ
سنہ ۱۸۷۶ء	۳۶٫۳	۳۳٫۲	۳۲٫۶	۲۶٫۲	۴۰٫۹	۳۹٫۲	۳۷٫۱	۳۱٫۸	۳۰٫۸	۳۳٫۰
سنہ ۱۹۰۱ء	۲۸٫۵	۲۹٫۴	۲۹٫۷	۲۲٫۰	۳۵٫۷	۳۲٫۶	۳۲٫۳	۲۹٫۶	۲۷٫۰	۲۹٫۰
سنہ ۱۹۱۳ء	۲۳٫۱	۲۲٫۶	۲۵٫۶	۱۹٫۰	۲۷٫۵	۳۱٫۷	۲۸٫۳	۲۵٫۲	۲۳٫۱	۲۳٫۱
سنہ ۱۹۲۶ء	۱۷٫۸	۱۸٫۹	۲۱٫۰	۱۸٫۸	۲۰٫۷	۲۷٫۸	۲۳٫۸	۱۹٫۷	۱۶٫۹	۱۸٫۲

یہ نقشہ ضبط ولادت کے نتائج صاف ظاہر کر رہا ہے۔ اس تحریک کے آغاز کی تاریخ سے تمام ممالک میں بلا استثناء شرح پیدائش کا کم ہونا اور برابر کم ہوتا چلا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ضبط ولادت اس کی تنہا وجہ نہیں تو ایک بہت بڑی وجہ ضرور ہے خود انگلستان کے رجسٹرار جنرل نے تسلیم کیا ہے کہ شرح پیدائش کے کم ہونے کی ۷۰ فی صدی ذمہ داری برتھ کنٹرول کے رواج پر ہے۔ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ مغربی ممالک کی شرح پیدائش کو گھٹانے میں ضبط ولادت کے مصنوعی ذرائع کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔

اس سے زیادہ واضح طور پر ضبط ولادت کے نتائج معلوم کرنے کے لیے ان ممالک کی شرح مناکحت اور شرح پیدائش کا مقابلہ کیجیے۔ انگلستان میں ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۱ء تک شرح مناکحت میں ۶ر۳ فیصدی کی کمی واقع ہوئی لیکن شرح پیدائش ۵ر۱۲ فی صدی کم ہوگئی۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۳ء تک شرح مناکحت بدستور قائم رہی مگر شرح پیدائش میں ۵ر۱۶ فی صدی کمی واقع ہوئی۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۶ء تک شرح مناکحت ۱۰ فی صدی اور شرح پیدائش ۲۵ فی صدی کم ہوئی۔ یہی حال تمام یورپ کا رہا ہے ۱۸۷۶ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان مختلف ممالک میں شرح مناکحت اور شرح پیدائش کا جو تناسب پایا گیا ہے، اس کا حال ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا۔

	شرح مناکحت فی صدی		شرح پیدائش فی صدی	
فرانس	۷ر۶	اضافہ	۲۸ر۲	کمی
جرمنی	۹ر۴	کمی	۴۹ر۴	〃
اٹلی	۹ر۸	〃	۲۹ر۱	〃
ہالینڈ	۱۰ر۳	〃	۳۵ر۶	〃
سویڈن	۱۱ر۳	〃	۴۵ر۱	〃

	شرح مناکحت فی صدی		شرح پیدائش فی صدی	
ڈنمارک	۱۲ ۔ ۳	کمی	۳۵ ۔ ۶	کمی
سوئٹزرلینڈ	۱۲ ۔ ۹	"	۴۴ ۔ ۸	"
انگلستان اور ویلز	۱۳ ۔ ۳	"	۵۱ ۔ ۰	"
ناروے	۲۶ ۔ ۰	"	۳۸ ۔ ۰	"

اسی روش پر امریکہ بھی جا رہا ہے۔ وہاں ۵۰ سال کے اندر شرح پیدائش ۴۰ فی ہزار سے گھٹ کر ۲۱ فی ہزار رہ گئی اور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک شرح مناکحت میں ۱۱ فی صدی کی کمی واقع ہوئی، مگر شرح پیدائش اس مدت میں ۱۱ فی صدی کم ہوئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ضبط ولادت پر عمل کرنے والے ممالک میں عورت اور مرد کے زوجی تعلقات روز بروز کس قدر بے نتیجہ ہوتے جا رہے ہیں شادیوں میں جتنی کمی ہو رہی ہے۔ اس سے زیادہ کمی پیدائش میں ہو رہی ہے۔

شرح پیدائش کی اس روز افزوں کمی کے باوجود ان ممالک کی آبادی میں جو تھوڑا بہت اضافہ ہو رہا ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فن طب کی ترقی اور حفظان صحت کی وسیع تدابیر نے شرح اموات کو بھی بڑی حد تک گھٹا دیا ہے لیکن اب شرح اموات اور شرح پیدائش میں تھوڑا ہی سا فرق رہ گیا ہے، اور عام طور پر خوف کیا جا رہا ہے کہ عنقریب شرح پیدائش، شرح اموات سے کم ہو جائیگی جس کے معنی یہ ہیں کہ ان قوموں میں جتنے آدمی پیدا ہوں گے ان سے زیادہ مر جائیں گے۔ انگلستان میں ۱۹۳۳ء کے ربع اول میں پیدائش کی تعداد ۱۴۰۸۶،۵ تھی اور اموات کی تعداد ۱،۰۰۰۲۔ گویا تین مہینے کے اندر آبادی میں ۲۱ ہزار سے زیادہ کی کمی واقع ہوئی۔ ۱۹۳۲ء کے اسی زمانہ کی بہ نسبت پیدائش میں ساڑھے تین ہزار کی کمی ہوئی اور اموات میں ساڑھے ۱۰ ہزار کا اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۳۳ء کے ربع دوم میں پیدائش کی تعداد اموات سے زیادہ تھی مگر آبادی کا اضافہ معمول سے کم رہا۔ اٹلی میں ۱۹۲۴ء کی بہ نسبت ۱۹۳۲ء میں

ایک لاکھ ۲۲ ہزار بچے کم پیدا ہوئے۔ مگر اس مدت میں اموات کی کمی صرف ۵۵ ہزار تھی۔ سب سے زیادہ خطرناک حالت فرانس کی ہے جہاں انیسویں صدی کے آغاز سے شرح پیدائش برابر گھٹتی چلی جا رہی ہے[1]۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں شرح پیدائش ۲۲۳ تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ۲۲۱ ہوگئی، اور اب ۱۸ فی ہزار ہے۔ لیکن شرح اموات کی تقلیل شرح پیدائش کی تقلیل کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں فرانس کے ۹۰ اقطاع (DEPARTRMENTS) میں سے بارہ ایسے تھے جن میں شرح پیدائش شرح اموات سے زیادہ تھی۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں صرف چھ اقطاع ایسے رہ گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے ۶ حصے آبادی میں تھوڑا سا اضافہ کر رہے ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں ۸۴ حصے ایسے ہیں جہاں پیدائش کی بہ نسبت اموات کی تعداد زیادہ ہے۔

توفیر آبادی کی کوششیں | ان حالات نے تمام یورپ کے دوراندیش مدبرین میں اضطراب پیدا کر دیا ہے مختصراً ہم بیان کریں گے کہ مختلف ممالک میں شرح پیدائش کی اس کمی کو کس نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

انگلستان | سنہ ۱۹۱۶ء میں ایک نیشنل برتھ ریٹ کمیشن مقرر کیا گیا جس میں طب، معاشیات، سائنس عددیات (STATISTICS)، تعلیم، اور دینیات کے ۳۴ ماہرین شریک کیے گئے۔ حکومت کی جانب سے ڈاکٹر اسٹیونسن (STEVENSON) مہتمم عددیات، اور سر آرتھر نیوز ہوم (NEWS HOIME) پرنسپل میڈیکل آفیسر اس میں شریک ہوئے۔ اس کمیشن کی طرف سے اب تک متعدد رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک رپورٹ میں لکھا گیا ہے کہ:-

"برطانیہ کو اپنی شرح پیدائش کی روز افزوں کمی پر نہایت درجہ تشویش کی نظر کرنی چاہیے، اور اس کمی کو روکنے اور حتی الوسع زیادتی کی طرف لے جانے کے لیے ایسی عملی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، جو اس کے امکان میں ہوں۔"

---

[1] فرانس میں ضبط ولادت کا رواج انیسویں صدی کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ وہاں فرانسس پلاس اس رواج کا بانی ہے، جیسا کہ ابتدائے مضمون میں بیان کیا جا چکا ہے۔

سر جارج نیومن جو انگلستان کی وزارت صحت کے چیف میڈیکل آفیسر ہیں، شرح پیدائش کی کمی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اگر اس کمی کو نہ روکا گیا تو برطانیہ ایک چوتھے درجہ کی طاقت ہو جائے گی"

سر ولیم بیورج (BEVERIDGE) لندن اسکول آف اکنامکس کے ڈائرکٹر نے حال ہیں اپنی ایک نشر صوتی تقریر میں کہا کہ اموات اور پیدائش کا تناسب اگر اسی رفتار سے بگڑتا رہا تو آئندہ دس سال میں انگلستان کی آبادی گھٹنی شروع ہو جائے گی اور ۳۰ سال کے اندر ۲۰ لاکھ کی کمی واقع ہوگی۔ قریب قریب یہی رائے لورپول یونیورسٹی کے پروفیسر کار سانڈرس کی ہے ۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لیے ضبط ولادت کے خلاف تحریک شروع ہوگئی ہے۔ اور جمعیت حیات قومی (LEAGUE OF NATIONAL LIFE) کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی ہے جس میں ممتاز مرد اور خواتین شریک ہیں ۔

فرانس | حکومت کو اس خطرے کا احساس ہو گیا ہے کہ شرح پیدائش کا زوال فرانسیسی قوم کا زوال ہے ۔ فرانس کے اہل بصیرت محسوس کر رہے ہیں کہ اگر اسی رفتار سے ان کی آبادی گھٹتی رہی تو ایک روز فرانسیسی قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔ مردم شماری کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۱ء کے مقابلہ میں ۱۹۲۱ء میں فرانس کی آبادی ۲۱ لاکھ کم ہوگئی ۔ ۱۹۲۶ء میں ۱۵ لاکھ کا اضافہ ہوا لیکن وہ زیادہ تر غیر ملکی لوگوں کی درآمد کا نتیجہ تھا۔ فرانس میں اجنبی قوموں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے یہاں تک کہ آبادی کا ۷ء ۲ فی صدی حصہ اجنبی ہے ۔ یہ فرانسیسی قوم کے لیے اور بھی زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ قوم پرستی کے موجودہ دور میں اجنبی آبادی کا بڑھنا اور وطنی آبادی کا گھٹنا قومی زندگی کے لیے تباہی کا پیش خیمہ ہے فرانس میں ایک زبردست تحریک (NATIONAL ALLIANCE FOR THE INCREASE OF POPULATION) کے نام سے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے شروع ہوگئی ہے۔ حکومت نے ضبط ولادت کی تعلیم اور

نشر و اشاعت کو قانوناً ممنوع قرار دیا ہے۔ آبادی بڑھانے کے لیے تقریباً ایک درجن قوانین نافذ کیے گئے ہیں جن کی رو سے زیادہ بچے پیدا کرنے والے خاندانوں کو مالی امداد دی جاتی ہے ٹیکس میں کمی کی جاتی ہے، تنخواہیں، مزدوریاں اور پنشنیں زیادہ دی جاتی ہیں۔ ان کے لیے ریل کے کرائے کم کیے جاتے ہیں، حتیٰ کہ انہیں تمغے تک دیے جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف شادی نہ کرنے والوں یا بچے نہ رکھنے والے جوڑوں پر (SURTAX) لگایا جاتا ہے۔ گویا بعد از خرابی بسیار اب فرانسیسی قوم کی آنکھ کھلی ہے، اور وہ اس گناہ کا کفارہ ادا کر رہی ہے جو اس نے قوانین فطرت سے انحراف کر کے ضبط ولادت کی صورت میں کیا تھا۔

جرمنی | نازی جماعت نے برسراقتدار آنے کے بعد آبادی کے گھٹتے ہوئے زوال کو سب سے بڑا خطرہ قرار دیا اور اس کے تدارک کی کوشش کی۔ ایک نازی اخبار نے لکھا کہ:-

"اگر ہماری شرح پیدائش اسی طرح گھٹتی رہی تو خوف ہے کہ ایک وقت ہماری قوم بالکل بانجھ ہو جائے گی۔ اور موجودہ نسل کے کاموں کو سنبھالنے کے لیے نئی نسلیں اٹھنی بند ہو جائیں گی"

اس حالت کی اصلاح کے لیے حکومت نے ضبط ولادت کی تعلیم و نشر و تبلیغ کو قانوناً روک دیا۔ عورتوں کو کارخانوں اور دفتروں سے خارج کرنا شروع کیا۔ نوجوانوں کو نکاح کی طرف رغبت دلانے کے لیے قرضۂ شادی (MARRIAGE LOAN) کے نام سے رقمیں دیں، بن بیاہوں اور بے اولادوں پر ٹیکس لگائے۔ اور زیادہ بچے پیدا کرنے والوں پر ٹیکس کم کر دیے۔ ۱۹۳۴ء میں ایک کروڑ پونڈ کے قرضہ ہائے شادی دیے گئے جن سے ۸ لاکھ مردوں اور عورتوں نے فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۳۵ء کے نئے قانون کی رو سے ایک بچہ پیدا ہونے پر انکم ٹیکس میں ۱۵ فی صدی، دو بچوں پر ۳۵ فی صدی، تین پر ۵۵ فی صدی، چار پر ۷۵ فی صدی، پانچ پر ۹۵ فی صدی کمی کی جاتی ہے، اور جب چھ بچے ہوتے ہیں تو پورا انکم ٹیکس معاف کر دیا جاتا ہے۔

اٹلی | مسولینی کی حکومت ۱۹۳۳ء سے آبادی بڑھانے کی طرف خاص توجہ کر رہی ہے ضبط ولادت کی نشر و اشاعت قانوناً ممنوع ہے۔ نکاح اور تناسل کی ترغیب کے لیے وہ تمام تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں جو جرمنی اور فرانس کے حالات میں بیان کی گئی ہیں۔

سویڈن | حال میں سویڈن کے ایک سابق وزیر (TRYGGER) نے پارلیمنٹ (RIKSDAG) میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر سویڈش قوم خودکشی نہیں کرنا چاہتی ہے تو شرح پیدائش کی روزافزوں کمی کو روکنے کے لیے فوری تدابیر کرنے کی ضرورت ہے ۱۹۲۱ء سے شرح پیدائش کی کمی خوفناک ہو گئی ہے اور آبادی میں اضافہ بند ہو گیا ہے" اس تنبیہ کا یہ اثر ہوا کہ اب سویڈش پارلیمنٹ ایک کمیشن مقرر کرنے والی ہے جو آبادی کی توفیر کے ذرائع دریافت کریگا۔

اب آپ برتھ کنٹرول سے کافی روشناس ہو چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ تحریک کی حقیقت کیا ہے کن وجوہ سے یہ پیدا ہوئی، کن اسباب سے اس نے ترقی کی، جن ممالک میں یہ رائج ہوئی وہاں اس کے کیا نتائج رونما ہوئے، اور جنھوں نے اس کا اچھی طرح تجربہ کر لیا ہے وہ اب اس کو کس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہمیں اُمید ہے کہ برتھ کنٹرول کے متعلق اسلام کا فتویٰ زیادہ آسانی کے ساتھ آپ کی سمجھ میں آئے گا، زیادہ گہرائی کے ساتھ ذہن نشین ہوگا۔ اور اس کی مصلحتیں زیادہ روشنی کے ساتھ آپ پر واضح ہوں گی

مغربی تجربہ کے دو سبق | صفحات گذشتہ میں تحریک ضبط ولادت کی ترقی کے اسباب اور اس کے نتائج کا جو تفصیلی بیان پیش کیا گیا ہے اس کو بنظر غائر ملاحظہ کرنے سے دو اہم حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں

ایک یہ کہ اہل مغرب میں ضبط ولادت کی خواہش پیدا ہونا، اور اس تحریک کا اس کثرت سے ان کے افراد میں رائج ہو جانا، کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان کی فطرت ہی توالد و تناسل سے پرہیز کا اقتضاء کرتی ہے، بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ دو صدیوں سے ان کے ہاں تمدن و تہذیب اور معیشت و معاشرت کا جو نظام رائج ہے، اُس نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں جن میں وہ اولاد سے بچنے اور

توالد وتناسل سے نفرت کرنے پر مجبور کئے ہیں۔ اگر یہ حالات نہ ہوتے تو وہ اب بھی اسی طرح ضبط ولادت سے بیگانہ رہتے جس طرح انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں تھے۔ کیونکہ ان کی جو فطرت اس زمانے میں اولاد کی محبت اور توالد وتناسل کی جانب رغبت کا اقتضاء کرتی تھی، وہی فطرت اب بھی موجود ہے۔ ۶۰ سال کے اندر اس میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہوا ہے۔

دوسرے یہ کہ ضبط ولادت کے رواج سے مغربی قومیں جن خطرات ومشکلات میں گھر گئی ہیں انہوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ضبط ولادت کی تحریک، قوانین فطرت میں جو ترمیم کرنا چاہتی ہے وہ انسان کے لیے سخت نقصان دہ ہے، اور درحقیقت فطرت کے قوانین لائق ترمیم نہیں ہیں بلکہ وہ نظام تمدن وتہذیب اور نظام معیشت ومعاشرت بدل دینے کے لائق ہے۔ جو انسان کو قوانین فطرت کی خلاف ورزی پر مجبور کرکے ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔

اصول اسلام مغربی تجربہ کے یہ دو سبق ہم کو اصول اسلام سے بہت قریب لے جاتے ہیں اسلام دین فطرت ہے۔ اور اس نے شخصی واجتماعی طرز عمل کے لیے جتنے طریقے مقرر کیے ہیں وہ سب اس قاعدۂ کلیہ پر مبنی ہیں کہ انسان اُن قوانین فطرت کی پیروی کرے جن پر کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے، اور کوئی ایسا طرز زندگی اختیار نہ کرے جو قوانین فطرت کی خلاف ورزی پر قائم ہو، یا ان کی خلاف ورزی پر اس کو مجبور کرتا ہو۔ قرآن مجید ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کرکے اس کی جبلت میں اس طریقہ کی تعلیم بھی ودیعت فرمادی ہے جس پر چل کر وہ چیز نظام وجود میں اپنے حصہ کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دے سکتی ہے۔

رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰ : ۳)

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شئے کو اس کی خاص بناوٹ عطا کی پھر اس کو ان اغراض کے پورا کرنے کی راہ بھی بتادی جن کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔

کائنات کی تمام چیزیں بے چون وچرا اس ہدایت کی پیروی کر رہی ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ان کے لیے جو راستہ مقرر فرمایا ہے اس سے ہٹنے کی ان میں قدرت ہی نہیں البتہ انسان کو یہ قدرت دی گئی ہے کہ وہ اس راستہ سے ہٹ سکتا ہے، اس پر چلنے سے انکار کر سکتا ہے۔ اپنی عقل اور ذہانت سے کام لے کر اس کے خلاف دوسرے راستے نکال سکتا ہے، اور کوشش کر کے ان پر چل بھی سکتا ہے، لیکن ہر وہ راستہ جسے انسان خدا کے بنائے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر اپنی ہوائے نفس کے اتباع میں اختیار کرتا ہے، ٹیڑھا راستہ ہے، اور اس کی پیروی گمراہی ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸ : ۵) اس سے زیادہ گمراہ اور کون ہوگا جس نے اپنی ہوائے نفس کی پیروی کی اور اللہ کی ہدایت کو چھوڑ دیا۔

یہ گمراہی ظاہر میں خواہ کتنی ہی مفید نظر آئے، لیکن درحقیقت جو انسان اللہ کے بنائے ہوئے راستے کو چھوڑتا ہے اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ انجام کار میں اس کی غلط کاری خود اسی کے لیے نقصان دہ اور موجب ہلاکت ثابت ہوتی ہے۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۶۵ : ۱) اور جس کسی نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا اس نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا کی بناوٹ کو بدلنا اور ان قوانین فطرت کو توڑنا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جاری کیا ہے دراصل ایک شیطانی فعل ہے، اور شیطان ہی اس فعل کی تعلیم دیتا ہے

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (۴ : ۱۸) شیطان نے کہا کہ میں اولاد آدم کو حکم دوں گا کہ اللہ کی بناوٹ کو بدل ڈالیں۔

اور شیطان کون ہے؟ وہ جو ازل سے انسان کا کھلا دشمن ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ (۲ : ۱۶۸)

اور تم شیطان کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تم کو بدی اور بے حیائی کے کام کرنے کا حکم دیتا ہے۔

پس اسلام نے جس قاعدے پر اپنے نظام تمدن و تہذیب اور نظام معیشت و معاشرت کی بنیاد رکھی ہے وہ یہ ہے کہ انسان انفرادی اور مجموعی حیثیت سے اپنی فطرت کے تمام مقتضیات کو ٹھیک ٹھیک قوانین فطرت کے مطابق پورا کرے اور اللہ کی دی ہوئی تمام قوتوں سے اس طریقہ پر کام لے جس کی ہدایت خود اللہ نے دی ہے۔ نہ کسی قوت کو معطل و بیکار بنائے نہ کسی قوت کے استعمال میں اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت سے انحراف کرے، اور نہ شیطانی تحریص و ترغیب سے گمراہ ہو کر اپنی فلاح و بہبود ان طریقوں میں تلاش کرے جو فطرت کی سیدھی راہ سے ہٹ کر نکلتے ہیں۔

تمدن اسلام میں ضبط ولادت کی گنجائش ہی نہیں اس قاعدے کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اسلام پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اسلامی نظام تمدن نے سرے سے ان اسباب و دواعی کا ہی استیصال کر دیا ہے جن کی وجہ سے انسان اپنی فطرت کے اس اہم اقتضاء یعنی توالد و تناسل سے پرہیز کرنے پر مجبور ہوتا ہے یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے برتھ کنٹرول کی ضرورت داعی نہیں ہوتی، نہ اس کی عین سرشت اس کا اقتضاء کرتی ہے بلکہ ایک خاص طرز کا نظام تمدن جب کسی انسانی جماعت میں مخصوص قسم کے حالات پیدا کر دیتا ہے، تب انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی آسائش اور اپنی فلاح و بہبود کی خاطر اپنی آیندہ نسل کا سلسلہ منقطع کر دے، یا اس کو بڑی حد تک گھٹانے کی کوشش کرے۔ اس سے آپ خود یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی تمدن اس خاص طرز سے مختلف طرز پر قائم ہو، اور اس میں وہ مخصوص قسم کے حالات پیدا ہی نہ ہوں، تو سرے سے وہ مشکلات اور وہ دواعی وجود ہی میں نہ آئیں گے جو انسان کو اللہ کی بناوٹ کے بدلنے، اور اس کی حدود

سے تجاوز کرنے، اور قوانین فطرت کے مقتضیات سے انحراف کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

اسلام کے نظام معاشی نے سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دی ہے وہ سود کو حرام کرتا ہے اجارہ داری کو روکتا ہے، جوے اور سٹے کو ناجائز قرار دیتا ہے، مال جمع کرنے سے منع کرتا ہے اور زکواۃ و وراثت کے طریقے جاری کرتا ہے یہ احکام ان بہت سی خرابیوں کا استیصال کردیتے ہیں۔ جنہوں نے مغرب کی معاشی زندگی کو سرمایہ داروں کے سوا اور سب کے لیے ایک مستقل عذاب بنا دیا ہے۔

اسلام کے نظام معاشرت نے عورت کو وراثت کے حقوق دیے ہیں مرد کی کمائی میں اس کا حق مقرر کیا ہے۔ اور عورت کے دائرہ عمل کو فطری حدود میں تقسیم کیا ہے، عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کو حجاب شرعی کے ذریعہ سے روک دیا ہے، اور اس طرح معیشت و معاشرت کی ان بہت سی خرابیوں کو دور کر دیا ہے جن کی وجہ سے عورت اپنے فطری فرض افزائش نسل و تربیت اولاد سے انحراف کرنے پر آمادہ یا مجبور ہوتی ہے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات انسان کو سادہ اور پرہیزگارانہ زندگی بسر کرنا سکھاتی ہیں وہ زناکاری اور شراب خواری کو حرام کرتا ہے۔ رقص و سرود سے (جو قوی ترین محرکات زنا میں سے ہے) روکتا ہے، بہت سے اُن تفریحی مشاغل اور عیش پسندانہ تفریحات کی راہ بند کرتا ہے جو انسان کو فضول خرچ بناتے ہیں۔ لباس، مکان اور آرائش و آسائش کے اسباب میں کفایت شعاری برتنے کی تاکید کرتا ہے، اور اس بد اخلاقی، اسراف اور حد سے بڑھی ہوی لذت پرستی کا استیصال کر دیتا ہے، جو مغربی ممالک میں برتھ کنٹرول کی ترویج کے اہم اسباب میں سے ہے اس کے ساتھ اسلام آپس کی ہمدردی اور امداد باہمی کی تعلیم دیتا ہے صلۂ رحمی کی تاکید کرتا ہے ہمسایوں کی مدد، اور غریب و نادار ابنائے نوع پر انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیتا ہے، اور خود

غرضی و نفس پرستی سے روکتا ہے۔ یہ سب چیزیں ایک طرف انسان میں منفرداً، اور دوسری طرف سوسائٹی میں مجتمعاً ایک ایسا اخلاقی ماحول پیدا کر دیتی ہیں جس میں ضبط ولادت کے داعیات پیدا ہی نہیں ہوتے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسلام نے خدا پرستی کی تعلیم دی ہے۔ وہ خدا پر بھروسہ کرنا سکھاتا ہے اور یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کر دیتا ہے کہ اس کا اور ہر جاندار کا اصلی رازق حق تعالےٰ ہے یہ چیز انسان میں وہ ذہنیت پیدا ہی نہیں ہونے دیتی جس سے وہ اپنی زندگی میں صرف اپنے ہی ذرائع اور اپنی ہی کوشش پر بھروسہ کرنے لگتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام کے اجتماعی قوانین اور اس کی اخلاقی تعلیمات اور روحانی تربیت نے ان اسباب و دواعی میں سے ہر سبب اور ہر داعیہ کو مٹا دیا ہے جو مغربی تمدن و تہذیب میں ضبط ولادت کے لیے باعث تحریک ہوئے ہیں۔ اگر انسان ذہنی و عملی حیثیت سے ایک سچا مسلمان ہو تو نہ کبھی اس کے نفس میں ضبط ولادت کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے، اور نہ اس کی زندگی میں ایسے حالات پیش آسکتے ہیں جو اس کو فطرت کے سیدھے راستے سے منحرف ہونے پر مجبور کر دیں۔

یہ تو مسئلہ کا سلبی (NEGATIVE) پہلو تھا۔ اب ہم کو ایجابی (POSITIVE) پہلو سے دیکھنا چاہیئے کہ ضبط ولادت کے متعلق اسلام کا فتویٰ کیا ہے۔

ضبط ولادت کے متعلق اسلام کا فتویٰ

قرآن مجید میں ایک جگہ یہ قاعدۂ کلیہ بیان کر دیا گیا ہے کہ تغییر خلق اللہ ایک شیطانی فعل ہے وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (۴: ۱۱۹) اس آیت میں تغییر خلق اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو جس غرض کے لیے بنایا ہے اُس کو اُس غرض اصلی سے پھیر کر کسی دوسری غرض کے لیے استعمال کیا جائے، یا اس طور پر اس سے کام لیا جائے کہ غرض اصلی اس سے فوت ہو جائے۔

اس قاعدۂ کلیہ کے تحت ہم کو دیکھنا چاہیے کہ عورت اور مرد کے زوجی تعلق میں تغییر خلق اللہ یعنی اس تعلق

کی فطری غرض کیا ہے، اور ضبط ولادت سے تغییر خلق اللہ لازم آتی ہے یا نہیں۔ خود قرآن مجید اس سوال کے حل میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ وہ عورت اور مرد کے زوجی تعلق کی دو غرضیں بتاتا ہے ایک یہ کہ :-

نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ (۲ : ۲۸)	تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں پس تم جس طرح چاہو اپنی کھیتیوں میں جاؤ اور اپنے لیے آیندہ کا بندوبست کرو۔

اور دوسری یہ ہے کہ :-

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (۳۰ : ۳)	اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہیں میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت ورحمت پیدا کی

پہلی آیت میں عورتوں کو "کھیتی" کہہ کر ایک حیاتی حقیقت (BIOLOGICAL) کا اظہار کیا گیا ہے حیاتیات (BIOLOGY) کے نقطہ نظر سے مرد کی حیثیت کاشتکار کی ہے اور عورت کی حیثیت کھیتی کی اور ان دونوں کے تعلق سے فطرت کی اولین غرض بقائے نوع ہے۔ اس غرض میں انسان اور حیوان اور نبات سب مشترک ہیں۔

دوسری آیت میں اس تعلق کی ایک اور غرض بھی بیان کی ہے، اور وہ قیام تمدن ہے، جس کی بنیاد شوہر اور بیوی کے باہم مل کر رہنے سے پڑتی ہے۔ یہ غرض انسان کے لیے مخصوص ہے، اور انسان کی مخصوص بناوٹ ہی میں ایسے داعیات پیدا کر دیئے گئے ہیں جو اس غرض کے پورا کرنے کے لیے ابھارتے ہیں۔

خلق اللہ کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے کارخانہ کو چلانے کے لیے منجملہ بہت سے انتظامات کے دو زبردست انتظام کیے ہیں۔ ایک تغذیہ۔ دوسرے تولید۔ تغذیہ کا مقصد یہ ہے کہ جو انواع اس وقت موجود ہیں وہ ایک مدت معینہ تک زندہ رہ کر اس کارخانہ کو چلاتی ہیں۔ اس کے لیے رب العالمین نے غذا کا وافر سامان مہیا کیا، اجسام نامیہ (ORGANIC BODIES) میں غذا کو جذب کرنے اور اس کو اپنا جزء بنانے کی قابلیت پیدا کی، اور ان میں غذا کی طرف ایک طبیعی خواہش پیدا کر دی جو ان کو غذا حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے اگر یہ نہ ہو تو تمام اجسام نامیہ (خواہ نباتات ہوں یا حیوانات یا انسان) ہلاک ہو جائیں اور اس کارخانہ عالم میں کوئی رونق باقی نہ رہے لیکن فطرت الٰہیہ کے نزدیک اشخاص وافراد کے بقا کی بہ نسبت انواع واجناس کا بقاء زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اشخاص کے لیے زندگی کی ایک بہت ہی قلیل مدت ہے، اور اس کارخانہ کو چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اشخاص کے مرنے سے پہلے دوسرے اشخاص ان کی جگہ لینے کے لیے پیدا ہو جائیں۔ اس دوسری اعلیٰ اور اشرف ضرورت کو پورا کرنے کے لیے فطرت نے تولید کا انتظام کیا ہے۔ انواع میں نر اور مادہ کی تقسیم، نر و مادہ کے اجسام کی جداگانہ ساخت دونوں میں ایک دوسرے کی جانب میلان اور زوجی تعلق کے لیے دونوں میں ایک زبردست خواہش کا موجود ہونا، یہ سب کچھ اسی غرض کے لیے ہے کہ دونوں مل کر اپنی موت سے پہلے اپنے جیسے افراد اللہ تعالیٰ کے اس کارخانہ کو چلانے کے لیے پیدا کر دیں۔ اگر یہ غرض نہ ہوتی تو سرے سے نر و مادہ یا مرد و عورت کی علیحدہ علیحدہ صنفات پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

پھر دیکھیے کہ جو انواع کثیر الاولاد ہوتی ہیں۔ ان میں فطرت نے اولاد کی محبت کا کوئی خاص جذبہ پیدا نہیں کیا کہ وہ اپنے بچوں کی نگرانی اور حفاظت کریں۔ اس لیے کہ یہ انواع محض اپنی کثرت تناسل کے بل پر قائم رہتی ہیں۔ لیکن جن انواع کی اولاد کم ہوتی ہے ان میں اولاد

کی محبت پیدا کی گئی ہے اور ماں باپ کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ ایک کافی عرصہ تک اپنی اولاد کی نگرانی وحفاظت کریں یہاں تک کہ وہ خود اپنی حفاظت کے قابل ہو جائیں ۔ اس معاملہ میں انسان کا بچہ سب سے زیادہ کمزور ہوتا ہے اور زیادہ مدت تک ماں باپ کی نگرانی کا محتاج رہتا ہے ۔ دوسری طرف انواع حیوانی میں شہوت کا جذبہ یا تو موسمی ہوتا ہے ۔ یا جبلی مطالبات کے تحت محدود ہوتا ہے ۔ لیکن انسان میں یہ جذبہ نہ تو موسمی ہے اور نہ جبلت نے اس کو محدود کیا ہے ۔ اس لیے نوع انسانی میں عورت اور مرد ایک دوسرے کے ساتھ دائمی تعلق رکھنے پر مجبور ہیں ۔ یہی دونوں چیزیں انسان کو مدنی الطبع بناتی ہیں ۔ یہیں سے گھر کی بنیاد پڑتی ہے ، اور گھر سے خاندان اور خاندان سے قبیلے بنتے ہیں ۔ اور آخر کار اسی بنیاد پر تمدن کی عمارت قائم ہوتی ہے ۔

اس کے بعد انسانی ساخت پر غور کیجئے حیاتیات کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے جسم کی بناوٹ میں شخصی مفاد پر نوعی مفاد کو ترجیح دی گئی ہے اور انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے اس کی ذات سے زیادہ اس کی نوع کے مفاد کے لیے ہے انسان کے جسم میں اس کے زوجی غدد (SEXUAL GLANDS) سب سے زیادہ اہم خدمات انجام دیتے ہیں ۔ یہ غدے ایک طرف انسان کے جسم کو وہ مار الحیات (HARMON) بہم پہنچاتے ہیں جو اس میں حسن وجمال ، رونق و تازگی ، ذہانت اور تیزی ، توانائی اور قوت عمل پیدا کرتا ہے ۔ اور دوسری طرف یہی غدے انسان میں تولید کی قوت پیدا کرتے ہیں ، جو عورت اور مرد کو تناسل کے لیے باہم ملنے پر مجبور کرتی ہے جس وقت انسان نوعی خدمت کے لیے مستعد ہوتا ہے ، وہی زمانہ اس کے شباب اور حسن اور عمل کا بھی ہوتا ہے اور جب وہ نوعی خدمت کے قابل نہیں ہوتا تو وہی زمانہ اس کے بڑھاپے اور ضعف کا ہوتا ہے ، زوجی فعلیت کا کمزور ہونا ہی در اصل آدمی کے لیے موت کا پیغام ہے اگر انسان کے جسم سے اس کے زوجی غدد نکال دیے جائیں تو جس طرح وہ نوعی خدمت کے قابل نہیں رہتا اسی طرح شخصی خدمت کے لیے بھی اس کی قابلیت بہت کم ہو جاتی ہے ۔ اس لیے کہ ان غدوں کے بغیر اس کی دماغی اور جسمانی قوتیں نہایت کمزور ہوتی ہیں ۔

عورت کے جسم میں نوعی مفاد کی خدمت کو مرد سے بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عورت کے جسم کی ساری مشین اسی لیے بنائی گئی ہے کہ وہ بقائے نوع کی خدمت انجام دے وہ جب اپنے شباب کو پہنچتی ہے تو ایام ماہواری کا دور شروع ہو جاتا ہے جو ہر مہینے اس کو استقرار حمل کے لیے تیار کرتا رہتا ہے۔ پھر جب نطفہ قرار پاتا ہے تو اس کے پورے نظام جسمانی میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے بچے کا مفاد اس کے تمام جسم پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ اس کی قوت کا صرف اتنا حصہ اس کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے جتنا اس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے، باقی ساری قوت بچے کے نشوونما میں صرف ہوتی ہے۔ یہی چیز ہے جو عورت کی فطرت میں محبت قربانی اور ایثار (ALTRUISM) پیدا کرتی ہے اور اسی لیے پدریت کا رابطہ اتنا گہرا نہیں جتنا مادریت کا رابطہ ہے۔ وضع حمل کے بعد عورت کے جسم میں ایک دوسرا انقلاب رونما ہوتا ہے۔ جو اسے رضاعت کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس زمانہ میں غدد رضاعت ماں کے خون سے بہترین اجزاء جذب کر کے بچے کے لیے دودھ مہیا کرتے ہیں۔ اور یہاں فطرت الٰہیہ پھر عورت کو نوعی مفاد کے لیے قربانی پر مجبور کرتی ہے رضاعت کے بعد عورت کا جسم از سر نو ایک دوسرے استقرار حمل کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک عورت اس نوعی خدمت کے لیے مستعد رہتی ہے۔ جہاں اس کی یہ استعداد ختم ہوئی اور اس کا قدم موت کی طرف بڑھا۔ سن یاس شروع ہوتے ہی اس کا حسن و جمال رخصت ہو جاتا ہے، اس کی شگفتگی، اس کی جولانی طبع، اس کی جاذبیت کافور ہو جاتی ہے، اور اس کے لیے جسمانی تکالیف، اور نفسانی افسردگی کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوتا ہے جو صرف موت ہی کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لیے بہترین زمانہ وہ ہے جب وہ نوع کی خدمت کے لیے جیتی ہے، اور جب وہ صرف اپنے لیے جیتی ہے تو بُری طرح جیتی ہے[1]۔

---

[1] اس موضوع پر ایک روسی مصنف (ANTON NEMILOV) نے ایک بہترین کتاب لکھی ہے جس کا نام (BIOLOGICAL TRAGEDY OF WOMAN) ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اس کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع ہوا ہے۔

اس بحث سے قرآن مجید کے اس ارشاد کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان زوجی تعلق پیدا کرنے سے فطرت کا اصل مقصد بقائے نوع ہے، اور اس کے ساتھ دوسرا مقصد یہ ہے کہ انسان عائلی زندگی (DOMESTIC LIFE) اختیار کرکے تمدن کی بنیاد رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان جو کشش رکھی ہے، اور ان دونوں کے زوجی تعلق میں جو لذت پیدا کی ہے، وہ صرف اس لیے ہے کہ انسان اپنی طبیعی رغبت سے ان مقاصد کو پورا کرے۔ مگر جو شخص محض اس لذت کو حاصل کرنا چاہتا ہے، اور ان مقاصد کی خدمت بجا لانے سے انکار کرتا ہے، وہ یقیناً خلق اللہ کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ان اعضا اور ان قوتوں کو جو اللہ تعالےٰ نے بقائے نوع کے لیے عطا کیے ہیں، انکی غرض اصلی کے خلاف محض اپنی نفسانی غرض کے لیے استعمال کرتا ہے اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو محض زبان کی لذت حاصل کرنے کے لیے عمدہ عمدہ غذاؤں کے نوالے منہ میں چبائے مگر حلق کے نیچے اتارنے کے بجائے ان کو تھوک دے جس طرح ایسا شخص خودکشی کا ارتکاب کرتا ہے، اسی طرح وہ شخص جو زوجی تعلق سے محض لذت حاصل کرتا ہے، اور بقائے نسل کے مقصد کو پورا نہیں ہونے دیتا وہ نسل کشی کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ وہ فطرت کے ساتھ دغا بازی کر رہا ہے۔ فطرت نے اس فعل میں جو لذت رکھی ہے وہ دراصل معاوضہ ہے اس خدمت کا جو فطرت کے ایک مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ بجا لاتا ہے۔ لیکن یہ شخص معاوضہ تو پورا لے لیتا ہے، اور خدمت بجا لانے سے انکار کر دیتا ہے۔ کیا یہ دغا بازی نہیں؟

تغییر خلق اللہ کی سزا آئیے اب ہم دیکھیں کہ جو شخص فطرت کے ساتھ یہ دغا بازی کرتا ہے، کیا فطرت اس کو سزا دیے بغیر چھوڑ دیتی ہے، یا اس کی کچھ سزا بھی دیتی ہے؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ اس کی سزا ضرور دی جاتی ہے، اور وہ سزا یہ ہے کہ ایسا شخص خود ہی اپنے آپ کو نقصان اور ٹوٹے میں مبتلا کرتا ہے

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ وہ لوگ ٹوٹے میں پڑ گئے جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی

سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ (۶: ۱۴۰)

بے بغیر سمجھے بوجھے قتل کیا اور اس نعمت کو جو اللہ نے ان کو عطا کی تھی اللہ پر افترا باندھ کر اپنے اوپر حرام کر لیا

اس آیت میں قتل اولاد کے ساتھ نعمت "تناسل کو اپنے لیے حرام کر لینے (یعنی ضبط ولادت) کا نتیجہ بھی خسران بتایا گیا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ یہ خسران کن کن صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

جسم و نفس کا نقصان توالد و تناسل کا معاملہ چونکہ براہ راست انسان کے جسم اور نفس سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے ہم کو سب سے پہلے ضبط ولادت کے ان اثرات کی تحقیق کرنی چاہیے جو انسان کے نفس اور جسم پر مترتب ہوتے ہیں۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ انواع میں نر و مادہ کی دو الگ الگ صنفیں بنانے سے فطرت کا اصل مقصد ہی توالد و تناسل اور بقائے انواع ہے یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ نر و مادہ کی عین فطرت اس کا اقتضاء کرتی ہے کہ وہ اولاد پیدا کریں، اور خصوصاً نوع انسانی میں عورت کے اندر طبعاً اولاد کی خواہش اور محبت کا ایک زبردست داعیہ پیدا کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کے جسم میں اس کے زوجی غدد کا کتنا قوی اور گہرا اثر ہے، اور کس طرح یہ غدے انسان کو نوع کی خدمت پر ابھارنے اور اس میں حسن، توانائی، عملی سرگرمی اور ذہنی قوت پیدا کرنے کے دوہرے فرائض انجام دیتے ہیں خصوصاً عورت کے متعلق آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے جسم کی پوری مشین ہی خدمت بقائے

---

۱ قدیم مفسرین نے حرموا ما رزقهم الله سے مراد صرف حلال غذاؤں کی تحریم ہی لی ہے اس لیے کہ ان کے زمانے میں ضبط ولادت کی تحریک کا کوئی وجود ہی نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے جس کا علم ان تمام چیزوں پر حاوی ہے جو ہو چکی ہیں اور ہونے والی ہیں۔ ایسے وسیع الفاظ استعمال کیے ہیں جو صرف حلال غذاؤں کی تحریم ہی کو نہیں بلکہ ہر اس نعمت کی تحریم کو شامل ہیں جو اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے اور چونکہ یہاں قتل اولاد کے بعد ہی تحریم رزق کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ لوگ ٹوٹے میں ہیں جو اولاد کو پیدا ہونے کے بعد قتل کر دیتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی ٹوٹے میں ہیں جو اولاد کی پیدائش ہی کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔

نوع کے لیے مناسب بنائی گئی ہے، اور اس کی تخلیق کا اہم ترین مقصد یہی ہے، اور اس لیے اس کی عین فطرت اس سے اس خدمت کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان سب امور کو پیش نظر رکھ کر آپ کی عقل خود اس نتیجہ پر پہنچ سکتی ہے کہ جب انسان، زوجی تعلق سے محض لذت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے سے انکار کر دیگا جس کی طلب اس کے جسم کے ریشہ ریشہ میں اس قدر گہرائی کے ساتھ پیوست کر دی گئی ہے، تو ممکن نہیں کہ اس کے نظام عصبی اور اس کے زوجی غدد کی فعلیت پر اس کے بُرے اثرات مترتب نہ ہوں، اور ان اثرات سے اس کا نفس محفوظ رہ سکے۔

تجربہ اس عقلی نتیجہ کی تائید کرتا ہے ۱۹۲۷ء میں برطانیہ عظمیٰ کے نیشنل برتھ ریٹ کمیشن نے ضبط ولادت کے مسئلہ پر طبی نقطۂ نظر سے جو رپورٹ شائع کی تھی اس میں لکھا ہے۔

مانع حمل وسائل کے استعمال سے مردوں کے نظام جسمانی میں برہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ عارضی طور پر ان میں مردانہ کمزوری یا نامردی بھی پیدا ہو سکتی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے کہا جا سکتا ہے کہ ان وسائل کا کوئی زیادہ بُرا اثر مرد کی صحت پر نہیں پڑتا البتہ اس بات کا ہمیشہ خطرہ ہے کہ مانع حمل وسائل کے استعمال سے جب مرد کو زوجی تعلق میں اپنی خواہشات کی پوری تسکین حاصل نہ ہوگی تو اس کی عائلی زندگی کی مسرتیں غارت ہو جائیں گی۔ اور وہ دوسرے ذرائع سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جو اس کی صحت کو برباد کر دیں گے اور ممکن ہے کہ اسے امراض خبیثہ میں مبتلا کر دیں"

عورتوں کے متعلق کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ :۔

"جہاں طبی لحاظ سے منع حمل ناگزیر ہو، یا جہاں بچوں کی پیدائش حد سے زیادہ ہو، وہاں تو منع حمل کی تدابیر عورت کی صحت پر بلا شبہ اچھا اثر ڈالتی ہیں۔

لیکن جہاں ان میں سے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، وہاں منع حمل کی تدابیر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کے نظام عصبی میں سخت برہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں بدمزاجی اور چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے جب اس کے جذبات کی تسکین نہیں ہوتی تو شوہر کے ساتھ اس کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ نتائج ان لوگوں میں زیادہ نمایاں دیکھے گئے ہیں جو عزل (COITUS - INTERUPTUS) کا طریقہ اختیار کرتے ہیں"۔

ڈاکٹر میری شارلیب (MARYSHARLIEB) اپنے چہل سالہ تجربات کے نتائج ان الفاظ میں بیان کرتی ہے۔

"ضبط ولادت کے طریقے خواہ وہ فرزجے (PESSARIES) ہوں یا جراثیم کش دوائیں یا ربر کی ٹوپیاں اور لفافے یا دوسرے طریقے، بہر حال ان کے استعمال سے کوئی فوری نمایاں نقصان تو نہیں ہوتا۔ لیکن ایک عرصہ تک ان کو استعمال کرتے رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے عورت میں عصبی ناہمواری (NERVOUS INSTABILITY) پیدا ہو جاتی ہے پژمردگی، شگفتگی کا فقدان افسردہ دلی، طبیعت کا چڑچڑا پن اور انفعال پذیری غمگین خیالات کا ہجوم، بے خوابی، پریشان خیالی، دل و دماغ کی کمزوری، دوران خون کی کمی، ہاتھ پاؤں کا سن ہو جانا، جسم میں کہیں کہیں ٹیسیں اٹھنا ایام ماہواری کی بے قاعدگی، یہ ان طریقوں کے لازمی اثرات ہیں"۔

بعض دوسرے ڈاکٹروں نے بیان کیا ہے کہ اخراج رحم (FALLING OF THE WOMB) حافظہ کی خرابی اور بسا اوقات مراق، خفقان اور جنون جیسے عوارض بھی ان طریقوں کے استعمال سے

پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ زیادہ عرصہ تک جس عورت کے ہاں بچہ نہیں ہوتا اس کے اعضاء تناسل میں ایسے تغیرات واقع ہوتے ہیں جن سے اس کی قابلیت تولید (FARTILITY) متاثر ہو جاتی ہے اور اگر کبھی وہ حاملہ ہو تو اس کو زمانۂ حمل اور وضع حمل میں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔[۵]

پروفیسر لیونارڈ ہل ایم بی اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:۔

بلوغ کے وقت عورت کے جسم میں جتنے تغیرات ہوتے ہیں سب تناسل کے مقصد ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ ایام ماہواری کے دور سے اسی غرض کے لیے ہوتے ہیں کہ بار بار عورت کو استقرار حمل کے لیے تیار کریں۔ ایک ناکتخدا عورت یا ایسی عورت میں جو اپنے آپ کو استقرار حمل سے روکتی ہے، ایام کا ہر دورہ ان تمام اعضاء کی ناامیدی کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ جو اس دورہ میں حمل کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ اس اقتضائے طبیعی کے پورا نہ ہونے اور تناسلی اعضاء کے معطل رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تناسلی اعضاء کی فعلیت میں برہمی و بدنظمی پیدا ہو، ایام ماہواری تکلیف اور بے قاعدگی کے ساتھ آئیں، چھاتیاں ڈھلک جائیں چہرے کی رونق اور خوبصورتی رخصت ہو جائے اور مزاج میں اشتعال پذیری، یا افسردگی پیدا ہو جائے۔"

"یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی زندگی میں اس کے زوجی غدد کا بڑا اثر ہے جو غدے زوجی قوت پیدا کرتے ہیں، وہی انسان میں توانائی، حسن اور چستی بھی پیدا کرتے ہیں انہی سے انسان میں کیریکٹر کی بہت سی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔

---

[۵] ڈاکٹر آرنلڈ لورانڈ (LLRAND) نے اپنی کتاب (LIFE SHORTENING HABITS AND REJUVINATION) میں تدابیر مانع حمل کے مضر اثرات نہایت تفصیلی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں فلیڈلفیا سے شائع ہوئی ہے۔

زمانۂ بلوغ کے قریب جب ان غدوں کا عمل تیز ہوجاتا ہے، تو جس طرح انسان میں تناسل کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اس میں خوبصورتی، شگفتگی، ذہنی قوت جسمانی طاقت، جوانی اور عملی سرگرمی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اگر ان غدود کے فطری مقصد کو پورا نہ کیا جائیگا تو یہ اپنے ضمنی فعل یعنے تقویت کو بھی چھوڑ دیں گے خصوصاً عورت کو استقرار حمل سے روکنا دراصل اس کی پوری مشین کو معطل اور بے مقصد بنانا ہے۔"

ان مضرتوں کے علاوہ ایک بڑی مضرت یہ بھی ہے کہ ضبط ولادت کے طریقے استعمال کرکے جب استقرار حمل کی طرف سے بے فکری ہوجاتی ہے تو شہوانی جذبات قابو میں نہیں رہتے، عورت پر مرد کے شہوانی مطالبات، حد اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں، اور زوجین کے درمیان ایک خالص بہیمی تعلق باقی رہ جاتا ہے جس میں تمام تر شہوانی میلانات ہی کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ چیز صحت اور اخلاق دونوں کے لیے غایت درجہ نقصان دہ ہے۔ فورسٹر (FOERSTER) لکھتا ہے:۔

"مرد کی زوجیت کا رخ اگر کلیۃً خواہشات نفس کی بندگی کی طرف پھر جائے اور اس کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی قوت ضابطہ نہ رہے تو اس سے جو حالت پیدا ہوگی وہ اپنی نجاست و دنائت اور زہریلے نتائج میں ہر اس نقصان سے کہیں زیادہ ہوگی جو بے حد و حساب بچے پیدا کرنے سے رونما ہوسکتی ہے۔

معاشرتی نقصان | عائلی زندگی میں ضبط ولادت کے جو مضر اثرات مترتب ہوتے ہیں ان کی طرف اوپر ضمناً اشارہ کیا جا چکا ہے شوہر اور بیوی کے تعلقات پر اس کا پہلا اور فوری اثر یہ ہوتا ہے کہ جب دونوں کے داعیات فطرت کی تکمیل نہیں ہوتی تو ایک غیر محسوس طریقہ پر دونوں میں ایک طرح کی اجنبیت پیدا ہونے لگتی ہے،، جو بعد میں مودت و رحمت کی کمی، سرد مہری اور آخر کار

نفرت وبیزاری تک پہنچ جاتی ہے۔ خصوصاً عورت میں ان طریقوں کی مداومت سے جو عصبی ہیجان اور چڑچڑاپن پیدا ہوتا ہے وہ خانگی زندگی کی ساری مسرتوں کو غارت کر دیتا ہے۔

لیکن اس کے علاوہ ایک اور بڑا نقصان بھی ہے۔ جو مادی اسباب سے زیادہ روحانی اسباب کی بدولت رونما ہوتا ہے جسمانی حیثیت سے عورت اور مرد کا تعلق محض ایک بہیمی تعلق ہے جیسا جانوروں میں ہوتا ہے۔ مگر جو چیز اس تعلق کو ایک اعلیٰ درجہ کا روحانی تعلق بناتی ہے، اور اس کو مودّت و رحمت کے ایک گہرے رابطہ میں تبدیل کر دیتی ہے وہ اولاد کی تربیت میں دونوں کی شرکت اور امداد باہمی ہے۔ ضبط ولادت اس مضبوط روحانی رابطہ کو وجود میں آنے سے روکتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان کوئی گہرا اور مستحکم تعلق پیدا نہیں ہوتا، اور ان کے تعلقات بہیمیت کے درجہ سے آگے بڑھنے نہیں پاتے۔ بہیمیت کے تعلق میں ہر مرد و عورت کے لیے ہر مرد و عورت یکساں ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ایک جوڑہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کا ہو کر رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں زوجی تعلقات نہایت ضعیف ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ضبط ولادت کی تحریک کے ساتھ ساتھ طلاق کا رواج اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ درحقیقت وہاں عائلی زندگی (DOMESTIC LIFE) کا سارا نظم درہم برہم ہوتا نظر آتا ہے۔

اخلاقی نقصان اخلاق پر ضبط ولادت کے مضر اثرات متعدد وجوہ سے رونما ہوتے ہیں۔

(۱) عورت اور مرد کو زنا کا لائسنس مل جاتا ہے۔ حرامی اولاد کی پیدائش سے سیرت پر بدنامی و ذلت کا بدنما داغ لگ جانے کا کوئی خوف باقی نہیں رہتا۔ اس لیے ناجائز تعلقات پیدا کرنے میں دونوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

(۲) لذت پرستی اور بندگی نفس حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اور اس سے ایک عام اخلاقی انحطاط، وبائی مرض کی طرح پھیل جاتا ہے۔

(۳) جن زوجین کے ہاں اولاد نہیں ہوتی ان میں بہت سے وہ اخلاقی خصائص پیدا ہی نہیں ہوتے جو صرف تربیت اطفال ہی سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ماں باپ بچوں کی تربیت کرتے ہیں اسی طرح بچے بھی ماں باپ کی تربیت کرتے ہیں۔ بچوں کی پرورش سے ماں باپ میں محبت، ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ عاقبت اندیشی اور کفایت شعاری کا سبق سیکھتے ہیں، سادہ معاشرت اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور محض اپنی ذاتی آسائش کے پیچھے اندھے نہیں ہو سکتے ضبط ولادت ان تمام اخلاقی فوائد کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ توالد و تناسل کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ اپنی صفت تخلیق و ربوبیت کا ایک حصہ انسان کو عطا کرتا ہے، اور اس طرح یہ انسان کے لیے متخلق باخلاق اللہ ہونے کا ایک بڑا وسیلہ ہے ضبط ولادت پر عمل کرنے سے انسان اس بڑی نعمت کو کھو دیتا ہے۔

(۴) ضبط ولادت سے بچوں کی اخلاقی تربیت نامکمل رہ جاتی ہے جس بچے کو چھوٹے اور بڑے بھائی بہنوں کے ساتھ رہنے سہنے، کھیلنے، کودنے اور معاملت کرنے کا موقع نہیں ملتا وہ بہت سے اعلیٰ اخلاقی خصائص سے محروم رہ جاتا ہے۔ بچوں کی تربیت صرف ماں باپ ہی نہیں کرتے بلکہ وہ خود بھی ایک دوسرے کی تربیت کرتے ہیں۔ ان کا آپس میں رہنا ان کے اندر ملنساری، محبت، ایثار، اتحاد باہمی اور ایسے ہی بہت سے اوصاف پیدا کرتا ہے، اور وہ ایک دوسرے پر نکتہ چینی کر کے خود ہی اپنے بہت سے اخلاقی عیوب کو دور کر لیتے ہیں۔ جو لوگ ضبط ولادت پر عمل کر کے اپنی اولاد کو صرف ایک بچے تک محدود کر لیتے ہیں، یا دو بچے اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ ان میں عمر کا بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے، وہ دراصل اپنی اولاد کو ایک بہتر اخلاقی تربیت سے محروم کر دیتے ہیں۔

نسلی و قومی نقصانات | یہ تو وہ نقصانات تھے جو محض افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں اٹھانے پڑتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ اس تحریک کے رواج عام سے نسلوں اور قوموں کو بحیثیت مجموعی کس قدر شدید نقصان پہنچتا ہے۔

قحط الرجال تخلیق انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو زبردست انتظام کیا ہے، اس میں خود انسان کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ مرد اپنا نطفہ عورت کے جسم میں پہنچا دے۔ اس کے بعد کوئی چیز انسان کے اختیار میں نہیں ہے اور سب کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت اور اس کے ارادے پر منحصر ہے۔ ہر مرتبہ جب مرد عورت سے ملتا ہے تو مرد کے جسم سے کروڑوں جراثیم حیات عورت کے جسم میں داخل ہوتے ہیں، اور عورت کے جسم سے لاکھوں بیضی خلایا (FGG-CELLS) نکل کر ان جراثیم سے ملنے کے لیے بڑھتے ہیں ان جراثیم اور ان خلایا میں سے ہر ایک جداگانہ نسلی اور شخصی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ انہی میں بلہاء اور مغفلین بھی ہوتے ہیں، اور عقلاء و حکماء بھی۔ ان میں ارسطو اور ابن سینا بھی ہوتے ہیں، چنگیز اور نپولین بھی ہوتے ہیں، شیکسپیر اور حافظ بھی ہوتے ہیں، میر جعفر اور میر صادق بھی ہوتے ہیں۔ یہ بات انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ کسی خصوصیت کے جرثومہ کو کسی ایک خصوصیت رکھنے والے بیضی خلیہ سے ملا کر اپنے انتخاب سے ایک خاص قسم کا انسان پیدا کر دے۔ یہاں صرف اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی کام کرتا ہے اور وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس وقت کس قوم میں کس قسم کے آدمی بھیجے۔ انسان جو اپنے عمل کے نتائج سے بالکل بے خبر ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے اس انتظام میں دخل دے گا تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص اندھیرے میں لکڑی گھمائے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی لکڑی کسی سانپ یا بچھو کو مارے گی یا کسی انسان کا سر پھوڑے گی، یا کسی قیمتی شے کو توڑ پھینکے گی۔ بہت ممکن ہے کہ ضبط ولادت پر عمل کرنے والا انسان اپنی قوم میں ایک بہترین جنرل یا مدبر یا حکیم کی پیدایش کو روک دینے کا سبب بن جائے، اور اپنی حد سے گذر کر اللہ تعالیٰ کے فعل میں دخل دینے کی سزا اس کو اس صورت میں ملے کہ اس کی نسل میں احمق یا بے ایمان اور غدار پیدا ہوں۔ خصوصاً جس قوم میں یہ مداخلت عام ہو جائے وہ تو بالیقین اپنے آپ کو قحط الرجال کے خطرے میں مبتلا کرتی ہے۔

شخصی اغراض پر قوم کی قربانی ضبط ولادت کی عام تحریک میں ہر شخص اپنے ذاتی حالات اور خواہشات

ضروریات پر نظر رکھ کر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کتنی اولاد پیدا کرے، بلکہ سرے سے پیدا کرے بھی یا نہیں۔ اس فیصلہ میں اس کے پیش نظر یہ سوال ہی نہیں ہوتا کہ قوم کو اپنی آبادی برقرار رکھنے کے لیے کم از کم کتنے بچوں کی ضرورت ہے۔ اشخاص نہ اس کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں، اور نہ شخصی ضروریات کے سامنے وہ قومی ضرورت کا لحاظ کرنے پر قادر ہیں۔ اس طرح اولاد کی پیدائش سراسر افراد قوم کی خود غرضی پر منحصر ہو جاتی ہے اور شرح پیدائش اس طور پر گھٹتی چلی جاتی ہے کہ اس کو کسی حد پر روکنا قوم کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اگر افراد میں خود غرضی بڑھتی رہے اور وہ خراب حالات جو ان کو ضبط ولادت پر ابھارتے ہیں، خراب تر ہوتے رہیں تو یقیناً ایسے افراد اپنی اغراض پر قوم کی زندگی کو قربان کر دیں گے حتی کہ ایک روز قوم کا خاتمہ ہی ہو جائے گا۔

قومی خودکشی | ضبط ولادت کی عام تحریک سے جس قوم کی آبادی گھٹنے لگتی ہے وہ ہر وقت تباہی کے سرے پر ہوتی ہے۔ اگر کوئی عام وبا پھیل جائے، یا کوئی بڑی جنگ چھڑ جائے جس میں کثرت سے آدمی مرنے لگیں، تو ایسی قوم میں دفعۃً آدمیوں کا کال رونما ہو جائے گا۔ اور وہ کسی ذریعہ سے بھی اتنے آدمی فراہم نہ کر سکے گی۔ جو مرنے والوں کی جگہ لے سکیں۔ یہی چیز اب سے دو ہزار سال پہلے یونان کو تباہ کر چکی ہے۔ یونانیوں میں اسقاط حمل اور قتل اولاد کا رواج پڑ گیا تھا جس سے آبادی گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ اسی زمانہ میں خانہ جنگیاں برپا ہوئیں جنہوں نے قوم کے بکثرت افراد کو ہلاک کر دیا۔ اس دوہرے نقصان نے یونانی قوم کا ایسا زور توڑا کہ پھر وہ نہ سنبھل سکی اور آخر کار اپنے گھر میں دوسروں کی غلام بن کر رہی۔ ٹھیک ٹھیک اسی خطرہ میں مغربی ممالک اپنے آپ کو مبتلا کر رہے ہیں ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا ہی یہ ہو کہ ان سے خودکشی کرائے۔ مگر ہم کیوں ان کی اندھی تقلید کر کے اپنی شامت کو اپنے ہاتھوں دعوت دیں؟

معاشی نقصان | تجربہ اور تحقیق سے یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ ضبط ولادت معاشی حیثیت

سے مفید ہے اب معاشیات کے ماہرین میں یہ خیال روز بروز ترقی کرتا جارہا ہے کہ آبادی کی تقلیل معاشی انحطاط (ECONOMIC DEPRESSION) کے نہایت قوی اسباب میں سے ہے، اس لیے کہ شرح پیدائش کے گھٹنے سے پیدآور آبادی (PRODUCING POPULATION) کے مقابلہ میں خرچ کرنے والی آبادی (CONSUMING POPULATION) کم ہوجاتی ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پیدآور آبادی میں بیکاری بڑھتی چلی جائے۔ پیدآور آبادی صرف جوانوں پر مشتمل ہوتی ہے برعکس اس کے خرچ کرنے والی آبادی میں بوڑھے، بچے، معذورین بھی شامل ہوتے ہیں جن کا پیدآوری میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اگر ان کی تعداد گھٹ جائے تو مجموعی طور پر خرچ کرنے والوں میں بھی کمی واقع ہوگی۔ مال کے خریدار کم ہوجائیں گے۔ اسی نسبت سے مال طیار کرنے والوں کو کام کم ملے گا۔ اسی وجہ سے جرمنی اور اٹلی کے ماہرین معاشیات خاص طور پر توفیر آبادی کے لیے زور دے رہے ہیں۔

ضبط ولادت کے نقصانات کی یہ تفصیل جو سراسر حقائق پر مشتمل ہے، اس آیت پاک کی ایک جزئی تفسیر ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "وہ لوگ ٹوٹے میں پڑ گئے جنھوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بغیر سمجھے بوجھے ہلاک کر دیا اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو حرام کر لیا" نیز اس سے اس آیت کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (۲:۲۰۵)

اور جب وہ پلٹتا تو اس نے زمین میں فساد پھیلانے اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرنے کی تدبیریں کیں۔

مباحث مذکورہ بالا کو پیش نظر رکھ کر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حرث اور نسل کی بربادی کو فساد فی الارض سے کیوں تعبیر فرمایا ہے۔ پھر اس بحث سے آپ اس آیت کا مفہوم بھی خوب سمجھ سکتے ہیں جس میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ

اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ان کو

نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۔ (۱۷: ۳۱)۔ رزق دینے والے بھی ہم ہی ہیں، اور تم کو بھی، انہیں قتل کرنا ایک بڑی خطا ہے ۔

یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ معاشی مشکلات کے خوف سے اولاد کی تعداد گھٹانا محض ایک حماقت ہے ۔

اس کے بعد ہم کو ان دلائل سے بحث کرنی ہے جو ضبط ولادت کی تائید میں پیش کیے جاتے ہیں ۔ اسی ضمن میں ہم اُن احادیث کی صحیح تفسیر بھی بیان کریں گے ۔ جن سے ضبط ولادت کی موافقت میں استدلال کیا جا سکتا ہے ۔

ضبط ولادت کی تائید میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر اُن حالات پر مبنی ہیں جو مغربی تہذیب و تمدن نے پیدا کیے ہیں ۔ حامیان ضبط ولادت کا طریق فکر یہ ہے کہ تمدن و معاشرت کے یہ اطوار، اور تہذیب کے یہ طریقے، اور معیشت کے یہ اصول تو نا قابل تغیر ہیں ۔ البتہ ان سے جو مشکلات پیدا ہوتی ہیں، ان کو ضرور حل کرنا چاہیے، اور ان کا آسان حل یہی ہے کہ افزائش نسل کو روک دیا جائے ۔ لیکن ہم کہتے ہیں کو تم تمدن و تہذیب کے اسلامی اصول اور معیشت و معاشرت کے اسلامی قوانین اختیار کر کے ان مشکلات ہی کو پیش آنے سے روک دو، جنہیں حل کرنے کے لیے تم کو قوانین فطرت کے خلاف جنگ کرنی پڑتی ہے ۔

اس مسئلہ پر اشاعت گذشتہ میں کافی بحث کی جا چکی ہے ۔ لہٰذا اب ہم صرف ان دلائل سے بحث کریں گے جو مخصوص حالات پر نہیں بلکہ عام انسانی حالات پر نظر کر کے حامیان ضبط ولادت نے اپنی کتابوں اور تقریروں میں بیان کیے ہیں ۔

خدائی انتظامات میں مداخلت | سب سے بڑی دلیل جس نے لوگوں کو بہت زیادہ دھوکے میں ڈالا ہے یہ ہے کہ زمین میں قابل سکونت جگہ محدود ہے ۔ انسان کے لیے وسائل معاش بھی محدود ہیں ۔

لیکن انسانی نسلوں میں افزائش کی قابلیت غیر محدود ہے۔ زمین میں ایک اچھے معیار زندگی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار ملین آدمی سما سکتے ہیں۔ اس وقت زمین کی آبادی دو ہزار ملین تک پہنچ چکی ہے، اور اگر حالات مناسب ہوں تو ۳۰ سال کے اندر یہ آبادی دوگنی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ اندیشہ بالکل بجا ہے کہ ۵۰ سال کے اندر زمین آدمیوں سے بھر جائے گی، اور اس کے بعد نسلوں میں جو اضافہ ہوگا وہ اولاد آدم کے معیار زندگی کو گراتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ ان کے لیے پچھلے آدمیوں کی طرح زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ پس انسانیت کو اس خطرہ سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ تحدید نسل (BIRTH LIMITATION) کے طریقے اختیار کر کے نسلوں کی افزائش کو ایک حد مناسب کے اندر محدود کر دیا جائے۔

یہ در اصل خدا کے انتظام پر نکتہ چینی ہے جس بات کو یہ لوگ خود حساب لگا کر اس قدر آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں، ان کا گمان ہے کہ خدا اس سے بے خبر ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ زمین میں کس قدر گنجائش ہے اور انسان کس حد تک اس میں سما سکتے ہیں۔ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۔ ان نادانوں کو معلوم نہیں کہ اللہ نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کیا ہے۔ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۔ اس کے خزانوں سے جو چیز بھی صادر ہوتی ہے ایک جنچے تلے اندازے پر ہوتی ہے۔ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۔ ان کا گمان خواہ کچھ ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ جس ہستی نے اس عالم کو پیدا کیا ہے وہ تخلیق و آفرینش کے فن میں اناڑی نہیں ہے۔ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِينَ ۔ اگر یہ اس کے کاموں کو بصیرت کی آنکھوں سے دیکھتے اور اس کے انتظام پر غور کرتے تو ان پر خود ہی روشن ہو جاتا کہ وہ اپنے حساب اور اندازے میں ان سے زیادہ کامل ہے۔ اس نے اسی محدود رقبہ زمین پر اپنی مخلوق کی بیشمار انواع پیدا کی ہیں جن میں سے ہر ایک کے اندر توالد و تناسل کی ایسی زبردست قوت ہے کہ اگر صرف

ایک ہی نوع، بلکہ بعض انواع کے صرف ایک جوڑے کی نسل کو وہ پوری قوت کے ساتھ بڑھنے دے تو ایک قلیل مدت میں تمام روئے زمین صرف اسی نسل سے پٹ جائے، اور کسی دوسری نسل کے لیے ذرہ برابر جگہ باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر نباتات کی ایک قسم ہے جس کو نباتات (SISYMBRIUM) کہتے ہیں۔ اس نوع کے ہر فرد میں عموماً ساڑھے سات لاکھ بیج ہوتے ہیں۔ اگر اس کے صرف ایک پودے کے سب بیج زمین میں اُگ جائیں۔ اور تین سال تک اس کی نسل بڑھتی رہے تو زمین میں دوسری نسلوں کے لیے ایک چپہ بھی باقی نہ رہے۔ ایک قسم کی مچھلی (STAR FISH) ۲۰ کروڑ انڈے دیتی ہے۔ اگر اس کے صرف ایک فرد کو اپنی پوری نسل بڑھانے کا موقع مل جائے تو تیسری چوتھی پشت تک پہنچتے پہنچتے تمام دنیا کے سمندر اسی سے لبالب بھر جائیں اور ان میں پانی کے ایک قطرے کی بھی گنجائش نہ رہے۔ دور کیوں جائیے خود انسان ہی کی قوت تناسل کو دیکھ لیجیے۔ ایک مرد کے جسم سے ایک وقت میں جو مادّہ خارج ہوتا ہے۔ اس سے تمام دنیا کی بالغ عورتیں حاملہ ہو سکتی ہیں۔ اگر صرف ایک ہی مرد کی پوری استعداد تناسل کو قوت سے فعل میں آنے کا موقع مل جائے تو چند سال میں ساری زمین اس کی اولاد سے کھچا کھچ بھر جائے۔ مگر وہ کون ہے جو ہزاروں لاکھوں سال سے کرہ زمین پہ ان بے شمار انواع کو اس زبردست قوت تناسل کے ساتھ پیدا کر رہا ہے اور کسی نوع کو اس کی مقرر و مقدر حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا؟ کیا وہ تمہاری سائنٹیفک تدبیریں ہیں؟ یا خدا کی حکمت؟ خود تمہارے اپنے سائنٹیفک مشاہدات گواہ ہیں کہ مادۂ ذی حیات میں نشو و نما کی قوت بے اندازہ ہے، حتیٰ کہ ایک واحد الخلیہ جرثوم نامی (UNICELLULAR ORGANISM) میں نمو کی اتنی قوت ہوتی ہے کہ اگر اس کو پیہم غذا ملتی رہے اور تقسیم در تقسیم کا موقع مل جائے تو پانچ سال کے اندر وہ اتنا ذی حیات مادہ پیدا کر سکتا ہے جو زمین کی جسامت سے دس ہزار گنا زیادہ ہوگا۔ مگر وہ کون ہے جس نے قوت حیات کے اس خزانے پر کنٹرولر مقرر کر رکھے ہیں؟ وہ کون ہے

جو اس خزانے میں سے قسم قسم کی مخلوقات نکال رہا ہے، اور ایسے ٹھیک حساب کے ساتھ نکال رہا ہے کہ اس میں نہ کبھی افراط ہوتی ہے نہ تفریط؟

اگر انسان اپنے خالق کی ان نشانیوں پر غور کرے تو وہ کبھی اس کے انتظام میں دخل دینے کی جرأت نہ کرے۔ یہ سب جاہلانہ اوہام ہیں جو محض اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ آفاق اور خود اپنے انفس میں اپنے رب کی آیات کو نہیں دیکھتے۔ ان کو ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ انسانی سعی و عمل کی حد کہاں تک ہے اور کس حد پر پہنچ کر خالص خدائی انتظامات شروع ہوتے ہیں جن میں دخل دینا تو درکنار سمجھنے پر بھی انسان قادر نہیں ہے جب انسان اپنی حد جائز سے بڑھ کر خدا کے حدود انتظام میں دخل دینے کی کوشش کرتا ہے، تو خدا کے انتظامات میں تو وہ ذرہ برابر بھی خلل انداز نہیں ہو سکتا، البتہ خود اپنے لیے دماغی کاوشیں اور ذہنی الجھنیں ضرور پیدا کر لیتا ہے۔ وہ بیٹھ کر حساب لگاتا ہے کہ دس سال کے اندر ہندوستان کی آبادی ساڑھے تین کروڑ بڑھ گئی۔ آئندہ دس سال میں چار کروڑ اور بڑھ جائے گی۔ ۷۰ سال میں ۴۳ کروڑ ہو جائے گی۔ ۹۴ سال میں دگنی ہو جائے گی۔ پھر سوچتا ہے کہ اتنے آدمی آخر کہاں سمائیں گے؟ کیا کھائیں گے؟ کیونکر جیئیں گے؟ اسی فکر میں وہ الجھتا ہے مضامین لکھتا ہے، تقریریں کرتا ہے، کمیٹیاں بناتا ہے، کونسل میں عقلاء قوم کو اس مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے توجہ دلاتا ہے۔ مگر وہ بندہ خدا نہیں سوچتا کہ جس خدا نے ہزارہا سال سے انسانوں کی بستی اس بر اعظم میں بسا رکھی ہے وہ خود اس مسئلہ کو حل کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا، اور جب وہ انہیں ہلاک کرنا چاہے گا تو ہلاک بھی کر دے گا۔ آبادیوں کی پیدائش، اور ان کے گھٹاؤ بڑھاؤ اور ان کے لیے زمین میں گنجائش نکالنے کا انتظام اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا	زمین میں چلنے پھرنے والی کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے رزق
عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا	کا انتظام خدا کے ذمہ نہ ہو۔ اور وہی زمین میں ان کے

وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ۔ ٹھکانے اور ان کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک کتاب روشن میں لکھا ہوا موجود ہے۔ (۱۱ : ۱)

یہ انتظام ہماری عقل و نظر کی رسائی سے بہت دور کسی پوشیدہ مقام سے ہو رہا ہے۔ اٹھارویں صدی کے خاتمہ سے انیسویں صدی کے وسط تک انگلستان کی آبادی میں جس تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ ہوا اس کو دیکھ کر عقلائے فرنگ ابتدا میں حیران تھے کہ یہ بڑھتی ہوئی آبادی کہاں سمائے گی اور کیا کھائے گی۔ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ انگلستان کی آبادی جس رفتار سے بڑھی، اس سے بدرجہا تیز رفتاری سے اس کے وسائل رزق بڑھے اور انگریزی قوم کو پھیلنے کے لیے زمین کے بڑے بڑے رقبے ملتے چلے گئے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ اضافہ آبادی کے ساتھ ساتھ وسائل رزق میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان اضافہ آبادی کا اوسط ۱۰ ½ فیصدی رہا۔ لیکن زرعی پیداوار میں ۱۵ فی صدی اور صنعتی پیداوار میں ۱۵ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ گذشتہ ۳۰ سال کے اندر اس ملک کی آبادی تو صرف ۱۳ ½ فی صدی زیادہ ہوئی مگر اس کی زرعی پیداوار میں ۲۹ فی صدی کا اضافہ ہو گیا۔ ظاہر میں ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں موجودہ آبادی سے دوگنی زیادہ آبادی کے لیے وسائل رزق موجود ہیں۔ یہاں کی زمین کا ۶۵ فی صدی حصہ قابل زراعت ہے جس میں سے ابھی تک صرف ۳۵ فی صدی حصہ زیر کاشت آیا ہے۔ اس کے علاوہ قدرتی ثروت کے بہت سے خزانے یہاں موجود ہیں جن سے ابھی کام لینا باقی ہے۔ صنعت اور تجارت کے میدان میں ابھی تک ہندوستان نے اتنا کام بھی نہیں کیا ہے جتنا دوسرے ممالک کر چکے ہیں۔ اور ترقی کے جو امکانات ابھی پوشیدہ ہیں ان کا تو ہم کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ ان سب باتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود اگر کوئی شخص اس فکر میں غلطاں ہو کہ یہ روز افزوں آبادی کہاں رہے گی اور کیا کھائے گی، تو یہ اس کی

اپنی حماقت ہے۔ اس کا کام صرف انسانی دائرہ عمل میں رہ کر سوچنا اور عمل کرنا ہے۔ اس دائرہ سے نکل کر وہ خالص خدائی انتظامات کے دائرہ میں قدم رکھنے کی کوشش کرے گا تو اپنے لیے ایسی مشکلات پیدا کرلے گا جن کا درحقیقت کوئی حل اس کے پاس نہیں۔

موت کا بدل | حامیان ضبط ولادت تسلیم کرتے ہیں کہ انواع کی تعداد کو ایک حد مناسب کے اندر محدود رکھنے کا انتظام خود فطرت نے کیا ہے، اور یہ انتظام نوع انسانی پر بھی حادی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ فطرت اس کام کو موت کے ذریعہ سے انجام دیتی ہے، جس میں انسان کے لیے سخت روحانی اور جسمانی اذیتیں ہیں۔ کیوں نہ ہم اس کے بجائے خود اپنی احتیاطی تدبیروں سے اپنی آبادیوں کو محدود رکھنے کا انتظام کرلیں؟ زندہ انسانوں کے لقمۂ اجل ہونے، طرح طرح کی تکلیفوں سے جان دینے، اور پسماندوں کے تڑپ تڑپ کر رہ جانے سے تو بدرجہا بہتر یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ انسان پیدا ہی نہ ہوں۔

یہاں پھر یہ لوگ خدائی انتظام میں مداخلت بے جا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ تمہاری احتیاطی تدبیروں سے کیا جنگ، وبائیں، امراض، سیلاب، زلزلے بند ہو جائیں گے؟ کیا تم نے خدا (یا بزعم خود "فطرت") سے کوئی ایسا معاہدہ کرلیا ہے کہ جب تم ضبط ولادت پر عمل شروع کرو گے تو فرشتہ موت برطرف کر دیا جائے گا؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور یہ یقیناً نہیں ہے، تو بتاؤ کہ ضبط ولادت اور فرشتۂ موت کی دوہری کارگذاری کا تختۂ مشق بن کر نوع انسانی کا کیا حشر ہوگا؟ ایک طرف تم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی آبادیوں کو گھٹا لوگے۔ دوسری طرف زلزلے ہزاروں آدمیوں کو بیک وقت نذر اجل کر دیں گے، سیلابوں میں بستیوں کی بستیاں اُجڑ جائیں گی، وبائیں آکر آبادیوں پر جھاڑو پھیر دیں گی۔ لڑائیوں میں تمہارے سائنٹیفک آلات لاکھوں بلکہ کروڑوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیں گے۔ اور موت کا فرشتہ فرداً فرداً بھی آدمیوں

کی رو میں قبض کرتا رہے گا۔ کیا تم حساب لگا کر اتنا بھی نہیں معلوم کر سکتے کہ جس خزانے میں آمد گھٹتی چلی جائے اور خرچ بدستور رہے وہ کب تک بھرلوپر رہے گا؟

اس سوال کو بھی جانے دو۔ کیا تمہارے پاس اپنی آبادیوں کے لیے "حدِ مناسب" مقرر کرنے کا کوئی معیار ہے؟ اور اگر بالفرض ہے، تو کیا تم اس معیار کے مطابق حسبِ ضرورت بچے پیدا کرنے اور صرف ضرورت سے زیادہ بچوں کی پیدائش روک دینے پہ قادر ہو؟ جب عوام الناس میں خودغرضانہ ذہنیت پیدا ہو جائے، اور وہ اپنے شخصی حالات اور نفسانی رجحانات کی بنا پہ بچوں کی ضرورت و عدمِ ضرورت کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں، اور ضبطِ ولادت کے عملی طریقے اور وسائل بھی آسانی کے ساتھ ان کو بہم پہنچ جائیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ ملکوں اور قوموں کی آبادی کو کسی مناسب حد تک ہی گھٹایا جائے۔ اور اس حد سے زیادہ نہ گھٹنے دیا جائے؟ قیاس کی ضرورت نہیں تجربہ شہادت دے رہا ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک بھی ایسی کوئی "حدِ مناسب" مقرر کرنے اور افراد کے عمل کو اس حد کے اندر محدود رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ پھر وہ کیا سامان ہے جس کو لے کر تم اُس خدائی تدبیر میں دخل دینے چلے ہو جس کے تحت وہ انسانی بستیوں کے لیے "حدِ مناسب" مقرر کرتا اور ایک اندازے کے ساتھ ان کو گھٹاتا بڑھاتا ہے؟

معاشی حیلہ | کہا جاتا ہے کہ محدود آمدنی رکھنے والے ماں باپ بچوں کی زیادہ تعداد کے لیے اچھی تعلیم و تربیت، عمدہ معاشرت، اور ایک بہتر آغاز (FAIR START) کے وسائل بہم پہنچانے پہ قادر نہیں ہو سکتے۔ جب بچوں کی تعداد والدین کی حدِ استطاعت سے بڑھ جاتی ہے یا مفلس والدین کے ہاں اولاد پیدا ہو جاتی ہے تو ان کا معیارِ حیات گر جاتا ہے۔ تعلیم خراب، تربیت ناقص، غذا، مکان، لباس، ہر چیز بدتر، اور آئندہ ترقی کے راستے مسدود۔ ایسے حالات میں بیکار آبادی بڑھانے سے بہتر ہے کہ ضبطِ ولادت کے ذریعہ سے بچوں کی تعداد کو اسی حد تک محدود رکھا جائے جس حد تک والدین

کے وسائل ساتھ دے سکیں، اور ناموافق حالات میں افزائش نسل کا سلسلہ موقوف رہے اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔

یہ دلیل آج کل لوگوں کو بہت اپیل کر رہی ہے، اور بظاہر بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے لیکن در حقیقت یہ بھی اُتنی ہی کمزور ہے جتنی پہلی دونوں ہیں۔ اول تو "اچھی تعلیم و تربیت"، "عمدہ معاشرت" اور "بہتر آغاز" ہی مبہم الفاظ ہیں جن کا کوئی واضح اور متعین مفہوم نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے ذہن میں ان کا الگ مفہوم رکھتا ہے، اور ان کے لیے ایسے معیار مقرر کرتا ہے۔ جو اس کے اپنے حالات اور وسائل و ذرائع کی صحیح تشخیص پر نہیں بلکہ اپنے سے بہتر لوگوں کے معیار پر پہنچنے کی حریصانہ خواہش پر مبنی ہوا کرتے ہیں۔ ایسے غلط معیار پر جو شخص اپنی اولاد کے لیے "اچھی تعلیم و تربیت" اور "عمدہ معاشرت" اور "بہتر آغاز" کا خواہش مند ہوگا، وہ یقیناً یہی فیصلہ کرے گا کہ اس کے ہاں ایک دو بچوں سے زیادہ نہ ہوں، بلکہ بعض حالات میں تو وہ سرے سے بے اولاد ہی رہنا پسند کرے گا، کیونکہ لوگوں کی خواہشات کا دائرہ عموماً ان کے وسائل کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہوتا ہے، اور جن امور کو وہ خواہشات کے حصول پر موقوف رکھتے ہیں وہ سرے سے ظہور ہی میں نہیں آتے۔ یہ محض نظریہ ہی نظریہ نہیں ہے، بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے۔ یورپ میں اس وقت لاکھوں جوڑے ایسے موجود ہیں، جو محض اس لیے بے اولاد رہنا پسند کرتے ہیں کہ ان کے پیش نظر اولاد کی تعلیم و تربیت اور عمدہ معاشرت، اور بہتر آغاز کا معیار اتنا بلند ہے کہ وہ بالفعل اس تک پہنچنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے۔

علاوہ بریں یہ دلیل اصولی حیثیت سے بھی غلط ہے۔ قوموں کی ترقی کے لیے یہ بات مفید نہیں بلکہ سخت مضرت رساں ہے کہ ان کی نسلیں تمام تر راحت اور آسائش کے ماحول میں پرورش پائیں، اور ان کو مصائب، مشکلات، ناداری، اور جد وجہد سے دوچار ہی نہ ہونا پڑے۔ یہ چیز تو اُس سب سے بڑی درس گاہ کو بند کر دے گی جس میں انسان کی تعلیم و تربیت تمہارے مدرسوں اور کالجوں سے زیادہ

بہتر طریقہ پر ہوتی ہے وہ درس گاہ زمانے کی درس گاہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے تاکہ انسان کے صبر، استقامت، ہمت اور حوصلوں کی آزمائش کرے، اور انہیں کو پاس کرے جو اس آزمائش میں پورے اتریں۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔ (۲: ۱۹) وہ ایک بھٹی ہے جو ناقص کو خالص سے تمیز کرتی ہے، اور تپا تپا کر کھوٹ کو نکال دیتی ہے۔ وہاں مصائب اس لیے ڈالے جاتے ہیں کہ ان کے مقابلے کی قوت پیدا ہو مشکلات اس لیے پیدا کی جاتی ہیں کہ انسان ان پر غالب آنے کی جدوجہد کرے سختیاں اس لیے عائد کی جاتی ہیں کہ اس کی کمزوریاں دور ہوں اور اس کی چھپی ہوئی قوتیں عمل کے میدان میں نمایاں ہوں۔ جو لوگ اس درس گاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں وہی دنیا میں کچھ کر کے دکھاتے ہیں اور دنیا میں آج تک جتنے بڑے بڑے کام کیے ہیں وہ اسی درس گاہ کے سند یافتوں نے کیے ہیں تم اس درس گاہ کو بند کر کے دنیا کو راحت کدے میں تبدیل کرنا چاہتے ہو تاکہ تمہاری نسلیں عیش پسند، پست حوصلہ، کام چور، اور برمول بن کر اٹھیں تم چاہتے ہو کہ تمہاری اولاد آسائش کے گہوارے میں آنکھ کھولے۔ اونچے مدرسوں اور شاندار اقامت خانوں میں رہ کر تعلیم حاصل کرے اور جوان ہو کر زندگی کے میدان میں قدم رکھے تو اس طرح کہ اس کے پاس ایک "بہتر آغاز" کے لیے کافی سرمایہ موجود ہو تم امید رکھتے ہو کہ اس صورت سے وہ دنیا میں کامیاب ہوں گے اور ترقی کے آسمانوں میں چمکیں گے مگر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی تعلیم و تربیت کے ساتھ تم صرف تیسرے درجہ کے ناطق حیوانات پیدا کر سکتے ہو یا زیادہ سے زیادہ دوسرے درجہ کے۔ درجہ اول کے انسان تمہاری نسلوں میں کبھی نہ اٹھیں گے یقین نہ آئے تو دنیا کی تاریخ اور اکابر رجال کے سوانح اٹھا کر دیکھ لو۔ تم کو درجہ اول کے جتنے آدمی ملیں گے ان میں سے کم از کم ۹۰ فی صدی ایسے ہوں گے جو مفلس و نادار ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئے مصیبت کی آغوش میں پرورش پا کر اٹھے۔ تمناؤں کے خون اور خواہشات کی قربانی کے ساتھ جوانی بسر کی۔ زندگی کے سمندر

میں بغیر کسی سازوسامان کے پھینک دیئے گئے۔ موجوں سے تیرنا سیکھا تھپیڑوں سے بڑھنے کا سبق حاصل کیا۔ اور آخر کار ساحل کامرانی پر اپنی برتری کا جھنڈا نصب کر ہی کے چھوڑا۔

چند اور دلیلیں | یہ تین بڑی دلیلیں تھیں۔ ان کے بعد تین چھوٹی دلیلیں اور بھی ہیں جن کو ہم اختصاراً کے ساتھ بیان کر کے اختصار ہی کے ساتھ جواب بھی دیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ ضبط ولادت کے ذریعہ سے اچھی قسم کی نسلیں پیدا کی جا سکتی ہیں جن کی تندرستی اچھی ہو، قویٰ مضبوط ہوں، اور جن میں کام کرنے کی عمدہ صلاحیتیں ہوں۔ اس خیال کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ انسان کے ہاں جب بھی ایک دو بچے ہوں گے، قوی و تندرست، ذہین اور طباع ہوں گے اور جب زیادہ بچے ہوں گے تو سب کے سب کمزور، بیمار، بیکار اور کند ذہن ہوں گے لیکن اس مفروضہ کی تائید میں نہ کوئی علمی دلیل ہے، اور نہ باضابطہ مشاہدات و تجربات کے نتائج محض ایک گمان ہی گمان ہے جس کے خلاف ہزاروں شہادتیں عالم واقعہ میں موجود ہیں۔ درحقیقت انسان کی پیدائش کے متعلق کوئی ضابطہ بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ چیز کلیتہً خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اور خدا جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ (۳: ۱) قوی اور تندرست اور ذہین اولاد پیدا کرنا، اور کمزور، مریض اور بلید الذہن اولاد نہ ہونے دینا انسان کے اختیار سے باہر ہے۔

اسی سے قریب المأخذ یہ دلیل ہے کہ ضبط ولادت انسان کو ایسے بچوں کی بیکار پیدائش اور پرورش کی مشقت سے بچا دیتا ہے جن کی دنیا کو ضرورت نہیں ہے۔ جو کبھی کارآمد بننے والے نہیں ہیں، یا بلوغ سے پہلے مر جانے والے ہیں۔ یہ خیال اس وقت صحیح ہوتا۔ جب انسان کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہوتا کہ کونسا بچہ کن خصوصیات کا حامل ہوگا؟ لائق ہوگا یا نالائق؟ زندہ رہے گا یا مر جائے گا؟ اس کا وجود کارآمد ہوگا یا بیکار؟ جب یہ چیز انسانی نظر سے قطعاً پوشیدہ ہے تو محض

رجماً بالغیب کوئی رائے قائم کرنا صریح حماقت ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ بچوں کی پیدائش سے عورت کی صحت خراب ہوجاتی ہے اور اس کے حسن وجمال میں بھی فرق آجاتا ہے۔ لیکن صفحات گذشتہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ضبط ولادت کے مصنوعی طریقے بھی صحت اور جمال کے لیے بے ضرر نہیں ہیں۔ ان سے بھی صحت کو اتنا ہی نقصان پہنچتا ہے جتنا کثرت اولاد سے پیدا ہوسکتا ہے۔ طبی حیثیت سے کوئی ایسا قاعدہ عام مقرر نہیں کیا جاسکتا، کہ عورت کتنے بچوں کی ولادت کا بار اٹھا سکتی ہے۔ یہ بات ہر عورت کے شخصی حالات پر منحصر ہے۔ اگر ایک طبیب کسی عورت کے خاص حالات کو پیش نظر رکھ کر یہ رائے قائم کرے کہ حمل اور وضع حمل کی تکلیف اس کی زندگی کے لیے خطرناک ہوگی تو ایسی حالت میں بلاشبہ طبیب کے مشورے سے ضبط ولادت کا کوئی مناسب طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے، بلکہ اگر ماں کی جان بچانے کے لیے ضروری ہو تو اسقاط حمل کرانا بھی ناجائز نہیں ہے لیکن صحت کو محض ایک بہانہ بنا کر ضبط ولادت کو ایک عام طرز عمل بنا لینا اور دائماً اس پر عمل کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

اصول اسلام سے کلی منافات حامیان ضبط ولادت کے مذکورہ بالا دلائل پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ تحریک دراصل دہریت والحاد کے شجر خبیث کی پیداوار ہے۔ جن لوگوں کے دماغوں سے خدا کا تصور نکل چکا ہے، اور جو دنیا کے معاملات میں اس نقطۂ نظر سے غور وفکر اور تدبیر و تصرف کرتے ہیں کہ خدا سرے سے موجود نہیں ہے۔ یا اگر ہے تو محض ایک معطل ہستی ہے، اور انسان آپ ہی اپنی قسمت کا بنانے والا اور اپنے تمام معاملات کی تدبیر کرنے والا ہے، وہی اس تحریک کو وجود میں لائے ہیں، اور انہی کے دماغوں کو اس تحریک کے دلائل اپیل کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے واضح ہوجانے کے بعد یہ امر کسی تشریح کا محتاج نہیں رہتا کہ یہ تحریک اصلاً اسلام کے خلاف ہے۔ اس کے اصول کلیتہً اصول اسلام کی ضد ہیں، اور اسلام کا عین مقصد ہی اس ذہنیت کو مٹانا ہے جس سے

ضبط ولادت جیسی تحریکات وجود میں آتی ہیں ۔

احادیث نبوی مسلمانوں میں جو حضرات ضبط ولادت کے مؤید ہیں ان کو اپنی تائید میں قرآن سے ایک لفظ سے بھی نہیں مل سکتا اس لیے وہ حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بعض ایسی احادیث سے استدلال کرتے ہیں جن میں اس فعل کی اجازت پائی جاتی ہے لیکن حدیث سے استدلال کرنے میں چند امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جن کو نظر انداز کر کے کسی فقہی مسئلہ کا استنباط نہیں کیا جا سکتا۔

اولاً مسئلہ متعلقہ کے باب میں تمام احادیث کا استقصاء لیا جائے ۔

ثانیاً ۔ ارشاد نبوی کے موقع و محل کو پیش نظر رکھا جائے ۔

ثالثاً ۔ اُس وقت عرب کے جو حالات تھے ان کو ملحوظ رکھا جائے ۔

لہٰذا ہم ان تینوں اُمور کو ملحوظ رکھ کر ان احادیث پر نظر ڈالیں گے جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں ۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ عرب جاہلیت میں برتھ کنٹرول کے لیے قتل کا طریقہ رائج تھا جس کے دو وجوہ تھے ۔ ایک معاشی حالات کی خرابی جن کی وجہ سے ماں باپ اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے تاکہ ان کے رزق میں کوئی شریک پیدا نہ ہو ۔ دوسرے غیرت کا حد سے بڑھا ہوا جذبہ ۔ جو لڑکیوں کے قتل کا محرک ہوتا تھا ۔ اسلام نے آکر اس کو سختی کے ساتھ منع کیا، اور اس باب میں عربوں کی ذہنیت ہی بدل دی ۔ اس کے بعد مسلمانوں کا رجحان عزل (COITUS INTERRUPTUS) (یعنی مباشرت بلا انزال فی الفرج) کی طرف راغب ہوا لیکن یہ رجحان عام نہ تھا ۔ نہ برتھ کنٹرول کی کوئی تحریک جاری ہوئی تھی ۔ نہ اس کو قومی پالیسی بنانا مقصود تھا ۔ نہ اس کے محرک وہ عہد جاہلیت کے جذبات اور خیالات تھے جن کی وجہ سے قتل اولاد کے ظالمانہ طریقہ پر عمل کیا جاتا تھا ۔ بلکہ دراصل اس کے تین وجوہ تھے جو احادیث کے تتبع سے ہم کو معلوم ہوتے ہیں ۔

ایک یہ خیال کہ لونڈی سے اولاد نہ ہو ۔

دوسرے یہ کہ لونڈی کے امّ ولد ہونے سے یہ خوف تھا کہ وہ فروخت نہ کی جاسکے گی۔

تیسرے یہ کہ زمانہ رضاعت میں حمل ٹھیر جانے سے شیر خوار بچہ کو نقصان پہنچنے کا خوف تھا۔

ان وجوہ سے مخصوص حالات میں بعض صحابہ نے عزل کی ضرورت محسوس کی اور یہ دیکھ کر کہ اس فعل کے عدم جواز کا کوئی صریح حکم کتاب وسنت میں نہیں آیا ہے، اس پر عمل کیا، مثلاً ابن عباس، سعد بن ابی وقاص اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم۔ انہی میں سے ایک حضرت جابرؓ بھی ہیں جنہوں نے شارع کے سکوت کو رضا پر محمول کیا ہے چنانچہ ان سے جو احادیث مروی ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں:—

كنا نعزل على عهد رسول الله صلعم۔	ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عزل کرتے تھے
كنا نعزل والقرآن ينزل۔	ہم عزل کرتے تھے اس حال میں کہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔
كنا نعزل على عهد رسول الله صلعم والقرآن ينزل۔	ہم عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عزل کرتے تھے جبکہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

ان احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ اور ان کے ہم خیال صحابہؓ نے عزل کے باب میں کوئی صریح حکم نہ ہونے سے فائدہ اٹھایا۔ ایک اور حدیث جو انہی صحابی سے امام مسلم نے نقل کی ہے، یہ ہے کہ "ہم عہد رسالت میں عزل کرتے تھے۔ اس کی خبر حضورؐ کو پہنچی اور آپؐ نے ہم کو منع فرمایا۔" اس حدیث میں ابہام ہے۔ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ عزل کے متعلق کس صورت سے استفتا کیا گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کیا فرمایا۔ اس کی تفصیل دوسری احادیث میں بیان ہوئی ہے

ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ ہمارے ہاتھ لونڈیاں آئیں اور ہم نے عزل کیا پھر اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: "کیا تم ایسا کرتے ہو؟ کیا تم ایسا کرتے ہو؟ کیا تم ایسا کرتے ہو؟ قیامت تک جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ تو ہو کر ہی رہیں گے"۔ (بخاری)۔

امام مالک نے موطا میں انہی ابو سعید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ غزوہ بنی المصطلق میں ہمارے ہاتھ لونڈیاں آئیں۔ اہل وعیال سے دوری ہم پر شاق گزر رہی تھی۔ ہم نے چاہا کہ ان عورتوں سے استمتاع کریں۔ مگر اس کے ساتھ ہماری خواہش یہ بھی تھی کہ ان کو فروخت کر دیں۔ اس لیے ہم نے خیال کیا کہ ان سے عزل کرنا چاہیے تاکہ اولاد پیدا نہ ہو۔ ہم نے حضورؐ سے سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا ما علیکم ان لا تفعلوا۔ ما من نسمۃ کائنۃ الا وھی کائنۃ۔ اگر تم ایسا نہ کرو تو کوئی حرج نہیں۔ قیامت تک جو بچے پیدا ہونے والے ہیں وہ تو ہو کر ہی رہیں گے"۔

مسلم کی حدیث ہے کہ جب عزل کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ لا علیکم ان لا تفعلوا ذلکم۔ اگر تم ایسا نہ کرو تو کوئی حرج نہیں"۔ ایک دوسری حدیث میں ہے۔ ولم یفعل ذالک احدکم۔ تم میں سے کوئی یہ فعل کیوں کرے"۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ میرے پاس ایک لونڈی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس سے اولاد ہو۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا۔ اعزل عنھا ان شئت فانہ سیأتیھا ماقدر لھا۔ تو چاہے تو عزل کر لے۔ مگر جو اولاد اس کی تقدیر میں لکھی ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گی۔

ان کے علاوہ حضرت ابو سعید سے ترمذی نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ صحابہ میں سے جو اہل علم تھے وہ عموماً عزل کو مکروہ سمجھتے تھے۔ موطا میں امام مالک نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو عزل کو ناپسند کرتے تھے۔

ان سب روایات کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کی اجازت نہ دی تھی۔ بلکہ آپؐ اس کو ایک عبث اور ناپسندیدہ فعل سمجھتے تھے، اور آپؐ کے جن اصحاب کو تفقہ فی الدین کا مرتبہ حاصل تھا، وہ بھی اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے لیکن چونکہ عزل کی کوئی عام تحریک قوم میں جاری نہیں ہوئی تھی، اور اس کو ایک عام قومی طرز عمل نہیں بنایا جارہا

تھا، اور محض چند افراد اپنی مجبوریوں اور ضرورتوں کی بنا پر اس فعل کا ارتکاب کرتے تھے، اس لیے آپؐ نے اس کو صاف طور پر ناجائز نہ ٹھیرایا۔ اگر اس وقت برتھ کنٹرول کی کوئی عام تحریک شروع ہوتی تو یقیناً حضورؐ نہایت سختی کے ساتھ اس کو روکتے۔

عزل پر ضبط ولادت کے دوسرے طریقوں کو بھی قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان طریقوں کو شارع نے صرف اس وجہ سے حرام نہیں کیا کہ بعض حالات میں انسان فی الواقع ان کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور احتیاط کا مقتضیٰ یہی ہے کہ اس کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ مثلاً حمل ٹھیرنے سے عورت کی جان کا خطرے میں پڑ جانا، یا اس کی صحت کو غیر معمولی نقصان پہنچنے کا خوف، یا زمانہ رضاعت میں شیر خوار بچے کو مضرت پہنچنے کا اندیشہ، یا اور ایسے ہی دوسرے وجوہ ان حالات میں اگر آدمی طبی مشورے سے ضبط ولادت کا کوئی طریقہ اختیار کرے تو یہ جائز ہے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ لیکن بلا ضرورت اس کو ایک عام طرز عمل بنانا احکام اسلام کے قطعاً خلاف ہے، اور وہ تمام خیالات جن کی بنا پر ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی طرف رجحان پیدا ہوتا ہے، اصول اسلام کے بالکل منافی ہیں۔

ترانہ کہ تازیانہ؟

(جناب مرزا عزیز فیضانی)

مفیدِ ملت کے حق میں مسلک نہیں ہے اسوقت زاہدانہ
عمل کے میدان میں جوش درکار آج کل ہے مجاہدانہ

عمل کے دم سے جہاں کی تاریخ بن سکو گے، بنا سکو گے
وگرنہ رہ جائے۔ وہ بھی شاید۔ تمہارا باقی فقط فسانہ

جو قوم، جو فوج، بے نظام و امام ہو کر رہی جہاں میں
گیا ہر اک وار اُسکا خالی، خطا ہوا اُسکا ہر نشانہ

سکونِ خاطر سے اب بھی زاہد ہے محوِ اشغالِ سُبحہ خوانی
ہوا ہے تسبیحِ نظمِ ملت کا منتشر کب سے دانہ دانہ

یہ آج حجروں کے گوشے گوشے سے آرہی ہے صدائے پیہم
کہ خیر ایمان کی مناؤ بہت ہی نازک ہے یہ زمانہ

یہی غنیمت ہے معرکے میں کہ بیٹھ کر مانگیے دعائیں
شکست پر لائیے دو آنسو ظفر پہ پڑھ لیجیے دوگانہ

مقابلہ غیر کا اگر ہو تو ہے غلامانہ خُو ہماری
مگر جب اپنوں سے واسطہ ہو دماغ ہوتا ہے پھر شہانہ

کہاں وہ رفعت وہ عزم و ہمت کہ آشیانہ بھی اِک قفس تھا
کہاں یہ دُونِ ہمتی و پستی کہ اب قفس بھی ہے آشیانہ

جمود و غفلت کا اور کوئی علاج اے ہمنوا نہیں ہے
قلم میں تلوار کا اثر ہو، بیاں ہو محشر، زباں زبانہ

عزیز پوچھو تو اس زمانے کے شاعرانِ غزل سرا سے
کہ محوِ غفلت مِلل کے حق میں ترانہ اچھا کہ تازیانہ؟

اقوال حضرت عثمانؓ

جناب شیخ عبدالمالک۔ کرنال شاپ لاہور

۱۔ ایسی بات مت کہہ جو مخاطب کی سمجھ سے باہر ہو۔

۲۔ تعجب ہے اُس پر جو دوزخ کو برحق مانتا ہے اور پھر گناہ کرتا ہے۔

۳۔ تعجب ہے اُس پر جو اللہ کو حق جانتا ہے اور پھر غیروں کا ذکر کرتا اور اُن پر بھروسہ رکھتا ہے۔

۴۔ تعجب ہے اُس پر جو شیطان کو دشمن جانتا ہے اور پھر اُس کی اطاعت کرتا ہے

۵۔ بعض اوقات جرم معاف کرنا مجرم کو اور زیادہ خطرناک بنا دیتا ہے۔

۶۔ عافیت کے نو حصے لوگوں سے الگ رہنے میں ہیں اور ایک حصہ ملنے میں۔

۷۔ جو شخص مصیبت کے وقت اوّل اپنی تدبیریں اور پھر خلقِ خدا کی امداد سے عاجز ہو کر خدا کی جانب رجوع کرتا ہے خداتعالے بھی اُس کی جانب سے منہ پھیر لیتا ہے۔

۸۔ مت رکھ امید کسی سے مگر اپنے رب سے اور مت ڈر کسی سے مگر اپنے گناہ سے۔

۹۔ اپنا بوجھ خلقت میں سے کسی پر مت رکھ خواہ کم ہو یا زیادہ۔

۱۰۔ خاموشی غصہ کا بہترین علاج ہے۔

۱۱۔ زبان کی لغزش پاؤں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔

۱۲۔ اگر تُو گناہ پر آمادہ ہے تو کوئی ایسا مقام تلاش کر جہاں خدا نہ ہو۔

۱۳۔ اے انسان اگر تُو معبودِ حقیقی کی پرستش نہیں کرنا چاہتا تو اسکی بنائی ہوئی چیزوں کو بھی استعمال نہ کر۔

۱۴۔ ترغیب دلانے کی نیت سے علانیہ صدقہ دینا خفیہ سے بہتر ہے۔

۱۵۔ اللہ کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھنا افضل ترین ایمان ہے۔

حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ چودہویں صدی میں

یا

ماہنامہ "الفرقان" بریلی

کا ولی اللہ نمبر

جو ۲۰×۲۶/۸ سائز کے تین سو سے زیادہ صفحات پر انشاء اللہ آخر دسمبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہو گا

پوری کیفیت تو مطالعہ ہی سے معلوم ہوسکے گی لیکن کچھ اندازہ غالباً آپ اس سے بھی فرمائیں گے کہ ادارۂ الفرقان کے علاوہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالاعلے مودودی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی (ایم اے) اڈیٹر "برہان" دہلی اور مولانا سید علی ندوی پروفیسر ندوۃ العلماء و ایڈیٹر "الندوہ" لکھنو ــــ جیسے اہل قلم و ارباب تحقیق نے بھی اس نمبر کی تیاری میں خاص حصہ لیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کارناموں، الہامی نظریوں اور آپ کے انقلاب انگیز فلسفہ کے متعلق اس نمبر میں تقریباً بیس مشاہیر اہل قلم اور ممتاز علماء کرام کے بصیرت افروز اور مبسوط مقالے ہیں نیز بلند پایہ سعرائی کیف آور نظمیں اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کی لکھی ہوئی بعض نہایت اہم اور تاریخی تحریرات کے فوٹو بھی آپ اس نمبر میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

کثرت اشاعت کے لیے قیمت عہ (ڈیڑھ روپیہ) رکھی گئی ہے لیکن الفرقان کے مستقل خریداروں سے اس کی علیحدہ کوئی قیمت نہیں لی جائے گی بشرطیکہ اس کا سالانہ چندہ تین روپے (للعہ) اس کی اشاعت سے پہلے وصول ہو جائے اس نمبر کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے نمبر کا مفصل اشتہار دفتر الفرقان سے طلب فرمائیے۔

ناظم دفتر "الفرقان" بریلی (یو۔پی)

اعلان

پیغام حق کا اقبال نمبر

اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو ماہ جنوری ۱۹۴۱ء میں پیغام حق کا جو نمبر نکلے گا وہ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے لیے مخصوص ہوگا۔ اہل ادب سے استدعا ہے کہ وہ اس نمبر کو کامیاب بنانے کی سعی کریں۔ کوشش کی جاوے گی کہ یہ نمبر علامہ مرحوم کی شخصیت اور تعلیمات کا پورا پورا مرقع بن جائے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی بی اے آنرز اس نمبر کو مرتب کرینگے۔ اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی علامہ اقبال سے متعلق تمام پہلوؤں پر اپنے مخصوص محققانہ انداز میں ایک مبسوط مقالہ تحریر فرمائیں گے۔ علاوہ ازیں پروفیسر علم الدین سالک ایم۔ اے، ڈاکٹر محمد باقر پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ڈی۔ لٹ، اور دیگر بلند پایہ اہل قلم حضرات کے مضامین بھی شائع ہونگے، اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے اپنے خیالات کی اشاعت کا یہ بہترین موقع ہے یہ نمبر انشاء اللہ العزیز ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر جاوے گا۔ اور بہت بڑی تعداد میں چھپوایا جائے گا۔ اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ ؍) ہوگی۔ جو حضرات پیغام حق کے مستقل خریدار ہیں اُن سے زاید کچھ نہیں لیا جاوے گا۔

چندہ سالانہ عوام کے لیے عا ؍ ہے اور ذی استطاعت حضرات کے لیے صہ ؍ ہے۔

مینجر پیغام حق

ظفر منزل۔ تاجپورہ۔ لاہور